سرپرست
حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

مدیر:
خلیل الرحمن سجاد ندوی

ممالک غیر سے
بحری ڈاک سے ۳ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ۹ پونڈ
ایک شمارہ کی قیمت ہندوستان میں
۲/۵۰

چندہ سالانہ
ہندوستان میں ۲۵/-
پاکستان سے پاکستانی سکہ میں ۶۰/-
بنگلہ دیش سے ہندوستانی سکہ میں
۳۰/-

جلد (۵۲) | بابت ماہ جنوری ۱۹۸۴ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ | شمارہ (۱)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیے۔ ورنہ وی پی نہیں کیا جائے گا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط وکتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چیٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں۔ اگر دوبارہ بھیجنے کے لیے دفتر میں پرچہ ہو گا تو ضرور بھیجا جائے گا۔

پاکستانی خریدار حضرات مبلغ ۔۳۰ روپے ہندوستانی سکہ میں کسی بھی ذریعہ سے الفرقان لکھنؤ کو روانہ فرمائیں یا پاکستانی سکہ میں ۔۶۰ روپے ناظم ادارۂ اصلاح وتبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیج دیں۔

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

افتتاحیہ

الحمد للہ الذی بعزتہ و جلالہ تتم الصالحات۔

الحمد للہ کہ محرم ۱۳۵۳ھ (مارچ ۱۹۳۴ء) میں الفرقان کے اجراء سے جس چراغ کو روشن کیا گیا تھا محرم ۱۴۰۴ھ میں اس کو ۵۱ سال پورے ہوگئے، جلدوں کے اعتبار سے یہ شمارہ اس کی ۵۲ ویں جلد کا پہلا شمارہ ہے۔ اس موقع پر سب سے پہلے تو دل و زبان سے اللہ کی حمد و تقدیس اور شکر و ثنا اس توفیق پر، اور پھر اس سے قبولیت اور عفو و درگذر کی دعا و التجا!

حضرت والد ماجد متعنا اللہ بطول بقائہ کی نصف صدی سے زیادہ مدت میں دینی، اصلاحی، دعوتی اور علمی مساعی کا معتد بہ حصہ الفرقان کے صفحات کے ذریعہ عمل میں آیا ہے۔ کس عزیمت، کیسے صبر و حوصلے اور استقامت کے ساتھ اور کتنی سخت مشقتیں برداشت کرکے، اور کس قوت ارادی اور ذوق یقین کے ساتھ یہ طویل سفر طے ہوا ہے، یہ اللہ جانے یا اس کا وہ بندہ جس کو اس نے اس کی توفیق بخشی ــــ کچھ اندازہ اس کا وہ لوگ کرسکتے ہیں جنھیں اس طرح کے کاموں کا تجربہ ہے۔

پھر ایک طویل مدت تک اس چراغ کی خدمت و حفاظت بھائی صاحب مدظلہ کے ذمے رہی، الفرقان کے صفحات شاہد ہیں کہ انھوں نے کتنے نامساعد حالات میں نہ صرف یہ کہ اس چراغ کو روشن رکھا، بلکہ اس کی روشنی کو اور زیادہ نکھارا، اور اس کے دائرہ کو اور زیادہ وسعت دی۔

اور اب ایک سال ہوا کہ یہ بارگراں اس طفل مکتب کے دوش ناتواں پر آگیا ہے ــــ تمنائیں تو بہت ہیں، لیکن استعداد کمزور، اگر یہ یقین نہ ہوتا کہ کام تو اللہ کے ارادہ سے ہوتا ہے نہ کہ کسی کی صلاحیت سے تو شاید اس میدان میں نہ اترنے ہی میں عافیت سمجھتا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ کام لے لے جو اس کے علم میں حق ہو، اور ہر اس راہ سے بچائے جو اس کے علم میں باطل ہو۔ اور اپنے لیے اور امت کے لیے نافع و مضر اذکار و اعمال کو سمجھنے والی عقل سلیم اور فرقان مبین نصیب فرمائے۔ یہ ہیچمدان اپنے بزرگوں اور محسنوں سے، اپنے اساتذہ و دیگر حضرات اہل علم سے اور تمام قارئین کرام سے دعاؤں، نصیحتوں اور مشوروں کا طالب ہے۔ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ، وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ۔

خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

۲۷ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

ہر قوم، اور ہر مذہب وملت کی تاریخ میں کچھ ایسے واقعات ہوتے ہیں، جن کی حیثیت خصوصی اہمیت کی حامل ہوتی ہے، اور ان کے ساتھ اس قوم یا مذہب وملت کے لوگوں کو خصوصی تعلق خاطر ہوتا ہے۔ اور ماہ وسال کی گردش میں جب وہ دن آتے ہیں جن کے ساتھ ان واقعات کی تاریخ وابستہ ہوتی ہے، تو ان کی یادیں دلوں میں تازہ ہو جاتی ہے اور اس یاد کا اظہار ہر قوم اپنے طرز پر کرتی ہے۔ جو اس کے عقائد وافکار اور ذوق ومزاج کے مطابق ہوتا ہے۔

اسلام نے انسانوں کی فطرت کے اس تقاضے کا پورا لحاظ کیا ہے۔ اسلام کی تاریخ ایک ملت تہذیب اور مکمل نظام حیات کے لحاظ سے ابراہیم علیہ السلام سے خاص مناسبت رکھتی ہے۔ اہل بصیرت نے انھیں اس پورے تربیتی نظام کا اولین فاؤنڈر قرار دیا ہے جس کا نام بھی خود انھوں ہی نے "اسلام" منتخب کیا تھا۔ اسی لیے ان کے کتنے ہی عاشقانہ اعمال اور پاکیزہ خصلتوں کی یاد طواف بیت اللہ، سعی، وقوف عرفات، منیٰ ومزدلفہ کی حاضری، رمی جمرات، قربانی، تلبیہ، احرام، تکبیر تشریق، اجتماع عید الاضحیٰ نیز غسل، وضو، اور طہارت وپاکیزگی کے تفصیلی احکام کی شکل میں باقی رکھی گئی۔ اور اس طرح اپنی تاریخ کے اہم واقعات اور بانیان مذہب کے اعمال وکردار کی یاد منانے کے ایک مخصوص اور مستقل طریقے کی بنا ڈالی گئی۔

جس طرح پوری انسانی زندگی کے متعلق اللہ کی اصولی وتفصیلی ہدایات کو سب سے پہلے لانے والے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے اسی طرح ان ہدایات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے والے اور اس مبارک مشن کو مکمل کرنے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ چنانچہ ان پر جس مہینے میں اس تکمیلی پیغام اور آخری صحیفۂ ہدایت "قرآن مجید" کا نزول شروع ہوا اس مہینے کو صیام

وقیام اور روزہ وتراویح کا مہینہ قرار دیا گیا۔ اسلام ہی کی نہیں انسانیت کی تاریخ کا عظیم واقعہ نزول قرآن جس رات میں پیش آیا تھا اس رات کو شب قدر قرار دیتے ہوئے اسلام نے اس عظیم واقعہ کی یاد اس طرح منوائی کہ اس پورے مہینے کو بھی اور اس رات کو بھی عبادت، تلاوت ذکر و دعا، توبہ و استغفار، روزہ و نماز اور اعتکاف وخلوت کے لیے مخصوص کردیا ــــ یاد منانے کا یہ طریقہ بھی اسلام کے مخصوص ذوق و مزاج کی بہترین نمائندگی کرتا ہے۔

یاد منانے کے طرز کے یہ دو اسلامی نمونے ذہن میں رکھیے اور اب ایک نظر اس سلسلے میں غیر مسلموں کے طرز عمل پر ڈال لیجیے۔ بات لمبی ہو جائے گی اگر اس وقت اس سلسلے میں دنیا کے مختلف مذاہب کے طرز عمل کا ذکر کیا جائے گا، ورنہ اس بارے میں ان مذاہب کی تاریخ اور ان کے فلسفہ کی کتابوں کے مطالعہ سے ایسی حقیقتیں سامنے آئی ہیں جو مضحکہ خیز بھی ہیں اور غم انگیز بھی!

اس سلسلہ کی تفصیل طلب باتوں کو کسی آئندہ موقع کے لیے چھوڑتے ہوئے اس وقت تو ہم ایسے چند مناظر کی طرف اشارے کرتے ہیں جن کا مشاہدہ ہم آپ اپنے ماحول میں بار بار کرتے رہتے ہیں۔

ہندو مذہب کے ماننے والے جو تیوہار دسہرہ، درگا پوجا، دیوالی، ہولی وغیرہ مناتے ہیں وہ سب ان کی مذہبی دعوی تاریخ کے کچھ واقعات کی۔ اس وقت ان کے ثبوت یا عدم ثبوت کی بحث نہیں۔ یاد ہی ہیں۔ جو کچھ ان موقعوں پر ہوتا ہے اس کا ایک حصہ تو وہ ہے جو سب کی نگاہوں کے سامنے کیا جاتا ہے، اور ایک حصہ وہ ہے جو عبادت خانوں یا گھروں کے اندر کیا جاتا ہے ـــــ دوسرے حصے سے تو ہم یہاں تعرض نہیں کریں گے اولاً اس لیے کہ اس کا تذکرہ کرنا تو درکنار سننا بھی کسی سلیم الذوق انسان کے لیے مشکل ہے۔ اور ثانیاً اس لیے کہ اندرون خانہ کی چیزیں تفصیلی اور قابل اعتماد حوالوں کے بغیر قابل ذکر نہیں ہوتیں، اور ان صفحات میں اس وقت اس کی گنجائش نہیں ـــــ البتہ پہلے حصہ کی مشترک چیزوں میں جلوس، گانے بجانے، رقص وسرور، روشنی، قہقہے، کھیل تماشے، مشاعرے اور اسی طرح کے بہت سے غیر سنجیدہ اور لغو قسم کے مظاہر ہے ہر شخص کے مشاہدہ میں روزمرہ آتے رہتے ہیں۔

اب تو اس میدان میں ریس کا بازار اتنی زوروں میں سرگرم ہے کہ آئے دن یہ تماشا دیکھنے کو ملتا ہے کہ شہر کی مصروف ترین سڑکوں پر ٹریفک کو روکا جا رہا ہے۔ شاندار گیٹ بنائے جا رہے ہیں، عمارتوں کو سجایا جا رہا ہے، چراغاں کا اہتمام ہو رہا ہے، گانے بجانے میں مست رقص وسرود کے نشہ میں

رشاد ایک جلوس نکل رہا ہے، جس میں جانوروں سے لے کر ڈکوں تک سب ہی سواریاں استعمال ہو رہی ہیں ۔۔۔۔ اور ان سب تماشوں کا اہتمام کوئی سرکس کی پارٹی نہیں کرتی، بلکہ مختلف مذاہب کے نام لیوا اپنے مذہبی تیوہاروں کو منانے کے لیے یہ سب کرتے ہیں۔

ابھی دسمبر کا مہینہ گذرا ہے۔ اس میں پوری دنیا کی عیسائی برادری نے کرسمس کا جشن منایا، جو دراصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جشن ولادت ہے۔ پوری عیسائی دنیا اس موقع پر چراغاں کرتی ہے، آتش بازی کا اہتمام کرتی ہے۔ ڈرامے، کھیل کود اور رقص کی محفلیں ہوتی ہیں۔ اور وہ سب ہوتا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر کی سطروں میں مخفی سا اشارہ کیا ہے۔

اس موقع پر یہ وضاحت مفید ہوگی کہ اس کی ابتدا اسی مقدس مقصد سے ہوئی تھی کہ اس دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی تعلیمات کو یاد کیا جائے گا، چنانچہ شروع میں اس کی تقریبات کلیسا ہی میں انجام پاتی تھیں۔ اور ان میں کچھ مذہبی رسوم ادا کی جایا کرتی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس جشن کا سلسلہ کہاں تک پہنچ گیا؟ اس کی مختصر کہانی "میری ہیزلٹائن" سے سنیے، جو جشن و تقریبات کی ماہر مصنفہ ہیں، وہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ "کرسمس" میں لکھتی ہیں:-

"کئی صدیوں تک کرسمس خالصتہً ایک کلیسا کا تہوار تھا جسے کچھ رسوم ادا کرکے منایا جاتا تھا، لیکن جب عیسائی مذہب بت پرستوں کے ممالک میں پہنچا تو اس میں سرمائی نقطۂ انقلاب کی بہت سی تقریبات شامل ہو گئیں اور اس کا سبب گریگوری اعظم (اول) کی آزاد خیالی اور اس کے ساتھ عیسائیت کے مبلغین کا تعاون تھا۔ اس طرح کرسمس ایک ایسا تہوار بن گیا جو بیک وقت مذہبی بھی تھا اور لادینی بھی، اس میں تقدس کا پہلو بھی تھا اور لطف اندوزی کا بھی۔"

اس کے بعد کرسمس کس طرح منایا جانے لگا؟ یہ بیان کرتے ہوئے میری ہیزلٹائن لکھتی ہیں:-

"رومی لوگ اپنی عبادت گاہوں اور اپنے گھروں کو سبز جھاڑیوں اور پھولوں سے سجاتے تھے، ڈرائڈس (پرانے زمانے کے پادری) بڑے تزک و احتشام سے آمر بیلیں جمع کرتے اور اسے اپنے گھروں میں لٹکاتے، لیکن توم کے لوگ سدا بہار پودے استعمال کرتے۔"

انھوں نے آگے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ کس طرح شجر کرسمس (CHRISTMAS TREE) کا رواج

چلا چراغاں اور آتش بازی کے شعلے اختیار کیے گئے۔ قربانی کی عبادت کی جگہ شاہ بلوط کے درخت نے لے لی۔ مذہبی نغموں کی جگہ عام خوشی کے نغمے آگئے اور موسیقی کرسمس کا ایک اہم حصہ بن گئی۔

مقالہ نگار آگے رقم طراز ہیں:-

"کرسمس میں اگرچہ زیادہ زور مذہبی پہلو پر دیا گیا تھا، لیکن عوامی جوش و خروش نے نشاط انگیزی کو اس کے ساتھ شامل کرکے چھوڑا، اور کھیل، گانا بجانا، کھیل کود، رقص، ناٹک بازی اور پریوں کے ڈرامے تقریبات کا حصہ ہو گئے۔"[1]

اسلام اور غیر اسلام کا یہ امتیاز مذکورہ بالا گفتگو سے واضح ہو گیا ہوگا کہ:

۱- اسلام کسی مقدس سے مقدس شخصیت، حتیٰ کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی ولادت یا وفات سے کسی تاریخ یا یادگار کو وابستہ نہیں کرتا۔ بلکہ انبیاء علیہم السلام اپنی ایمانی دعوت کی جد و جہد میں جن مراحل سے گذرے، اور جس سیرت و کردار اور اعمال و اطوار کا ان سے ظہور ہوا، ان کی یاد باقی رکھنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

۲- لیکن یہ یاد بھی کیسے منائی جائے؟ اس بارے میں اس کا اپنا مزاج، اپنا اصول اور اپنا طرز ہے۔ اور زندگی کے کسی شعبے میں اس کے اپنے طرز عمل اور طریق کار کو چھوڑ کر اہل باطل کے طریقوں کو اختیار کرنا کوئی معمولی گناہ نہیں ہے یہ پورے دین کی تحریف کرنے اور اسلام کی صورت مسخ کرنے والا عمل ہے ـــــ انبیاء کرام علیہم السلام کے ان واقعات کی جو ایمان و عمل کے لحاظ سے ہر انسان کے لیے نمونہ بن سکتے ہیں، اور دعوت ایمانی کی راہ میں بنیادی اہمیت کے حامل ان کے احوال و کوائف کی یاد اسلام کس طرح منواتا ہے؟ اس بارے میں ہم اس گفتگو کے شروع میں دو نمونے پیش کر چکے ہیں؛ لیجیے اب سلسلۂ کلام کو مربوط کرنے کے لیے اس سلسلہ کی ایک مثال اور ملاحظہ فرمایئے!

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یوم عاشورہ (۱۰ محرم) زمانۂ جاہلیت میں قریش مکہ کے نزدیک بہت محترم دن تھا، اسی دن خانۂ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا، اور قریش اس دن روزہ رکھتے تھے۔ حضرات اہل علم کا خیال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی کچھ روایات اس دن کے بارے میں ان تک پہنچی ہوں گی ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چونکہ دستور تھا کہ قریش ملت ابراہیمی کی نسبت سے جو اچھے کام کرتے تھے، ان میں آپ ان سے اتفاق و اشتراک فرماتے تھے،

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ص ۱۱۴۲، ج ۵ مطبوعہ ۱۹۵۰ء، مقالہ کرسمس

اس لیے آپ قریش کے ساتھ عاشورہ کا روزہ بھی رکھتے تھے[1] پھر جب آپ مدینہ طیبہ تشریف لائے اور یہاں کے یہود کو بھی آپ نے عاشورہ کا روزہ رکھتے دیکھا اور ان سے آپ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ وہ مبارک تاریخی دن ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو اللہ نے نجات عطا فرمائی تھی اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرقاب کیا تھا (اور ایک روایت کے مطابق اسی دن حضرت نوح کی کشتی جودی پہاڑ پر لگی تھی) تو آپ نے یہود سے کہا کہ "اللہ کے پیغمبر موسیٰ سے ہمارا تعلق تم سے زیادہ ہے اور ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں" اور پھر آپ نے خود بھی اس دن روزے کا زیادہ اہتمام فرمایا اور مسلمانوں کو بھی اس کا عمومی حکم دیا[2] جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، اس یادگار کا تعلق موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش یا وفات سے نہیں، بلکہ ان کی دعوتی جدوجہد کے ایک اہم موڑ سے ہے۔ اور اس یادگار میں نہ جلوس ہے نہ جلسہ، نہ آتش بازی ہے نہ روشنی، عبدیت کی روح سے معمور ایک خاموش انفرادی عمل ہے روزہ اور بس!

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ یہود بھی اس یادگار میں بس روزہ ہی رکھتے تھے — لیکن یہ خیال درست نہیں، صحیح مسلم میں حضرت ابوموسیٰ کی روایت سے صراحۃً مذکور ہے کہ یہودِ خیبر اس دن خوب جشن مناتے اس دن کو تیوہار قرار دے کر اپنی عورتوں کو اچھے اچھے لباس اور زیورات پہناتے..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے اہل ایمان سے فرمایا۔ "تم تو اس دن بس روزہ ہی رکھو"

لیکن قربان جائیے صحابہ کرام کے ذوقِ اتباع پر ان کے مزاج اسلامی کے عمیق فہم پر اور اس بارے میں ان کی ذکاوتِ حس پر! اس روزہ میں جو تھوڑی سی یہود کے ایک عمل سے مشابہت و مماثلت کی تھی اس میں بھی ان کو اجنبیت سی محسوس ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ:۔

"جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم عاشورہ میں روزہ رکھنے کا معمول بنا لیا اور مسلمانوں کو بھی اس کی تلقین کی تو بعض صحابہ نے عرض کیا کہ:۔ یا رسول اللہ! اس دن کو تو یہود و نصاریٰ بڑے دن کی حیثیت سے مناتے ہیں (اور یہ گویا ان کا قومی و مذہبی شعار ہے اور خاص اس دن ہمارے روزہ رکھنے سے ان کے ساتھ اشتراک اور تشابہ ہوتا ہے تو کیا اس میں کوئی ایسی تبدیلی ہو سکتی ہے جس کے بعد یہ اشتراک اور تشابہ والی بات باقی نہ رہے) تو آپ نے

---

[1] یہ بات بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ کی روایت سے نقل کی گئی ہے (ملاحظہ ہو باب صیام یوم عاشوراء)

[2] یہ بات بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت میں موجود ہے۔ (ایضاً)

ارشاد فرمایا کہ: "ان شاء اللہ جب اگلا سال آئے گا تو ہم نویں کو روزہ رکھیں گے"۔

صحابۂ کرام کے اس اشکال کی وجہ ظاہر ہے کہ یہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے اثر سے ان کے ذہن و دماغ میں یہ حقیقت خوب راسخ ہو گئی تھی کہ اسلام اور کفر میں صرف چند عقائد اور رسوم عبادت ہی کا فرق نہیں ہے، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں، تمدن کے ہر گوشے میں، اور انفرادی و اجتماعی ہر قسم کے اعمال اور اخلاق و اطوار میں بنیادی اور اصولی فرق ہے اور اس فرق کو ہر طرح سے واضح رہنا چاہیے اور کوئی بات ایسی نہیں ہونی چاہیے جس سے یہ فرق مخفی یا مبہم ہو جائے۔

انھوں نے اپنے کانوں سے مختلف موقعوں پر آپ کو یہ ہدایات دیتے سنا تھا کہ "خالفوا المشرکین، احفوا الشوارب واعفوا اللحی" (بخاری و مسلم) (مشرکین کی مخالفت کرو، مونچھیں کترواؤ، اور داڑھیاں بڑھاؤ) "خالفوا الیہود فانہم لا یصلون فی نعالہم ولا خفافہم" (ابو داؤد) (یہود سے مختلف رویہ اختیار کرو، وہ جوتوں اور موزوں کو پہنے ہوئے نماز نہیں پڑھتے) "فصل ما بین صیامنا وصیام أهل الكتاب اكلة السحر" (مسلم) (اہل کتاب کے اور ہمارے روزوں میں فرق یہ ہے کہ ہم سحری کھاتے ہیں اور وہ نہیں کھاتے) "لا یزال الدین ظاهرا ما عجل الناس الفطر لان الیهود والنصاری یؤخرون" (ابو داؤد) (دین اس وقت تک غالب رہے گا جب تک مسلمان افطار میں جلدی کرتے رہیں گے، اس لیے کہ یہود و نصاریٰ اسے مؤخر کرتے ہیں)

آپ نے صرف اس وجہ سے کہ عبادت کے اوقات میں مومنین اور مشرکین کا امتیاز باقی رہے، ان اوقات میں نماز سے روک دیا جو مشرکین کی پوجا کے اوقات ہیں۔ اسی مشابہت سے بچنے کے لیے آپ نے سترہ کو بالکل سامنے رکھنے سے منع فرمایا۔۔۔ اس سلسلے میں آپ کی یہ اصولی اور جامع ہدایت خاص طور سے قابل ذکر ہے "من تشبہ بقوم فہو منہم" (جو جس قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ در اصل انہی میں سے ہوتا ہے) "کل شیء من امر الجاهلية تحت قدمی موضوع" (جاہلیت کی ہر بات میرے قدموں تلے پامال ہوتی ہے) (ابو داؤد و نسائی)۔

الغرض ان نبوی احکام و ہدایات کا ایک ضخیم دفتر ہے جنھوں نے صحابۂ کرام کے ذہن و دماغ میں اس بارے میں کوئی ابہام باقی نہیں رکھا تھا کہ تہذیب و معاشرت، عادات و خصائل، مذہبی و قومی تقریبات، لباس و شعائر، غرضیکہ پوری زندگی میں غیر مسلموں کی مشابہت سے بچنے کی پوری فکر و سعی کرنی چاہیے ـــــ اور اسی وجہ سے انھوں نے عاشورا کے روزہ کے بارے میں مذکورہ بالا اشکال کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس اشکال کو قبول فرما کر اس کا ایک حل تجویز فرما دیا۔

یہاں تک کی گفتگو کا خلاصہ ایک بار ذہن میں تازہ کر لیجیے، ہماری معروضات کا حاصل یہ ہے کہ اپنی تاریخ کے واقعات کی یاد منانا دنیا کی قوموں کی روایت ہے۔ اور زندگی کے ہر گوشے کی طرح اس بارے میں بھی اسلام اور کفر کے طریقے بالکل جداگانہ ہیں۔ ہم نے اس فرق کی بابت یہ عرض کیا تھا کہ اسلام شخصیتوں کی یاد نہیں مناتا، وہ ان کی قربانیوں اور ان کی ذکر کردہ رسوم عاشقانہ کی عملی سنجیدہ، اور مؤثر یاد قائم رکھنے کا داعی ہے۔ جبکہ کفار کے ہاں شخصیتوں کی یاد کے نام پر ظاہری و نمائشی ہنگاموں، اسراف و تبذیر، بے حیائی و فحاشی، ساز و نغمہ اور عیش و نشاط کی محفلوں، اور مصنوعی روشنیوں، جھنڈیوں، قمقموں جیسی لغویات کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

ربیع الاول کا مہینہ قریب الختم ہے۔ اس مہینے میں عید میلاد النبی کے جلسوں اور جلوسوں کے نام پر ہم جو کچھ کر رہے ہیں؟ کوئی بتائے کہ اس میں کتنی چیزیں ہیں جو اسلام کی ہیں اور کتنی وہ ہیں جو کفر کی ہیں؟......

جلوس نکالے جاتے ہیں، کوچہ و بازار سجائے، اور در و دیوار روغن کیے جاتے ہیں۔ جھنڈیاں آویزاں ہوتی ہیں، علم لہرائے جاتے ہیں، محرابیں بنتی ہیں، کھانوں کی دیگیں پکتی ہیں، مشاعروں میں نہ جانے کیا کچھ گت خیال خدا و رسول کی شان میں مدح رسول کے نام پر کی جاتی ہیں...... اور کاش! کہ بس یہی سب کچھ ہوتا۔ اور کچھ نہ ہوتا، مسلم ملک پاکستان کے عظیم شہر کراچی میں اس سلسلے میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے بارے میں وہاں کے عظیم عالم و محقق اور شرعی عدالت کے جج مولانا محمد تقی عثمانی کی زبانی سنیے:-

"ہر سال عید میلاد النبی کے نام سے کراچی میں ظلم و جہالت کے ایسے ایسے شرمناک مظاہرے کیے جاتے ہیں کہ ان کے اور ان کے انجام کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ مختلف محلوں کو رنگین روشنیوں سے دلہن بنایا جاتا ہے اور وہاں کے تقریباً تمام ہوٹلوں میں عید میلاد النبی اس طرح منائی جاتی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر لگا بلند آواز سے شب و روز ریکارڈنگ کا طوفان برپا رہتا ہے۔ بہت سے سینماؤں میں عید میلاد النبی کی خوشی میں سینکڑوں بلب لگا کر ان اخلاق سوز اور برہنہ تصویروں کو اور نمایاں کر دیا جاتا ہے، جو اپنی ہر ادا سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی نافرمانی کی برملا دعوت دیتی ہیں، اور ان ہی مقامات پر انسانیت کش تصویروں کے سائے میں شاید تبرک کے خیال سے خانہ کعبہ اور روضۂ اقدس کی تصویریں بھی چسپاں ہوتی ہیں، قدم قدم پر روضۂ اطہر اور مسجد نبوی کی شبیہیں بنا کر کھڑی کی جاتی ہیں جنھیں کچھ بے فکرے نوجوان ایک تفریح گاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور کچھ بے پردہ عورتیں انھیں چھو چھو کر خیر و برکت حاصل کرتی ہیں

اور ظاہر ہے کہ جب پورے محلے کو روشنیوں میں نہلا کر جگہ جگہ محرابیں کھڑی کر کے اور قدم قدم پر فلمی ریکارڈ بجا کر ایک میلے کا سماں پیدا کر دیا جائے تو پھر عورتیں اور بچے ایسے میلے کو دیکھنے کے لیے کیوں نہ پہنچیں جس میں میلے کا لطف بھی ہے اور (معاذ اللہ تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کا ثواب بھی، چنانچہ راتوں کو دیر تک یہاں تفریح باز مردوں عورتوں اور بچوں کا ایسا مخلوط اجتماع ہوتا ہے جس میں بے پردگی، غنڈہ گردی اور بے حیائی کو کھلی چھوٹ ملی ہوتی ہے۔" (ماہنامہ البلاغ، کراچی)

یہ تو کراچی کا حال ہوا، مصر اور بعض دوسرے عرب مسلم ممالک کے متعدد دوستوں نے ناچیز راقم سطور کو اپنے یہاں کی محافل میلاد کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، شاید ہندوستان کے بہت کم مسلمان اس پر یقین کر سکیں، وہاں میلاد کے نام پر ہونے والی بہت سی محفلوں میں شراب و کباب اور وہ سب ہوتا ہے جو لندن پیرس اور برلن میں نئے سال یا کرسمس کی رات میں ہوتا ہے۔

الامان الحفیظ! ساتویں صدی ہجری میں عراق کے ایک مجہول الحال شخص عمر بن محمد اور ایک بے حال بادشاہ ابو سعید بن زین العابدین نے جس میلاد کا سلسلہ صرف اسلیے شروع کیا تھا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت اور سیرت مبارکہ کا بیان کیا جائے اور پھر اس میں شدت جیسا کہ ملا علی قاری نے اور بعض دوسرے اہل علم نے اشارہ کیا ہے[1] ۔ اس جذبے سے آئی کہ چونکہ عیسائی لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے یوم ولادت میں شوکت و احتشام کا مظاہرہ کرتے ہیں اسلیے ہم بھی اسلامی شوکت کے مظاہرے کے لیے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا روز میلاد منانے کا اہتمام کریں۔ اب وہی میلاد کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے؟

ہمارے نزدیک یہ بالکل فطری بات ہے۔ جو کام وحی کی رہنمائی کے بغیر شروع کیا جاتا ہے، وہ شروع میں خواہ کتنا ہی مقدس نظر آئے، لیکن رفتہ رفتہ انسان اس میں نفسانی لذت کے مواقع تلاش کر لیتا ہے اور اس کا حلیہ بگاڑ کر چھوڑتا ہے۔

کرسمس کے ارتقا کی وہ تاریخ ذہن میں رکھیے اور پھر اپنے جشن میلاد کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیجیے۔ بالکل صحیح کہا ہے کسی نے ع کیں رہ کہ تو می روی بترکستان است اور اسی لیے ہم نے عرض کیا تھا کہ جشن میلاد میں یہ سب ہونا بالکل فطری ہے۔ اس لیے کہ جس کام میں غیر نبوی طریقہ اختیار کیا جائے گا، اس کا مقصد ہزار نیک ہو، لیکن وہ رفتہ رفتہ روح دین سے دور ہی ہو جائے گا۔

بلاشبہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا واقعہ ہماری ہی نہیں انسانیت

---

[1] ملاحظہ ہو رسالہ مورد الروی، از ملا علی قاری۔

کی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ ہے، لیکن ہم دکھے دل سے کہتے ہیں کہ اس کی یاد منانے کا وہ طریقہ جو کافروں اور آپ کے دشمنوں کا ہے یا جس میں ان کی پوری مشابہت ہے، سراسر غلط ہے اور اس کے جو نتائج سامنے ہیں ان کے علاوہ کسی اور نتیجہ کی توقع حقیقت ناشناسی کی دلیل۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ولادت کی یاد منانے کا خود جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ اس حدیث میں بیان ہوا ہے جو صحیح مسلم میں حضرت ابو قتادہ کی روایت سے نقل کی گئی ہے ــــــ ان کا ارشاد ہے :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوشنبہ کے روزہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ " اس دن میری پیدائش ہوئی اور اسی دن مجھ پر وحی کا نزول (شروع) ہوا۔

آپ نے دیکھا! یہاں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے لیے اپنی ولادت اور آغاز وحی کی یادگار کے طور پر جس عمل کو اختیار فرمایا وہ ہر دوشنبہ کا روزہ ہی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں،

ظاہر ہے کہ نبوی طریقہ ہر طریقہ سے اعلیٰ و افضل طریقہ ہے اس کو ترک کر کے دوسرے طریقوں کو اختیار کرنے والوں سے قرآن کی زبان میں ہم کہتے ہیں (أتستبدلون الذی هو أدنی بالذی هو خیر) کیا تم معمولی اور حقیر چیز کو اس شے پر ترجیح دے رہے ہو جو تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے،

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ مسئلہ اتنا سنگین اور غلطی اتنی بنیادی ہے۔ لیکن ہمیں اصلاح میں حکمت و تدریج کے اصول کو نہیں چھوڑنا ہے۔ یہ رواجی دین امت میں اسی وقت سے آنا شروع ہوا ہے جب سے اس کے اندر سے دین اور محبت و اطاعت رسول کی صفتیں نکل گئیں، جس رفتار سے امت کے اندر حقیقی دین آتا چلا جائے گا اسی رفتار سے یہ سب خرافات اس کے اندر سے نکلتی چلی جائیں گی ــــ ورنہ اگر شروع ہی میں ماننے کا مزاج اور ایمانی ذوق و استعداد بنائے بغیر یہ مسائل چھیڑ دیے گئے تو ان سے اُلٹے نتائج نکلنے کا خطرہ ہے! بس ہمارا غرض یہ ہے کہ امت کے تمام طبقات کے اندر حقیقی دین لانے والی جدوجہد ہی کو اصل میدانِ عمل بنائیں۔ کہ اس مثبت اور بنیادی کام کے بغیر کسی قسم کا تکمیلی و اصلاحی کام عملاً ناممکن ہے اور اس کے بعد ہر بات کا منوانا اور ہر غلط روایت کا ترک کروانا آسان! فھل من مذکر؟

درس قرآن

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

سُوْرَۃُ اللَّھَبْ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ   بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّ تَبَّ ○ مَآ اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ وَمَا کَسَبَ ○
سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَھَبٍ ○ وَّامْرَاَتُہٗ حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ ○
فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ○

ٹوٹ گئے ہاتھ ابولہب کے اور وہ خود ٹوٹ گیا (ختم ہو گیا) اس کے کچھ کام نہ آیا اس کا مال اور نہ وہ جو اس نے کمایا۔ وہ بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔ — اور اس کی بیوی بھی ایندھن لادے ہوئے — اس کی گردن میں رسی ہوگی خوب بٹی ہوئی۔ (سورۂ لہب)

(تفسیر و تشریح) یہ سورۂ لہب ہے، اس سے پہلے سورۂ نصر تھی، اس میں اللہ تعالیٰ کی اس نصرت اور فتح مبین کا ذکر کیا گیا تھا جو اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور بشارت کے مطابق فتح مکہ کی شکل میں ظاہر ہوئی — اور جیسا کہ میں نے ذکر کیا تھا وہ یا تو فتح مکہ سے کچھ پہلے بشارت کے طور پر نازل ہوئی تھی یا فتح مکہ کے وقوع و ظہور کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتانے کے لیے کہ ملت ابراہیمی کے احیا اور بیت اللہ کی تطہیر اور اس کو پھر سے دعوت توحید کا مرکز بنانے کا جو اہم کام آپ سے لینا تھا وہ تکمیل کو پہنچ گیا اب آپ آخرت کی تیاری کی طرف زیادہ توجہ کریں — بہرحال سورۂ نصر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری دور میں نازل ہوئی

تھی جبکہ وہ نصرت اور فتح موعود یا تو آنکھوں کے سامنے آگئی تھی یا اس کے آثار ظاہر ہو گئے تھے اور اس کا ظہور قریب ہی تھا۔

اس کے بعد متصلاً یہ سورۂ لَہَب ہے جو نبوت اور دعوتِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھی اس میں بھی ایک خاص انداز سے خداوندی نصرت کی اور اس وقت کی سب سے بڑی اسلام دشمن طاقت کے بالکل ٹوٹ پھوٹ جانے کی پیشین گوئی کے انداز میں اطلاع اور بشارت دی گئی تھی۔ جس کا بظاہر حالات اس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ کتب حدیث میں اور سیرت کی عام کتابوں میں بھی یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ" (جس میں آپ کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ خاص طور سے اپنے قریبی رشتہ داروں اور قبیلہ والوں کو شرک و کفر کے نتیجہ میں آنے والے خداوندی عذاب سے آگاہی دیجیے اور ان کے دلوں میں آخرت کی فکر پیدا کرنے کی کوشش کیجیے جس سے وہ بالکل غافل ہیں)۔ تو آپ نے صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر قبیلہ قریش کی مختلف شاخوں کو نام بنام نہایت بلند آواز سے گویا چیخ کر اس طرح پکارا جیسے کہ آپ ان کو کسی بڑے اور فوری خطرہ سے خبردار کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی یہ غیر معمولی پکار سنکر وہ لوگ جمع ہو گئے —— آپ صفا پہاڑی کی چوٹی پر تھے اور سامنے اس کے دامن میں قریش کے سرداروں اور ذمہ داروں کا مجمع تھا —— آپ نے ان سب کو مخاطب کر کے فرمایا، بتاؤ اگر میں تم سے کہوں کہ کوئی دشمن لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے اس پہاڑ کے دوسری طرف آگیا ہے اور وہ تم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے۔ تو کیا تم میری اس بات کو سچ مانو گے، اور اس حالت میں جو کچھ کرنا چاہیے وہ کرو گے؟ —— سب نے کہا ہاں ہم آپ کی بات کو سچ مانیں گے کیونکہ ہم نے کبھی آپ کو غلط بات کہتے نہیں سنا —— اس کے بعد آپ نے ان سے فرمایا سنو! میں تمھیں آگاہ کرتا ہوں ایک شدید

عذاب سے (جو کفر و شرک کی موجودہ زندگی کے نتیجہ میں آنے والا ہے) ـــــ آپ کا مقصد یہ تھا کہ اس عذاب شدید سے بچنے کی فکر کرو اور اپنے خالق و پروردگار خداوند کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کر لو ـــــ آپ کی یہ بات سنکر جو انتہائی خلوص اور دلسوزی کے ساتھ کہی گئی تھی، ابولہب نے نہایت گستاخانہ انداز میں کہا "تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا" (جس کا مطلب ہے کہ ہلاکت و بربادی ہو تیرے لیے (تیرا ناس ہو) کیا یہی سنانے کے لیے تو نے ہم سب کو جوڑا تھا) روایت میں ہے کہ اسی دور میں یہ سورۂ لہب نازل ہوئی، اس میں پیشین گوئی کے طور پر اعلان فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ خود یہ ابولہب اس دنیا میں بھی تباہ و برباد ہو گا، اس کا ناس ہو گا، اور آخرت میں یہ دوزخ کا ایندھن بنے گا، اور اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ دوزخ میں ڈالی جائے گی جو اسلام دشمنی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی میں اس کی شریک و رفیق ہے

حدیث اور سیرت کی کتابوں میں اس سورت کے نزول کا جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے یہ میں نے اس کا حاصل مطلب اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے ـــــ اب سورت کے الفاظ کی روشنی میں اس کا مضمون سمجھنے کی کوشش کریں۔ "تباب" کے معنی ہیں کسی چیز کا تباہ و برباد اور ضائع ہو جانا۔ تَبَّتْ اور تَبَّ اس سے نکلے ہیں۔ اور یَد کے اصل معنی ہاتھ کے ہیں۔ اور چونکہ انسان کے اعضا میں ہاتھوں کی خاص اہمیت ہے، آدمی زیادہ تر کام ہاتھوں ہی سے کرتا ہے اس وجہ سے کبھی کبھی ہاتھوں سے مراد خود آدمی کی ذات ہوتی ہے، قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے "ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ" دوسری جگہ فرمایا گیا ہے "ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ" ان آیتوں میں "یداك" اور "ایدیکم" سے مراد خود ہاتھوں والے آدمی ہیں۔ اس محاورہ کے مطابق "يدا ابی لھب" سے مراد خود ابولہب کی ذات اور اس کی شخصیت ہے، اس بنا پر آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مغرور اور اپنے وقت کا فرعون ابولہب جس نے ہمارے رسول کی دعوت حق کے جواب میں "تبًّا لك" (تیرے لیے تباہی

و بربادی ہو) کہا ہے۔ وہ خود سن لے اور سب سن لیں کہ اس کے لیے خداوندی فیصلہ ہو چکا کہ وہ خود تباہ و برباد ہو گا۔ آگے بطور تاکید کے فرمایا گیا ہے۔ "وَتَبَّ" مطلب یہ ہے کہ اس کی تباہی بربادی یقینی ہے۔ اس میں شک شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

تَبَّتْ اور تَبَّ دونوں ماضی کے صیغے ہیں۔ جب مستقبل میں ہونے والے کسی واقعہ کو ماضی کے صیغے سے بیان کیا جاتا ہے تو مطلب یہی ہوتا ہے کہ یہ بات ایسی یقینی ہے جیسے کہ ماضی میں ہو چکی۔ قیامت اور آخرت میں ہونے والے واقعات کا ذکر قرآن مجید میں جا بجا اسی طرح ماضی کے صیغوں سے کیا گیا ہے۔ مثلاً "وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ" اس آیت میں "نُفِخَ" اور "صَعِقَ" ماضی کے صیغے ہیں اور قیامت میں ہونے والے واقعات کے لیے استعمال کیے گئے ہیں، یہ قرآن پاک کا عام انداز بیان ہے اور اس میں بڑی بلاغت ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے "مَا أَغْنٰى عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ" اس کا مطلب سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ابو لہب بڑا دولتمند تھا، گویا مکہ کا ایک قارون تھا، اور اس دولتمندی اور اپنی دوسری ترکیبوں تدبیروں سے اس نے عزت و وجاہت کا ایک خاص مقام قوم میں حاصل کر لیا تھا، اور یہ بھی اس کا کمایا ہوا سرمایہ تھا —— جب کسی بدخود غلط آدمی کو یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں تو اس میں غرور اور گھمنڈ آجاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا؟ —— اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ابو لہب کا مال اور اس کا کمایا ہوا سرمایہ اس کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور اس کی تباہی و بربادی کا جو فیصلہ اللہ تعالے کی طرف سے ہو چکا ہے اس سے اس کو نہ بچا سکے گا۔

یہاں تک اس دنیوی زندگی ہی میں ابو لہب پر آنے والی تباہی و بربادی کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور قطعیت کے ساتھ اعلان کیا گیا ہے کہ وہ ہلاک و برباد ہو گیا اور اس کی دولتمندی اور اس کا سرمایہ اس کے کچھ بھی کام نہ آیا۔ یعنی خداوند قہار کی طرف سے یہ فیصلہ ہو چکا جو مقررہ وقت پر سب کے سامنے آجائے گا۔ چنانچہ ایسا

ہوا کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد بہت بُری موت مرا، وہ ایسی چیچک میں مبتلا ہوا جس کو دیکھ کر گھن آئے اور دہشت ہو، اور اس کو چھوت لگنے والی بیماری سمجھنے کی وجہ سے کوئی پاس نہ جائے، وہ اسی حال میں مرگیا، روایات میں ذکر کیا گیا ہے کہ اس کی لاش دو تین دن تک گھر ہی میں پڑی رہی، اُس کے گھر والے بھی دور دور ہی رہے بالآخر کچھ حبشی مزدوروں سے وہ لاش گھر سے اٹھوائی گئی انھوں نے اس کو لیجا کر ایک گڑھے میں ڈال دیا اور اوپر سے پتھر ڈال کر ڈھک دیا ——— اُس کی دولتمندی اور عزت و وجاہت اور اس کی پارٹی اس بُرے انجام سے اس کو نہ بچا سکی ——— یہ سب دراصل اللہ تعالیٰ کے ارشاد "تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ" کا عملی ظہور تھا ——— جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اُس وقت کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ مکے کے اس قارون ابولہب کا ایسا انجام بھی ہوسکتا ہے ——— لیکن ہوا اور سب نے دیکھا ——— بلاشبہ یہ پیشین گوئی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و نبوت کی روشن دلیلوں میں سے ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے "سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ" ——— یہ ابولہب کے اخروی انجام کا بیان ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ آخرت میں دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا۔ نار کے معنی آگ کے ہیں اور اُس سے مراد دوزخ کی آگ ہے۔ اور ذات لھب اس کی صفت ہے جس کے معنی ہیں شعلہ زن اور بھڑکتی ہوئی، اس میں اُس آگ کی غیر معمولی شدت کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس کو اُس کے معروف نام ابولہب سے بھی مناسبت ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے "وَامْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ ۝" ابولہب کی بیوی جس کا نام ام جمیل تھا اور وہ ابوسفیان کی بہن تھی، جیسا کہ میں نے کہا تھا وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور ایذا رسانی میں ابولہب کی پوری شریک و رفیق تھی بعض روایات میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ خاردار لکڑیاں اور

جھاڑیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں ڈالتی تھی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس طرح کی اور بھی کیا کیا حرکتیں کرتی ہوگی۔ ان آخری دو آیتوں میں اس کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ ابولہب کے ساتھ اس کی یہ بیوی بھی جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالی جائے گی۔ "حَمَّالَةَ الْحَطَبِ" کا لفظی ترجمہ ہے، ایندھن کی لکڑیاں لادے ہوئے بظاہر مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے کے لیے خاردار لکڑیاں لا لا کر آپ کے راستہ میں ڈالا کرتی تھی، اس کی مناسبت سے دوزخ میں اس پر یہ عذاب بھی مسلط کیا جائے گا کہ وہ اور اس کا شوہر ابولہب جس آگ میں ڈالے جائیں گے اس کو اور تیز کرنے کے لیے یہ ایندھن کی لکڑیاں لاد لاد کر لائے گی اور اس آگ میں ڈالے گی اور خود بھی اسی میں جلے گی۔

"فِي جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ" کا مطلب یہ ہے کہ وہاں دوزخ میں اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی پڑی ہوگی —— جنگل سے لکڑیاں لاد کر لانے والی باندیوں کا یہ طریقہ تھا کہ جس رسی سے وہ لکڑیوں کا گٹھا باندھ کے لاتی تھیں وہ ان کے گلے میں پڑی رہتی تھی، ظاہر ہے کہ یہ ایک ذلت کی نشانی بھی تھی، تو اس آیت میں ابولہب کی بیوی ام جمیل کے بارے میں (جو یقیناً گلے میں قیمتی ہار اور گلوبند وغیرہ پہنے رہتی ہوگی) فرمایا گیا ہے کہ دوزخ میں بجائے گلوبند اور ہاروں کے اس کی گردن میں لکڑیاں لانے والی باندیوں کی سی رسی پڑی ہوگی۔ اور دوزخ کی آگ کے علاوہ اس پر یہ ذلت کا عذاب بھی مسلط ہوگا۔ علاوہ ازیں جن مجرموں کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے ان کی گردن میں بھی مضبوط بٹی ہوئی رسی ہی ڈالی جاتی ہے اور اسی کے ذریعہ ان کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔ تو اس سورۂ تبت کی ان آخری دو آیتوں (حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ فِي جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ ۝) میں ابولہب کی بیوی کی دوزخ میں جو حالت ہوگی اس کی گویا تصویر کھینچ کے دکھا دی گئی ہے، جو یقیناً بڑی عبرتناک ہے۔

ایک وضاحت | قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین و مکذبین کفار و مشرکین یا منافقین میں سے ابولہب کے سوا کسی کے لیے

بھی نام لیکر دنیوی یا اخروی عذاب کی وعید نہیں سنائی گئی ہے۔ نہ لعنت یا مذمت ہی کی گئی ہے، بلکہ اُن میں سے کسی کا نام کے ساتھ قرآن مجید میں ذکر ہی نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ آپ اور آپ کی دعوتِ توحید و ایمان کا دشمن صرف یہ ابولہب ہی نہیں تھا قریش کے سرداروں اور سربرآوردہ لوگوں میں، ابوجہل اور امیہ بن خلف وغیرہ بھی بدترین دشمنوں میں تھے، یہاں تک کہ آپ کو ختم کر دینے کی سازش میں بھی یہ سب برابر کے شریک تھے ـــــ لیکن قرآن پاک میں اِن میں سے کسی کا بھی نام ذکر نہیں کیا گیا، ان میں سے صرف ابولہب کا ذکر اس سورت میں کیا گیا ہے اور دنیا میں بھی اُس کی تباہی و بربادی کی پیشنگوئی کی گئی ہے اور آخرت میں وہ اور اس کے ساتھ اُس کی بیوی جس طرح دوزخ کی آگ میں ڈالے بھونے جائیں گے اُس کا بھی گویا عام اعلان کیا گیا ہے ـــــ ہمارے مفسرین نے ابولہب کے ساتھ اس امتیازی برتاؤ کی مختلف وجوہات لکھی ہیں اور وہ سب بجائے خود صحیح ہو سکتی ہیں ـــــ اس عاجز کے نزدیک اس کی سب سے اہم وجہ اور مصلحت یہ ہے کہ اِن مکذبین اور دشمنوں میں ابولہب آپ کا سب سے قریبی رشتہ دار تھا، جو آپ کا چچا یعنی آپ کے دادا عبدالمطلب کا بیٹا تھا (عوام میں مشہور یہ ہے کہ ابوجہل آپ کا چچا تھا یہ صحیح نہیں ہے وہ دور کا رشتہ دار تھا، چچا یہ ابولہب تھا) اس سورۂ لہب میں جس طرح نامزد کر کے اس کا اور اس کے دنیوی اور اخروی عذاب کا ذکر کیا گیا اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے اس بے لاگ قانون عدل کا اعلان ہو گیا کہ جنت و دوزخ اور ثواب و عذاب کا فیصلہ نسب اور قرابت داری کی بنیاد پر نہیں ہوگا بلکہ ایمان و عمل کی بنیاد پر ہوگا ـــــ قرآن پاک ہی میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ جیسے جلیل القدر پیغمبر کے باپ کے جہنمی ہونے اور اسی طرح حضرت نوح کے بیٹے اور حضرت لوط کی بیوی کے دنیا میں معذب اور آخرت میں دوزخی ہونے کا صراحت سے جو بیان کیا گیا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے اس قانون عدل کا اظہار و اعلان ہے۔ حدیث شریف میں ہے آپ نے فرمایا "من بطأ به عمله لم يسرع به نسبه" (مطلب یہ ہے کہ جو آدمی عمل کی کوتاہی

کی وجہ سے پیچھے رہ جائے گا اُس کا نسب اس کو آگے نہیں لے جا سکے گا) —— اور مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگر گوشہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ایک دن فرمایا "یا فاطمۃ انقذی نفسک من النار فانی لا املک لکم من اللہ شیئاً"۔ (مطلب یہ ہے کہ اے بیٹی فاطمہ اپنی نجات اور بخشش کے لیے خود ہی فکر کرلے مجھے اللہ کے فیصلے کے بارے میں کوئی اختیار نہیں) اسی طرح آپ نے اپنی پھوپی حضرت صفیہ سے اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے بھی فرمایا۔

بہرحال اس عاجز کے خیال میں قرآن پاک میں خصوصیت سے ابو لہب کا نام لیکر دنیا میں اس کی تباہی و بربادی اور آخرت میں اس کے اور اس کی بیوی کے دوزخ کی آگ میں ڈالے جانے کا اعلان فرمائے جانے کی اہم وجہ اور مصلحت یہ ہے کہ کسی کے لیے اس غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے کہ ایمان و عمل کی کوتاہی کے باوجود کوئی شخص اپنے باپ یا بیٹے، یا بیوی یا شوہر، یا چچا یا بھتیجے کی نیک عملی اور عند اللہ مقبولیت کی وجہ سے جنت حاصل کرلے گا۔ یہ وہ گمراہی ہے جس میں یہودی خاص طور سے مبتلا تھے، وہ کہتے تھے کہ ہم تو پیغمبروں کی اولاد ہیں، ہماری بخشش کے لیے بس یہ نسبت کافی ہے —— قرآن پاک میں جا بجا اس غلط عقیدہ کا رد کیا گیا ہے۔ اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے باپ، حضرت نوح کے بیٹے اور حضرت لوط کی بیوی، اور اس سورۂ لہب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب کے دوزخی ہونے کا اعلان فرما کر گویا اس پر آخری مہر لگا دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان و عمل کی یعنی اللہ و رسول کی فرمانبرداری کی توفیق عطا فرمائے اور ہر قسم کی گمراہیوں سے حفاظت فرمائے۔ اور جو کوتاہیاں ہوئیں یا آئندہ ہوں ان کی مغفرت فرمائے —— اور ہمارے لیے دنیا میں بھی خیر مقدر فرمائے اور آخرت میں بھی۔ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃً وفی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔

خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

سیرت النبیؐ کا پیغام
مسلمانوں اور غیر مسلموں کے نام

ربیع الاول کے مہینے میں ہر طرف جلسہائے سیرت کی دھوم ہوتی ہے۔ ان جلسوں کی حقیقی نوعیت سے جو لوگ واقف ہیں اور کسی خود فریبی میں بھی مبتلا نہیں ہیں یہ حقیقت ان پر عیاں ہے کہ ان کا نقصان بسا اوقات ان کے فائدے سے زیادہ ہے، عموماً ان جلسوں کے منتظمین سال میں ایک بار اس جلسہ کا اہتمام کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے محبت رسول اور دین کی خدمت کا حق ادا کردیا، ہمیں کسی مسلسل جد و جہد کی ضرورت نہیں، اسی سے ملتا جلتا حال بیشتر سامعین و حاضرین کا ہوتا ہے ــــــ دین کو، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو خود اپنے اندر اور ایک مسلمان کے اندر کیسے اور کس تدبیر سے جاری و نافذ کیا جائے، اس کی سنجیدہ فکر عموماً ناپید ہوتی ہے، اس کے لیے دعاؤں کا اہتمام تو دور کی بات ہے، نہ جانے کتنے پرجوش منتظمین فرض نماز ہی کا بھی اہتمام نہیں کر پاتے ــــــ اس کے علاوہ اور بھی نہ جانے کتنے پہلو ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر اور کیسے کیسے بلند پایہ اصحاب بصیرت اور اہل تجربہ و نظر کی رائے کو سامنے رکھ کر ہم نے یہ بات عرض کی ہے کہ ان جلسوں کا نقصان ان کے فائدے سے بالعموم زیادہ ہی ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان جلسوں کے بارے میں جو شخص یہ رائے رکھے گا ان میں شرکت سے گریز ہی کو کم از کم

اپنے لیے بہتر نہ ہوگا۔

لیکن چھوٹوں کو بارہا ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جو وہ بڑوں کے پاس و لحاظ میں کرتے ہیں یا کبھی کوئی اور عارضی مصلحت غالب آجاتی ہے ـــــ کچھ ایسا ہی اس بار راقم سطور کے ساتھ ہوا۔ جب ہمارے محترم مولانا محمود الحسن صاحب (ناظم دینی تعلیمی کونسل) نے بندہ سے بستی کے جلسۂ سیرت میں چلنے کے لیے فرمایا، اور مصلحت یہ بیان فرمائی کہ وہاں جلسہ میں غیر مسلم خواص کی بڑی تعداد کی حاضری متوقع ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کے موجودہ حالات میں یہ ضروری ہے کہ غیر مسلم حضرات کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کے فرق کو بار بار واضح کیا جاتا رہے، اور سیاسی پلیٹ فارموں کے بجائے دعوتی انداز سے ان تک بات پہنچانے کی کوشش کی جاتی رہے۔ یہ مصلحت، اور مولانا موصوف کی فرمائش کا لحاظ کر کے دونوں پہلو ایسے تھے کہ ان کی وجہ سے معذرت کر دینے سے پہلے والد ماجد مدظلہ سے دریافت کیا تو انھوں نے بھی جانے کے حق میں رائے دی۔

بہرحال بنام خدا بندہ وہاں گیا اور جو کچھ بن پڑا عرض کیا ـــــ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی بھی بڑی تعداد جلسہ میں تھی اور غیر مسلموں کی بھی، اور دونوں میں تعلیم یافتہ اور خواص کی اکثریت تھی، تقریر ریکارڈ کر لی گئی تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک طالب علم مولوی اکبر شریف ندوی نے اسے قلمبند کیا ہے ـــــ اور اب یہ ناظرین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے گنجائش کی کمی، اور تقریر کی طوالت کی وجہ سے اسے باقساط شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان شاء اللہ زیادہ سے زیادہ تین قسطوں میں مکمل ہو جائے گی ـــــ سجاد]

خطبۂ مسنونہ کے بعد،

محترم حضرات، آپ میں سے بہت سے لوگوں نے، خاصکر انھوں نے جن کو

اردو شاعری اور ادب سے شناسائی ہے، مشہور استاذ شاعر اختر شیرانی صاحب کا نام سنا ہوگا، اُن کے حالات سے قدرے تفصیلی واقفیت رکھنے والے حضرات یہ بھی جانتے ہوں گے کہ بہت سے دوسرے شعراء کی طرح۔ یہاں موجود شعراء کرام مجھے معاف کریں۔ وہ بھی شراب وکباب کا خاص ذوق رکھتے تھے، اپنی بات شروع کرنے سے پہلے میں ان کا ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔

ایک دن وہ مخمور کیفیت میں، نشہ میں ڈوبے ہوئے بیٹھے تھے۔ شاگردوں کی خاصی تعداد حاضر تھی، ان میں سے کسی منچلے نے اسی حالت میں مشہور اساتذہ کلام اور شعر و نثر کے ماہرین کے بارے میں ان سے سوالات شروع کر دیے۔ غالب کے بارے میں دریافت کیا، ذوق کے بارے میں دریافت کیا، انشا کے بارے میں دریافت کیا، وہ سب پر اپنی اسی کیفیت میں، بڑی شان بے نیازی کے ساتھ اظہار خیال کرتے رہے۔ کسی کو "بے ذوق" قرار دیا اور کسی کے بارے میں کہا کہ اس کی انشاء میں سقم تھا ....

ان کی اس کیفیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہاں موجود ایک شخص نے، جس کے بارے میں ہم ہلکے سے ہلکا لفظ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بدنصیب اور علم وہدایت سے محروم تھا، سوال کر دیا، "حضور! محمد کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں سمجھتا ہوں کہ اس شخص کو یہ امید رہی ہوگی کہ اپنے اس موڈ میں مست استاد جی کوئی ایسی بات کہہ دیں گے جو ہم شاعروں کے لیے سند بن جائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی اس امید کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس نے اپنے استاد میں کسی دینی جذبے یا مذہبی حس کا کبھی تجربہ نہ کیا ہوگا، اس بے خبر کو خبر نہ تھی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت ومحبت کی ایک چنگاری ہر مسلمان کے دل کے کسی گوشے میں دبی رہتی ہے۔ اور جب اسے ہوا دے دی جائے تو وہ چمک اٹھتی ہے، اور پورے وجود پر چھائی ہوئی تاریکیوں کو مٹا کر ظاہر و باطن کو منور کر دیتی ہے۔

یہ مبارک نام جیسے ہی اختر شیرانی کے کانوں نے سنا، ایک لرزہ سا ان پر

طاری ہوا، اپنی چھڑی اٹھا کر اس کی پیشانی پر ماری اور کہا کہ بدبخت! تیری یہ جرأت کیسے ہوئی کہ اس ناپاک مجلس میں یہ پاک نام تو لے لیا!

مجھے جو بات عرض کرنی ہے وہ یہی ہے کہ بے شمار حوصلہ شکن، اور مایوس کن علامتوں کے درمیان ایک بات ہے جو امید افزا ہے۔ وہ یہ کہ ایک مسلمان خواہ وہ کیسا بھی گیا گذرا ہو، ماحول کی خرابی اور غفلت کا جس درجہ بھی شکار ہو، لیکن اس عظیم بندۂ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے اس کا دل خالی نہیں ہوتا، اور جب تک یہ بات موجود ہے، جبتک یہ نورانی دھاگہ سلامت ہے یہ امید قائم رہتی ہے کہ اگر اس محبت کے نام پر، اس عقیدت کے واسطے سے اگر اس سے بات کی جائے تو فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت تو ایسی دلآویز اور پرکشش شخصیت ہے کہ مسلمان تو مسلمان! دنیا کے وہ عام انسان بھی جن کو آپ کے بارے میں کسی ذریعہ سے جاننے کا موقع ملا ہے، عقیدت و احترام کے جذبات رکھتے ہیں۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ اس اجتماع میں غیر مسلم خواص کی بڑی تعداد بھی شریک ہے۔ میں اپنے مسلمان بھائیوں سے بھی اور غیر مسلم بھائیوں سے بھی اسی امید افزا علامت کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ اہم باتیں کرنے کے لیے یہاں حاضر ہوا ہوں۔ اگرچہ اس عنوان پر ہونے والے عام جلسوں کا تجربہ انتہائی مایوس کن ہی ہے۔ اور اس کی وجوہ بھی ہمارے سامنے ہیں۔ غلط طریقوں سے اور بغیر کسی سنجیدہ فکر و محنت کے، بغیر کسی اندرونی کڑھن اور دعاؤں کے اہتمام کے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو زندہ کرنے والی کوشش میں جن اوصاف کا ہونا لازمی ہے۔ ان سے بالکلیہ اعراض کر کے جو کوشش کی جائے گی، ان کا بے نتیجہ ہونا، بلکہ بعض پہلوؤں سے مضر ہونا بالکل فطری اور لازمی امر ہے۔

ایک حقیقت ہے جس کو ہر شخص محسوس کر سکتا ہے وہ یہ کہ اس کائنات میں موجود

مخلوقات، اور کارفرما طاقتوں کے درمیان ایک مخلوق ہے جو اسے آباد کردیتی ہے۔ یا برباد کردیتی ہے۔ ایک طاقت ہے جو یا تو اس دنیا کو امن وسلامتی کا گہوارہ اور اطمینان ومسرت کی جنت بنا دیتی ہے یا اسے نفرت وعداوت کا جہنم، اور مصیبتوں اور آفتوں کی کھٹی بنا دیتی ہے۔ وہ طاقت انسان کی ہے۔

عمر کے اعتبار سے، سائز کے اعتبار سے، وزن کے اعتبار سے، طول وعرض کے اعتبار سے، اور دوسرے مختلف پہلوؤں سے دنیا میں موجود بہت سی دوسری مخلوقات انسان سے بڑھی ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ہی ہے جو اس کائنات کا مخدوم ہے، سب کچھ اُسی کے لیے ہے، اسی کی خدمت کے لیے ہے۔ اس کے لیے مسخر ہے۔۔۔۔۔ وہی ہے جس کے وجود کے ساتھ اس (دنیا) کا وجود وابستہ ہے اور جس کے ارادہ اور جس کی نیت کے ساتھ اس دنیا کی قسمت وابستہ ہے۔ وہ چاہتا ہے تو یہ دنیا بنتی ہے، وہ چاہتا ہے تو یہ دنیا بگڑتی ہے اس دنیا کے بننے اور بگڑنے کا تعلق نہ کسی اور مخلوق سے ہے، نہ انسان کے باہر پھیلی ہوئی بے شمار چیزوں اور وسائل سے، اگر ایسا ہوتا تو آج کی دنیا جو چیزوں اور وسائل راحت کے اعتبار سے انتہائی ترقی یافتہ ہے سب سے زیادہ پرسکون ہوتی۔ اس دنیا کے بننے اور بگڑنے کا تعلق انسان اور صرف انسان سے ہے۔ "ظہر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس (انسانوں کے اعمال ہی کے سبب بر و بحر (خشکی اور سمندر) ہر جگہ تباہی غالب ہوگئی)۔

انسان کی اس عظمت، اور کائنات میں اس کے اس مقام کو ذہن میں رکھیے اور اس سوال کا جواب دیجیے کہ ایسی خطرناک صلاحیت ایسے متضاد جذبات اور پوری دنیا کو بنانے اور بگاڑ دینے کی دوہری استعداد رکھنے والی مخلوق کو کسی رہنمائی کی ضرورت ہے یا نہیں؟

اس پوری کائنات کے پیدا کرنے والے کے بارے میں اگر کوئی یہ گمان رکھتا ہو کہ اس نے انسان کو ایسی صلاحیت تو بخش دی کہ وہ چاہے تو ایمان دار بن جائے،

چاہے تو یے ایمان بن جائے، چاہے تو اپنے ماحول اور معاشرہ کے لیے خیر و برکت کا پیغام بن جائے اور چاہے تو نحوست اور ہلاکت و بربادی کی نشانی بن جائے۔ لیکن اس نے اس کی ایسی رہنمائی نہیں کی جس سے اسے اس صلاحیت کے استعمال کا صحیح طریقہ آجائے اور اس کے اندر اور باہر کی دنیا میں خیر اور اطمینان و سکون کا غلبہ ہو جائے ـــــــ اگر خدا کے بارے میں کوئی یہ گمان رکھتا ہے تو شاید اس نے خدا کی حکمت و دانائی، اور رحمت و رأفت کو بالکل ہی نہیں سمجھا۔

اگر ہم آپ خود اپنے اندر چھپے ہوئے متضاد جذبات و خواہشات پر غور کریں تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ ہمیں اور دنیا کے ہر انسان کو رہنمائی کی ضرورت ہے ـــــــ اور وہ رہنمائی کسی اور کی طرف سے نہیں اس انسان کو بنانے والے، اور اس کے اندر یہ صلاحیت اور جذبات رکھنے والے خالق ہی کی طرف سے آنی چاہیے کیونکہ کسی بھی مشین کو استعمال کرنے کے لیے رہنمائی وہی دیتا ہے اور وہی دے سکتا ہے جو اسے بناتا ہے۔ اس لیے کہ وہی اس کی تمام نزاکتوں سے واقف ہوتا ہے۔

یہ مان لینے کے بعد، یا یوں کہیے کہ اس فطری اور مسلّم حقیقت کے استحضار کے بعد اب ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اس رہنمائی کی صورت کیا ہونی چاہیے یعنی کس ذریعہ سے یہ رہنمائی انسان کو دی جائے؟

ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری دنیا میں جو مختلف مشینیں اور مصنوعات بنانے والے کارخانے ہیں وہ ان مشینوں کے استعمال کے طریقے کی وضاحت کے لیے دو طریقوں سے کام لیتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ایک کتابچہ (CATALOGUE) میں تمام ضروری باتیں لکھ دی جاتی ہیں، اور وہ کتابچہ اس مشین کے ساتھ رکھ دیا جاتا ہے ـــــــ لیکن کچھ مشینیں زیادہ قیمتی، زیادہ نازک اور زیادہ پیچیدہ ہوتی ہیں۔ اس صورت میں مشین بنانے والا کارخانہ صرف اس کتابی رہنمائی کو کافی نہیں سمجھتا، بلکہ کچھ تربیت یافتہ انجینیر اور ماہرین مختلف علاقوں میں بھیجتا ہے، جو مختلف علاقوں میں اس کارخانے کی ایجنسیوں کے کارکنوں کو اس مشین کے استعمال کی عملی تربیت دیتے ہیں، اور وہ لوگ پھر یہی طریق کار تمام خریداروں کے ساتھ برتتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں جو مشین سب سے زیادہ پیچیدہ ہے، سب سے زیادہ نازک ہے، اور سب سے زیادہ قیمتی ہے وہ خود انسان ہے۔ اس مشین کا استعمال غلط ہو گا تو اس کا نتیجہ یہ نہیں نکلے گا کہ بلب فیوز ہو جائے گا، یا ٹائر میں سے ہوا نکل جائے گی، یا لاسلکی پیغامات کی وصولیابی میں خلل پڑے گا۔ یہ نتائج معمولی ہیں، ان نتائج کی تلافی یا تدارک بھی ممکن ہے۔ لیکن انسان کی مشین کے غلط استعمال کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دنیا کے جنگلی جانوروں میں انسان کی شکل کے ایک انتہائی خطرناک جانور کا اضافہ ہو جائے گا، اور پھر کمزوروں پر آفت آئے گی، محکوم حاکموں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنیں گے۔ طاقت کی زبان کے سوا، کوئی اور زبان سمجھی نہ جائے گی۔ نہ جان محفوظ رہے گی نہ مال نہ کسی دوشیزہ کی عزت و آبرو سلامت رہے گی اور نہ کسی عابد و زاہد کا معبد۔

اور پھر اس زندگی کے بعد جو زندگی آئے گی، جس کا واحد مقصد ہی اس دنیا وی زندگی میں انسان کے اعمال کا بدلہ دینا ہے، اس زندگی میں بھی وہ انسان ایک ایسے انجام سے دوچار ہو گا جس سے زیادہ بُرے انجام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

تو میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی رہنمائی کے لیے بھی دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک مکمل کتاب کی۔ اور ایک عملی رہنما کی۔ مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں خدا کی طرف سے انسانیت کی تربیت اور رہنمائی کے لیے یہی دو طریقے استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ کتابی رہنمائیاں بھی آئی ہیں، اور عملی رہنما بھی۔

اس دنیا میں جتنی کتابیں موجود ہیں جن کو دنیا کے بہت سے لوگ رہنما قرار دیتے ہیں، اور جتنی وہ شخصیتیں ہیں جن کو رہبر سمجھا جاتا ہے۔ ان کتابوں کا اور ان شخصیتوں کی تاریخ کا مطالعہ ایک طالب علم کی حیثیت سے میرا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ ہے۔ اور اس مطالعہ کی روشنی میں بلا کسی تکلف کے، بلا کسی ابہام کے اور بغیر کسی تحفظ کے، پورے اعتماد کے ساتھ میں عرض کرتا ہوں کہ وہ کتاب جس سے واقعی مکمل، اور ہمہ گیر رہنمائی پوری انسانیت کو مل سکتی ہے وہ صرف ایک ہے

جس کو ہم آپ "قرآن" کے نام سے جانتے ہیں۔ اور وہ شخصیت جو ایک مثالی کمل اور عالمگیر اور حقیقی وعملی رہنما شخصیت ہے وہ حضرت اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم شخصیت ہے ـــــ یہ اور ان دونوں ذریعوں سے رہنمائی دینے والی ذات خدا کی ذات عالی ہے۔ جس کے سوا کسی اور کو انسانوں کی رہبری کا حق نہیں۔

محترم حضرات! اب مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ایک کامیاب اور مثالی رہنمائی میں کیا کیا صفات ہونی چاہئیں۔ اور پھر میں یہ کوشش کروں گا کہ اس بارے میں کچھ عرض کروں کہ وہ صفات خدا کی اس رہنمائی میں جو قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملی ہے کس حد تک موجود ہیں؟ پھر ہمیں اور آپ کو یہ سوچنا ہوگا کہ اس رہنمائی کا ہم پر کیا حق ہے؟ اور اس کا ہم سے کیا مطالبہ ہے؟ (باقی)

حضرت مجدد الف ثانی رح ایک ہندی مصنف کی نگاہ میں

جناب عبدالرؤف خاں، ایم۔ اے

[انسانی نفسیات کی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، جسے عہد جدید کے تجربوں نے اور زیادہ عالم آشکارا کر دیا ہے۔ کہ تہذیبوں، معاشرتوں، عادات و معمولات اور رسوم و رواج کا مسئلہ سرسری اور سطحی نہیں بلکہ ان میں سے ہر چیز قلب و دماغ میں اپنی گہری جڑیں رکھتی ہے۔ اور اقوام و ملل کی صورت گری اور شخصیت سازی میں ان کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اور ان میدانوں میں کسی قوم کی مشابہت و تقلید پوری ملت کی نفسیات پر اثر انداز ہوتی ہے۔

اسلام چونکہ محض چند عقائد و رسوم کا مجموعہ نہیں، بلکہ وہ پوری زندگی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دینے کا نام ہے اس لیے اس بارے میں اس نے سب سے زیادہ محتاط روش پر زور دیا ہے اور عقائد و عبادات اور عادات و اخلاق کے ساتھ تہذیب و معاشرت میں بھی اپنے تشخص اور خصائص کی حفاظت پر اصرار کیا ہے — اور اس کے ساتھ ساتھ عام انسانوں سے نفرت و تعصب اور تحقیر و تذلیل سے منع بھی کیا ہے —

ہندوستان میں مسلمان جن بڑے نازک امتحانات سے دوچار رہے ہیں ان میں سے ایک اسی معتدل اور باریک صراطِ مستقیم پر ثبات و استقامت ہے — تاریخ میں ایسے کئی دور آئے جب یہ ملی تشخص خطرے میں پڑنے لگا۔ ایسے موقع پر مشیت الٰہی نے ایسے افراد مہیا کر دیے جنہوں نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور ملت اسلامیہ میں اسی معتدل طرز عمل کا احیا کیا۔ ان میں سرفہرست امام ربانی مجدد الف ثانی رح تھے جنہوں نے اس وقت اس فتنہ کی بیخ کنی مثبت دعوتی مہم کے ذریعہ کی جبکہ اس کے پیچھے ایک عظیم منصوبہ بند سازش تھی جس کے لیے حسب معمول، قوم پرست سیکولر اور نام نہاد مسلمانوں کو ان کے [illegible] اکبر کی قیادت میں مہرے کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے وہ تمام لوگ جو اپنے کو سیکولر اور قومی یکجہتی کے علمبردار کہتے ہیں اکبر کی محبت اور مجدد صاحب اور اورنگ زیب سے نفرت ان کی علامت سی بن گئی ہے — اس اہم موضوع پر ایک تازہ کوشش کا جائزہ ذیل کے مضمون میں ملاحظہ فرمائیے جس کے لیے ادارہ الفرقان فاضل مضمون نگار کا ممنون ہے — مدیر]

ہندی زبان و ادب کے نامور شاعر اور ادیب آنجہانی رام دھاری سنگھ دنکر (وفات ۲۴ اپریل ۱۹۷۴ء) نے اپنی ضخیم تصنیف "سنسکرتی کے چار ادھیائے" (ثقافت کے چار ابواب) میں مذاہب عالم کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے ایک باب میں "اسلام" نیز مسلم نشاۃ ثانیہ کے ضمن میں ہندوستانی بزرگان دین مثلاً امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، سر سید مرحوم (م ۱۸۹۸ء) مولانا الطاف حسین حالی مرحوم (م ۱۹۱۴ء) علامہ شبلی نعمانیؒ (م ۱۹۱۴ء) نیز علامہ سر محمد اقبالؒ (م ۱۹۳۸ء) وغیرہم کے کارہائے نمایاں پر اپنے تحفظات ذہنی کے پیش نظر ایک مخصوص زاویۂ نگاہ سے خامہ فرسائی کی ہے۔ زیر نظر مضمون میں ہم حضرت مجدد الف ثانی کے سلسلے میں مذکورہ کتاب کے ہندی اقتباس کا اردو ترجمہ نذر قارئین کرتے ہوئے دنکر جی کے بعض مزعومات کا تاریخی شواہد کی روشنی میں تجزیہ پیش کرنا چاہیں گے۔ حضرت مجددؒ کی ذات گرامی کے بارہ میں فاضل مصنف رقمطراز ہیں :۔

"شیخ احمد سرہندی کی ولادت ۱۵۶۳ء میں اور وصال ۱۶۲۴ء میں اکبر کے انتقال کے کوئی انیس (۱۹) سال بعد ہوا۔ شیخ احمد، ابن تیمیہ کے تلمیذ تھے۔ وہ صرف سنت رسول اللہ ہی نہیں بلکہ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے شدید ترین مخالف بھی تھے۔ اسلام کو وہ تمام مذاہب اور تہذیبوں کے اثرات سے محفوظ و مامون رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اسلام کی اس قدیم اور ابتدائی شکل کے قائل تھے۔ جب اسلامی معاشرہ میں تصوف کا نفوذ نہیں ہوا تھا اور نہ اسلامی ثقافت پر کسی غیر اسلامی ثقافت کا سایہ ہی پڑا تھا۔ انیسویں صدی میں وہابیوں نے اسلام کی جس قدیم ہئیت کو واپس لانے کی کوشش کی اور بیسویں صدی میں اس کی جس شکل کا تذکرہ حالی و اقبال نے کیا، شیخ احمد سرہندی بھی اسلام کی اسی ہئیت کے معتقد تھے۔

تقریباً چار سو سال کے باہمی اختلاط سے مسلمانوں نے ہندوؤں سے جو عادات و اطوار اخذ کیے، شیخ سرہندی ان سب کو گناہ سمجھتے تھے۔ شادی و شرادھ (یعنی ۱۹۸۴) تقریبات و تہوار نیز روزمرہ کی زندگی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بہت سے رسم و رواج یکساں ہو گئے تھے۔ اُس زمانہ میں گاؤکشی سے مسلمان بھی متنفر ہونے لگے تھے اور نکاح بیوگان کو بنظر حقارت دیکھا جانے لگا تھا۔ شیخ احمد نے ان تمام امور کو معیوب بتلایا اور مسلمانوں سے کہا کہ ہنود کے اختلاط سے تم نے جو کچھ اخذ کیا ہے اُسے ترک کر دینا چاہیے کیونکہ یہ (تمام) باتیں اصل اسلام کے خلاف ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اُسی طرح زندگی بسر کرنا چاہیے جس طرح (حضرت) محمد صاحب کے عہد میں عرب کے مسلمان رہتے تھے۔ نیز انھیں اس بات سے ہوشیار رہنا چاہیے کہ ہندوستان میں بسنے والے غیر مسلم، جو اکثریت میں ہیں، کی عادات و اطوار اُن میں جاگزیں نہ ہو جائیں۔ ہندوؤں سے شیخ احمدؒ کو انتہائی عداوت تھی وہ اُنھیں کافر سمجھتے تھے اور اُنھیں اس بات کا یقین تھا کہ کافروں کے استیصال اور تذلیل سے بڑھ کر خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

شیخ احمد نے ہندو مسلم اتحاد کے خلاف اپنا مسموم پرچار عہد اکبر میں ہی شروع کر دیا تھا۔ لیکن اکبر کا دبدبہ سارے ملک میں تھا۔ لہٰذا شیخ احمد کی تحریک اُس وقت طاقت حاصل نہ کر سکی مگر اکبر کے انتقال کے بعد انھوں نے بے خوف ہو کر مسلمانوں میں شعلے بھڑکانا شروع کر دیا۔ نتیجۃً جہانگیر نے انھیں مقید کر دیا۔ مگر جہانگیر سخت گیر نہ تھا اس لیے بااثر مسلمانوں کی مداخلت کے سبب اسے رحم آگیا اور شیخ احمد کو قید سے رہا کر دیا۔ لیکن شیخ احمد کو ہندو مسلم اتحاد پر رحم نہ آیا۔ قید سے رہا ہوتے ہی انھوں نے

اپنی دعوتی سرگرمیاں از سر نو شروع کر دیں اور (تقریباً) جہانگیر کے عہدِ حکومت تک وہ اپنے نظریات کی اشاعت بے روک ٹوک کرتے رہے۔
شیخ احمد کی رحلت کے بعد ان کے افکار و نظریات کی اشاعت کا بیڑہ ان کے خلفِ رشید محمد معصوم نے اٹھایا اور جب محمد معصوم کا وصال ہو گیا تو اسی دعوت کو ان کے فرزند ارجمند شیخ سیف الدین نے مزید تندہی اور جانفشانی کے ساتھ جاری رکھا۔ ہندوستان کی شومئی تقدیر کہ انہی شیخ سیف الدین کو اورنگ زیب نے اپنا مقتدا و پیشوا بنایا اور اس طرح اورنگ زیب کے روپ میں شیخ احمد کی روح کو وہ طاقتور انسان نصیب ہو گیا جو ان (حضرت مجدد) کے خوابوں کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا"۔
آنجہانی ڈِنگر جی نے سطورِ بالا میں تاریخی واقعات و حقائق کو نہایت سادہ لوحی" کے ساتھ مسخ کرتے ہوئے حضرت شیخ الاسلام حافظ احمد تقی الدین ابن تیمیہ اور امام ربانی حضرت شیخ احمد سرہندی کے مابین رشتۂ استادی و شاگردی قائم کر دیا ہے جبکہ اول الذکر بزرگ کی ولادتِ باسعادت ۶۶۱ھ مطابق ۱۲۶۳ء کو بمقام حرّان (دمشق) اور وفات ۷۲۸ھ مطابق ۱۳۲۸ء کو زندانِ دمشق میں واقع ہوئی اور مؤخر الذکر بزرگ (الفِ ثانی) کی پیدائش ۹۷۱ھ مطابق ۶۴-۱۵۶۳ء کو سرہند (پنجاب) میں ہوئی اور پھر ۱۰۳۴ھ مطابق ۱۶۲۴ء کو آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ گویا ہر دو بزرگانِ دین کے عہدِ حیات میں تقریباً تین سو سال کا بُعدِ زمانی اور ہزاروں میل کا بُعدِ مکانی حائل ہے مگر فاضل مصنف کے تعصبات و تحفظاتِ ذہنی نے زمان و مکان کی حدود و قیود کا کوئی خیال نہیں کیا ؎

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے بیشتر تعلیم اپنے والد ماجد شیخ عبدالاحد (م ۱۰۰۷ھ / ۱۵۹۸ء) نیز دیگر اساتذۂ عصر اور سر آمد علماءِ روزگار سے حاصل کی بعد ازاں حضرت خواجہ

باقی باللہ (م ۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء) کی خدمتِ فیض رساں میں حاضر ہو کر سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کی۔ ناظرین فیصلہ فرمائیں کہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کا شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سے اکتسابِ فیض کیونکر ثابت ہو سکتا ہے؟

مصنف موصوف نے یہ کہتے ہوئے حضرت مجددؒ کی ذاتِ گرامی کو اپنے غم و غصہ کا ہدف بنایا ہے کہ "وہ نہ صرف متشدد مسلمان ہی تھے بلکہ دیگر مذاہب کے کٹر مخالف بھی" فی الواقع ڈاکٹر جی کو اسلام کے بارہ میں ابتدائی معلومات سے بھی بہرہ نہ تھا ورنہ ظاہر ہے کہ اسلامی زندگی کچھ اعمال و معتقدات کے اختیار اور بعض اعمال کے ترک کی ہدایتیں ہیں خواہ وہ اپنی ذات سے متعلق ہوں یا دوسروں سے، اس میں جہاں سیئات سے احتراز اور حسنات پر عمل پیرا ہونے کی تاکید فرمائی ہے وہاں اسلامی نظامِ حیات کے اصول و مبادیات سے واقف کار کا یہ فرضِ منصبی بھی ہے کہ وہ اس مکمل ضابطۂ حیات (اسلام) کے محاسن دوسروں کے سامنے پیش بھی کرے اور جو اس طریقِ کار کی پیروی کر رہے ہیں انھیں ان کی کوتاہیوں پر متنبہ بھی یہی اس مذہب کے بزرگوں کا مشن رہا ہے اور اسی طریقِ کار سے اسلام کی ترویج و اشاعت ہوتی رہی ہے۔ دیگر ممالک کے علاوہ ہندوستان میں بھی اسی طریق و طرز سے اسلام اشاعت پذیر ہوتا رہا ہے۔ بزرگانِ اسلام مثلاً حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (م ۶۳۳ھ / ۱۲۳۵ء) خواجہ فرید الدین شکر گنجؒ (م ۶۶۴ھ / ۱۲۶۵ء) نیز دوسرے بزرگانِ دین کی سیرت و تاریخ میں یہ حقیقت روزِ روشن کی مانند عیاں ہے۔ مگر خدا جانے خوشہ چینانِ فرنگ کی نظروں میں یہ کتنا سنگین جرم ہے کہ وہ ایک بزرگ (حضرت مجددؒ صاحب) کو صرف اس بنا پر موردِ عتاب گردان رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اپنے مذہبی قانون کا کلی طور پر پابند اور [illegible] سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں گو یہ کوئی معیوب بات نہیں کیونکہ آج کل بھی جماعتیں (PARTIES) اپنے اپنے اصول و ضوابط (دستور) مرتب کرتی ہیں جن کے اصول باہم متضاد و متخالف ہوتے ہیں مگر ان جماعتوں کا ہر ممبر اپنی پارٹی کے نافذ کردہ اصول کی پابندی کر کے اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

پارٹی یا ذی کمان ہر اس ممبر کے خلاف جو ضوابط سے روگردانی کرے، ایکشن لیتا اور تادیبی کارروائی کرتا ہے۔ لیکن فاضل مصنف کے نزدیک مذہب سے وفاداری، جس کا مقصد دارین کی فلاح و نجاح ہے، اک ایسا جرم ہے جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر جی کا یہ فرمانا کہ "ہندوؤں سے شیخ احمد کو انتہائی عداوت تھی" نفسیاتی طور پر درست معلوم نہیں ہوتا۔ گاندھی جی کہا کرتے تھے "گناہ سے نفرت کرو گنہگار سے نہیں" ان کا یہ قول ہر مصلح پر صادق آتا ہے۔ کوئی بھی ریفارمر اور سماج سدھارک اپنے اختیار کردہ لائحۂ عمل کے ماسوا دیگر طریقہائے زندگی سے تو بیزاری کا اظہار کر سکتا ہے اور کرنا بھی چاہیے مگر انسانوں سے نہیں کیونکہ انسان تو اس کے مشن کے لیے خام مواد (RAW MATERIAL) کا حکم رکھتے ہیں۔ دیگر پیروانِ مذاہب سے عداوت و نفرت کا جذبہ مصلحانِ ہنود کے یہاں کارفرما ہو سکتا ہے کیونکہ ہندو مذہب کا مزاج دعوتی و تبشیری نہیں بلکہ چند (FLEXIBLE) اصولوں سے مرکب ایک کلچر ہے۔ آنجہانی رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری (م اوائل ۱۹۸۲ء) ہندو مذہب کو شرنت مزاج سے ہی تعبیر کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "ہندو سماج کی روح مذہبی عقائد و رسوم اور ملی تنظیم کے مقاصد سے بے نیاز ہے۔" اس کے برعکس اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کی کارفرمائی حیات بعد ممات تک پر محیط ہے لہٰذا اس کی دعوت ہی یہ ہے کہ ساری دنیا کو اس کے نوشیں ثمرات سے بہرہ ور اور متمتع کیا جائے اور یہ کام عداوت سے نہیں الفت و رافت ہی سے انجام پذیر ہو سکتا ہے کیونکہ بیمار قومیں دارِ محبت ہی سے شفایاب ہو سکتی ہیں۔

یہ بات قرین قیاس ہے کہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی اصلاحی کوششوں سے بیشتر غیر مسلموں کی مؤانست و مجالست کے سبب مسلمانوں کے ایک طبقہ میں نکاح بیوگان وغیرہ امور کو بہ نظر استحسان نہ دیکھا جاتا ہو مگر آپ کی تحریک کے دوررس نتائج و ثمرات سے نہ صرف یہ کہ مسلمان ہی مستفید و مستفیض ہوئے بلکہ موجودہ ہندوستان میں ہندوؤں کی پہلی اصلاحی تحریک 'برہمو سماج' (قائم ۱۸۲۸ء) کے بانی راجہ رام

موہن رائے (م ۱۸۳۳ء) جنھیں ہندوستانی تحریک قومیت کا مسیحا اور موجودہ ہندوستان کا 'باوا' (FATHER OF MODERN INDIA) کہا جاتا ہے، نے اپنی مذکورہ تحریک کے اصولوں میں نکاحِ بیوگان کی ترویج کو سرِفہرست جگہ دی۔ اس کارِ خیر کو ہندوؤں میں فروغ دینے کے لیے اسی تحریک کے روحِ رواں کیشو چندر سین نے نہایت شدومد کے ساتھ جاری رکھا اور حکومتِ وقت سے سول میرج ایکٹ (CIVIL MARRIAGE ACT) پاس کرا کے نکاحِ بیوگان کی قانونی اجازت حاصل کی تھی۔ دیگر ہندو احیائی تحریکات نے بھی اس ضمن میں اپنا پورا زور صرف کیا، گویا حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی اصلاحی مساعیٔ جمیلہ کے اثرات بالواسطہ یا بلاواسطہ ہندوستانی غیرمسلم معاشرہ میں نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

سری دنکر جی کے اس فقرہ سے، "لیکن شیخ احمد کو ہندو مسلم اتحاد پر رحم نہ آیا" متبادر ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت کی خلیج حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے قصداً حائل کی۔ لیکن موصوف کا یہ مفروضہ قیاس مع الفارق اور تاریخی شواہد کے یکسر منافی ہے۔ تاریخ کا ایک ادنیٰ مبتدی بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ اس نفرت کا تخم سرزمین ہند میں اہل برطانیہ نے اپنی حکومت مستحکم کرنے کے لیے عمداً بویا۔ ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن نے برٹش حکومت کو مشورہ دیا کہ ہمیں قدیم سلطنتِ روم کے اصولِ حکمرانی DIVIDE AND RULE یعنی 'نفرت ڈالو اور حکومت کرو' کو ہی اپنے نصب العین کے طور پر قبول کر لینا چاہیے۔ اس پالیسی کے اختیار کرنے کا ہی نتیجہ تھا کہ انگریزوں نے اولاً حیدرآباد کے نظام اور ارکاٹ کے راجہ کو باہم برسرپیکار کیا اور پھر مرہٹوں کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کیا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی فرماتے ہیں کہ: "ہندو مسلم تعلقات کی کشیدگی برطانوی عہد سے شروع ہوتی ہے۔ لڑاؤ اور حکومت کرو، برطانوی سامراج کا تقاضہ تھا اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مختلف قسم کے نفاق اور اختلافات عمداً پیدا کیے گئے تھے۔ سرہنری ایلیٹ نے اس زہر کو تاریخ ہند کی رگوں میں پہنچا کر اس طرح تاریخی سطحِ نظر کو

خراب کیا کہ اس کے برخلاف آج جو بات کہی جاتی ہے وہ شک آمیز تعجب سے سنی جاتی جاتی ہے۔[۳۳] اس تفرقہ انگیزی کے بارہ میں COUPLAND کا ایک اقتباس پیش کرنا قارئین کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ "ہندوازم کی ابتداء ندیوں اور نباتات سے ہوئی جبکہ اسلام کا آغاز صحرا میں ہوا۔ ہندو مختلف دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں مسلمان صرف ایک (خدا) کی۔ ہندوؤں میں 'ورن ویوستھا' (ذات پات) کے بندھن انتہائی سخت ہیں مسلمان اپنے تمام دینی بھائیوں کو برابر سمجھتے ہیں۔ ہندوؤں کی ادبی زبان سنسکرت ہے مسلمانوں کی عربی اور فارسی۔ ایک کی عام 'بھاکا' (زبان) ہندی ہے دوسرے کی اردو اور دونوں (زبانیں) ہی ہندوستانی سے مختلف ہیں۔"[۳۴]

مندرجہ بالا تاریخی آثار و شواہد کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں ہوگا کہ ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کو حضرت شیخ احمد سرہندیؒ نے پارہ پارہ کیا یا انگریز اور ان کے کاسہ لیس لوگوں نے مذہبی اصولوں پر سختی سے کاربند و عمل پیرا ہونا قومی یک جہتی و ہم آہنگی کے منافی نہ ازمنۂ قدیم میں تھا نہ عہدِ وسطیٰ اور نہ دورِ جدید میں ہی۔ مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور شیخ الاسلام حضرت حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ کی نظیر ہمارے سامنے ہے کہ ان حضرات سے بڑھ کر اپنے اپنے مذاہب پر سختی کے ساتھ کون گامزن ہوسکتا ہے مگر ان بزرگوں کے کسی قول و فعل سے قومی یک جہتی کے دکاز، کو کبھی ہلکی سی خراش بھی نہ آئی۔ ارباب بصیرت سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ آج بھی وہ کون لوگ ہیں جو قومی اتحاد کو ڈائنامیٹ کرنے پر مستعد و آمادہ ہیں۔ بلکہ آجکل تو اس مقصد کے لیے دستے بھی، قائم کی جارہی ہیں جن کا وجود ہی نفرت اور ہنسا، (हिंसा) پر منحصر ہے۔ ساتھ ایسا نفرت انگیز لٹریچر شائع کیا جارہا ہے جس کا تاریخ سے دور دراز کا بھی کوئی واسطہ نہیں اورنگ زیب تو اب اس لٹریچر کی جان بن چکا ہے۔ دنکر جی نے ایک اور ہستی (حضرت مجدد صاحبؒ) سے ان (اورنگ زیب) کا رشتہ جوڑتے ہوئے قومی یک جہتی کی خدمت کے سلسلہ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

مصنف کی پریشان خوابی کا ایک معروضہ یہ بھی ہے کہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ اسلام کی اس قدیم اور ابتدائی شکل کے قائل تھے جب اسلامی معاشرہ میں تصوف کا نفوذ نہیں ہوا تھا، گویا ڈاکٹر جی کے نزدیک مسلم معاشرہ میں تصوف ہندوؤں سے اختلاط سے اثر پذیر ہوا۔ جبکہ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ ہندوؤں میں بھکتی تحریک، صوفیائے کرام کی کارکردگی کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی۔ دوسرے ہندو مذہب کی پیچیدہ صنم پرستی اسلامی توحید کے بالمقابل فلسفیانہ حیثیت سے بہت پست معلوم ہوتی ہے ایسی صورت میں مسلمانوں کو کیا احتیاج تھی کہ وہ اپنی روحانی تربیت کے لیے ہندوؤں کی طرف رجوع کرتے؟ بہرحال ہمارے ملک میں اسلام یا بالفاظ دیگر مسلمانوں پر ہندوؤں کے جو کچھ بھی اثرات مترتب ہوئے وہ اُس اقتدار و نفوذ کے مقابلے بالکل فروتر ہیں جو اسلام کو اس ملک میں حاصل رہا۔ کیا حضرت شیخ علی بن عثمان (داتا گنج بخش) ہجویریؒ (المتوفی ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) اور حضرت خواجہ معین الدین سنجریؒ (م ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء) نے ہندوستان آکر تصوف سیکھا؟ بفرض محال اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے تو کیا حضرت حسن بصریؒ (م ۱۱۰ھ/۷۲۸ء) حضرت ذوالنون مصریؒ (م ۲۴۵ھ/۸۵۹ء) اور حضرت جنید بغدادیؒ (م ۲۹۷ھ/۹۰۹-۱۰ء) نیز دیگر متقدمین صوفیائے کرام بھی ہندوستان تشریف لائے؟ تاریخ سے قدرے شغف رکھنے والا ہر انسان جانتا ہے کہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ تصوف کے نقشبندی خانوادے کے مجدد اور امام تھے۔ یہ ایں سبب یہ سلسلہ آگے چل کر نقشبندیہ مجددیہ کے نام سے معروف و مشہور ہوا۔ اس صورت میں یہ کیونکر باور کیا جاسکتا ہے کہ آپؒ مسلمانوں کو تصوف سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ البتہ تصوف کے نام پر مسلم معاشرہ میں جو غیر اسلامی طور طریقے، خرافات اور بدعات رائج ہوگئیں تھیں، اُن سے آپؒ نے ملت کو پاک صاف اور منزہ کرنے کی انتھک کوشش کی جو بہرحال میں درست اور صحیح تھا۔

ہموطنی و ہمسائگی کی بناء پر شادی و سرادھ (۱۲۱۹ھ) کی رسومات ہند و تقریبات و تہواروں کے مسلم معاشرہ میں رواج پذیری کے خلاف مخلصین کو قابل اعتراض ٹھہرانے

سے پیشتر اگر فاضل مصنف ان رسومات کی افادیت اور معقولیت کو منطقی نقطۂ نظر سے ثابت کرتے تو کچھ اور بات تھی۔ رہا گاؤکشی کا معاملہ تو جہاں تک باہمی رواداری اور دوسرے طبقہ کی دلآزاری کا تعلق ہے، یہ امر درخور اعتنا ہو سکتا ہے تاہم ماہرین معاشیات کی آراء کے پیش نظر یہ مسئلہ (امتناعِ گاؤکشی) ملک کی معیشت پر اقتصادی پہلو سے کوئی منفعت بخش نتائج مرتب نہیں کرتا۔

ہر حال میں اتباعِ سنت کا خیال رکھنے والا کوئی بھی بزرگ ہندوؤں کے استیصال و تذلیل کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ کیسے قرار دے سکتا ہے کیونکہ وہ ساری مخلوق کو خدا کا کنبہ سمجھ کر بلا امتیازِ مذہب و ملت ہر شخص کے ساتھ رحم و کرم، عفو و درگذر اور شفقت و رافت کا سلوک فرماتے تھے۔ اُن کا یقین راسخ تھا کہ ان کے اس عمل کے عوض آسمان والا (خدا) اُن پر روزِ حشر رحم فرمائے گا۔ حضرت امام ربانیؒ کی غیر مسلم حضرات سے محبت و الفت کا ثبوت مکتوبات میں آپ کے مکتوب ۱۶۷ کی عبارت سے بہ آسانی مہیا ہو جاتا ہے جس میں جناب ہردے رام صاحب کے کسی عریضہ کے جواب میں یوں تحریر فرماتے ہیں:" تمہارے دو خط موصول ہوئے: دونوں سے محبتِ فقراء اور اس گروہ سے التجا کا جذبہ مفہوم ہوا ...... کیا عجب نعمت ہے یہ، کہ کسی کو اس دولت سے نوازدیں۔"[۴]

ڈاکٹر جی کے محولہ بالا اقتباس کے ایک فقرہ سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کو جہانگیر نے اس لیے حوالۂ زنداں کیا کہ آپؒ قومی ہم آہنگی کے "کاز" (مقصد) کو درہم برہم کر رہے تھے یعنی آپؒ کے مقید کیے جانے کا سبب ہند و مسلم منافرت کے شعلوں کو ہوا دینا تھا مگر جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اول تو یہ مسئلہ انگریز کی آمد کے بعد منصوبہ بند اسکیم کے تحت منصۂ شہود پر آیا۔ دوسرے آپ کے محبوس کیے جانے کا سبب راہِ عزیمت پر گامزن ہونا تھا۔ جیسا کہ نواب صدیق حسن خاں نے تحریر فرمایا ہے کہ " سلطان جہانگیر نے سجدۂ تعظیمی نہ کرنے کے سبب آپ کو قلعۂ گوالیار میں محبوس کیا۔"[۵]

سہ

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

اس سلسلہ میں ہم ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب کا قول نذر ناظرین کرنا چاہیں گے جنھیں تاریخ جہانگیر پر درجہ استناد حاصل ہے موصوف اپنی مشہور تصنیف 'ہسٹری آف جہانگیر' کے صفحہ ۳۸۳ پر ایک وضاحتی نوٹ میں یوں رقمطراز ہیں:-

"A Respected Muslim Pir (or religious guide) whose family Migrated from Afghanistan to Sindh, refused to prostrate himself before the Emperor Jahangir. He was thrown into prison, but the Emperor soon repented of his harshness, released the Pir and begged his pardon."

یعنی "ایک مسلم پیر (دینی پیشوا) جن کا خاندان افغانستان سے نقل وطن کر کے سندھ میں اقامت گزیں ہوا، نے شہنشاہ جہانگیر کے سامنے زمیں بوس ہونے سے انکار کیا (اس پاداش میں) انھیں نذرِ زنداں کر دیا گیا مگر جلد ہی بادشاہ اپنی سخت گیری پر نادم و پشیمان ہوا اور حضرت شیخؒ کو رہا کر کے معذرت خواہاں ہوا۔" عالم اسلام کے مستند ترین عالمِ دین حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی ادام اللہ فیوضہم اس غیر مناسب سزائے قید کے ضمن میں ایک اور وجہ بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "اس (قید) کی اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت مجددؒ کے ارکانِ سلطنت اور امرائے دربار سے خصوصی تعلقات ہو گئے تھے اور اُن کو حضرت سے گہری عقیدت تھی، جو ایک ایسے ذکی الحس حکمراں کے لیے جو اپنے والد کے خلاف علم بغاوت بلند کر چکا تھا اور بیٹوں سے زور آزمائی کر کے تختِ سلطنت پر بیٹھا تھا، وسوسہ اندازی کے لیے کافی تھا۔"[۱۱] مولانا محترم کے اس بیان کی تائید ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب کے ایک دوسرے ریمارک سے بھی ہوتی ہے جو حسب ذیل ہے:-

"He confined Shaikh Ahmad of Sirhind & Sh. Ibrahim Baba

For a few years in the state prisons of Chunar and Gowalier, but the predominant vision of the injustice was the influence which they wielded on their devoted Afghan and other muslem disciples. History of Jahangir, by Dr. Beni Prasad, Revised Ed. 1940

یعنی" اس (جہانگیر) نے شیخ احمد سرہندی اور شیخ ابراہیم بابا کو چند سال تک چُنار اور گوالیار کے شاہی قید خانوں میں محبوس رکھا۔ لیکن اس ناانصافی کی اصل وجہ یہ تھی کہ اُن کا اثر و رسوخ افغانوں اور دیگر مسلم مریدین (کے اذہان و قلوب) میں سرایت کر رہا تھا" ان بدیہی حقائق کی روشنی میں آسانی سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت مجدد صاحبؒ کو مسجون و محبوس کرنے کا سبب ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کو مخدوش کرنا نہ تھا۔

آخر میں دنکر جی کے ان خیالات کے بارے میں اپنے اس نقطۂ نظر کو دوہراتے ہوئے کہ وہ شکست خوردہ ذہنیت اور منفی طرز فکر کا نتیجہ ہیں، ہم یہ وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمیں موصوف کی روح سے کسی قسم کا گلہ شکوہ نہیں کیونکہ جن کا نباہ گاندھی جی سے بھی نہ ہوسکا وہ مسلمانوں کے بارہ میں اپنے ذہن کے دریچے کیسے وا رکھ سکتے ہیں۔ بقول ظفر الملت مولانا ظفر علی خاں مرحوم ؎

جو ابوالکلام آزاد کا کس طرح دے سکتے ہیں ساتھ
جو نہیں سکتا ہے گاندھی جی سے بھی جن کا نباہ

حواشی:- لہ "سنسکرتی کے چار ادھیائے" از رام دھاری سنگھ دنکر ص ۹۰-۲۸۸ طبع پنجم ۱۹۷۰ء پربھات آفسیٹ پریس دریا گنج دلی ملا

لٰہ 'داستان تاریخ اردو' مصنفہ پروفیسر حامد حسن صاحب قادری صفا مطبوعہ ۱۹۵۷ء دوسرا ایڈیشن۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سنہ وفات میں اختلاف ہے بہرحال تاریخی مادہ "آفتاب ملک ہند" سے بھی ۶۳۳ھ ہی برآمد ہوتے ہیں۔

۵۳ ملاحظہ ہو ماہنامہ جامعہ نئی دہلی بابت جولائی ۱۹۸۲ء مقالہ بعنوان "فراق گورکھپوری سے ایک ملاقات" از سید فیاض علی صاحب ص-۱۳-

۵۴ راجہ رام موہن رائے اور برہمو سماج کے تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو The social Renaissance in India, Hinduism through the Ages, By D. S. Sharma, pp. 56-63. 1957. pp. 9-45

۵۵ "ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر" از ڈاکٹر محمد عمر صاحب ص ۳۰ مطبوعہ سنہ ۱۹۷۵ء

भारतीय राष्ट्रीय आंदोलन [illegible] ۵۶ بحوالہ

Coupland. N. 24. P. 31. ,, डा. डी. सी. गुप्ता पृ. 50 (1977)

۵۷ ملاحظہ ہو ماہنامہ الفرقان لکھنؤ ص ۱۲ بابت ماہ جون ۱۹۷۶ء مضمون "تجلیات مجدد الف ثانی" از حضرت مولانا نسیم احمد صاحب امروہوی۔

۵۸ دیکھیے پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب ایم۔اے حیدرآباد سندھ کا مقالہ بعنوان "شیخ مجدد کے اصلاحی کارنامے" قسط ۲ (واقعہ اسیری) ماہنامہ الفرقان لکھنؤ ص ۱۹ بابت ماہ شعبان ۱۳۸۱ھ مطابق فروری ۱۹۶۲ء۔

۵۹ 'History of Jahangir' by Dr. Beni Prasad P. 393. 3RD ed. 1940 Appendix B. (with a reference to) {... the report of the Trial of Mujadid held in the Sessions Court, Karachi, on Oct. 1921

۶۰ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ چہارم از حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۱۶۱ مطبوعہ ۱۹۸۰ء

ممالک غیر سے

بحری ڈاک سے ۳ پونڈ

ہوائی ڈاک سے ۵ پونڈ

ایک شمارہ کی قیمت ہندستان میں ۲/۵۰

چندہ سالانہ

ہندوستان میں ۲۵/۰

پاکستان سے پاکستانی سکہ میں ۴۰/۰

بنگلادیش سے ہندستانی سکہ میں ۳۰/-

جلد (۵۲)	بابت ماہ فروری ۱۹۸۴ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ	شمارہ (۲)

نمبر شمار	مضامین	مضمون نگار	صفحہ
۱	نگاہِ اولیں	خلیل الرحمٰن سجاد ندوی	۲
۲	درس قرآن	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی	۶
۳	سیرت النبی کا پیغام مسلمانوں اور غیر مسلموں کے نام	خلیل الرحمٰن سجاد ندوی	۱۲
۴	اسوۂ نبوی کی روشنی میں ہمارے لیے صحیح طریقۂ کار	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی	۲۷
۵	یادِ رفتگاں	" "	۳۳
۶	انتخاب۔	از افادات حضرت شاہ وصی اللہ قدس سرہٗ	۳۸

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آ جانا چاہیے۔ ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی روانہ کیا جائے گا۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت:۔ کوشش کی جاتی ہے کہ الفرقان انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ ہو جائے اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں۔ اگر دوبارہ دیکھنے کے لیے دفتر میں پرچہ ہوگا تو ضرور بھیجا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار حضرات	مبلغ ۴۰ روپے ہندستانی سکہ میں کسی بھی ذریعہ سے دفتر الفرقان کو روانہ فرمائیں
	یا پاکستانی سکہ میں ۴۰ روپے ناظم ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیج دیں۔

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

اس ماہ فروری کے اواخر اور مارچ کے اوائل میں کچھ اہم اجتماعات ہو رہے ہیں، اس وقت ان کا تذکرہ کرکے ناظرین کرام سے ان کے لیے حسب توفیق دعاؤں اور جد وجہد کی گذارش کرنی ہے۔

۲۵/۲۶/۲۷ فروری کو لکھنؤ سے ۷۰۔۸۰ کیلومیٹر پر واقع بستی سیتا پور میں تبلیغی اجتماع ہو رہا ہے۔ الحمد للہ کہ اس کے لیے ہر جگہ خصوصاً یوپی اور شمالی ہند کے اضلاع میں محنت ہو رہی ہے۔ ملک اور بیرون ملک کی جماعتیں محلے محلے انفرادی اور اجتماعی ملاقاتوں کے ذریعہ اپنے مسلمان بھائیوں سے رابطہ قائم کر رہی ہیں۔

اسی طرح کا ایک اجتماع پورنیہ (صوبہ بہار) میں ارریا کوٹ کے مقام پر یکم مارچ سے ۵ مارچ تک ہو رہا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خصوصاً ۳ مارچ سے ۵ مارچ تک تبلیغی کام کے ذمہ داروں کو جوڑا گیا ہے اور انشاء اللہ ان سے ہمارے اکابر جو باتیں کریں گے اس میں خصوصی توجہ دعوت کے اصولوں اور مزاج کی وضاحت کی طرف ہوگی، تبلیغی کام کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں میں جو کمزوریاں اور امراض پیدا ہو رہے ہیں، اس قسم کے تربیتی اجتماعات میں شرکت سے ان کی اصلاح آسان ہو جاتی ہے۔

ان اجتماعات کے عنوان پر جو خصوصی محنت ہو جاتی ہے، اور اس کے ذریعہ جتنی بڑی تعداد میں لوگ دعوت و اصلاح اور تعلیم و تربیت کے اس عمومی نظام سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنی جان، اپنا مال اور اپنا وقت قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، اور پھر ذکر و تعلیم اور

دعوت و دعا کے اعمال کے ذریعہ جو روحانی فضا اس قسم کے اجتماعات میں قائم ہو جاتی ہے۔ جو بلاشبہ اجتماعی برکات کے نزول کا سبب اور عام مسلمانوں کے لیے حوصلہ شکن حالات میں دولت ایمان پر ثبات و استقامت کے لیے حوصلہ افزا ہوتی ہے۔ در اصل وہی ان اجتماعات کا حاصل ہے۔

اسلام نے اپنے نظام تربیت میں جو جامعیت و ہمہ گیری اور توازن و اعتدال کا معجزانہ نمونہ اور اس کے خدائی دین ہونے کی دلیل ہے۔ حج کے اجتماع کو ایک ایسا رکن قرار دیا ہے استطاعت کے باوجود جس کی ادائیگی میں تغافل کو قرآن مجید نے اپنے ایک اشارہ میں ایمان کے فقدان کی علامت قرار دیا ہے (..... ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ایسے شخص کے بارے میں نصرانیت یا یہودیت (کی افراط و تفریط اور بے اعتدالیوں) میں مبتلا ہو جانے اور اسی حال میں دنیا سے جانے کے خطرہ کا اظہار فرمایا ہے۔

یاد رہے کہ یہود و نصاریٰ دونوں کے یہاں انفرادی عبادت نماز تو کسی نہ کسی درجہ اور شکل میں موجود تھی، البتہ اجتماعی عمل "حج" بالکلیہ متروک تھا، (ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ از شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ)

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لسان حق ترجمان کے ذریعہ بار بار مختلف انداز سے اس کی تاکید فرمائی ہے کہ حج کے اجتماع میں زیادہ سے زیادہ توجہ اور وقت ذکر و دعا، تعلیم و تعلم اور حج کی روح سے تعلق رکھنے والے عبادتی اعمال میں صرف کیا جائے؛ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حج اس بات کا سب سے زیادہ حقیقی اور عملی منظر تھا) اور بڑی صراحت سے ان کاموں میں لگنے سے منع فرمایا ہے جو روح حج کے منافی ہیں۔ (فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج)۔

بلا کسی تشبیہ کے راقم سطور عرض کرتا ہے کہ اگر بیت اللہ میں اور منیٰ و عرفات میں حاضر ہونے والے بندگان خدا کے لیے بھی وہاں کی پر انوار فضاؤں سے مستفید ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے اوقات کو صحیح استعمال کریں اور پوری یکسوئی کے ساتھ ان کاموں میں لگے رہیں جن کے لیے وہ دور دراز سے سفر کر کے آئے ہیں، تو ظاہر ہے کہ ان اجتماعات

میں جو دنیا کے مختلف حصوں میں منعقد ہوتے ہیں آنے والوں کے لیے اس امر کا اہتمام کتنا ضروری ہوگا؟

ان سطور کا ناچیز راقم اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے ہوئے الفرقان کے ان صفحات کے ذریعہ اپنے تمام قارئین سے اپنے اپنے علاقوں کے ذمہ داروں کے مشورہ کے ماتحت جماعتیں بنا بنا کر سیتا پور اور پورنیہ کے ان اجتماعات میں بشرط استطاعت شرکت کی گذارش کرتا ہے۔ نیز اس طرف بھی توجہ دلاتا ہے کہ اجتماع میں شرکت کرنے والے حضرات اس جدوجہد میں عملی شرکت کی نیت سے شریک ہوں اور دوران اجتماع اپنے اوقات کی پوری حفاظت کریں اور ترتیب کے مطابق وہاں ہونے والے انفرادی و اجتماعی اعمال میں یکسوئی کے ساتھ اور ایمان و احتساب کی روح کے ساتھ شریک رہیں۔

ساتھ ہی سب حضرات سے ان اجتماعات کی قبولیت اور افادیت کے لیے دعاؤں کے اہتمام کی بھی گذارش ہے۔

۲۸، ۲۹ فروری اور یکم مارچ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے بارے میں مشوروں اور تبادلۂ خیالات کی غرض سے ایک اجتماع طلب کیا گیا ہے ـــــ جس کے لیے مدارس کے ذمہ داروں اور دیگر حضرات اہل علم کی خدمت میں دعوت نامے ارسال کر دیے گئے ہیں۔

عرصہ دراز سے اس ضرورت کا احساس تمام ہی مدارس اور اہل علم میں شدت سے کیا جا رہا ہے کہ ہمارے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم میں ایسی اصلاحات کی ضرورت ہے جن سے اس کی افادیت قائم اور برقرار رہے، اور طالبان علوم نبوت کے علم و فہم اور استعداد میں ہمارے اکابر اہل علم کی طرح گہرائی، وسعت اور رسوخ پیدا ہو، اور ان میں وہ کردار ادا کر سکیں جس کی ان سے توقع کی جاتی ہے اور جس کا فقدان شرمناک اور افسوسناک نتائج کا سبب بن رہا ہے۔

بارھویں صدی ہجری کے امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس تحتی برِاعظم کے علمی حلقہ کو ایک نیا موڑ دیا تھا اور ایک مخصوص علمی ذوق و مزاج کی بنا ڈالی تھی۔ امتدادِ زمانہ، اور فکرِ اسلامی کی جدید تدوین نے ولی اللہی ذوق و مزاج اور اس کے اعتدال و توازن اور جامعیت و ہمہ گیری کی قدر پورے عالم اسلام میں اہل بصیرت کی نگاہوں میں دو چند کر دی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پورے اخلاص اور دلسوزی کے ساتھ اپنے نظام تعلیم کا جائزہ لیا جائے، خاص طور سے ان گوشوں کو متعین کیا جائے جہاں ولی اللہی رہنمائی کی روشنی میں نصاب تعلیم اور طرزِ تدریس میں اصلاح و تغییر کی ضرورت محسوس ہو اور پھر صرف تجویزیں پاس کر دینے ہی پر اکتفاء نہ کیا جائے بلکہ بنام خدا اس کام کا آغاز عملی طور پر کر دیا جائے۔ اور الاہم فالاہم کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف علوم و فنون پر درسی کتابیں اور افراد تیار کرنے کا کام (اختصاص کے نظام کے ماتحت) شروع کر دیا جائے۔

بہرحال مقصد کی اہمیت کے بارے میں حضرات اہل علم کی خدمت میں کچھ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ دعا ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہونے والا یہ اجتماع عملاً مفید ہو۔ مدارس کے محترم ذمہ داران اور حضرات اہل علم امید ہے کہ وقت نکال کر اس اجتماع میں شرکت فرمائیں گے۔ متعدد حضرات سے مختلف موضوعات پر مقالہ لکھنے کی بھی گزارش کی گئی ہے، امید ہے کہ ان مقالات اور ان کی روشنی میں تبادلۂ خیالات کے نتیجہ میں اس کام کے خطوط کچھ زیادہ واضح ہوں گے۔ اور اس سلسلے کی ذمہ داریاں تقسیم کر کے سب کے تعاون سے اس علمی فریضہ کی ادائیگی ممکن ہو سکے گی۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک أمراً۔

ایک ضروری اعلان:- دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہونے والے اس علمی اجتماع کی تیاریوں اور سیتاپور اور پورنیہ میں ہونے والے مذکورہ بالا تبلیغی اجتماعات کی وجہ سے یہ ناچیز راقم سطور اس ماہ فروری میں مارچ کے شمارہ کی تیاری کا کام نہیں کر پائے گا۔ اس لیے انشاء اللہ مارچ کا شمارہ بھی اپریل کے شمارہ کے ساتھ مشترکہ طور پر اپریل ہی میں شائع ہوگا، لہٰذا مارچ میں الفرقان کا انتظار نہ کیا جائے۔ انشاء اللہ آئندہ شمارہ اپریل میں شائع ہوگا جو مارچ اور اپریل کا مشترکہ شمارہ ہوگا۔

درسِ قرآن

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

سُوْرَۃُ الْاِخْلَاص

اعوذ باللہ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم ۔۔۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ یَلِدْ ۝ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝

(اے پیغمبر) کہدو وہ اللہ ایک ہے۔ (یگانہ و یکتا ہے) اللہ بے نیاز ہے۔ (اسکو کسی کی احتیاج نہیں، اور سب اس کے محتاج ہیں) نہ اس سے کوئی پیدا ہوا۔ اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ اور نہ کوئی ہستی اس کے ہمسر اور اس کے برابر ہے

تفسیر و تشریح، اللہ تعالیٰ کی توحید خالص اور اس کی صفات کا مسئلہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تعلیم کا سب سے اہم اور مرکزی نقطہ رہا ہے۔ خاتم النبیین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی لائی ہوئی کتاب اللہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم کا مرکزی نقطہ بھی یہی توحید خالص اور صفات الٰہی کا مسئلہ ہے۔ پورے قرآن مجید میں مختلف پیرایوں میں اس کا بیان ہوتا رہا ہے۔ قرآن مجید جو سورۂ فاتحہ سے شروع ہوا تھا اب ختم ہو رہا ہے سورۂ فاتحہ گویا اس کا افتتاحیہ تھا، اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور توحید خالص کا بیان تھا جو ہدایت و استقامت اور ہر طرح کی گمراہیوں سے حفاظت کی دعا پر ختم ہوا تھا ـــــ یہ سورۂ اخلاص گویا قرآن مجید کا اختتامیہ ہے جس میں بہت مختصر لیکن نہایت جامع الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور صفات کا بیان فرمایا گیا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ قرآن مجید کی بنیادی دعوت و تعلیم کا جوہر اور خلاصہ ہے اور اس صفت میں یہ سورت منفرد ہے

اس سورت کا مضمون اور پیغام سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن میں رکھ لیجیے کہ جب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مشرک اور خدا ناآشنا قوم کو اُن کے باطل معبودوں، دیوتاؤں، دیویوں کی فرضی ہستیوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت و پرستش کی اور اسی کو خالق و پروردگار اور کارساز ماننے کی دعوت دی تو وہ ان لوگوں کے لیے ایک بہت ہی عجیب بات تھی قرآن مجید ہی میں اُن کا یہ قول نقل فرمایا گیا ہے "اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ" ــــــ باپ دادا سے وراثت میں پائے ہوئے شرک نے ان کی عقلوں کو ایسا مسخ کر دیا تھا کہ یہ بات کہ اس ساری کائنات کا خالق و مالک پروردگار و کارساز بس ایک اللہ ہی ہے اور سب کچھ اُس کے اور صرف اسی کے قبضہ و اختیار میں ہے اور صرف وہی عبادت اور پرستش کے لائق ہے، ان کے لیے ناقابل فہم ہو گئی تھی۔ حالانکہ یہ دنیا کی سب سے بڑی سچائی اور روشن حقیقت ہے ــــــ مشرکین کے علاوہ یہود و نصاریٰ بھی جو اہل کتاب تھے اپنے پیغمبروں اور ان کی لائی ہوئی آسمانی کتابوں کی اصل تعلیم و ہدایت کو بھلا کر طرح طرح کے مشرکانہ اوہام وخرافات میں اور خداوندی صفات کے بارے میں سخت گمراہیوں میں مبتلا تھے۔ عیسائی ایک کے بجائے تین خداؤں کے قائل تھے، عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور ان کی والدہ مریم صدیقہ کو خدائی میں شریک مانتے تھے۔ آج بھی تثلیث عیسائیت کا بنیادی عقیدہ ہے ــــــ یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اس کے علاوہ بھی طرح طرح کی گمراہیوں میں مبتلا تھے۔

قرآن مجید میں سیکڑوں جگہ آفاقی اور انفسی دلائل و براہین اور انبیاء سابقین کی دعوت و تعلیم کے حوالوں کے ساتھ توحید اور خداوندی صفات کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس سلسلہ میں مشرکین و اہل کتاب کے اوہام و خرافات کا غلط باطل اور خلاف عقل و فطرت ہونا واضح کیا گیا ہے ــــــ اب اس سورۂ اخلاص میں جس کو میں نے قرآن مجید کا "اختتامیہ" کہا ہے، چھوٹی چھوٹی چار آیتوں اور چار جملوں میں توحید اور صفات خداوندی کے بارے میں قرآن پاک کی دعوت و تعلیم کا خلاصہ اس طرح پیش کر دیا گیا اور بات ایسی دوٹوک کہی گئی ہے جس کے بعد کسی گمراہی اور غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہتی ــــــ

اس تمہید کے بعد الفاظ کی روشنی میں اس سورت کے مضمون و مدعا اور پیغام کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

"قُل" یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ اے ہمارے پیغمبر آپ لوگوں کو بتلا دیجیے اور اعلان کر دیجیے کہ "ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ" روایات میں ہے کہ بعض لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ آپ ہمارے تمام دیوتاؤں معبودوں کا انکار کر کے جس معبود کی عبادت اور بندگی کی دعوت دیتے ہیں اس کا تعارف کرائیے اور اس کی صفات بیان کیجیے! تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سورۂ اخلاص نازل ہوئی، اس میں آپ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ آپ بتلا دیں، اعلان اور منادی کر دیں کہ میں جس معبود برحق کی عبادت اور بندگی کی دعوت دیتا ہوں وہ اللہ ہے۔
مشرکین عرب جو قرآن پاک کے اول مخاطب تھے زمین و آسمان اور اس پورے عالم کے خالق و پروردگار کے لیے اسم ذات کے طور پر اللہ ہی کا لفظ استعمال کرتے تھے۔
تو مطلب یہ ہوا کہ اے پیغمبر تم بتلا دو اور اعلان کر دو کہ میں جس معبود برحق کی عبادت اور بندگی کی دعوت دیتا ہوں وہ وہی اللہ ہے جو تمہارے نزدیک بھی اس سارے عالم اور سنسار کا خالق اور پروردگار ہے۔ آگے اس کی صفت بیان فرمائی گئی "اَحَدٌ" یعنی وہ ایک اور یگانہ و یکتا ہے ——— اَحد اور واحد کے معنی ایک کے ہیں لیکن اَحد کے مفہوم میں یکتائی بھی شامل ہے تو اَحد کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ایک اور صرف ایک ہی ہے اور یکتا و یگانہ ہے اس کی ذات و صفات میں کوئی اس کا شریک اور کوئی اس کے مثل نہیں، اس کے مفہوم میں یہ بات بھی آگئی کہ وہ قدیم لم یزل و لایزال ہے ——— اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تین حرفی جملہ (ھو اللہ احد) میں اللہ تعالیٰ کا جامع مانع تعارف کرا دیا گیا اور اجمال کے ساتھ اس کی تمام صفات کا بیان ہو گیا۔ اَحدیت تمام صفات کمال کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔
اس کے آگے تین آیتوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ اس کے بعض مضمرات کی صراحت اور وضاحت ہے اور آیت کے پہلے حرف "قُل" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت

ورسالت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس تین حرفی جملہ میں اللہ تعالیٰ کی جو شان بیان فرمائی گئی ہے اس کی تفصیل کئی جلدوں میں لکھی جا سکتی ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے "اللہ الصمد" اہل لغت نے صمد کے کئی معنی بیان کئے ہیں، یہاں اس کا مفہوم ہے ایسی ذات جو سب سے بے نیاز ہو کسی کی اس کو حاجت نہ ہو اور سب اس کے محتاج ہوں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص صفت ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک وثمیل نہیں اس میں ہر طرح کے شرک کا بھی رد ہو گیا۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "لم یلد ولم یولد" مطلب یہ ہے کہ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ وہ کسی کا ہم جنس نہ اس کا کوئی ہم جنس یہ بھی اَحدیت ہی کے ایک پہلو کا بیان ہے ــــ مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے، اور نصاریٰ حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہتے اور ان کے اور خدا تعالیٰ کے درمیان باپ بیٹے کا رشتہ قائم کرتے تھے، یہود حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا بتلاتے تھے، یہ شدید گمراہی اور اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی تھی اس آیت میں ان سب گمراہیوں کا قلع قمع کیا گیا۔

آگے فرمایا گیا ہے "ولم یکن لہ کفواً احد" کفو کے معنی مماثل اور ہمسر کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے اعلیٰ و بالا ہے کوئی اس کے ہمسر اور اس کے برابر نہیں وہ خالق ہے، اس کے علاوہ سب مخلوق، وہ رب ہے اور سب اس کے بندے، وہ ابدی ازلی ہے اور اس کے علاوہ سب حادث و فانی۔ اور یہ بھی اس کی شانِ احدیت ہی کا تقاضا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس چھوٹی سی سورت کے چھوٹے چھوٹے چار جملوں میں اللہ تعالیٰ کی جو مثبت اور منفی صفات بیان کی گئی ہیں ان کے ذریعہ توحید و صفات کا واضح بیان اور اللہ تعالیٰ کا پورا تعارف ہو گیا ہے۔ اس سورت نے بتلایا کہ معبود برحق اللہ اور صرف اللہ ہے، وہ یگانہ و یکتا ہے، کوئی اس کا شریک وثمیل نہیں وہ ازلی ابدی ہے، وہ بالکل بے نیاز ہے اس کو کسی کی احتیاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا، وہ سب سے اعلیٰ و بالا ہے کوئی اس کا ہمسر اور اس کے برابر نہیں، وہ خالق ہے اور سب مخلوق، وہ رب ہے اور سب اس کے بندے

غلام اور محکوم۔ توحید و صفات کے بیان میں اس سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ سب اسی کی تفصیل اور مزید وضاحت ہو گی۔ اس معنوی عظمت اور جامعیت کے باوجود یہ بہت مختصر ہے، ہر شخص اس کو آسانی سے چند منٹ میں یاد کر سکتا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کو قرآن پاک کا اختتامیہ بنایا گیا ہے۔ آگے کی دو سورتیں بھی گویا اس کا تتمہ ہیں۔

اس سورت کے خصائص و فضائل اس درس کے سلسلہ میں بار بار یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی ہر آیت اور ہر سورت اس لحاظ سے کہ وہ کلام اللہ ہے یکساں قابل عظمت ہے۔ اس کے باوجود مضامین کی خصوصیت کی وجہ سے بعض آیتوں اور بعض سورتوں کو خاص فضیلت اور عظمت حاصل ہے۔ آیتوں میں مثلاً آیۃ الکرسی جس میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفات کمال کا بیان فرمایا گیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خاص فضیلت بیان فرمائی۔ اس طرح آپ نے مختلف سورتوں کے فضائل بیان فرمائے جن کا ذکر ان سورتوں کے درس میں کیا جاتا رہا ہے۔ اس سورۂ اخلاص کے فضائل میں بہت سی حدیثیں حدیث کی کتابوں میں روایت کی گئی ہیں اور آپ نے اس سورت کے پڑھنے کی خاص طور سے ترغیب دی ہے اور اپنی نمازوں میں بھی آپ یہ سورت بکثرت اور خاص اہتمام سے پڑھتے تھے۔ اس سلسلہ کی چند حدیثیں بھی سن لیجیے!

ایک حدیث میں ہے کہ ایک صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے اس سورت قل ھو اللہ احد سے بہت ہی محبت ہے مجھے یہ بڑی پیاری لگتی ہے، آپ نے فرمایا "اِنَّ حُبَّكَ اِيَّاهَا اَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ" (یقین کرو اس سورت سے تمہاری اس محبت نے تم کو جنتی بنا دیا، جنت میں پہنچا دیا۔)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ یہ سورت "قل ھو اللہ احد الخ" پڑھ رہا ہے، تو آپ نے فرمایا "وَجَبَتْ" حدیث کے راوی صحابی کہتے ہیں کہ میں نے حضور سے عرض کیا کہ کیا چیز واجب ہو گئی؟ آپ نے

فرمایا کہ اس شخص کے لیے جنت واجب ہوگئی۔

ایک[3] اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستہ (چند نفر کی ایک جماعت) کسی مہم پر روانہ فرمائی اور ایک صاحب کو ان کا امیر مقرر کر دیا، وہ صاحب جب نماز پڑھاتے تو قل ھو اللہ ہی پڑھتے۔ جب یہ لوگ اس مہم سے واپس آئے تو ان کے ساتھیوں نے حضور سے اس کا ذکر کیا کہ یہ ہمارے امیر صاحب ہر نماز میں "قل ھو اللہ ہی پڑھتے تھے۔ آپ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے اور ہر نماز میں قل ہو اللہ ہی کیوں پڑھتے تھے؟ چنانچہ ان لوگوں نے پوچھا تو ان امیر صاحب نے کہا "لانھا صفۃ الرحمٰن وأنا احب ان اقرأھا" (یعنی چونکہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان ہے اور مجھے اس سے خاص محبت ہے اس لیے میں نماز میں اسی کو زیادہ پڑھتا ہوں)، آپ نے ارشاد فرمایا کہ "اخبروہ ان اللہ یحبہ" (ان کو میری طرف سے بتلا دو کہ تمہارے اس عمل اور حال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرماتا ہے اور تم کو اللہ تعالیٰ کی محبوبیت نصیب ہے۔)

ایک[4] حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "قل ھو اللہ احد تعدل ثلث القرآن (یعنی یہ سورہ تہائی قرآن کے برابر ہے) شارحین حدیث اور علماء نے اس کی توجیہ میں بہت کچھ لکھا اور کہا ہے کہ اس سورت کو تہائی قرآن کے برابر کس وجہ سے قرار دیا گیا ہے۔ میرے نزدیک زیادہ دل لگتی توجیہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے بنیادی مضامین تین ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی توحید وصفات کا بیان۔ دوسرے معاد یعنی آخرت کا بیان۔ تیسرے نبوت و رسالت اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ آنے والی شریعت کا بیان۔ اور "قل ھو اللہ" پہلے مضمون پر پوری طرح حاوی ہے اس لیے اس کو تہائی قرآن فرمایا گیا ہے واللہ اعلم۔

---

[1] یہ حدیث جامع ترمذی میں حضرت انسؓ سے روایت کی گئی ہے۔ [2] یہ حدیث امام مالک اور امام ترمذی اور امام نسائی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ [3] یہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کی ہے [4] یہ حدیث امام مسلم نے حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت کی ہے

خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

سیرت النبیؐ کا پیغام
مسلمانوں اور غیر مسلموں کے نام

(دوسری قسط)

محترم حضرات!

ابھی میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انسان کو خدائی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ میں نے لفظ بولا ہے "انسان"۔ میں نے ہندوستانی نہیں کہا، امریکی نہیں کہا، عربی نہیں کہا، عجمی نہیں کہا، امیر نہیں کہا، غریب نہیں کہا۔ یہیں سے یہ بات آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس رہنمائی میں جو انسان کی اصلاح و تربیت کے لیے آئی ہو، پہلی صفت یہ ہونی چاہیے کہ اس کا خطاب دنیا کے ہر انسان سے ہو۔ پوری انسانی دنیا کے ہر ہر فرد کے لیے اُس رہنمائی کا مخاطب بننا، اس کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ممکن ہو —— انسان چاہے مشرق کا ہو یا مغرب کا، شمال کا ہو یا جنوب کا، مالدار ہو یا غریب، حاکم ہو یا محکوم، پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ، گورا ہو یا کالا، ہر انسان اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے صرف ایک انسان ہوتا ہے۔ اس کی فطرت ایک ہے، اس کی ذہنی خصوصیات ایک ہیں۔ بھوک سب کو لگتی ہے، پیاس سب کو لگتی ہے، سردی بھی سب کو لگتی ہے، گرمی بھی سب کو محسوس ہوتی ہے اچھے معاملہ سے محبت اور نرمی سے ہر انسان خوش ہوتا ہے۔ بُرا سلوک، نفرت اور سختی ہر انسان کو بری لگتی ہے۔ عزت ہر انسان کو پسند ہے، ذلت ہر انسان کو ناپسند ہے۔ مال اور اولاد سے ہر انسان کو محبت ہے۔ عزیزوں اور دوستوں کے ملنے سے ہر انسان کو

خوشی ہوتی ہے اور ان کی جدائی سے ہر انسان کو غم ہوتا ہے۔ اپنی عزت یا جان و مال کو خطرہ محسوس کرکے خوف اور غصہ کے جذبات ہر انسان میں پیدا ہوتے ہیں۔۔۔۔۔

بہر حال یہ بات بالکل بدیہی اور دو اور دو چار کی طرح واضح ہے کہ انسان دنیا بھر میں ایک ہے، اس کی نفسیات ایک ہے، اس کی فطرت ایک ہے ــــ اسی لیے یہ بھی بالکل ضروری ہے کہ جو رہنمائی انسانوں کو کامیاب اور خوش بخت کرنا چاہتی ہو، اس کا خطاب کسی خاص نسل سے، کسی خاص زبان بولنے والوں سے، کسی خاص علاقے یا کسی خاص ذات سے، کسی مخصوص ملک کے باشندوں سے، کسی ایک طبقہ کے افراد سے نہیں، بلکہ ایک ایک انسان سے، انسان ہونے کے ناطے ہو۔ اگر کوئی رہنمائی ایسی ہے جو صرف مالداروں کو مخاطب کرتی ہے یا صرف غریبوں کو مخاطب کرتی ہے، اگر کسی رہنمائی کا خطاب کسی مخصوص ذات یا طبقہ سے ہے، اگر کسی رہنمائی میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جن پر صرف مالدار لوگ عمل کر سکتے ہوں، غریب نہ کر سکتے ہوں یا مرد ہی عمل کر سکتے ہوں، صنف نازک کے لیے اس پر عمل ممکن نہ ہو، اگر کوئی رہنمائی ایسی ہو کہ صرف دیہات کے لوگ، صرف غیر ترقی یافتہ زمانے اور پچھڑے ہوئے علاقوں کے لوگ اس پر عمل کر سکتے ہوں، متمدن بستیوں کے لوگ، اور ترقی یافتہ انسان اس پر عمل نہ کر سکتے ہوں، جس پر اونٹوں اور گھوڑوں ہی کے دور میں عمل ہو سکتا ہو، سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں اس پر عمل نہ ہو سکتا ہو یا اس کے برعکس اس سے معاشرہ کے صرف وہ افراد ہی فائدہ اٹھا سکیں جو تعلیم اور تمدن کے اعتبار سے ایک مخصوص اور بلند معیار پر ہوں۔ ایک عام ناخواندہ انسان اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے، تو ایسی رہنمائی اس لائق نہیں ہے کہ پوری انسانی دنیا کی قسمت اس سے وابستہ کر دی جائے، اور ہر ہر انسان کو اس پر عمل کی دعوت دی جائے۔

اس پوری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام انسانوں کی تربیت کے لیے خدا کی مطلوبہ رہنمائی میں پہلی صفت یہ ہونی چاہیے کہ اس کا خطاب بلا کسی تفریق کے تمام انسانوں سے ہو۔

اب آگے بڑھیے۔ اس خدائی رہنمائی میں جو دوسری صفت ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کی فطرتِ عامہ کے مطابق ہو۔

اس کی وضاحت کے لیے عرض کرتا ہوں کہ ساری دنیا کے انسانوں کے مزاج، افتادِ طبع اور رجحانات و میلانات میں کچھ تو وہ ہیں، جو ماحول، خاندان اور دیگر تمدنی و اجتماعی اور تاریخی و جغرافیائی عوامل کے اثر سے نشو و نما پاتے ہیں اور اسلیے ان میں دنیا کی مختلف قوموں اور خاندانوں میں یکسانیت نہیں ہوتی ——— لیکن انسان کی فطرت کے بہت سے ایسے تقاضے ہیں جو ہر انسان میں یکساں طور پر ہوتے ہیں۔ اور ان کی تکمیل کا تقاضا انسانوں میں طبعی طور پر ہوتا ہے اور اس لیے یہ ضروری ہے کہ جو رہنمائی عملی طور پر پورے انسانی معاشرہ کی تہذیب و تربیت کا بیڑا اٹھائے وہ انسان سے ان طبعی تقاضوں کو جن کو میں نے فطرتِ عامہ کے نام سے ابھی ذکر کیا ہے کچلنے کا مطالبہ نہ کرے، ان کو بالکلیہ نظر انداز کرنے کا مطالبہ نہ کرے، بلکہ اس کی اصلاحی کوشش کا دار و مدار اس پر ہو کہ انسانوں کو ایسا پروگرام دیا جائے جس سے وہ اپنے ان فطری تقاضوں کی تکمیل اچھے سے اچھے اور فطری طریقے پر ہی کرلیں۔ مثال کے طور پر انسان کو خدا نے اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ کھانے پینے (رزق) کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور رزق کے اسباب کو خدا نے انسانوں کے باہر کی دنیا میں اس کے چاروں طرف پھیلا دیا ہے۔ اور انسان کی فطرت میں یہ صلاحیت اور تقاضا رکھا ہے کہ وہ ان اسباب کو استعمال کر کے رزق کے حصول کی جد و جہد کرے اور اس فطری ضرورت کو پورا کرے ——— اسی طرح انسان کے جسم کو خدا نے ایسا بنایا ہے کہ اسے سردی یا گرمی سے بچنے کے لیے بھی اور اپنی انسانیت کے تقاضے سے بھی لباس پہننے کی ضرورت ہے ——— اور اسی طرح خدا نے نسلِ انسانی کے چلتے رہنے کی مصلحت سے انسانوں کے اندر جنسی خواہش (SEXUAL DESIRE) رکھی ہے۔

اب اگر کوئی رہنمائی انسانوں سے اس کا مطالبہ کرے کہ وہ اپنی اصلاح و تطہیر کرنا چاہتے ہیں تو وہ نہ تو رزق کی جد و جہد میں لگیں، نہ لباس پہنیں چاہے دن ہو یا رات یا

دھوپ ہو یا برسات، اور نہ اپنے دوسرے فطری تقاضوں کی تکمیل کا سامان کریں، تو مجھے یہ کہنے میں اور آپ کو یہ سمجھنے اور ماننے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ یہ رہنمائی عام انسانوں کے لیے ناقابل عمل اور پہنچ سے باہر (OUT OF REACH) ہے اور اس سے انسانی معاشرہ کی اصلاح و تربیت کی توقع بجائے خود ایک حماقت ہے۔

اس پوری گزارش کا خلاصہ یہ ہے کہ جو رہنمائی عملی طور پر انسانوں کی تہذیب و تربیت کا کام کر سکتی ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسانی فطرت کے ساتھ اس کا معاملہ مثبت ہو منفی نہ ہو۔ اور انسانوں کے لیے وہ قابل عمل اور ان کی دسترس کے اندر (WITHIN REACH) ہو۔

جو تیسری صفت اس رہنمائی میں ہونی چاہیے، اسے ہم ہمہ گیری اور شمول و جامعیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ انسان کی زندگی کے بہت سے شعبے اور گوشے ہیں، اور اس دنیا میں انسان کی بہت سی حیثیتیں اور ذمہ داریاں ہیں ۔۔۔ مثال کے طور پر انسان کی زندگی کا ایک گوشہ روحانی و ملکوتی ہے اور دوسرا جسمانی و حیوانی، ایک پہلو انفرادی ہے اور دوسرا اجتماعی، اس کی زندگی میں جذبات و خواہشات کا بھی حصہ ہے اور اخلاق و معاملات کا بھی، دل کا بھی اور دماغ کا بھی، دنیا کا بھی آخرت کا بھی، خوشی کا بھی غم کا بھی، محبت کا بھی نفرت کا بھی، خلوت کا بھی جلوت کا بھی ۔۔۔ اسی طرح اس کی حیثیتیں بے شمار ہیں، خدا کے ساتھ اس کا تعلق اور حیثیت ایک محتاج، عاجز و لاچار مخلوق اور بندے کی ہے۔ مخلوقات کے ساتھ اس کے تعلقات اور رشتوں ناطوں میں بہت تنوع ہے۔ وہ کسی کی اولاد ہے اور کسی کا والد، کسی سے چھوٹا ہے کسی سے بڑا، کبھی بیمار ہے کبھی تندرست، کبھی خوشحال ہے کبھی تنگ دست، کبھی سوداگر ہے کبھی گاہک، کبھی لینے والا ہے اور کبھی دینے والا، کبھی حاکم ہے کبھی محکوم، کبھی طالب علم ہے کبھی استاد، کبھی مسافر ہے کبھی مقیم، کبھی میزبان ہے کبھی مہمان، کبھی قرض دینے والا ہے کبھی قرض لینے والا، کبھی امانت رکھنے والا اور کبھی امانت کا محافظ، یا تو وہ باپ ہے یا ماں، بھائی ہے یا بہن، شوہر ہے یا بیوی، بیٹا ہے یا بیٹی۔

تو ظاہر ہے کہ جو رہنمائی اتنی متنوع حیثیتیں اور ضروریات رکھنے والے انسانوں

کی اصلاح و تربیت کی ضامن ہو، اس کے لیے ضروری ہوگا کہ اس میں سب ضرورتوں اور ان سب حیثیتوں کے بارے میں واضح ہدایات ہوں اور ان میں سے کسی ایک پہلو کو، کسی ایک گوشے کو اس میں تشنہ نہ چھوڑا گیا ہو —— اگر ایسا نہ ہوا تو اس رہنمائی سے پوری انسانی زندگی کی اصلاح نہیں ہو سکے گی —— کیونکہ انسان کا وجود ان سارے تنوع اور گوناگوں پہلوؤں سے مرکب ایک اکائی ہے، اگر ان میں سے کسی ایک گوشے میں خرابی باقی رہ گئی تو اس کا اثر پورے انسانی وجود پر لازماً پڑے گا۔

چوتھی صفت انسانوں کی فلاح و بہبود کی ضامن رہنمائی میں لازماً ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی اصل شکل میں موجود رہے۔ اور اس میں تبدیلی کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مختلف زمانوں میں اور مختلف علاقوں میں جو رہنمائیاں انسانیت کی اصلاح و تربیت کے لیے آتی تھیں۔ وہ کچھ مدت کے بعد دشمنوں کی دانائی اور دوستوں کی نادانی کے نتیجہ میں حذف و ترمیم اور کمی بیشی کا شکار ہو کر اساطیری روایات و حکایات میں تبدیل ہو جایا کرتی تھیں۔

مجھے جو بات یہاں عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ انسانیت کی گتھیاں صرف اس رہنمائی کے ذریعہ مستقل طور پر سلجھ سکتی ہیں جس کی حذف، ضیاع اور ترمیم و اضافہ سے حفاظت کے لیے کوئی مضبوط اور مستقل انتظام ہو، تاکہ اس کا اطمینان کیا جا سکے کہ یہ رہنمائی اپنے تمام اجزاء کے ساتھ اپنی اصلی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس اطمینان کے بغیر، انسانیت کی باگ ڈور کسی رہنمائی کے ہاتھ میں دے دینا نہ عقل کی بات ہے نہ عدل کی!

پانچویں صفت جو انسانوں میں خیر کو غالب کرنے والی رہنمائی میں ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی طاقت ہو جس کے ذریعہ ایک ایک انسان کو اس راہ پر چلایا جا سکے جو اس رہنمائی کے نزدیک انسان کی خوش بختی کی راہ ہو۔

ہم آپ سب جانتے ہیں کہ انسان کے اندر بے شمار خواہشات اور جذبات ہیں،

اور انسان کی اصلاح و تربیت کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ اسے اپنی خواہشات اور جذبات پر قابو ہو جائے، وہ اس کے تابع ہوں، نہ یہ کہ انسان ان کا تابع و محکوم ہو، اور جبتک ہر انسان کے پاس وہ طاقت نہ ہو جس سے وہ ان جذبات و خواہشات کو حدود و قیود کے اندر رکھ سکے، اس وقت تک یہ بات عملاً ممکن نہ ہو گی ——— یہی وہ طاقت ہے جس کو قرآن مجید نے ایمان اور تقوے کا نام دیا ہے۔ اس اندرونی طاقت کے بغیر کسی خارجی دباؤ یا بیرونی طاقت کے ڈر سے ہو سکتا ہے کہ انسان بعض جرائم کے اعلانیہ ارتکاب سے رک جائے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ خارجی دباؤ اس کے اندر کی دنیا کو بدل دے اور اس کی اصلاح و سیرت سازی کا وہ کام کرے جو انسانوں کی تربیت کے لیے آنے والی رہنمائی کا اصل مقصود ہے، اور جو خود جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا انسان کی فطرت کی ایک ضرورت ہے۔

ایک بار پھر اس صفت کو ذہن میں تازہ کر لیجیے، میری معروضات کا حاصل یہ ہے کہ انسانوں کی اصلاح و تربیت کے لیے آنے والی رہنمائی کے عملی طور پر مفید مطلب اور مؤثر ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے پاس وہ طاقت ہو جس سے اسے انسانوں کے دلوں میں، دماغوں میں، فکر و وجدان اور قلب و روح کی گہرائیوں میں نفوذ مل سکے۔

چوتھی صفت اس رہنمائی میں ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ جس شخص کے ذریعہ وہ رہنمائی ملے وہ انسانوں ہی میں سے ہو اور وہ اس کے ہر ہر جزو پر سو فیصد خود عمل پیرا ہو، تاکہ ہر انسان کے لیے اس رہنمائی کو ایک مجسم انسانی زندگی کی شکل میں دیکھنے کا موقع ملے اور ایک کامل ترین عملی نمونہ کو سامنے رکھ کر اس کے لیے خود اس رہنمائی کے ہر ہر جزو پر عمل کرنا آسان ہو۔

ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ انسان کے لیے صرف اس کا ہم جنس (انسان) ہی رہنما اور نمونہ بن سکتا ہے۔ انسان اپنے سے مختلف الجنس مخلوق سے مرعوب تو ہو سکتا ہے لیکن اسے اپنا آئیڈیل قرار نہیں دے سکتا کیونکہ یہ خیال بجا طور پر اس کے لیے رکاوٹ بنے گا کہ ایک ایسی مخلوق کو اپنا رہبر اور آئیڈیل قرار دینے کا کیا جواز ہے جس کے جذبات و خواہشات

اس کے اپنے جذبات و خواہشات سے مختلف ہیں جس کی صلاحیت و استعداد، جس کی فطرت و قوت، اس کی اپنی صلاحیت اور فطرت و قوت سے مختلف ہے۔ بہرحال یہی وجہ ہے کہ انسان کی اصلاح و تربیت کے لیے رہنمائی لے کر آنے والوں کا خود انسان اور (اپنی جنس اور اصل کے اعتبار سے) صرف انسان ہونا ضروری ہے۔

جو ساتویں اور آخری صفت اس رہنمائی میں ہونی چاہیے، اور جس کی طرف اشارہ ابھی چھٹی صفت کی تشریح کے ضمن میں آچکا ہے، وہ یہ ہے کہ جو انسان خدا کی طرف سے اس رہنمائی کو لے کر آئے وہ اس کے ہر ہر جزو پر خود عمل کرتا ہو۔ اس لیے کہ عملی نمونہ دیکھے بغیر انسان اُس کو نہ پوری طرح سمجھ سکتا ہے، اور نہ اس کے مطابق اپنی سیرت و کردار کی تعمیر کا اس میں اتنا طاقتور داعیہ پیدا ہو سکتا ہے جو دوسرے موانع اور رکاوٹوں پر غالب آجائے۔

یہ بالکل فطری سی بات ہے، ڈرائیونگ سکھانے والے کو خود عملی طور پر ڈرائیونگ کر کے سکھانا پڑتا ہے، اسی طرح تیراکی سکھانے والوں کو، ہوابازی کی تعلیم دینے والوں کو، ڈاکٹروں اور وکیلوں کو اپنے اپنے شعبوں میں عملی تربیت دینی پڑتی ہے۔ جب ان شعبوں کے لوگ اپنے معلموں کی نگرانی اور رہنمائی میں اپنے شعبہ میں درپیش آنے والے مختلف تجربات سے گزرتے ہیں، تب جا کر ان لوگوں کو ان اصولی و نظری ہدایات کو عملی طور پر دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے جو وقتاً فوقتاً وہ اپنے اساتذہ و معلمین سے سنتے رہتے تھے، اور اس عینی مشاہدہ اور ذاتی و عملی تجربہ کے بعد ہی وہ ان اصولوں کو اور ان کی اہمیت اور افادیت کو پوری طرح سمجھ پاتے ہیں ـــــ بالکل یہی معاملہ انسان کی روحانی و اخلاقی تربیت کا بھی ہے، جب تک زندگی کے اس شعبے میں انسانوں کو اپنے رہنماؤں کے عملی اسوے کا مشاہدہ نہ ہو گا، اس وقت تک وہ ان کی ہدایات و تعلیمات پر پوری طرح عمل پیرا نہ ہو سکیں گے۔

محترم حضرات! یہ ہیں وہ سات صفات جو انسانوں کی اصلاح و تربیت کے لیے آنے والی خدائی رہنمائی میں لازماً ہونی چاہئیں ـــــ عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے۔ تجربہ اس کی شہادت دیتا ہے، علم و وجدان اس کی تائید کرتے ہیں۔

اب آئیے دیکھیں کہ یہ صفات اس رہنمائی میں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدائے وحدہٗ لاشریک کی طرف سے لے کر آئے تھے، کس حد تک موجود ہیں؟ اس موقع پر ایک بار پھر ان سات صفات کو ذہن میں مستحضر کر لیجیے وہ یہ ہیں۔ (۱) بلا کسی تفریق کے تمام انسان اس کے مخاطب ہوں، (۲) انسانوں کی فطرت کے ساتھ اس کا معاملہ مثبت ہو منفی نہ ہو، (۳) مکمل اور ہمہ گیر ہو، (۴) اپنی اصل شکل میں محفوظ رہے (۵) اس کے ساتھ کوئی موثر طاقت ہو (۶) اس رہنمائی کا لانے والا خود انسانوں میں سے ہو، (۷) وہ اس رہنمائی کا لانے والا خود عمل کر کے اپنی رہنمائی کے ہر ہر جزو کا عملی نمونہ پیش کرے۔

یہ بات اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ آپ میں سے کسی کے لیے بھی اس امر کے تفصیلی دلائل بیان کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی طرف سے رہنمائی ملنے کے بعد سے پہلے دن سے اپنی پوری توجہ یکساں طور پر پوری دنیائے انسانیت کی طرف مرکوز فرمائی۔ قرآن مجید میں آپ کی لائی ہوئی رہنمائی کی اس خصوصیت کا جا بجا اعلان کیا گیا ہے۔ سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے براہ راست محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرما کر ساری دنیا کے انسانوں کے سامنے اس کی وضاحت کا یوں حکم دیا ہے:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ	اے محمد! کہہ دو کہ اے فرزندانِ آدم! میں تم سب کے لیے اللہ کا رسول ہوں اس اللہ کا جو کسی خاص قوم یا نسل کا نہیں بلکہ زمین و آسمان کا مالک ہے۔

سورۂ سبا میں فرمایا گیا ہے: "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ" (اے محمد! ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بھیجا ہے)

سورۂ فرقان میں فرمایا گیا ہے: "تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا" (بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندے پر قرآن اتارا تا کہ وہ تمام دنیا کو آگاہ کرے۔)

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوتی مہم کے بالکل آغاز میں ہی

جبکہ آپ کی رسائی مکہ مکرمہ کی گلیوں اور وادیوں سے آگے نہیں تھی، تمام انسانوں کو ان الفاظ سے خطاب کرنا شروع فرما دیا تھا، "یا ایھا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا" (اے انسانو! اس بات کا اقرار کرلو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، تم کامیاب ہو جاؤ گے)

محترم حضرات! یہ کسی پر جوش عقیدت مند کی مدح خوانی نہیں ایک کھلی ہوئی تاریخی حقیقت ہے۔ آپ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی دور کے حلقہ بگوشوں کے نام سنے ہوں گے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کے ساتھ لیے جانے والے ناموں میں سرفہرست ہے یہ مکہ مکرمہ کے قریشی النسل باشندے تھے۔ دولتمند تھے، ماہر انساب تھے، صاحب الرائے اور بااثر شخص کی حیثیت سے عام طور پر معروف ومقبول تھے۔ انہی خوش نصیبوں میں حمزہ اور عمر جیسے شریف النسب اور حوصلہ مند زعمائے قوم بھی تھے۔ اور قبیلۂ تیم کے خباب بن الارت، اور حبشی النسل بلال اور ابو فکیہ جیسے غلام اور فقراء بھی تھے زنیرہ اور البینہ جیسی مظلوم اور بیکس باندیاں بھی تھیں۔ یمن کے رہنے والے جواں عمر عمار بھی تھے، اور ان کے بوڑھے والد یاسر اور بوڑھی ماں سمیّہ بھی تھیں۔ ایرانی النسل صہیب بھی تھے جن کی پرورش روم میں ہوئی تھی اور اس لیے رومی کہلاتے تھے، ان کے بارے میں مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ عربی زبان ٹھیک سے بول نہیں سکتے تھے ——— عثمان بن عفان جیسے کبیر السن اور صاحب جاہ واعزاز بھی تھے اور علی بن ابی طالب جیسے نوخیز نوجوان اور خاندان بنو ہاشم کے چشم وچراغ بھی تھے۔ مکہ مکرمہ کی شریف معززاور تاجر پیشہ خاتون خدیجہ بھی تھیں اور قبیلہ جواز دکے ضماد بن ثعلبہ جیسے طبیب بھی تھے۔

یہ تو میں نے بالکل ابتدائی دور میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرنے والوں کی فہرست میں سے چند نام ذکر کیے ہیں جو اس وقت یاد آگئے ہیں۔ ورنہ اس فہرست میں بھی اور کافی نام باقی ہیں، البتہ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا خطاب ہر انسان سے تھا، اس میں نہ زبان کا امتیاز تھا نہ رنگ ونسل کا، نہ جنس

کا نہ طبقہ کا، نہ ملک کا نہ قوم اور برادری کا۔ نہ حسب کا یہاں کوئی اعتبار تھا نہ نسب کا نہ زر کا نہ زور کا، اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا، یہ تو نام ان لوگوں میں سے چند کے ہیں جو بالکل ابتدائی دور میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ آئے تھے۔ اس کے بعد جب اسلام کی روشنی دنیا میں پھیلی اور انسانوں کی پوری دنیا اس روشنی سے منور ہونے لگی تو یہ سارے فرق تو خود بخود مٹتے چلے گئے جنھوں نے انسانوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے اور جنھوں نے کچھ کو محمود بنا دیا ہے اور کچھ کو ایاز، کسی کو بندہ بنا دیا ہے اور کسی کو بندہ نواز۔

آپ میں سے بیشتر حضرات تعلیم یافتہ اور باخبر ہیں، میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ ماضی قریب کے کسی ایسے رہنما کا یا کسی ایسی رہنمائی کا نام بتلیے جو اس معیار پر پوری اترتی ہو۔ اس لیے کہ ماضی بعید کے بارے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت انسانی دنیا کے پاس ایسے وسائل نہیں تھے کہ کسی رہنمائی کو پوری دنیا کے لیے واجب العمل قرار دیا جا سکتا۔ اس کا سب سے بڑا، اور کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے بھی کوئی ایسی عالمی رہنمائی نہیں آئی بلکہ مختلف علاقوں اور قوموں میں الگ الگ رہنما بھیجے گئے) اسی لیے میں نے آپ سے ماضی قریب ہی کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ جتنے نام آج کل رہنماؤں کے طور پر لیے جاتے ہیں ذہن میں مستحضر کر لیجیے، ابراہیم لنکن کا نام لیا جاتا ہے، لینن اور اور اسٹالن کا نام لیا جاتا ہے۔ ماؤزے تنگ کا نام لیا جاتا ہے، گاندھی اور مصطفےٰ کمال کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن کیا ان قومی اور طبقاتی رہنماؤں کو دوسری قومیں اور تمام انسان اپنا لیڈر مان سکتے ہیں؟ بات صاف ہے، جس شخص کی محبت خیر خواہی اور کارکردگی کسی خاص طبقہ یا علاقہ تک محدود ہو، دوسرے لوگ اسے اپنا رہنما کیوں مانیں؟ یہ مقام تو صرف اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جس کے پاؤں میں کوئی زنجیر نہ ہو، جس کی نظر میں سارے انسان ایک ہوں، جس کے دل میں سب کا یکساں درد ہو، جس کی پکار صرف انسان کے نام پر ہو، اور تاریخ کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ مقام انسانیت کی تاریخ میں صرف ایک رہنما کو اور صرف ایک رہنمائی کو حاصل ہوا ہے، وہ رہنما ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ رہنمائی

ہے اسلام ۔

لیجئے اب آپ دوسری صفت پر غور کیجیے : میں نے عرض کیا تھا کہ انسانوں کی اصلاح و تربیت کے لیے آنے والی رہنمائی کو انسانوں کی فطرت سے ہم آہنگ ہونا چاہیے ۔ آیئے قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آنے والی رہنمائی پر اس پہلو سے بھی نظر ڈالی جائے ، عام طور پر روحانی رہنماؤں کی رہنمائیوں میں ہمیں یہ رجحان نظر آتا ہے کہ جب تک انسان اپنے جسمانی اور فطری تقاضوں کو کچلے گا نہیں ، اور جب تک وہ دنیا و مافیہا سے اپنے کو بالکل منقطع نہ کرے گا ، اور دنیا کی ہر چیز سے سنیاس نہ لے لے گا ، اس وقت تک وہ خدا کا قرب اور روحانی ترقی نہیں حاصل کر سکتا ، اور یہی وجہ ہے کہ عام طور پر دین و مذہب کے بارے میں جو تصور دنیا کے انسانوں کے ذہنوں میں راسخ ہو گیا ہے وہ اتنا مخالف فطرت اتنا مشکل ، اتنا خوفناک اور اس قدر مافوق العادۃ اور ماوراء العقل ہے کہ اس کے لیے دلوں میں احترام اور تقدیس اور تعظیم کے جذبات تو کسی حد تک مذہب پسند لوگوں میں پیدا ہو جاتے ہیں لیکن وہ کبھی اس پر عمل کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتے ۔۔۔ وہ سنیاسی لوگوں کو عظمت سے دیکھنے ہی کو ، اور ان کی کچھ خدمت کر دینے کو ، اور ان کا آشیرواد لے لینے ہی کو اپنی دینداری کا مظہر اور اپنی نیکی کی معراج سمجھتے ہیں ۔

محترم حضرات ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں صراحت کے ساتھ اس بارے میں آپ سے باتیں کروں ، میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک انسان کی حیثیت سے اس مسئلہ پر غور کریں ، وہ رہنمائی جو انسانوں کی سب سے عظیم ضرورت کی تکمیل کا دعویٰ کرے ، اگر وہ انسانوں سے یہ کہے کہ تمھیں اپنی تربیت کے لیے برہنہ یا نیم برہنہ رہنا پڑے گا ، تمھیں معاشی جد و جہد اور کاروبار سے ، شادی بیاہ سے اور بیوی بچوں کے جھمیلوں سے ہزاروں میل دور رہنا پڑے گا تمھیں بھوکا اور پیاسا رہنا پڑے گا ، تمھیں اپنے جسم کے کم از کم کسی ایک حصے کو معطل اور مادُف کر دینا پڑے گا ۔ تو کیا آپ میں سے کوئی اس رہنمائی کو قبول کرنے کا ارادہ کرے گا ؟ صحیح العقل انسانوں میں سے کتنے افراد اس رہنمائی پر عمل کر سکیں گے ؟ انسانوں کی فطرت کے اندر بہت سے تقاضے رکھ دینا ، اور پھر ان کو بے رحمی کے ساتھ کچلنے کا اس سے مطالبہ کرنا کیا ایسی بات ہے کہ اسے

خدا کی طرف منسوب کیا جا سکے، اور جس کا ظہور خدا سے ہو سکے ؟

نام لیے بغیر میں عرض کرتا ہوں کہ جو رہنمائیاں، اس وقت انسانوں کی روحانی تربیت کے نام پر ہماری دنیا میں موجود ہیں، کم و بیش سب اس بارے میں منفی ہی رخ رکھتی ہیں۔ لیکن جو رہنمائی اللہ کی کتاب قرآن مجید اور اللہ کے بھیجے ہوئے رہنما محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ ہمیں ملی ہے صرف وہ ہے جس نے فطرت انسانی کے ساتھ سو فیصد مثبت معاملہ کیا ہے۔ جس نے فطرت کے تقاضوں کو، اور ان کی تکمیل کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے، بلکہ اس پر زور دیا ہے اور قدم قدم پر ایسی ہدایات دی ہیں جن سے اس گمراہی کا سدباب ہو جائے کہ روحانی ترقی فطرت کو کچلے بغیر ممکن نہیں۔

قرآن مجید کی دوسری سورت میں ایک جگہ تمام انسانوں کو خطاب فرما کر کہا گیا ہے "یا ایھا الناس کلوا مما فی الارض حلالاً طیباً، ولا تتبعوا خطوات الشیطان، انہ لکم عدو مبین" (اے انسانو! زمین میں جو کچھ وہ چیزیں ہیں جو حلال اور پاکیزہ ہیں انھیں کھاؤ، اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو، وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے) ایک اور جگہ تمام انسانوں کو خطاب کر کے اس غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے جو عام طور پر اس بارے میں انسانوں کے ذہنوں میں پیدا ہو جاتی ہے، فرمایا گیا ہے "یا بنی آدم خُذُوا زِینَتَکُم عند کُلّ مَسْجِدٍ وَکُلُوا وَاشْرَبُوا وَلا تُسْرِفُوا اِنَّہ لا یُحِبُّ الْمُسْرِفِین"، (اے انسانو! ہر نماز کے وقت (خاص طور پر) اپنے کو (لباس وغیرہ سے) مزین کر لیا کرو، اور کھاؤ اور پیو اور بیجا نہ اڑاؤ، اللہ تعالیٰ بیجا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا)

اسی سلسلے میں قرآن مجید میں ایک اور مقام پر اس بات کو سوالیہ انداز میں اس طرح کہا گیا ہے: "قُل من حَرَّمَ زِینَۃَ اللہ التی أخرج لِعِبادہ وَالطیبات مِنَ الرِّزق" (اے رسول! آپ (ان لوگوں سے) یہ پوچھیے کہ (آخر) زینت کے جس سامان کو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے اس کے اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزوں کے استعمال کی کس نے ممانعت کی ہے ؟) کھانے پینے اور لباس کی طرح فطرت انسانی کا ایک اور پہلو ہے اور وہ ہے "زوجیت" یا ازدواجی زندگی، انسانی وجود گو بیشتر دوسری مخلوقات کی طرح دو جنسوں

پر تقسیم کیا گیا ہے، مرد اور عورت MALE اور FEMALE اور خدا نے ان دونوں کے قرب و اتصال ہی کو نسلِ انسانی کے چلنے کا ذریعہ قرار دیا ہے، اور اسی لیے ان دونوں میں ایک دوسرے کے قرب و اتصال کی خواہش بھی رکھی ہے ــــــــ جو کھانے اور پینے ہی کی طرح انسانی فطرت کا ایک لازمی اور اہم جزو ہے ــــ جو رہنمائیاں انسان سے اپنے فطری تقاضوں کو کچلنے کا مطالبہ کرتی ہیں، ان کا نشانہ یہ پہلو بھی بنتا ہے بلکہ شاید سب سے زیادہ بنتا ہے۔ لیکن یہ بھی مسلّمہ حقیقت ہے کہ فطرت کو کچلنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوپاتی، بلکہ اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ انسان کے اندرون میں اس قسم کے غیر فطری دباؤ کے خلاف انتہائی شدید ردِ عمل اور باغیانہ جذبہ پیدا ہوتا ہے اور ہوس پرستی اور اباحیت کا ایسا سیلاب اُمنڈ آتا ہے کہ سب حدود و قیود اور سارے اخلاقی بندھن ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں اور معاشرہ میں جنگل کے قانون کی حکمرانی ہو جاتی ہے۔ مسیحی دنیا کا جو اخلاقی انحطاط ہے وہ سب اسی کا نتیجہ ہے ــــــ قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو خدائی رہنمائی ملی ہے۔ اس نے جس طرح کھانے پینے اور پہننے کو روحانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں قرار دیا۔ بلکہ اس میں بے اعتدالی اور افراط و تفریط سے منع کیا اسی طرح اس نے ازدواجی زندگی کو بھی ایک فطری ضرورت تسلیم کیا بلکہ اس کو روحانی تربیت کے نصاب کا نصف حصہ قرار دیا اور اس پر زور دیا کہ نوجوانی کے مرحلہ پر پہنچنے کے بعد اس ضرورت کی تکمیل کے فطری اور مناسب انتظام میں تاخیر بھی نہ ہونی چاہیے، اور اس بارے میں ایسی تفصیلی ہدایات دیں جن پر عمل کے ذریعہ انسانی زندگی کی یہ ضرورت زیادہ سے زیادہ سہولت اور پاکیزگی سے پوری ہو جائے اور انسان کو زیادہ سے زیادہ سکون و اطمینان بخشے۔

قرآن مجید کی ایک آیت میں ازدواجی تعلقات کو بدن اور لباس کے باہمی تعلق سے تشبیہ دی گئی ہے، یعنی جس طرح جسم کو لباس کی ضرورت ہے، اور لباس کی خوبصورتی جسم ہی سے ظاہر ہوتی ہے، اور جس طرح لباس سے جسم کو آرام بھی ملتا ہے اور پردہ پوشی بھی ہوتی ہے اسی طرح مرد و عورت دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بھی ہیں، اور دونوں ایک دوسرے کی راحت کا، اور پردہ پوشی کا ذریعہ بھی ہیں ــــــ قرآن مجید میں ایک اور جگہ

زوجیت کے اس نظام کو اور دونوں جنسوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت کے جذبہ کی تخلیق کو اللہ نے اپنی خدائی کی نشانی کے طور پر ذکر فرمایا ہے:- "ومن آیاتہ أن خلق لکم من أنفسکم أزواجا لتسکنوا الیھا و جعل بینکم مودۃ ورحمۃ إن فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون" محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی سے، جن کے ذہن میں ان کے خاص ذوق کی وجہ سے یہ بات پوری طرح صاف نہیں ہو سکی تھی، اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا" أما واللہ إنی لأخشاکم للہ وأتقاکم لہ لکنی أصوم وأفطر وأصلی وأرقد وأتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی" دیکھو میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا اور اس کی مرضی کا لحاظ رکھتا ہوں، لیکن میں روزے رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا (رات میں) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے ازدواجی تعلقات بھی رکھتا ہوں، اب جو میرے اس طریقے پر نہیں چلے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ـــــ انسانوں کی فلاح وسعادت کے لیے آنے والی خدائی رہنمائی کی اسی مزاجی خصوصیت کا اعلان محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعلان کے ذریعہ فرمایا "لا رہبانیۃ فی الإسلام" "اسلام میں سنیاس نہیں ہے۔"

خدا کی اس رہنمائی میں جن اعمال و اخلاق کا انسانوں سے مطالبہ کیا گیا ہے، اور جن سے روکا گیا ہے، ان سب پر آپ نظر ڈالیے، ان میں سے کسی ایک جگہ بھی آپ اس رہنمائی اور فطرت کے تقاضے میں تضاد نہیں پائیں گے ـــــ انسانی اخلاق ومعاملات کی فہرست اگر کسی سلیم الفطرت اور خالی الذہن انسان کے سامنے رکھی جائے، اور اس سے کہا جائے کہ ان میں سے جن کو تم پسند کرو اس پر صحیح (✓) کا نشان لگادو اور جن کو ناپسند کرو ان پر غلط (×) کا نشان لگا دو، مثلاً اس سے کہا جائے کہ رحم دلی اور سنگدلی میں سے سخاوت اور بخل میں سے، ایثار اور حرص وطمع میں سے، انس ومحبت اور بیگانگی وعداوت میں سے نرم مزاجی اور درشت خوئی میں سے خوش کلامی اور بدزبانی میں سے سچائی اور امانت داری اور جھوٹ اور خیانت میں سے، ایفاء وعدہ اور وعدہ خلافی میں سے، تواضع وخاکساری اور غرور وتکبر میں سے، شرم وحیا اور بے شرمی میں سے، قناعت اور لالچ میں سے، صبر وشکر اور بے صبری و ناشکری میں سے،

مکاری و خود غرضی اور ایثار و اخلاص میں سے، صفائی اور سلیقہ مندی اور گندگی و بے سلیقگی میں سے، سستی و کاہلی اور چستی و نشاط میں سے، صلہ رحمی اور رشتہ داروں سے قطع تعلق میں سے، ادب اور شائستگی اور بے ادبی و بے تہذیبی میں سے ...... غرض کہ ان انسانی اخلاق و اطوار کی طویل فہرست میں سے تم جن کو پسند کرو، اور جن کو اپنی فطرت اور انسانی معاشرہ کی مصلحت سے قریب تر پاؤ ان پر صحیح کا نشان لگا دو، اور جن کو ان سے دور پاؤ اُن پر غلط کا نشان لگا دو، تو میں پورے اعتماد سے کہتا ہوں کہ اس شخص کو جو واقعۃً سلیم الفطرت ہے ایک منٹ بھی اس سوال کا جواب دینے کے لیے سوچنا نہیں پڑے گا۔ اور وہ انہی اخلاق و اطوار کو صحیح قرار دے گا جن کی پسند ہر انسان کے اندر فطری طور پر جاگزیں ہے، اور جن کے فقدان کا آج ہم سب رونا رو رہے ہیں ـــــ اب آپ اس شخص کے جواب کو سامنے رکھیے اور قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی رہنمائی کو اول سے آخر تک دیکھ جائیے، کہیں کسی ایک نقطہ پر بھی یہ اشکال آپ کے سامنے نہیں آئے گا کہ فلاں نقطہ میں دونوں میں مطابقت نہیں، فلاں چیز تو ہماری فطرت سے ہم آہنگ نہیں قدم قدم پر بلاشبہ قدم قدم پر آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ یہی سب باتیں تو ہمارے من میں تھیں؟ یہی سب تو وہ باتیں ہیں جن کی تمنا، جن کا تخیل اور جن سے مناسبت ہمارے دل و دماغ کے روئیں روئیں میں چھپی ہوئی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ جب ایک دیہاتی صحابی سے ایک شخص نے پوچھا کہ تمھیں محمد کی باتوں میں کیا خوبی نظر آتی ہے تو اس نے کہا "ما وجدت شیئاً محمد یَقُوْلُ اِفْعَلْ، و العقل یَقُوْلُ لَا تَفْعَلْ، وَمَا وَجَدْتُ شَیْئاً محمدٌ یَقُوْلُ لا تَفْعَلْ وَ الْعَقْلُ اِفْعَلْ" (مجھے کبھی اس کا تجربہ نہیں ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام کے کرنے کی ہدایت دے رہے ہوں اور عقل اسے نہ کرنے کا مطالبہ کر رہی ہو، اور نہ کبھی اس کا تجربہ ہوا کہ وہ کسی کام کے نہ کرنے کا حکم دے رہے ہوں اور عقل اس کے کرنے کا مشورہ دے رہی ہو۔

حضرات! یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر گھنٹوں نہیں ہفتوں گفتگو کی جائے، اور ضخیم جلدیں تصنیف کی جائیں تب بھی بہت کچھ تشنگی باقی رہ جائے گی، بس میرا مدعا اتنا ذہن میں رکھ لیجیے، اور بعد میں تنہائیوں میں سوچیے گا کہ انسانوں کی فلاح کے لیے ایسی رہنمائی کا ہونا ضروری ہے جو اس کی فطرت سے سو فیصد مطابقت رکھتی ہو، اور ایسی رہنمائی صرف وہ ہے کہ جو قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملی ہے، جسے اسلام کہتے ہیں۔ (باقی)

گاہے گاہے باز خواں۔۔۔

اسوۂ نبوی کی روشنی میں ہمارے لیے صحیح طریقہ کار

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

[الفرقان کی فائلوں میں دینی، دعوتی اور علمی موضوعات پر مشاہیر اہل علم و فضل کی انتہائی اہم اور مفید قلمی کاوشیں محفوظ ہیں۔ حال ہی میں ایک ضرورت سے ان فائلوں کی ورق گردانی کی تو یہ احساس ہوا کہ ان میں سے مختلف مضامین کا انتخاب کرکے وقتاً فوقتاً الفرقان کے موجودہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے رہنا ان شاء اللہ بہت مفید ہوگا۔ اس سلسلہ کا آغاز "گاہے گاہے باز خواں" کے زیر عنوان حضرت والد ماجد مدظلہ کے ایک مضمون سے کیا جارہا ہے جو تقریباً ۴۰ سال قبل محرم ۱۳۶۶ھ کے شمارے میں شائع ہوا تھا، صاحبِ مضمون نے اس میں معمولی سی لفظی ترمیم بھی کی ہے۔ ان شاء اللہ یہ سلسلہ آئندہ بھی حسبِ موقع جاری رہے گا ——— مدیر]

تھوڑی دیر کے لیے اپنی ظاہری آنکھوں کو بند کرکے تصور کی باطنی نظر اب سے پورے چودہ سو برس پہلے کی دنیا پر ڈالیے اور خاص کر ملک عرب کے شہر مکہ اور اس کے قرب و جوار کی آبادیوں کو اپنی نگاہ تصور کے سامنے لے آئیے! آپ کو نظر آئے گا کہ یہاں کی بسنے والی قوم میں جہالت بھی ہے افلاس اور فلاکت بھی ہے، شکست خانہ جنگی اور اس کی وجہ سے تباہی و بربادی بھی ہے، تہذیبی اور تمدنی ترقیوں میں بھی وہ اپنی ہمعصر قوموں سے

بہت پیچھے ہے، سیاسی طاقت سے بھی اس کا ہاتھ خالی ہے، بلکہ اس پورے علاقہ میں کوئی سیاسی نظام اور کوئی باقاعدہ یا بے قاعدہ حکومتی ادارہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے، ان سب کمزوریوں اور خرابیوں کے ساتھ مشرکانہ اوہام و خرافات میں بھی وہ بری طرح الجھی ہوئی ہے اور اپنی عملی زندگی میں خدا اور یوم جزا کو بالکل بھلائے ہوئے ہے، اپنے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل کی عظمت و بلند مقامی کی اگرچہ وہ پوری طرح قائل ہے، اور ان کی تعظیم بلکہ تقدیس، اُس کا دین و ایمان ہے اور اپنے کو وہ ان کی طرف منسوب بھی کرتی ہے، لیکن ان کی مقدس تعلیم سے وہ بالکل بیگانہ ہے، بلکہ اپنے چال چلن اور مذہبی رسوم میں ابراہیمی و اسماعیلی تعلیم و ہدایت سے یکسر منحرف ہے۔

اسی حالت میں خدا اپنے سب سے آخری برگزیدہ رسول کو اس قوم میں کھڑا کرتا ہے، قوم کی پوری زندگی کا ایک ایک گوشہ اور حیات قومی کا ایک ایک رخنہ اس رسول اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چشم بینا کے سامنے ہے، وہ قوم کی جہالت اور ناتعلیم یافتگی کو بھی کھلی آنکھوں دیکھ رہا ہے، افلاس و فلاکت اور وسائل معاش کی کمی بھی اس کی نظر میں ہے، تباہ کن خانہ جنگی اور قتل و غارت کی گرم بازاری بھی اس سے مخفی نہیں ہے، تہذیب و تمدن میں پسماندگی اور سیاسی نظام نہ ہونے کی وجہ سے پوری قوم میں افراتفری اور فتنہ و فساد کی تباہ کاری بھی اس کی نگاہ میں ہے، لیکن وہ ان مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کو بھی اولی درجہ نہیں دیتا، بلکہ اپنے بھیجنے والے احکم الحاکمین کے حکم سے تمام پیشرو نبیوں کی طرح وہ بھی سب سے پہلے، انسانیت کے صرف ایک بنیادی اصول اور انسانی زندگی کے متعلق صرف ایک اصولی اور اساسی اصلاحی سوال کو لے کر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی اولین دعوت و پکار بس یہ ہوتی ہے۔

"اے انسانو! اللہ کو اپنا واحد رب اور لاشریک الٰہ مان لو، اور صرف اسی کی عبادت و بندگی کرو۔ آخرت پر ایمان لاؤ اور اس دن کے مواخذہ اور عذاب سے ڈرو، اور مجھے اللہ کا رسول یقین کرو اور جو احکام وہ میری طرف وحی کرتا ہے میری طرح تم بھی ان کی اطاعت و پیروی کرو۔"

بس یہی اس کی سب سے پہلی دعوت اور اولین تعلیم و تلقین ہوتی ہے، یعنی وہ ایمان و عمل صالح کے اصولوں کو سب سے پہلے اپنی قوم کو منوانے اور ان کے دلوں میں اتارنے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کے بعد بھی اس کی تمام پیغمبرانہ جد وجہد کا مرکزی نقطہ یہی ایمان اور عمل صالح کا مسئلہ رہتا ہے، چنانچہ وہ جب بھی انسانی زندگی کے کسی شعبہ کی اصلاح و درستی کے لیے احکام و ہدایات دیتا ہے، یا فلاح و ترقی کے کسی پروگرام پر اپنے ماننے والوں کو چلاتا ہے تو ہر شعبۂ زندگی کے متعلق اس کی ہر جزئی ہدایت میں اور اصلاح و ترقی کے لیے اس کے بتلائے ہوئے ہر اقدام اور ہر حرکت میں ایمان اور اطاعت الٰہی کی روح اس طرح جاری و ساری ہوتی ہے جس طرح جاندار مخلوق کے تمام اعضا میں جوہر حیات اور درختوں کی شاخوں اور پتیوں میں تری اور شادابی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیس سالہ پیغمبرانہ جد وجہد اور آپ کے طرز کار کو اگر احادیث و سیر کی کتابوں میں بغور دیکھا جائے تو اول سے آخر تک یہی نظر آئے گا کہ آپ کے نزدیک انسانیت کا سب سے اہم بنیادی اور مرکزی مسئلہ ایمان اور اطاعت الٰہی ہی کا مسئلہ تھا اور دوسرے تمام مسائل و معاملات، نبوت کی نگاہ میں بعد کے درجہ کے اور اسی کے ماتحت اور اسی کے اقتضاآت کے مطابق حل کرنے کے تھے ——

نیز قرآن مجید میں جن انبیاء سابقین (علیہم السلام) کی دعوت کا تذکرہ اجمالاً یا تفصیل سے کیا گیا ہے، ان سب کا طریق کار بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے کیونکہ اختلاف زمان و مکان کے باوجود ان تمام مقدسین کے علم و ہدایت کا سرچشمہ اور احکام کا ماخذ ایک ہی تھا، یعنی وحی ربّانی اور تعلیم الٰہی۔

ہماری اس گذارش کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے، کہ انبیاء (علیہم السلام) کا طریقہ انسانوں کی مادی اور دنیوی ضرورتوں کی نفی پر مبنی ہے، یا وہ حضرات انسانوں کی معاشی اور سیاسی معاملات سے بے تعلق رہنا چاہتے ہیں —— یہ سراسر غلط اور باطل ہے — بلکہ ہمارا مقصد تو صرف یہ ہے کہ ان کی دعوت و تعلیم اور ان کی جد وجہد میں اولی اور بنیادی درجہ کی اہمیت اور مرکزی حیثیت ایمان اور عمل صالح کو حاصل ہوتی ہے، وہ سب سے

پہلے اور سب سے زیادہ زور انسانیت کے اسی پہلو کی اصلاح پر دیتے ہیں اور اس کے علاوہ انسانیت کے جو اور مسائل اور انسانوں کی جو دوسری ضرورتیں ہیں وہ ان سب کو اس کے ذیل میں لاکر اور اسی مرکز سے وابستہ کرتے ہوئے ان کو انجام دینے کی تعلیم دیتے ہیں اور یہی ان کے طریقہ کا امتیاز ہے۔

پس انبیاء علیہم السلام کی پیروی کرنے والوں اور ان کے طریقہ کار کو حق جاننے والوں کا لائحۂ عمل بھی یہی ہونا چاہیے کہ ایمان اور عمل صالح ہی کو وہ انسانیت کا سب سے اہم مسئلہ سمجھیں اور سب سے زیادہ توجہ اسی پر دیں اور اس کے سوا باقی تمام مسائل و معاملات کو وہ اس کے بعد کے درجہ پر رکھیں اور اسی مرکزی اور بنیادی مسئلہ سے ان کو وابستہ کرتے ہوئے اور اسی کے اقتضاآت کے مطابق ان کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

مگر آج یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ یوروپین اقوام کے خالص مادی نظریۂ حیات کا ہمارے بہت سے دینی حلقوں پر بھی اس قدر اثر پڑ چکا ہے کہ اس طریقہ پر کام کرنا تو درکنار وہ اس اصول پر کیے جانے والے کاموں کو معمولی اور ادنیٰ درجہ کے کام سمجھتے ہیں اور کسی ایسی جدوجہد میں ان کے لیے کوئی کشش نہیں رہی ہے جس کا رخ براہ راست مادی مسائل ہی کی طرف نہ ہو اور ایمان و عمل صالح کی دعوت اور عوام کی دینی اصلاح و تربیت کو جس میں اولی اور اساسی حیثیت دی گئی ہو اور دوسرے مسائل و معاملات کو اس کے زیر سایہ رکھنا اس کا اصول ہو۔

اس بارے میں ایک بڑی سنگین غلط فہمی بہت سے حضرات کو یہ بھی ہے کہ جب تک قوم کے مادی مسائل مناسب طریقے سے حل نہ ہو جائیں اور قوت و طاقت ہاتھ میں نہ آجائے اس وقت تک کوئی اصلاحی جدوجہد اور ایمان و عمل صالح کی کوئی دعوت نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ ایمانی نقطۂ نظر سے اس خیال کی تردید کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ نبوت و رسالت اور سلسلۂ تجدید و اصلاح کی پوری تاریخ اس کے خلاف شہادت

دے دی ہے لیکن خالص عقلی اور نظری طور پر بھی غور کیا جائے اور ماضی قریب ہی کے تجربات کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو باسانی سمجھ میں آسکتا ہے اور صاف نظر آسکتا ہے کہ ایمان اور عمل صالح کی دعوت اور اقامت دین کو اپنی جدوجہد کا مرکزی نقطہ بنائے بغیر اور وسیع پیمانے پر قوم کی اصلاح و تربیت کی پوری کوشش کیے بغیر جس قدر بھی مادی ترقی کی جائے گی اور جتنی بھی سیاسی طاقت حاصل ہوگی وہ قوم کے اندر بے دینی، خدا فراموشی اور دنیا پرستی کے فروغ کا باعث بنے گی۔

اتاترک، رضا شاہ اور امان اللہ خاں کی کوششوں کا نتیجہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، بیشک ان کے زیر قیادت ترکی، ایران اور افغانستان کو مادی اور سیاسی ترقی ضرور حاصل ہوئی، لیکن اس مادی اور سیاسی ترقی سے بدرجہا زیادہ دین کو زوال ہوا، بلکہ بعض شعبوں میں تو دینی احکام کو علی الاعلان اور باضابطہ طور پر ترک کر دیا گیا اور جن علماء اور اہل دین نے ان ترقیات سے اختلاف کیا اور رکاوٹ پیدا کرنی چاہی، ان کو بے دریغ گولیوں کا نشانہ بنایا گیا (حالانکہ ان میں سے اکثر وہ تھے جنھوں نے سیاسی آزادی اور ترقی کی جدوجہد میں بھی پورا پورا ساتھ دیا تھا) ——— یہ سب اسی کا نتیجہ تھا کہ ان مسلمان قوموں کی ترقی کی جدوجہد خالص مادی اور سیاسی ترقی کے لیے تھی جس میں ایمان و عمل صالح کی دعوت اور دینی اصلاح و تربیت کا کوئی ذکر اور کوئی حصہ نہ تھا۔ اس کا فطری اور طبعی انجام وہی ہونا چاہیے تھا جو ہوا۔

خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم   دیبا نتواں یافت ازاں پشم کہ رشتیم

اس کے بالمقابل گزشتہ صدی (تیرھویں صدی ہجری) میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک تجدید و جہاد کے انجام اور اس کے نتائج پر غور کیجیے، چونکہ دینی دعوت اور اقامت دین، اس تحریک کا نصب العین اور مرکزی نقطہ تھا اور مسلمانوں کی دینی اصلاح و تربیت کا کام اس میں مقدم رکھا گیا تھا، بلکہ ابتدا کئی برس تک ساری کوشش اسی مرحلہ پر صرف کی گئی تھی۔ اس لیے شروع میں جب اس تحریک کو کامیابی ہوئی اور بعض سرحدی علاقوں میں نظام حکومت قائم کرنے کا موقع ملا،

تو تمام شعبوں کی تنظیم بالکل "خلافت علیٰ منہاج النبوت" کے اصول پر کی گئی ــــــ پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد (سرحدی علاقہ کے ناتربیت یافتہ دنیا پرست "مسلمانوں" کی غداری اور بعض دوسرے اسباب سے) اگرچہ یہ تحریک بالاکوٹ کے محاذ پر شکست کھا کر اپنی اصلی حیثیت سے ختم ہو گئی لیکن پھر بھی ان بندگانِ خدا کی صحیح طریقہ پر اسی چند روزہ جدوجہد نے دینی تجدید و اصلاح کا اتنا بڑا کام کر دیا کہ سیکڑوں مدرسوں، ہزاروں عالموں اور لاکھوں کتابوں سے نہ ہو سکتا ــــــ جاننے والے جانتے ہیں کہ پچھلے دور میں صحیح الخیال ہندی مسلمانوں کے مختلف حلقوں میں اقامتِ دین اور احیاءِ شریعت کے لیے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ کوششیں ہوتی رہیں اور جن سرگرمیوں کا ظہور ہوتا رہا نیز آج بھی اس سلسلہ میں جو کچھ سعی و حرکت کسی شکل میں کہیں دکھائی دیتی ہے، وہ بڑی حد تک ان شہداءِ بالاکوٹ ہی کی میراث ہے۔

بہرحال جنگ کے میدان میں شکست کے باوجود اس تحریک کی یہ دینی برکات صرف اسی طرزِ عمل کا نتیجہ ہیں کہ اس کی ساری جدوجہد اور اس کا تمام ترکاروبار انبیاء علیہم السلام کے طریق پر تھا یعنی دینی دعوت اور احیاءِ شریعت اس کا نصب العین تھا اور عوام المسلمین کی دینی اصلاح و تربیت اس کے عملی پروگرام کی پہلی دفعہ تھی۔

آخر میں ایک بار پھر اپنے مدعا کی وضاحت کے لیے یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دین کی اہمیت اور نبوت کے مقام کو سمجھنے والے مسلمان اللہ کی دی ہوئی عقل و بصیرت اور صحیح علم سے کام لیتے ہوئے مقدس اسلام کے اقتضا اور اسوۂ نبوی کی روشنی میں اپنے طرزِ عمل پر غور کریں۔ اور ایمان و عمل صالح کی دعوت، مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور احیاءِ شریعت کے لیے جدوجہد کے بارہ میں جو سخت غفلت اب تک ان سے ہوئی ہے اور ہو رہی ہے اس کی سنگینی اور عند اللہ اس کی مبغوضیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ نظر سے اپنے اجتماعی کاموں کے رخ میں جو اصلاح و ترمیم ضروری معلوم ہو اس میں دریغ اور تاخیر نہ کریں ــــــ اللہ نے عمل کے لیے صرف ایک ہی زندگی عطا فرمائی ہے اگر بے فکری اور بے غوری سے یہ بھی غلط یا بے سود کاموں ہی میں ختم ہو گئی تو آخرت میں بڑی حسرت ہو گی۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

[illegible]

یاد رفتگان

گزرے ہوئے سال (۱۴۰۳ھ اور ۱۹۸۳ء) میں متعدد ایسے مخلص احباب نے سفر آخرت فرمایا جن کا حق تھا کہ ان کے حادثہ رحلت کا ذکر اور اپنے ناظرین سے اُن کے لیے دعائے مغفرت و رحمت کی استدعا کی جاتی جیسا کہ معمول رہا ہے۔ لیکن اس سال خود راقم سطور کی حالت زیادہ تر ایسی رہی کہ کچھ بھی لکھنا مشکل رہا، یہی ارادہ رہا کہ جب طبیعت بحال ہو گی تو ان شاء اللہ ان احباب مرحومین کے سفر آخرت، کا ذکر الفرقان میں کیا جائے گا اور ناظرین کرام سے ان کے لیے دعائے مغفرت کی استدعا، مگر اب تک اس کی نوبت نہیں آسکی۔

حال ہی میں اللہ کے ایک ایسے بندے کی وفات کی اطلاع ملی جنکو یہ عاجز اللہ کے مقبول بندوں میں سمجھتا تھا اور اس لیے ان کے ساتھ عقیدت و محبت کا خاص تعلق تھا۔ یہ مرشدی حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری قدس سرہ کے خلیفہ مجاز مولانا الحاج حافظ فتح محمد صاحب دہلوی تھے ـــــ راقم سطور نے جب کبھی رائے پور کی خانقاہ میں ان کو دیکھا ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ یہ خالص رجال آخرت میں سے ہیں اور اللہ کی رضا اور آخرت کی نجات و فلاح کے سوا ان کے سامنے زندگی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے ـــــ حضرت رائے پوریؒ کے وصال کے بعد دہلی میں قیام کر لیا تھا۔ مدت تک محلہ قریش نگر (صدر بازار دہلی) کی ایک مسجد کا حجرہ اُن کا مستقر رہا، بعض مخلص طالبین بھی ساتھ رہتے تھے، اُس زمانہ میں جب کبھی اس عاجز کا دہلی جانا ہوتا تو یہ خواہش رہتی کہ کم از کم ایک رات ان کا مہمان بنکر اُن کے ساتھ اسی حجرہ ہی میں رہوں، لیکن جہاں تک یاد ہے ایک دو دفعہ سے زیادہ اس کا موقع نہیں مل سکا۔

برسہا برس سے مرحوم ٹی بی کے مریض تھے، دونوں پھیپھڑے بہت زیادہ متاثر تھے، شریعت کا حکم اور سنت نبوی سمجھ کر علاج معالجہ بھی برابر کچھ نہ کچھ چلتا رہتا لیکن دن

اور رات کے مشاغل و معمولات بھی جاری رہتے ــــــ اِدھر بہت دنوں سے اُن کا کوئی عنایت نامہ نہیں آیا تھا جس سے مرض کی شدت یا تخفیف کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا۔ اب سے چند ہفتے پہلے ایک عنایت نامہ ملا تھا جس میں اپنی حالت کے بارے میں تو کچھ تحریر نہیں فرمایا تھا۔ البتہ اس عاجز سے یہ فرمائش کی تھی کہ دعائے ماثور "اللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْأَلُکَ ایماناً لایرتد ونعیماً لاینفد ومرافقۃ نبیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی اعلیٰ درجۃ الجنۃ جنۃ الخلد" جمع کے صیغے "اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْأَلُکَ" کے ساتھ پڑھا کروں اور اپنے ساتھ ان کی بھی نیت کیا کروں۔ یہ عنایت نامہ پڑھ کر میرا ذہن اس طرف بالکل نہیں گیا کہ مولانا کو غالباً اپنے وقت موعود اور سفرِ آخرت کا قرب محسوس ہوا ہے اس کی وجہ سے یہ فرمائش اس گنہگار سے کی گئی ہے۔ اور مجھے بھی اس طرف متوجہ کیا ہے کہ میں اس دعا کا اہتمام اور سفرِ آخرت کی فکر کروں ــــــ اب سے چند روز پہلے اُن کے خادم حافظ مطلوب حسین صاحب کے خط سے حادثۂ وفات کی اطلاع ہوئی تو ادھر ذہن گیا، اللہ تعالیٰ ان کو وہی درجہ عطا فرمائے جس کی وہ دعا کرتے تھے اور جس کی اس عاجز سے فرمائش کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے پہلے اس مبارک دعا کا اہتمام نصیب نہیں تھا مولانا مرحوم کی فرمائش کی برکت سے ہی کچھ نصیب ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے اور ان کی دعا اور آرزو کے مطابق اُن کے لیے جنۃ الخلد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرافقت مقدر فرمادے ــــــ ناظرین کرام سے بھی درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کے لیے اور اُن کے ساتھ اس عاجز کے لیے بھی یہ دعا فرمائیں۔

اوپر عرض کیا گیا تھا کہ گزرے ہوئے سال میں متعدد ایسے احباب مخلصین نے وفات پائی جن کا حق تھا کہ الفرقان میں ان کی رحلت کے ذکر کے ساتھ ان کے لیے دعائے مغفرت و رحمت کی استدعا کی جاتی، ان میں سے بعض حضرات کے بارے میں سطور ذیل میں لکھا جارہا ہے، اصل مقصد اِن مرحومین کے سفرِ آخرت کی اطلاع اور اُن کے لیے دعا کی استدعا ہی ہے، یہی چیز اُن کے کام آنے والی ہے اور دعا کرنے والوں کے لیے اجرِ عظیم کا وسیلہ۔

لے اے میرے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں ایسا ایمان جو ہمیشہ قائم رہے اور وہ نعمتیں جو ختم نہ ہوں، اور جنت کے اعلیٰ ترین درجہ ــــ جنۃ الخلد میں تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت

مرحوم مغفور مولانا محمد شکیل عباسی ندوی :۔

الفرقان میں دین وملت کے مخلص خادم قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کا ذکر بار بار آیا ہے، ان کی کتاب "تحریک خلافت" کی تلخیص بھی ایک مستقل شمارے میں شائع ہوئی تھی، مولانا محمد شکیل عباسی ندوی اُن کے چھوٹے بھائی تھے، ان کے بھی بعض مضامین الفرقان میں شائع ہوئے ہیں۔ راقم سطور کی نظر میں وہ مومن صالح، غیر معمولی درجہ کے فہیم وذکی اور دین وملت کے مخلص خادم تھے۔ تبلیغی کام سے بھی گہرا تعلق رہا تھا، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ نوراللہ مرقدہٗ کی نظر عنایت بھی نصیب ہوئی اور اُن کے فیوض سے بھی بہرہ یاب ہوئے۔ وہ ان بندگان خدا میں سے تھے جو باتیں بہت کم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کام زیادہ۔ اور شہرت نہ ہونے ہی میں خیریت سمجھتے ہیں ____ اپنے وطن بیارہ (ضلع بستی) میں ایک "بیت المال" قائم کر رکھا تھا جو معروف ومشہور تو نہیں لیکن کار خیر اور غریبوں کی خدمت کا مثالی ادارہ تھا۔

چند مہینے پہلے ان کی وفات کی اطلاع ملی تھی، اسی کے ساتھ معلوم ہوا تھا کہ اُن کے بعض قریبی اعزہ ان کے قائم کیے ہوئے "بیت المال" کو اسی منہاج پر چلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے صدقہ جاریہ کے طور پر اس کو جاری رکھے اور اُن کے ساتھ مغفرت اور رحمت کا معاملہ فرمائے۔"

مرحوم مغفور الحاج عبدالرحمٰن عبدالقادر نوردلی :۔

گجرات کے قدیم شہر پٹن کا ایک خوش نصیب تجارت پیشہ خاندان جس کو اللہ تعالیٰ نے دین کی دولت کے ساتھ دنیا کی دولت سے بھی نوازا ہے قریباً سوا سو ڈیڑھ سو سال پہلے سے جدہ میں سکونت پذیر ہے اسی کو اُس نے اپنا وطن بنا لیا ہے۔ یہ خاندان (غالباً) اپنے قدیم مورث نوردلی کے نام سے معروف ہے۔

جدہ میں ان کا قدیم طرز کا چار یا پانچ منزلہ مکان ہندوستان کے علماء ومشائخ کا گویا

مستقل مہمانخانہ ہے، دینداری اور اہل دین سے محبت اور ان کی خدمت اس خاندان میں متوارث چلی آرہی ہے۔ اب سے چند سال پہلے اس خاندان کے معمر بزرگ الحاج عبدالقادر نورولی رحمۃ اللہ نے وفات پائی تھی، الفرقان میں بھی ان کے حادثۂ وفات کا ذکر کیا گیا تھا۔ ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن نورولی نے مکہ مکرمہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، وہیں ان کا کاروبار تھا، مسجد حرام میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کا اہتمام نصیب تھا، اپنی خاندانی شرافت وخصوصیات کے ساتھ اردو میں لکھنے پڑھنے کا بھی خاص ذوق تھا گزرے ہوئے سال ہی میں اُن کی وفات کی بھی اطلاع ملی تھی۔ اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ مغفرت ورحمت کا خاص معاملہ فرمائے اور اس کا فضل وکرم پسماندگان کے شامل حال رہے۔

مرحوم مغفور حافظ محمد صدیق المیمنی مہاجر مکیؒ :-

بمبئی میں ایک معروف وممتاز شخصیت حاجی احمد غریب صاحب کی تھی، ان پر اور ان کے گھرانے پر بھی اللہ تعالیٰ کا یہ فضل تھا کہ دین سے تعلق اور دین وملت کے درد کے ساتھ دنیوی دولت ووجاہت بھی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی ——— اب سے قریباً ۲۰۔۲۵ سال پہلے ایسے حالات سے سابقہ پڑا کہ یہ خاندان ہندوستان کی سکونت ترک کرنے پر مجبور ہوا ——— حاجی احمد غریب صاحب کراچی چلے گئے، اور کچھ عرصہ بعد وہیں وفات پائی (رحمہ اللہ تعالیٰ) اُن کے چھوٹے بھائی حافظ محمد صدیق صاحب المیمنی حجاز مقدس چلے گئے اور مکہ معظمہ کو اپنا وطن بنا لیا، حافظ صاحب پر پہلے سے بھی صلاح کا غلبہ تھا اور غالباً وہی ان کو مکہ معظمہ لے گیا تھا، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ نور اللہ مرقدہٗ سے بیعت واصلاح کا تعلق تھا۔ پھر بلد اللہ الحرام کے قیام کے بعد جیسا کہ ہونا چاہیے تھا انابت الی اللہ کے جذبہ میں ترقی ہوگئی۔ راقم سطور کو اس زمانے میں جب مکہ مکرمہ حاضری نصیب ہوئی تو اکثر دیکھا کہ حافظ صاحب جماعت کے مقررہ وقت سے کافی پہلے مسجد حرام آجاتے اور طواف یا نوافل یا تلاوت میں مشغول رہتے ——— دینی اور اصلاحی کتابوں کے مطالعہ کا بھی خاص اہتمام رکھتے تھے، "الفرقان" بھی مستقل منگواتے تھے، اور معلوم ہوا ہے کہ کئی کئی سال کے لیے بدل اشتراک پیشگی بھیجدیتے تھے۔

یہ عجیب اتفاق ہوا کہ جس دن جناب الحاج عبدالرحمٰن وزولی صاحب نے وفات پائی، اسی دن حافظ صاحب بھی آخرت کے سفر پر روانہ ہوئے، ان میں سے ایک صاحب کی نماز جنازہ حرم شریف میں ظہر کی نماز کے بعد پڑھی گئی اور دوسرے صاحب کی عصر کی نماز کے بعد، اور دونوں مکہ مکرمہ کے قبرستان جنۃ المعلاۃ میں مدفون ہوئے جہاں ہم سب اہل ایمان کی سب سے بڑی اماں جان حضرت خدیجہ صدیقہ آرام فرما ہیں اور ہمارے قریبی اکابر میں سے حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ وغیرہ
اللہ تعالیٰ ان سب مرحومین کے ساتھ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔

مرحوم و مغفور الحاج محمد میاں صاحب

اللہ تعالیٰ کے بہت سے مخلص بندے ہیں جو محض کسی حسن ظن کی بنا پر راقم سطور سے اخلاص و محبت کا وہ تعلق رکھتے ہیں جس کا یہ عاجز مستحق نہیں۔ انہی میں سے ایک صاحب احمد آباد کے محمد میاں زری والے تھے، طویل مدت سے مختلف امراض و عوارض کی وجہ سے چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے تھے، ذیابیطس کے اثر سے بینائی بھی باقی نہیں رہی تھی، وہ بھی گزرے ہوئے سال میں راہی ملک بقا ہو گئے۔ ان کو الفرقان سے بھی بڑا گہرا تعلق تھا، اور چونکہ وہ طویل مدت تک مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ اللہ تعالیٰ کی ادارت میں شائع ہوتا رہا تھا اس لیے اُن سے بھی اُن کو محبانہ تعلق تھا، قدرتی طور پر ہم لوگوں کے دلوں میں بھی اُن کے اخلاص و محبت کی بڑی قدر تھی، چنانچہ گزشتہ سال جب مولوی عتیق الرحمٰن چند روز کے لیے لندن سے یہاں آئے تو یہیں سے یہ نیت کر کے آئے تھے کہ اگر ممکن ہوا تو وہ محمد میاں صاحب کی عیادت و ملاقات کے لیے احمد آباد بھی جائیں گے۔
جب انھوں نے مجھ سے اپنے اس ارادہ کا ذکر کیا تو میں نے ہی ان کو ان کے سفر آخرت کی اطلاع دی۔ اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔

محمد منظور نعمانی

ایک ضروری اعلان ہم نے ماہ مئی ۸۳ء کے شمارے میں اعلان کیا تھا کہ وی پی محصول میں زبردست اضافہ کے باعث مدت خریداری ختم ہو جانے پر خریداروں کو رسالہ ذریعہ وی پی نہیں بھیجا جائے گا۔ **لیکن** ہمارے ۷۵ فیصد خریداروں نے لکھا کہ رسالہ وی پی ہی سے بھیجا جائے۔ **لہٰذا** اب مدت خریداری ختم ہونے پر چندہ یا اطلاع نہ ملنے کی صورت میں اگلا شمارہ وی پی سے ہی روانہ کیا جائے گا۔

انتخاب

طریقت کے اہم اصول

از:- افادات و ملفوظات حضرت مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت والا نے معتبر کتابوں سے طریقت کے کچھ اصول بیان فرما کر ارشاد فرمایا کہ الاصل الاول:- میرے نزدیک تو سب سے پہلے حُسنِ نیت ہے جس کو اخلاص کہا جاتا ہے۔ یہ اصل الاصول ہے اور اس آیت سے ثابت ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں "وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" (حالانکہ ان لوگوں کو (کتب سابقہ) میں یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اُسی کے لیے خاص رکھیں)

نیز اس حدیث سے ثابت ہے۔

انما الاعمال بالنیات وانما لامریٍٔ مانوی فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہٗ الی دُنیا یصیبھا او امرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ تمام اعمال کا مدار نیت پر ہے۔ اور آدمی کے لیے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے اس کی ہجرت واقعی اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے، اور جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہے کہ اس کو حاصل کرے یا کسی عورت کی طرف ہے جس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی چیز کی طرف ہے جس کے لیے اُس نے نیت کی۔

پس کہنا چاہیے کہ الاصل الاول النیۃ والاخلاص۔

الاصل الثانی:- اور دوسری اصل خُلق حسن ہے۔ اس سے مراد خُلق باطنی ہے اور اخلاق حسنہ میں سب سے فاضل اور اصل تواضع ہے اور سب اسی سے حاصل ہو جاتے

سب کا مدار یہی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ من تواضع للہ رفعہ اللہ ۔ (جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بلندی عطا فرماتے ہیں۔ اور اخلاق سیئہ اس کی ضد ہیں۔ اور تمام اخلاق سیئہ میں اصل تکبّر ہے اور باقی سب اس کے تابع ہیں اور اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ؎

زاہد غرور داشت سلامت نبرد راہ   رند از رہِ نیاز بدار السلام رفت

اور اسی معنی میں کہا گیا ہے ؎

بچا لیا مجھے اے شیخ چشم ساقی نے   غرور زہد سے کا سرور ہی اچھا
دلِ شکستہ میں رہتا ہے بادۂ عرفاں   سُنا ہے میں نے کہ یہ شیشہ چور ہی اچھا

پس تکبّر کو چھوڑنا اور تواضع اختیار کرنا طریق کے مہمات میں سے ہے اور بہت ضروری ہے۔

الاصل الثالث :- ایسے لوگوں سے اختلاط اور صحبت جو اس کے ہم جنس اور اس کام میں متحد ہیں یہ بھی از بس ضروری ہے۔ بلا مجاہدہ بہت سے ملکات حسنہ اس اختلاط اور صحبت سے حاصل ہو جاتے ہیں اور اس کے خلاف میں یعنی ایسے لوگوں سے اختلاط جو کام میں متحد نہیں ہوتے سخت ضرر کا سبب بنتا ہے۔ کما ھو مشاھدٌ۔

الاصل الرابع :- دُنیا کے علائق میں عدم انہماک! یہ بھی طریق کی ایک بڑی اصل ہے اس لیے کہ یہ انہماک بھی خالق اور مخلوق کے تعلقات کی تحصیل میں نہایت درجہ مضر ثابت ہوتے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے ؎

تعلق حجاب ست و بے حاصلی   چو پیوندہا بگسلی واصلی

یعنی دنیا کا تعلق حجاب ہے اور اس کے ساتھ مقصود حاصل نہ ہوگا۔ جب ان تعلقات کو توڑ دوگے تب واصل ہو گے۔

اکل حلال بھی اسی میں داخل ہے حرام سے بڑے بڑے نقصانات ہوتے ہیں جیسا کہ بد پرہیزی سے ہوتے ہیں۔

اکابر طریق کا ارشاد ہے وہ فرماتے ہیں کہ

طالب صادق کہ در صحبت کامل افتد و شرائط طلب کہ اکابر قرار دادہ اند بجا آرد امید است کہ البتہ واصل گردد۔ و آنچہ گفتیم کہ در صحبت کامل افتد زیرا کہ از ناقص خود واصل نیست دیگراں راچگونہ واصل سازد۔

جو طالب صادق کسی کامل کی صحبت اختیار کرے اور طلب کے وہ شرائط جن کو اکابر نے مقرر فرمایا ہے، بجالائے تو امید ہے کہ یقیناً واصل ہو جائے گا۔ اور میں نے جو یہ کہا کہ کامل کی صحبت اختیار کرے وہ اس لیے کہ ناقص سے کامل نہیں پیدا ہو سکتا کیونکہ ناقص تو خود واصل نہیں ہے دوسروں کو کیا واصل بنائے گا۔

سبحان اللہ کیسی عمدہ بات ارشاد فرمائی اور ناقص کی صحبت سے احتراز پر کیسے بلیغ انداز میں تنبیہہ فرمادی۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ

"مضر ترین چیزہا صحبت ناقص است و ناقص دریں باب نزد من کسے ست کہ او را غم کمال و تاسف بر احوال خود نیست و آں کہ او را غم ایں کار است و درکمال او اگر ہر چند کامل نہ باشد در صحبت وے ضررے نیست۔"

یعنی سب سے زیادہ مضر شے ناقص کی صحبت ہے۔ اور میرے نزدیک ناقص وہ ہے جسے اپنے کمال کا غم اور بدحالی پر افسوس نہ ہو۔ اور جس کو اپنے کمال کا غم ہو ہر چند وہ کامل نہیں ہے۔ مگر اس کا رخ کمال کی طرف ہے اور ایسے شخص کی صحبت میں کوئی ضرر نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جسے اپنے نقصان کی خبر ہو اور اس کو دور کرنے کی فکر ہو اس کی صحبت مضر نہیں۔ اس غم کی وجہ سے وہ دوسروں میں بھی کمال کا غم اور فکر تو پیدا کرہی دے گا۔ یہ بھی کچھ کم نہیں۔ درد نایافت بھی حاصل ہو جائے تو بہت کچھ حاصل ہو گیا۔ آج یہی غم ہی تو نہیں پیدا ہوتا۔

قطب عالم، شیخ الشیوخ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کسی طالب کو تحریر فرماتے ہیں کہ "اگر بعد مجاہدہ ہزار سال حسرت و درد نایافت حاصل ہو جائے تو سب کچھ حاصل ہے۔"

(بشکریہ معرفت حق الہ آباد)

ممالک غیر سے

بحری ڈاک سے ۳ پونڈ

ہوائی ڈاک سے ۹ پونڈ

ایک شمارہ کی قیمت ہندوستان میں

۲/۵۰

چندہ سالانہ

ہندوستان میں -/۲۵

پاکستان سے پاکستانی سکہ میں -/۶۰

بنگلادیش سے ہندوستانی سکہ میں

-/۳۰

جلد (۵۲) بابت مارچ و اپریل ۱۹۸۴ء مطابق جمادی الثانیہ و رجب ۱۴۰۴ھ شمارہ (۳ و ۴)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی روانہ کیا جائے گا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں اگر دوبارہ بھیجنے کے لیے دفتر میں پرچہ ہوگا تو ضرور بھیجا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار حضرات مبلغ ۵۰ روپے ہندوستانی سکہ میں کسی بھی ذریعہ سے دفتر الفرقان لکھنؤ کو روانہ فرمائیں یا پاکستانی سکہ میں ۶۰ روپے ناظم ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیج دیں۔

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

گذشتہ شمارے میں ان صفحات میں راقم سطور نے خیرآباد (سیتاپور) اور اڑیسہ کوٹ کے تبلیغی اجتماعات اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہونے والے تعلیمی اجتماع کا تذکرہ کیا تھا۔ متعدد قارئین کرام نے یہ فرمائش کی ہے کہ ان اجتماعات کی کچھ روئداد بھی ان صفحات میں آجائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس فرمائش کی تعمیل کے بارے میں یہ ناچیز ان سطور کی تحریر کے وقت تک متردد ہے۔ اس لیے کہ دعوت و تبلیغ کی یہ جدوجہد اپنے اندر انفرادیت کی جو سیکڑوں وجوہ رکھتی ہے اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں جو کچھ ہے وہ عملی ہے۔ اس کے اسرار و حکم، اس کے اصول و آداب، اس کے مقاصد و منافع، اس کی نزاکتیں اور علمی بنیادیں، اتھاہ سمندر کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے ہیرے جواہرات کی مانند ہیں۔ سمندر کی سطح بالعموم نہایت پرسکون رہتی ہے اور اوپر سے پانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، مگر اس کی تہہ میں کیسے کیسے نادر اور بیش قیمت جواہرات چھپے رہتے ہیں جن تک ہر کس و ناکس کی رسائی نہیں ہوتی بلکہ ہر ایک کو نظر بھی نہیں آتے ــــ اور اسی لیے اس کام کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے قلم کی ترجمانی کافی نہیں ہے۔ جب تک مسلسل عملی طور پر مجاہدہ اور مشقت کے ساتھ، طالبانہ جذبہ، اصولوں کی پابندی اور دعاؤں کے اہتمام کے ساتھ شرکت نہیں ہوتی اس کام کی گہرائیاں ذہن و فکر پر نہیں کھلتیں ــــ سیدھی سادھی زبان میں یہی بات عام طور پر یوں کہی جاتی ہے کہ یہ کام سمجھ کے کرنے کا نہیں بلکہ کر کے سمجھنے کا ہے۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب (اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل کرے)

نے ایک مکتوب میں لکھا تھا:

"تمام انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے زمانہ میں کسی نہ کسی نقشے کے مقابلے پر آئے اور بتایا کہ کامیابی کا اس نقشے سے بالکل تعلق نہیں ہے۔ کامیابی کا تعلق براہِ راست اللہ جل شانہ کی ذات عالی سے ہے۔ اگر عمل ٹھیک ہوں گے اللہ جل شانہ چھوٹے نقشے میں بھی کامیاب کر دیں گے اور عمل خراب ہوں گے تو اللہ جل شانہ بڑے سے بڑے نقشے کو توڑ کر ناکام کر کے دکھائیں گے۔ کامیاب ہونے کے لیے اس نقشے میں عمل ٹھیک کرو۔ ہر نبی نے اپنے رائج الوقت نقشے کے مقابلے پر محنت کی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اکثریت، حکومت، مال، زراعت اور صنعت کے تمام نقشوں کے مقابلے پر تشریف لائے، آپ کی محنت ان نقشوں سے نہیں چلی، آپ کی محنت مجاہدوں اور قربانیوں سے چلی ہے، باطل تعیش کے نقشے سے پھیلتا ہے تو حق تکلیفیں اٹھانے سے پھیلتا ہے۔ باطل ملک و مال سے چمکتا ہے۔ جتنے فتنے ملک و مال اور تعیش کی بنیاد پر لائے جارہے ہیں، ان کا توڑ حق کے لیے فقر و غربت اور تکالیف برداشت کرنے میں ہے۔ اب اس کام کے ذریعہ امت میں مجاہدہ اور قربانی کی استعداد پیدا کرنی ہے اس کام کے لیے بہت بڑا خطرہ یہ ہے کہ اس کو نقشوں پر منحصر کر دیا جائے، اس سے کام کی جان نکل جائے گی، اسی کام کی حفاظت اسی میں ہے کہ کام کرنے والے اس کام کے لیے تمام میسر نقشوں کو بھی قربان کرتے ہوئے مجاہدے والی شکلوں کو قائم رکھیں اور کسی صورت میں مجاہدے والی شکلوں کو ختم نہ ہونے دیں۔ غریبوں میں اپنی محنت کو بڑھایا جائے، پیدل جماعتیں چلائی جائیں لوگ آئیں گے کہ یہ ہمارا پیسہ دین کے کام میں خرچ کر لیجیے پھر نقشہ کی قربانی دینی ہوگی۔ کہہ دیجیے کہ جناب یہاں اس کام میں خرچ کرنے کا صحیح اور پاک طریقہ و جذبہ سکھایا جاتا ہے پھر محل تلاش کر کے خود خرچ کر دیجیے گا۔ یہاں تو طریقہ سیکھ لیجیے۔

اس کام کی تعمیم کے لیے رواجی طریقوں، اخبار، اشتہار، پریس وغیرہ اور رواجی الفاظ سے بھی پورے پرہیز کی ضرورت ہے یہ کام سارا غیر رواجی ہے۔ رواجی طریقوں سے رواج کو تقویت پہنچے گی۔ اس کام کو نہیں ......" (ماخوذ از سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی مصنفہ مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمہ اللہ)

بہرحال راقم سطور کو جو تردد مذکورہ بالا اجتماعات کی روداد ان صفحات میں لکھنے کے بارے میں تھا اور جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اس کی بنیاد تبلیغی کام کی یہی مزاجی خصوصیت ہے جسے ہر قیمت باقی رکھنا ضروری ہے۔

دوسری طرف ایک پہلو یہ بھی تھا کہ الفرقان کے بیشتر ناظرین وہ ہیں جن کا کسی نہ کسی درجہ میں عملی تعلق اس جد و جہد سے ہے اور ان کے بارے میں یہ خطرہ نہیں ہے کہ وہ بس کچھ پڑھ کر یہ سمجھ لیں گے کہ ہم اس کام کو سمجھ گئے، بلکہ ان شاء اللہ عملی مجاہدہ میں ترقی ہی ہو گی ——— اور اس پہلو کا تقاضا اول الذکر پہلو سے مختلف تھا۔

بالآخر یہ طے کیا کہ بجائے مستقل مضمون لکھنے کے ایک خط شائع کر دیا جائے جو ناچیز راقم سطور نے عالمی شہرت کی حامل ایک اسلامی عربی یونیورسٹی میں زیر تعلیم اپنے بعض رفقاء و احباب کے نام لکھا ہے اور جس میں ان اجتماعات کی روداد لکھی ہے ——— ذیل میں ناظرین کرام وہی خط ملاحظہ فرمائیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے نافع بنا دے۔ اور اس کے شر سے راقم کی، تمام قارئین کی اور اس جد و جہد کی حفاظت فرمائے۔

رفقائے گرامی قدر ......! حفظکم اللہ و دعاکم و نفعنی بما آتاکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ بہت دنوں سے آپ لوگوں کی خیریت معلوم نہ ہوئی، اور دو حبیب سے کوئی خبر نہ آئی۔ دو تین ماہ پہلے ایک خط میں نے لکھا تھا اس کی رسید نہ ملنے سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کو نہیں ملا گذشتہ ماہ کا الفرقان اگر نظر سے گذرا ہو گا تو اس سے فروری کے اواخر اور مارچ کے اوائل میں خیر آباد (سیتا پور) اور پریہ کوٹ (پورینہ) میں ہونے والے

اجتماعات اور ندوہ میں نصاب تعلیم سے متعلق مذاکرہ علمی کے پروگرام کی خبر ملی ہو گی۔ پرسوں سے یہ خیال آرہا ہے کہ آپ حضرات کو ان اجتماعات کی کچھ کارگذاری سنائی جائے ــــــ کہ جب میں وہاں تھا تو یہاں کے اجتماعات کے حالات جاننے کے لیے بے قراری کے ساتھ دوستوں کے خطوط کا منتظر رہا کرتا تھا۔

خیرآباد ضلع سیتاپور کا تاریخی قصبہ ہے، ایک زمانہ میں اس کی ایک ممتاز دینی و علمی حیثیت رہی ہے، خیرآبادی علماء کا سلسلہ شمالی ہندوستان کے علمی سلسلوں میں اہمیت کے ساتھ ذکر ہوتا ہے، لیکن اب اس کی اور اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے قصبات کی حالت یہ ہے کہ دین و دنیا دونوں پر دھول اڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جہالت اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تمام برائیاں ہر چہار طرف پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں، بڑی بڑی حویلیاں ویران کھنڈروں میں تبدیل ہو گئی ہیں، گذشتہ سال جھانسی کے اجتماع کے بعد سے جب سے یہاں کا اجتماع طے ہوا مختلف قصبوں اور شہروں، صوبوں اور ملکوں کی جماعتوں کو اس طرف بھیجا جانے لگا اور جیسے جیسے اجتماع کا وقت قریب آتا گیا جماعتوں کی آمد اور محنت میں مزید اضافہ ہی ہوتا چلا گیا، اور اجتماع سے ایک دو ماہ قبل تو یہ نقشہ سامنے آیا کہ یو۔پی اور خصوصاً مشرقی یوپی کے ایک ایک قصبے اور ایک ایک گاؤں میں دور اور قریب کی کئی کئی جماعتیں پہنچتی رہیں اور حسب توفیق اللہ کے بندوں سے مل مل کر اللہ کے دین کی عظمت اور صحیح دین کو اپنی زندگی میں لانے کے لیے صحیح محنت کی ضرورت کا احساس دلاتی رہیں، بیشتر جماعتیں لکھنؤ سے گزرتی تھیں اس لیے ان سے حالات بھی معلوم ہوتے رہتے تھے، یہ خبریں بھی ملتی رہیں کہ فضا بن رہی ہے، اور لوگ اجڑ رہے ہیں، اور یہ بھی سننے کو ملا کہ ہمیں مسجد سے نکال دیا گیا، اور اذیت پہنچائی گئی۔

اجتماع ۲۷ فروری کو شروع ہونے والا تھا، لکھنؤ سے سینکڑوں بسیں مختلف محلوں سے ۲۵ کی شب میں بعد عشاء روانہ ہوئیں، ندوہ سے بھی تین بسیں گئیں، جس پنڈال میں بندہ کا قیام مشورہ سے طے کیا گیا تھا اس میں ندوہ کے دو سو طلبہ کے علاوہ لکھنؤ شہر کے خواص کا بھی قیام تھا۔

موسم سخت سردی کا تھا اور آنے والے مجمع کی تعداد منتظمین کے اندازہ سے بہت زیادہ

ہوگئی تھی، اس لیے ہزاروں لوگ سخت سردی کی رات میں کھلے آسمان کے نیچے رہے، آنے والوں کی بہت بڑی تعداد ان کی تھی جو اجتماع کے مقصد اور محنت سے واقف تھے، اور بہت بڑی تعداد ان کی تھی جو بس دینی اجتماع کی کشش سے صرف ثواب و برکت کے حصول کی نیت سے آئے تھے، اللہ کے کرم اور نظام سے امید یہی ہے کہ کوئی محروم نہ رہے گا، بعض ذمہ داروں سے اس کا ذکر آیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ بھیڑ ان قصبات سے آئی ہے جہاں کی اکثریت اس کام کی سخت مخالف تھی، ان کے آنے کی ہم کوتاہ بینوں اور ظاہر کے اسیروں کو زیادہ توقع نہیں تھی، لیکن اللہ نے ان کے دل میں ڈالا اور وہ یہاں آگئے، اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ ظاہری حالات، جن پر بار بار ہماری نگاہ اٹک جاتی ہے، کا بے حقیقت ہونا ظاہر ہوگیا اور دوسرا فائدہ انشاء اللہ یہ ہوگا کہ یہاں آنے اور اس فضا کو دیکھنے کے نتیجہ میں ان لوگوں کو اس کام کی عظمت مقبولیت اور ضرورت کا احساس ہوگا تو انشاء اللہ جب جماعتیں ان کے پاس پہونچ کر ان کے سامنے دین کو سیکھنے کے لیے کچھ وقت فارغ کرنے کا مطالبہ کریں گی تو ان کے لیے قدم اٹھانا آسان ہو جائے گا، بہرحال اجتماع تینوں دن جاری رہا دوسرے دن تین خصوصی اجتماع بھی ہوئے ایک تو علماء کرام اور طلبۂ علم کا، دوسرا خواص کا، اور تیسرا اجتماع غیر ملکی جماعتوں کا، سیتاپور شہر میں ایک اجتماع مستورات کا بھی ہوا۔

ہمارے ساتھ جو خواص تھے ان میں کئی اعلیٰ سرکاری افسران بھی تھے جس ستعدی اور جس محنت و مشقت کے ساتھ یہ حضرات تمام پروگراموں میں شرکت کرتے تھے اس سے مجھ جیسوں کو بڑا سبق ملا، ان میں سے ایک صاحب سے دوران گفتگو جب میں نے یہ کہا کہ آپ حضرات کے حق کے مطابق راحت رسانی کا انتظام نہ ہوسکا تو وہ آبدیدہ ہوکر کہنے لگے کہ مولانا! زندگی میں پہلی مرتبہ تو اسلام کا لطف آیا ہے، اور مسلمان ہونے کا مطلب سمجھ میں آیا ہے ایسا یہ سب کہہ کر مجھے اور گنہگار نہ کیجیے، یہ دعا کیجیے کہ جو وقت باقی ہے اس میں پچھلی زندگی کی تلافی کی توفیق ہو،

۲۷ فروری دوپہر بارہ بجے دعا پر اجتماع ختم ہوا، تقریباً دو سو جماعتیں

اللہ کی راہ میں نکلیں، والد اجداد حضرت مولانا علی میاں دامت برکاتہم بھی وہاں تشریف لے گئے، حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب، حضرت مولانا ابرار الحق صاحب، اور حضرت مولانا صدیق صاحب دامت فیوضہم بھی وہاں موجود تھے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اجتماع کو قبول فرمائے اور ایک ایک آنے والے کو اسلام کے ہر شعبہ میں اللہ پر یقین اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہج کے اتباع کے ساتھ زندگی گذارنا نصیب ہو۔

ہم لوگ اجتماع کے بعد فوراً ہی لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئے اور سہ پہر تک لکھنؤ پہنچ گئے، پہلے سے طے شدہ نظام کے مطابق حضرت مولانا انعام الحسن صاحب دام ظلہ اور ان کے رفقاء کا قافلہ مغرب کے وقت ندوہ پہونچ گیا، حضرت مولانا علی میاں دامت برکاتہم اس قافلہ کی پذیرائی کے لیے یہیں موجود تھے، بعد مغرب طلبہ کے سامنے مولانا عبید اللہ صاحب نے بات فرمائی بہت سے طلبہ نے اپنے ارادوں کا اظہار بھی کیا، عشا کے کچھ دیر بعد یہ قافلہ مشرقی یوپی اور بہار کے سفر پر روانہ ہو گیا، بارک اللہ فیہم حالین و مرتحلین۔

دوسرے ہی دن یعنی ۲۰؍ فروری سے ہمارے دار العلوم میں کتب خانہ اور مجلس تحقیقات کی نئی عمارتوں کا افتتاح اور تاریخ ندوۃ العلماء کے اجراء کی تقریبات منعقد ہونے والی تھیں، ۲۰؍ کی صبح ہی سے اس کے لیے شمال و جنوب کے مختلف مدارس کے نمائندے اور ہندوستان میں علوم اسلامیہ کے حفاظتی دستے کے قائدین اور سپاہی پہنچنے لگے تھے، اور ندوہ میں علم و دعوت کے دریاؤں کا یہ سنگم (مجمع البحرین بلکہ مجمع بحار الانوار) اہل شعور کے جذبات میں عجیب تلاطم برپا کر رہا تھا، تین دن پہلے جب میں سیتاپور کے لیے روانہ ہوا تھا تب تک تیاریوں کی رفتار سب کے لیے تشویش انگیز تھی، لیکن صرف تین دن کے بعد سیتاپور سے واپسی پر جو منظر دیکھا وہ حیرت انگیز تھا، ہمارے بعض اساتذہ کرام اور عزیز طلبہ کی شب و روز کی محنت سب کی آنکھوں کے سامنے تھی، تیاریاں مکمل تھیں اور سب کچھ تیار تھا۔

۲۸ر کی صبح ساڑھے دس بجے کتب خانہ کی نئی عمارت کا افتتاح ہونا تھا وقت مقررہ پر سب حضرات کتب خانہ جدید کے زیریں ہال میں جمع ہو چکے تھے۔ قاری ... صاحب نے تلاوت کلام پاک سے جلسہ کا آغاز کیا، تلاوت سے زیادہ آیات کے انتخاب نے عجیب سماں باندھ دیا لیجیے آپ بھی ان آیات سے محظوظ ہوئیے جو آیات قاری صاحب نے منتخب کی تھیں، ان میں سے چند یہ تھیں: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا
اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ
اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ○ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ○ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ○

میرا تو احساس ہے اور بعض دیگر رفقاء نے بھی اس کی تائید کی کہ آیات کے اس انتخاب نے پوری نشست بلکہ پورے اجتماع کا ایک رخ متعین کر دیا۔ اس کے بعد حضرت مولانا علی میاں دامت برکاتہم کی افتتاحی تقریر ہوئی جس کی تفصیل آپ حضرات "تعمیر حیات" میں پڑھیں گے۔ حضرت مولانا کی تقریر کا ایک ایک لفظ مولانا محمد علی مونگیری بانیٔ ندوۃ العلماء کے ذوق ایمانی اور علامہ شبلی نعمانی کے علمی و تحقیقی ذوق کی سلیمانی جامعیت کا ترجمان اور داعی تھا۔ اس تقریر کے بعد متعدد مقالات بھی پڑھے گئے، اور اسی نشست میں تاریخ ندوۃ العلماء کا سیٹ بانیٔ ندوۃ العلماء کے صاحبزادے حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ جو اس نشست کی صدارت بھی فرما رہے تھے کو پیش کر کے حضرت مولانا دامت برکاتہم نے اس کا اجراء بھی کیا۔ اسی دن عصر بعد النادی العربی کی طرف سے معزز مہمانوں کو استقبالیہ دیا گیا، اور بعد نماز مغرب مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی نئی عمارت کا افتتاح بھی ہوا۔

اگلے دن ۲۹ر کی صبح نو بجے کتب خانہ قدیم "عباسیہ ہال" میں نصاب تعلیم کے متعلق علمی مذاکرہ کا آغاز حضرت مولانا کی افتتاحی و تمہیدی تقریر سے ہوا جس کا مرکزی مضمون یہ تھا کہ ہندوستان میں جو نصاب تعلیم رائج ہے اس پر ایرانی ثقافت کا متعدد

سیاسی اور تاریخی عوامل کی وجہ سے گہرا اثر ہے اور یہ کہ ایرانی ذوق و مزاج اور عربی طرز فکر میں کئی اہم فرق ہیں، نیز اس نکتہ کی وضاحت کہ اسلام کا عربیت سے کیا تعلق ہے؟ اور اس سے اس کے مجموعی مزاج پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس کی روشنی میں ہمارے نصاب تعلیم میں کس نوعیت کی اصلاح کی ضرورت ہے۔[1] اس کے بعد اس موضوع پر متعدد مقالات پیش کیے گئے جو عنقریب "تعمیر حیات" کی خاص اشاعت میں شائع کیے جائیں گے۔

دو دن تک مسلسل نصاب تعلیم پر مختلف نقطہائے نظر اور مختلف مکاتب فکر کے مذکروں اور تبصروں سے "عباسیہ ہال" گونجتا رہا۔ الحمدللہ بہت خوش اسلوبی کے ساتھ ہر مکتب فکر کے خیالات سے استفادہ کا مثبت رجحان تمام تر کار مذاکرہ پر غالب رہا۔ نصاب تعلیم میں ضروری اصلاح و تغییر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس مذاکرہ میں ہمارے ملک کے مشہور و دقیق النظر عالم اور قاضی شریعت مولانا مجاہد الاسلام صاحب کی سربراہی میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی تھی، اس کی پیش کردہ تجویز کو باتفاق رائے منظور کر لیا گیا وہ تجویز بھی امید ہے کہ انشاء اللہ تعمیر حیات میں آجائے گی۔

---

۲۵ مارچ کی صبح بندہ ایک جماعت کے ساتھ جس میں دار العلوم کے طلبہ اور برادر مکرم مولوی خطیب عالم صاحب استاذ معہد دار العلوم اور لکھنؤ شہر کے بعض حضرات تھے، اڑیسہ کورٹ "پوریہ" کے اجتماع کے لیے روانہ ہوا اور اگلی صبح ہماری جماعت بسہولت و عافیت تمام اپنی منزل پر پہونچ گئی، آپ حضرات کے علم میں شاید آیا ہو کہ وہ علاقہ سخت سازشوں اور خطرات میں گھرا ہوا ہے، اخبارات کی اطلاعات برابر تشویش میں اضافہ کر رہی تھیں، اجتماع گاہ کی حدود سے بندرہ بیس کلومیٹر پہلے سے فضا کا کم اندازہ ہو رہا تھا اور جس کا واضح اور اک اجتماع گاہ پہونچکر اور وہاں کے حالات کو دیکھ کر اور لوگوں سے سنکر ہوا وہ ان سب اندیشوں کے بالکل برعکس تھا، بہت بڑی تعداد میں برادران وطن مخصوص عقیدت و احترام کے جذبات کے ساتھ اور محو حیرت بنے ہوئے شریک ہوئے تھے، دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ انھیں میں سے سینکڑوں عورتیں اور بچے آنے جانے والوں خصوصاً بزرگوں کی سواریوں اور قدموں سے

[1] یہ تقریر اسی شمارے میں پیش کی جا رہی ہے۔

اڑنے والی دھول بڑھنے ہیں لگے تھے، انھیں میں سے بہت سے دیکھنے والوں نے اجتماع میں آجانے والوں کو بغیر کسی ابرت کے منتقل کیا، عمومی اجتماع میں خصوصاً حضرت مولانا انعام الحسن صاحب دامت برکاتہم کے اختتامی بیان اور دعا میں بہت بڑی تعداد میں غیر مسلم عوام و خواص نے شرکت بھی کی، اللہ تعالیٰ اس فضا کو اس علاقہ اور اس پورے ملک میں قائم فرمائے، اور دامت کی داعیانہ حیثیت اور اسلام کی صحیح تصویر اپنی حقیقت کے ساتھ ہماری زندگیوں میں رچ بس کر تمام دنیا کے انسانوں کے سامنے اس طرح آئے کہ سلیم قلوب کے لیے اس کے قبول کرنے میں کوئی حجاب باقی نہ رہے، شیطان کی کیسی تلبیس یہ ہے کہ اس نے غلبۂ اسلام کی تمنا رکھنے والوں کو ایسا طرز فکر و عمل دے دیا ہے جس میں منفی اور نفرت انگیز پہلو غالب رہتے ہیں اور رحمت و شفقت اور حقیقی ہمدردی و خیر خواہی پر حاکمانہ اور جارحانہ طرز بیان کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ غیر تو غیر اپنوں کو بھی دعوت میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی!

ہم لوگ ہفتہ کی صبح اوریہ کوٹ پہنچے تھے، جمعرات سے وہاں اجتماع شروع ہو چکا تھا، حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری (متعنا اللہ بطول بقائہ) کا آخری بیان ہدایات چل رہا تھا، اس کے بعد حضرت مولانا انعام الحسن صاحب دامت برکاتہم کا بیان شروع ہوا صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہاں کے حالات اور فضا کے عین مطابق تمام انسانوں کے لیے اسلام کے پیام رحمت اور مزاج انسانیت کی دعوت اللہ اپنے اس داعی بندہ سے پہنچا رہا ہے، بیان کے بعد طویل دعا ہوئی، دعا کے وقت پورے مجمع کی جو کیفیت تھی وہ ناقابل بیان ہے، میں نے خود بہت سے غیر مسلموں کو بھی دعا میں روتے ہوئے دیکھا جو ہمارے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

دعا کے بعد اللہ کی راہ میں نکلنے والوں کا جماعت وار حضرت سے مصافحہ شروع ہوا، الحمد للہ کہ تقریباً چھ سو جماعتیں اس اجتماع سے نکلیں۔ جماعتوں کی اصلی تعداد اس سے کافی زیادہ تھی، لیکن جماعتوں کے چلانے والے احباب کی کمی کی وجہ سے دو، دو جماعتوں کو ضم کر کے ایک ہی جماعت بنا دیا گیا ___ اللہ تعالیٰ اس اجتماع سے اور ہر جگہ دین کی حقیقت اور ایمانی صفات کو اپنے اندر اتارنے اور پورے دین کو دنیا میں قائم کرنے والی اس جدوجہد کو سیکھنے، برتنے اور پھیلانے کے لیے نکلنے والوں کے ایک ایک قدم کو قبول فرمائے اور ہر

شش جہت سے ان کی ہر طرح کی حفاظت فرمائے، اور ان کی بہترین تربیت فرمائے۔
شنبہ کی شام سے تین دن کا خصوصی اجتماع شروع ہوا جس میں خاص طور سے ان احباب کو جمع کیا گیا تھا جو اس کام کو اپنے اپنے علاقوں میں لے کر چل رہے ہیں۔ پہلا بیان حضرت مولانا عبید اللہ صاحب کا ہوا، انھوں نے اس کام کے سات اصولوں پر بیان فرمایا

۱۔ ایمان و احتساب
۲۔ اخلاص
۳۔ استخلاص
۴۔ اتباع سنت
۵۔ عدم نقد (کسی فرد یا جماعت پر تنقید نہ کرنا کسی دینی کام کی تنقیص یا تحقیر نہ کرنا)
۶۔ نہج نبوت کا التزام
۷۔ سادگی، معاشرت میں، زندگی میں، دعوت اور طرز بیان میں۔

دوسرے دن صبح کا پہلا بیان حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری دامت فیوضہ کا ہوا، انھوں نے بھی ان ہی سات عناوین پر بات فرمائی، اس کے بعد آخر تک جتنے بیانات حضرت مولانا عبید اللہ صاحب، حضرت مولانا پالنپوری، مولانا احمد لاٹ صاحب ندوی میاں جی محراب اور خود حضرت جی کے ہوئے وہ سب انہی سات اصولوں پر زور اور ان ہی کی تفہیم و تشریح پر مشتمل تھے۔

ہمارے کچھ ساتھی اس بات پر حیران تھے کہ سب بیانات میں موضوع کی وحدت کس طرح ہے؟ میں نے از خود ان سے کچھ کہنے کے بجائے ایک بزرگ سے ان کے اس احساس کی ترجمانی کی تو انھوں نے بتایا کہ بھائی! ہم لوگ تو اپنے امیر کی ہدایت پر استعمال ہوتے رہنے کی کوشش ہی کو اپنی آخری سعادت سمجھتے ہیں۔ ہمارے حضرت نے پہلے ہی دن ہم لوگوں سے مشورہ کے دوران فرما دیا تھا کہ بھائی! میرا خیال یہ ہے کہ اپنے پرانے دوستوں کے سامنے ان ان باتوں کو رکھا جائے۔ بس! ہم میں سے ہر شخص کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنی گفتگو میں انہی باتوں کا بیان کیا جائے۔

ہمارے وہ ساتھی اس کام کی اجتماعیت اور اطاعت امیر کے مزاج کا یہ نمونہ دیکھ کر حیران رہ گئے! اور بندہ یہ سوچتا رہا کہ ابھی تو "مشتے نمونہ از خروارے" ہی سامنے آیا ہے ورنہ اس کام کی اندرونی جڑیں کتنی گہری، اور اس کی قوت و اشاعت کے اسرار کتنے مخفی اور کتنے عمیق ہیں اور تنظیم کے ظاہری، رواجی بلکہ مغربی طریقوں سے سو فیصد بے تعلقی کے ساتھ اس میں کیسی زبردست تنظیمی استعداد، اجتماعیت، اطاعت امیر اور التزام مشورہ ہے، بس اللہ ہی ہمیں سمجھا دے، بلکہ دکھا دے اور رواجی تشکلوں کی ذہنی مرعوبیت سے نکال کر نہج نبوت اور اس کے عمیق اثرات کا تجربہ و مشاہدہ کرا دے، یقین کیجیے کہ وہ شخص جس کے سامنے دعوت، علم، ذکر، تنظیم و اجتماعیت، اتحاد و اتفاق وغیرہ وغیرہ تمام گوشوں میں نہج نبوت کے معجزانہ اثرات آجاتے ہیں وہ ان شعبوں کو قائم کرنے والی رواجی تشکلوں کی مصنوعی چمک دمک، اور ٹیپ ٹاپ سے کبھی مرعوب و متاثر نہیں ہوتا۔ بلکہ دردمند اور فکرمند اذہان وقلوب کے انہی کی طرف متوجہ رہنے اور انہی پر قانع ہو جانے کو ایک بڑا المیہ، قوت، وسائل اور وقت کے ضیاع کا سبب نیز ایک خطرناک اور غیر شعوری شیطانی تلبیس اور کار نبوت کے مقاصد و ثمرات کو غیر نبوی وسائل سے حاصل کرنے کی قدیم پر فریب غلطی کا نتیجہ سمجھتا ہے۔

تین دن تک جس طرح یہ ساتوں باتیں مختلف انداز سے سامنے آتی رہیں اس سے پورے اجتماع کا ایک رُخ، ایک پیغام اور ایک سبق بن گیا، اسی طرح کے دوسرے تربیتی اجتماع میں جو گذشتہ سال گودھرا گجرات میں ہوا تھا، سب سے زیادہ زور اطاعت امیر اور مشورے کی پابندی اور ان دونوں میں نبوی نہج کی وضاحت اور اس کے التزام پر دیا گیا تھا، اور پہلے اجتماع میں جس میں کہ یہ بندہ حاضر نہیں تھا، لوگوں نے بتایا کہ صرف ایک ہی بات کی تاکید کی گئی تھی اپنے کو کچھ نہ سمجھنا، اور اپنی تقصیرات اور خامیوں پر ہر وقت نگاہ رکھنا۔

بات اصل میں یہ ہے کہ دعوت کی یہ محنت جس رفتار سے پھیل رہی ہے وہ آنکھوں کے سامنے ہے، یہ دین ہر سطح، ہر استعداد اور ہر طبقہ کے انسان کے لیے ہے، اسی طرح دین کی یہ محنت بھی ہر سطح، ہر استعداد اور ہر طبقہ کے انسان کے لیے ہے۔

آپ جیسے حضرات پر یہ بات بھی مخفی نہ ہوگی کہ دین کے اصل مزاج، اس کی روح، اسکی حقیقت اور اس کے اسرار و حکم کو سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، اس کے لیے بڑا گہرا فہم اور عمیق و راسخ علم چاہیے۔ لیکن خدا کا حکم سمجھ کر دین پر چلنا اتنا مشکل نہیں۔ (ولقد یسرنا القرآن للذکر)

اور اسی لیے اس کا مطالبہ ہر سطح، ہر استعداد اور ہر طبقہ کے انسان سے ہے، بلکہ اس بارے میں تو خدائی قانون، مخلوق کے پیمانوں سے بالکل مختلف ہے۔ وہ آدمی جو معمولی استعداد رکھتا ہے جب خدا کے حکموں پر چلنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں اس سے غلطیاں ہوتی ہیں کہیں اٹکتا ہے، کہیں پھسلتا ہے تو اس کو بجائے ڈانٹنے پھٹکارنے کے، اور بجائے مجرم ٹھہرانے کے دوہرے اجر کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ وہ حدیث تو ذہن میں ہوگی ہی جس میں فرمایا گیا ہے کہ وہ انسان جو قرآن پڑھنے کی کوشش کرے، لیکن روانی سے نہ پڑھ سکے بلکہ تکلف کے ساتھ اور اٹک اٹک کے پڑھے اسے تلاوت کے اجر و ثواب کے علاوہ اس زحمت و مشقت کا بھی ثواب ملے گا، اور گویا اس طرح یہ حدیث ایسے کمزور استعداد والے بندگان خدا کے لیے حوصلہ افزائی اور شکستہ دلی و مایوسی سے بچانے کا نبوی پیغام رکھتی ہے اسی طرح کی اور بھی مثالیں سیرت و سنت نبوی سے دی جاسکتی ہیں۔ آپ حضرات کے لیے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔

اسی طرح آپ حضرات کے سامنے یہ حقیقت بھی مستحضر ہوگی کہ قرآن اور نبوت کا تو خاص طرز فطرت انسانی کے عین مطابق یہ ہے کہ تربیت و اصلاح کا مکمل دستور پہلے سے نہیں دیا جاتا، بلکہ ضرورت کے مطابق، کسی واقعہ کے پیش آجانے کے بعد، کسی سوال کے جواب میں، کسی تجربہ کے نتیجہ میں ضروری اور مناسب ہدایت دے دی جاتی ہے، تربیت ہی وہ ہے جو ذہن و دماغ میں جاگزیں ہو جاتی ہے، اور جس کی وجہ سے نسخہ کی طوالت کے احساس سے مریض کو ناامیدی، اکتاہٹ اور گھبراہٹ نہیں پیدا ہوتی۔ اور نہ مفروضہ شکلوں کے فرضی تخیل میں ذہن و دماغ کی صلاحیتیں ضائع ہوتی ہیں۔

اسی طرح یہ حقیقت بھی پیش نظر ہوگی کہ دین کا دائرہ جتنا محدود، اور اس کے لیے

حالات جتنے ناموافق رہتے ہیں، اسی قدر اہل دین میں گہرائی پیدا ہوتی ہے اور جتنا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے پھیلاؤ تو یقیناً بڑھتا ہے البتہ گہراؤ کم ہو جاتا ہے۔ خود قرآن نے عہد نبوت کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے کہا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے اور اس کے بعد ایمان کے راستے میں جانی و مالی قربانی دینے والے ایک سطح کے نہیں ہیں۔ (لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل ......) اور پھر جیسے جیسے اسلام کے دائرے میں وسعت آتی گئی، اسی رفتار سے اہل اسلام کے اسلام میں عمق کم ہوتا گیا، یہ ایک فطری اور واقعی حقیقت ہے جس سے گریز عملاً ممکن نہیں ــــــ ہمارے حضرت مولانا سعید احمد خاں صاحب (بارک اللہ فی حیاتہ) اس قانونِ فطرت کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتے ہیں وہ یہ کہ پانی اگر مشکی یا حوض ہی میں رہتا ہے تو اس کا گہراؤ بہت زیادہ اور پھیلاؤ بہت کم رہتا ہے، لیکن جب اسے چمن میں یا کھیت میں ڈال دیا جاتا ہے تو اس کا گہراؤ بہت کم رہ جاتا ہے اور پھیلاؤ بہت بڑھ جاتا ہے ــــ

اسلام کے عہد اول میں اسلام کے پھیلاؤ کو بڑھتے دیکھ کر خوشی کے ساتھ ساتھ اُس زمانہ کے اکابر گہراؤ کی کمی کو محسوس کر کے بہت زیادہ رنج و غم اور فکر و تشویش کا اظہار بھی فرماتے تھے، اور گہرائی کو قائم رکھنے کی اور سطحیت سے بچنے اور امت کو بچانے کی ہر ممکن تدبیر بھی فرماتے تھے، مگر نئے خون کے داخلہ اور پھیلاؤ کی جد و جہد کو روک کر نہیں بلکہ اس کو جاری رکھتے ہوئے!

بہت سے مخلص حضرات اس تبلیغی کام کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اس میں ہم جیسے لگنے والوں کی علم و ذکر، اخلاق و معاملات اور دین و دعوت کے مزاج کے فہم، اعتدال و توازن وغیرہ امور میں سطحیت کی جو باتیں بالکل بجا طور پر محسوس فرما رہے ہیں۔ آپ کا یہ ساتھی قسم کھا کر کہہ سکتا ہے کہ اس کام کے ذمہ دار اکابر کی ہڈیاں بھی اسی غم میں گھلی جا رہی ہیں۔ اگر ان حضرات کے مزاج کا لحاظ مانع نہ ہوتا تو اس سلسلہ کے ان کے بعض حالات و واقعات جن کا بندہ کو علم ہے آپ کو سناتا۔ انفرادی افہام و تفہیم، ہر خط، ہر بیان اور ہر گفتگو کے ذریعہ اور اللہ کے سامنے رو رو کر اس سے استعانت، حفاظت، تربیت

مدد و تائید کی شب و روز کی دعاؤں کے ذریعہ اس قسم کے سیکڑوں عیوب کی اصلاح کی جو کوشش یہ حضرات کر رہے ہیں، وہ اگر ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتی تو ہم مجلسوں میں بیٹھ کر تنقید کر دینے اور موقع ملنے پر دل کی بھڑاس نکال کر وما علینا الا البلاغ پڑھ لینے پر اکتفا نہ کر لیتے۔

اسی تربیتی سلسلہ کو اجتماعی طور پر اس کام سے اپنے کو وابستہ کر دینے والے احباب کی زیادہ سے زیادہ تعداد کے سامنے چلانے، اور ان گوشوں کی اصلاح ہی کے لیے ہر سال میں اس طرح کا ایک اجتماع طے ہوا ہے، اور یہ کوٹ کا یہ اجتماع اس سلسلہ کا تیسرا اجتماع تھا، اللہ تعالیٰ ان تمام مساعی کو قبول فرمائے، اور ہم سب کو علمی و عملی غلطیوں سے، اور ہر قسم کے شر و فتنہ سے محفوظ رکھے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوستانہ انداز سے اپنے دل کے اس احساس کو آپ کے سامنے رکھ دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ ہماری آپ کی ذمہ داری دوہری ہے اللہ تعالیٰ اپنی ذمہ داری کے صحیح ادراک کی توفیق دے، اور اس کی ادائیگی کے صحیح طریق کی طرف ہماری آپ کی اور سب ہی وابستگان علوم نبوت کی رہبری فرمائے۔

شاید آپ حضرات نے سنا ہوگا کہ ایک میواتی نے ایک دفعہ اہل علم کے مجمع میں روتے ہوئے ایک حکایت بیان کی تھی کہ ایک بوڑھا اور بیمار شخص تھا، اس کے دو بیٹے تھے، ایک بڑا، اور دوسرا بہت چھوٹا، اس شخص نے بڑے بیٹے سے کہا کہ بیٹا! پانی پلا دو! بڑا بیٹا اپنے کام میں لگا رہا اور نہیں اٹھا، چھوٹے کو درد لگا، وہ بیچارہ اٹھا اور پانی لانے کی کوشش میں گر پڑا، گھڑا بھی ٹوٹا اسے چوٹ بھی آئی اور ابا کو پانی بھی نہ ملا، یہ مثال سنا کر اس میواتی نے اپنی زبان میں کہا کہ یہ بتاؤ کہ ابا خفا کس پر ہوگا؟ بڑے پر یا چھوٹے پر!...... دین کو پھیلانے اور ایک ایک انسان کے اندر لانے والا یہ بڑا اور نازک کام تو اصل میں علماء کا ہے، ہم میواتی جاہل لوگ اسے کریں گے تو یہ بگڑے ہی گا! لیکن......!

ارے بھئی معاف کیجیے گا! بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی میں اجتماع کی کارگزاری سنا

رہا تھا، اب یہ خط مستقل رسالہ بنتا جا رہا ہے، اس لیے اس سلسلہ کی باقی باتیں انشاء اللہ کبھی آئندہ! بس اتنا اور سنتے جائیے کہ خیرآباد کے اجتماع سے اس پورے علاقے میں بڑی اچھی فضا قائم ہو گئی ہے۔ اس سے پہلے بھی میرا بعض قصبات میں جانا ہوا تھا، اور اس کے بعد بھی، نمازیوں کی تعداد، اور عام لوگوں کے جوش و خروش میں نمایاں اضافہ ہے۔ برابر اطراف سے جماعتیں آرہی ہیں، اور جماعتوں کے تقاضے بھی بڑھ رہے ہیں، لکھنؤ شہر کی مساجد میں بھی صاف فرق محسوس ہو رہا ہے۔ خصوصاً نوجوان طبقہ الحمدللہ متوجہ ہے۔ (بلکہ یہ بھی سننے میں آیا کہ پرانا طبقہ اس نئے طبقہ کو خیرآبادی نمازی کا نام بطور مزاح دے رہا ہے)۔ پورنیہ سے واپسی میں ایک دن ہم لوگ مولوی خطیب عالم صاحب کے گاؤں میں رہے تھے۔ وہاں بھی اندازہ یہی ہوا تھا، اور پھر بعد میں کئی لوگوں نے بتایا بھی کہ اس پورے علاقے بلکہ نیپال تک الحمدللہ جماعتوں کی سخت محنت ہوئی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فضا بہت اچھی بن گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ پورے عالم میں ایمان و ہدایت کی فضا قائم فرمائے اور اس کے ثمرات و نتائج کو ظاہر فرمائے ـــــــ اس مقصد کے لیے دعاؤں کا اہتمام فرمائیے۔ یہ بندہ بھی آپ سب کی دعاؤں کا محتاج اور سائل ہے۔ والسلام

ایران کی انقلابی قیادت اور وحدت اسلامی

ایران کے انقلابی قائدین کی جس پروپیگنڈائی مہم کا رخ امت مسلمہ کی طرف ہے، اس میں سر فہرست اسلامی اتحاد کی دعوت اور (لاشیعیہ ولاسنیہ۔ جمہوریہ اسلامیہ) کا دلکش اور پُر فریب نعرہ ہے۔

اس مقدس نعرے کو ہم پر فریب کیوں کہہ رہے ہیں اس کے شواہد کی فہرست بہت طویل ہے۔ سرِدست اس سلسلہ میں حضرت والد ماجد مدظلہ کے نام آیا ہوا افریقہ کے ملک گینیا میں دعوت و تعلیم اسلامی کی خدمت انجام دینے والے ایک صاحب کا مکتوب ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور خط بھی پیش خدمت ہے جو انہی (مکتوب نگار) کے نام ان کے ایک شاگرد نے تہران کے ایک مدرسے سے لکھا تھا اور جس میں اس نے اپنی آپ بیتی بیان کی تھی ـ لیجیے بالترتیب یہ دونوں خط ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت مخدومی کرمی دامت برکاتہم و فیوضہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ
الحمدللہ بعافیت ہوں

لکھنؤ میں ملاقات کے دوران میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے یہاں سے پانچ طلبہ ایران گئے تھے یہاں تو کہا گیا تھا کہ ہم تمہیں سنی مدرسوں میں داخل کریں گے لیکن جب وہاں پہنچ گئے تو اس کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ شیعی مدرسوں میں داخل کر دیے گئے اور مجبور کیا گیا کہ انہی کے طریقہ پر عبادت کریں، وضو میں صرف پیروں پر مسح ہی کر سکتے ہیں، نماز انہی کے طریقہ پر پڑھیں۔ سجدہ صرف کربلا کی مٹی پر جائز ہے وغیرہ۔ ہاں جہراً خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اجمعین پر نام بنام لعنت بھیجاتے ہیں۔ اور صراحۃً کہا جاتا ہے کہ تمہیں ہر کام اسی طرح کرنا ہوگا جس طرح ہم بتاتے ہیں۔

ان طلبہ نے واپس آنا چاہا تو اجازت نہیں دی۔ آخر ایک طالب علم کے والد کا انتقال ہوا اور تار پہنچا تو اسے اجازت دی گئی۔ اس سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے تمام تفصیلات بتائیں۔ معلوم ہوا کہ خمینی حکومت انھیں مجتہد بنا کر بھیجے گی تاکہ وہ اپنے اپنے افریقی ملکوں میں شیعہ مذہب کی تبلیغ کریں۔ العیاذ باللہ

ان میں سے ایک طالب علم نے مختلف اوقات میں جو مجھے خطوط بھیجے تھے ان کی فوٹو کاپی ارسال کر رہا ہوں۔

لکھنؤ میں دوران گفتگو آپ نے فرمایا تھا کہ بھیج دینا چنانچہ اس عریضہ کے ساتھ وہ فوٹو کاپی بھی بھیج رہا ہوں۔

گذشتہ سال نیروبی میں "مدرسۃ الرسول الاکرم" کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا ہے، فی الحال وہاں تقریباً ۵۰ طالب علم ہیں۔ خالص شیعہ مذہب کی تعلیم ہے۔ ہر طالب علم کو ۳۰۰ شلنگ تقریباً ۲۰۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا ہے، رہائش کا مفت انتظام ہے۔ طلبہ سب افریقی ہیں۔ داخلہ کی پہلی شرط ہے کہ شیعہ مذہب کے مطابق عمل کریں گے۔ ایک غیرت مند طالب علم ایک ماہ رہنے کے بعد وہاں سے چلا گیا، خود اس نے صراحت سے مجھے بتایا کہ وہ جبراً کرتا شیعی

تعلیمات پر عمل کراتے ہیں اور جو انکار کرے اسے نکال دیئے جانے کی دھمکی دیتے ہیں۔
غریب طلبہ اولاً تو پانچ سو روپیہ ماہانہ لیکر اپنی اقتصادی حالت درست کرتے ہیں پھر یہ لالچ ہے کہ اسکالرشپ ملے گا۔ اور قم یا مشہد میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہی ان فساد کے اڈوں کو ختم کرے۔۔ والسلام

مندرجہ بالا مکتوب کے ساتھ جن خطوط کی فوٹو کاپی آئی ہے ان میں سے ایک ترجمہ کے ساتھ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

السلام علیکم ورحمة الله وبركاته، وبعد فاني والحمد لله مازلت في رعاية الله تعالى، أتمنى لكم كل مافيه الخير والسعادة فضيلة الشيخ: فاني أقدم إليكم هذا الخطاب راجيا من الله اولاً، ثم من سماحتكم، أن تنصروني مما وقعت فيه، بالنسبة للدراسة التي جئنا لأجلها كلها دروس حول مذهب الشيعة ونفس الحوزة التي نتعلم فيها قد أسست على العرب المهاربين من العراق وفيها طلبة من العراق، البحرين، السعودية أفغانستان وغيرها كلهم شيعيون، وكذلك كل طالب إذا وصل هنا يغير اسمه الحقيقي إلى الاسم المستعار وكذلك الأساتذة، ولكن الأمر الذي يهز قلوبنا هو أنهم يلازموننا أن نلعن الخلفاء الثلاثة يعني ابوبكر وعمر و

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،
اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں اس کے حفظ و امان میں رہ کر آپ حضرات کے لیے خیر و عافیت کا خواہاں ہوں
جناب عالی! میں آنجناب کی خدمت میں یہ خط پیش کرتے ہوئے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے پھر آپ حضرات سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ میں جس مصیبت میں گرفتار ہوں اسمیں آپ لوگ میری مدد فرمائیں گے۔ ہماری تعلیم کا حال یہ ہے کہ سارے کے سارے اسباق شیعہ مذہب ہی سے متعلق ہیں اور جس مدرسہ میں ہماری تعلیم ہوتی ہے ...... وہ ان عربوں کے لیے قائم کیا گیا ہے جو عراق سے بھاگ کر یہاں آتے ہیں اس میں عراق، بحرین، سعودیہ، افغانستان اور دوسرے ممالک کے طلبہ ہیں جو سب کے سب شیعہ ہیں، اور جو بھی طالب علم یہاں پہنچتا ہے اس کا نام بدل کر دوسرا نام رکھ دیا جاتا ہے،

عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین
لقولهم قد خالفوا أمر الرسول
وأيضاً يلزموننا أن نسجد على
الأحجار ويقال إنها تربة الحسينية
من كربلا في العراق وكثير من الأمور
التي لا نرضى بها وكذالك لا
نستطيع أن نخرج من إيران لأننا
لا نملك اقامة غير أن المسئولين من
الحوزة هم الذين يشتغلون بهذه
الأمور حينما يريد الطالب أن
يسافر، ونحن إلى الأن لن يسمح
لنا بالخروج وأخيراً أرجو منكم
أن تساعدوني لأنني في خطر كبير
وأخيراً استودعكم الله والسلام
عليكم ورحمة الله وبركاته

اور یہی حال اساتذہ کا ہے لیکن جس بات
سے ہمارا دل دکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں
مجبور کیا جاتا ہے کہ ہم خلفاء ثلاثہ حضرت
ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ
عنہم پر لعنت بھیجیں محض ان لوگوں کی اس
بدعقیدگی کی وجہ سے کہ ان صحابہ نے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم و وصیت سے
روگردانی کی تھی، نیز ہمیں پتھروں پر
سجدہ کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور یہ
کہا جاتا ہے کہ یہ عراق کے میدان کربلا کی
حسینی مٹی ہے اور بھی بہت سی باتیں
ہیں جن سے ہم سخت پریشان ہیں۔
ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ ہم ایران سے
نکل نہیں سکتے کیونکہ ہمیں اقامہ نہیں
دیا گیا ہے مزید یہ کہ مدرسہ کے ذمہ دار
حضرات ہی یہ سب کارروائیاں انجام دیتے ہیں جب کوئی طالب علم سفر کرنا چاہتا
ہے، لہٰذا ہمیں نکلنے کی اجازت مل ہی نہیں سکتی بہرحال آپ حضرات سے یہ
امید ہے کہ میری مدد فرمائیں گے کیونکہ میں سخت خطرے میں گھرا ہوں،

فی امان اللہ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

ان دونوں خطوں کے مشتملات اور ان کی روشنی میں دکھائی دینے والے ایرانی
قائدین کے کردار، ارادوں اور منصوبوں کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ عرض کرنے سے گریز
کرتے ہوئے ہم یہ فیصلہ اپنے محترم قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ اس کردار کے لوگ جب اتحاد
وتعاون اور شیعہ سنی اختلافات کی "پست سطح" سے بلند ہو کر اسلام اور ملت اسلامیہ کے وسیع

مقاصد و مصالح کے لیے متحد ہو جانے کی تلقین کرتے ہوئے نظر آئیں تو اس دوہرے کردار کو کیا نام دیا جائے؟ اور ان لوگوں کو کس فہرست میں رکھا جائے؟ (ما تخفی صدورہم اکبر)

حق یہ ہے کہ اس قسم کے تلبیسی فتنوں کی سحر کاریوں کو امت مسلمہ میں پھیلتے دیکھ کر امت کے تمام طبقات میں صحیح ایمانی شعور اور دین کا صحیح فہم پیدا کرنے والی عمومی دعوتی و تربیتی جدوجہد کی ضرورت کا احساس مزید طاقتور ہوتا ہے کہ یہی اس کا نبوی علاج ہے کہ

ہر مرض کی دوا اصلِّ علیٰ محمدؐ

اس شمارہ میں (اگلے صفحہ سے) حضرت والد ماجد مدظلہ کا ایک مضمون "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ مضمون ان کے ایک طویل مقالے کا ابتدائی حصہ ہے جو اس موضوع پر، سخت امراض و عوارض اور روز افزوں ضعف کے باوجود توفیق الٰہی نے ان سے لکھوایا ہے اور جس کے مکمل ہو جانے کی خوشخبری اپنے قارئین بلکہ اس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے، اور کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اسلام کو تحریف سے اور امت کو ہر قسم کے ضلال سے بچانے کی فکر رکھنے والے سب ہی حضرات کو سناتے ہوئے یہ ناچیز راقم سعادت اور اعزاز محسوس کر رہا ہے ——— اللہ تعالیٰ اس کی طباعت کے مرحلے کو جلد از جلد طے فرمائے۔ اور ہم سب کی ٹیڑھے میڑھے راستوں سے اور ظاہری و پوشیدہ ہر طرح کے فتنوں سے حفاظت فرمائے۔ اور اس مقصد کے لیے کی جانے والی تمام کوششوں کو قبولیت و نافعیت عطا فرمائے۔

مولانا محمد منظور نعمانی

ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت

ابتدائیہ:

ہمارے اس زمانے میں پروپیگنڈہ کیسی غیر معمولی اور کتنی مؤثر طاقت ہے اور کسی غلط سے غلط بات کو حقیقت باور کرادینے کی اس میں کس قدر صلاحیت ہے، اس کی تازہ مثال جو آنکھوں کے سامنے ہے وہ پروپیگنڈہ ہے جو موجودہ ایرانی حکومت کی طرف اپنے سفارت خانوں اور ایجنٹوں کے ذریعہ امام[ع] روح اللہ خمینی کی شخصیت اور ان کے برپا کیے ہوئے ایرانی انقلاب کی "خالص اسلامیت" اور اس سلسلہ میں اسلامی وحدت اور شیعہ سنی اتحاد کی دعوت کے عنوان سے کیا جارہا ہے۔ اس مقصد کے لیے کانفرنسوں پہ کانفرنسیں بلائی جارہی ہیں، جن میں دنیا بھر کے ملکوں سے ایسے نمائندے بلائے جاتے ہیں جن کے متأثر ہونے اور اپنے مقصد میں فائدہ اٹھانے کی توقع ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں میں کتابوں، کتابچوں، پمفلٹوں اور رسائل و اخبارات کا ایک سیلاب جاری ہے۔ کم از کم راقم سطور نے اپنی ستر سالہ شعوری زندگی میں نہیں دیکھا کہ کسی حکومت یا کسی سیاسی پارٹی کی طرف سے ایسے وسیع پیمانے پر اور ایسا فنکارانہ اور مؤثر پروپیگنڈہ کیا گیا ہو ـــــــ ہمارے اس دور کی حکومتیں

ع چونکہ ایرانی انقلاب کے قائد روح اللہ خمینی صاحب کے معتقدین اُن کے لیے لازماً "امام" کا لفظ لکھتے ہیں اس لیے ہم نے بھی ان کے احساسات کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کے لیے یہ لفظ استعمال کرنا مناسب سمجھا ہے۔ ہماری رائے، اور ہمارا نقطہ نظر ناظرین کو ان صفحات سے معلوم ہوجائے گا۔

زمانہ جنگ میں جس طرح اسلحہ اور دوسرے جنگی وسائل پر بے دریغ اور بے حساب دولت خرچ کرتی اور اس کے لیے حکومتی خزانے کا گویا منہ کھول دیتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ ایرانی حکومت اسی طرح اس پروپیگنڈے پر ملک کی دولت پانی کی طرح بہا رہی ہے ـــــ اسی مہینے مارچ کے شروع میں ضلع مراد آباد کے دیہات کے ایک صاحب کسی ضرورت سے لکھنؤ آئے، راقم سطور سے بھی ملے، انھوں نے بتلایا کہ ہمارے علاقے میں گاؤں گاؤں اس سلسلہ کا لٹریچر پہنچ رہا ہے ـــــ

بارش کی طرح برسنے والے اس لٹریچر اور اس پروپیگنڈے سے کلمۂ اسلام کی سربلندی اور "اسلامی حکومت" کے قیام کی تمنا اور خواہش رکھنے والے ہر اس شخص کا متاثر ہونا فطری بات ہے جو شیعیت اور شیعیت کی تاریخ سے اور اس وقت کے ایران کے اندرونی حالات اور وہاں کی سنی آبادی کی حالت زار سے امام روح اللہ خمینی کی شخصیت اور ان کے برپا کیے ہوئے انقلاب کی اس فکری و مذہبی بنیاد سے واقف نہ ہو جو خود امام خمینی نے اپنی تصانیف خاصکر اپنی کتاب "ولایۃ الفقیہ او الحکومۃ الاسلامیہ" میں پوری وضاحت سے بیان کی ہے ـــــ یہ کتاب ہی گویا اس انقلاب کی بنیاد ہے ـــــ اور اس کتاب کو بھی صحیح طور پر وہی سمجھ سکتا ہے جو شیعیت سے واقف ہو۔ اور اس نے مذہب شیعہ کا مطالعہ کیا ہو۔

اس موقع پر راقم سطور اس واقعی حقیقت کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ ہمارے عوام اور کالجوں، یونیورسٹیوں کے تعلیمیافتہ حضرات اور صحافیوں، دانشوروں کا کیا ذکر، ہم جیسے لوگ جنھوں نے دینی مدارس اور دارالعلوموں میں دینی تعلیم حاصل کی ہے اور عالم دین کہے اور سمجھے جاتے ہیں، عام طور سے شیعہ مذہب کے بنیادی اصول و عقائد سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ سوائے ان کے جنھوں نے کسی خاص ضرورت سے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہو ـــــ خود اس عاجز راقم سطور کا حال یہ ہے کہ اپنی درسی تعلیم اور اس کے بعد تدریس کے دور میں کبھی شیعہ مذہب سے میں اس سے

زیادہ واقف نہیں تھا جتنا ہمارے عام پڑھے لکھے لوگ واقف ہوتے ہیں (اور واقعہ یہ ہے کہ اس کو واقفیت سمجھنا ہی غلط ہے) ـــــــ پھر ایک وقت آیا کہ بعض اُن علمائے اہل سنت کی کتابوں کے مطالعہ کا اتفاق ہوا جنھوں نے مذہب شیعہ کی بنیادی کتابوں کو اچھی طرح دیکھ کے اس موضوع پر لکھا ہے (ان میں مولانا قاضی احتشام الدین مراد آبادی علیہ الرحمہ کی کتاب "نصیحۃ الشیعہ" خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس موضوع پر سب سے پہلے یہی کتاب راقم سطور کے مطالعہ میں آئی تھی، یہ اب سے کچھ کم سو سال پہلے کی تصنیف ہے، اس کا انداز بیان سنجیدہ و متین ہونے کے ساتھ بڑا دلچسپ بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر کبھی کبھی حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی علیہ الرحمہ کی بعض تصانیف بھی مطالعہ میں آئیں۔ اس کے بعد میں سمجھنے لگا تھا کہ شیعہ مذہب سے میں واقف ہو گیا۔ ـــــــ لیکن جب حال میں ایرانی انقلاب کے سلسلہ کے اس پروپیگنڈے کو جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور اس کے اثرات کو دیکھ کر اس موضوع پر لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا اور میں نے اس کو دینی فریضہ سمجھا تو شیعیت سے ذاتی اور براہ راست واقفیت کے لیے میں نے مذہب شیعہ کی بنیادی اور مستند کتابوں کا اور خود امام خمینی کی تصانیف کا مطالعہ ضروری سمجھا۔ چنانچہ گزشتہ قریباً ایک سال میں ـــــــ اس حالت میں کہ عمر اسّی سے متجاوز ہو چکی ہے، اور اس عمر میں ظاہری و باطنی قویٰ میں جو ضعف و اضمحلال فطری طور پر پیدا ہو جانا چاہیے وہ پیدا ہو چکا ہے، اس کے علاوہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض بھی ہوں اور اس کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کی صلاحیت بہت متاثر ہو گئی ہے، بہرحال اسی حالت میں ـــــــ ان کتابوں کے کئی ہزار صفحات پڑھے اور اب معلوم ہوا کہ میں شیعہ مذہب کے بہت سے پہلوؤں سے بھی واقف نہیں تھا۔ اسی مطالعہ ہی سے یہ بات سامنے آئی کہ امام خمینی کے برپا کیے ہوئے ایرانی انقلاب کی حقیقت و نوعیت کو شیعیت سے اچھی واقفیت کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا، کیونکہ مذہب شیعہ کا بنیادی عقیدہ "امامت" اور امام آخر الزماں (مہدی منتظر) کی "غیبت کبریٰ" کا شیعی عقیدہ و نظریہ ہی اس انقلاب کی اساس و بنیاد ہے۔

اس موقع پر راقم سطور اس حقیقت کا اظہار بھی مناسب سمجھتا ہے کہ مذہب شیعہ سے ہمارے علمائے اہلسنت کے واقف نہ ہونے کی خاص وجہ یہ ہے کہ شیعہ مذہب میں ـــــ اور جہاں تک اس عاجز کی واقفیت اور مطالعہ ہے دنیا کے ادیان و مذاہب میں سے صرف شیعہ مذہب میں ـــــ اپنے دین و مذہب کو چھپانے اور ظاہر نہ کرنے کا سخت تاکیدی حکم ہے ـــــ اس سے ہماری مراد شیعہ مذہب کی وہ خصوصیت اور وہ تعلیم نہیں ہے جو "تقیہ" کے عنوان سے عوام میں بھی معروف ہے، بلکہ تقیہ سے الگ یہ مستقل باب ہے اور کتب شیعہ اور ان کے ائمہ معصومین کے ارشادات میں اس کا عنوان "کتمان" ہے جس کے معنی چھپانے اور ظاہر نہ کرنے کے ہیں۔ اور تقیہ کا مطلب ہوتا ہے اپنے قول یا عمل سے اصل حقیقت اور واقعہ کے خلاف ظاہر کرنا اور اس طرح دوسرے کو دھوکے میں مبتلا کرنا ـــــ ان دونوں کا تفصیلی بیان اور ان کے بارے میں مذہب شیعہ کی بنیادی کتابوں کی تصریحات اور ان کے ائمہ معصومین کے ارشادات انشاء اللہ اس مقالہ میں بھی اپنے موقع پر ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے[1] ـــــ

اس وقت تو اس کے حوالہ سے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مذہب شیعہ کی اس تعلیم کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک پریس کے ذریعہ عربی فارسی کی دینی کتابوں کی طباعت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا اور ہاتھ ہی سے کتابیں لکھی جاتی تھیں ہمارے علماء عام طور سے مذہب شیعہ سے ناواقف رہے کیونکہ وہ کتابیں صرف خاص خاص شیعہ علما ہی کے پاس ہوتی تھیں اور وہ کسی غیر شیعہ کو ان کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے تھے ـــــ ہماری

---

[1] ناظرین کرام کتمان کی تاکید کے سلسلہ میں اُن کے امام معصوم امام جعفر صادق کا ایک ارشاد یہاں بھی ملاحظہ فرمالیں ـــــ مذہب شیعہ کی معتبر ترین کتاب "اصول کافی" میں ان کا یہ ارشاد روایت کیا گیا ہے:

انکم علی دین من کتمہ اعزہ اللہ	تم ایسے دین پر ہو کہ جو اس کو چھپائے گا اللہ
و من اذاعہ اذلہ اللہ	تعالیٰ اس کو عزت عطا فرمائے گا اور جو کوئی
(اصول کافی ص ۴۸۵ طبع لکھنؤ)	اس کو شائع اور ظاہر کرے گا اللہ اس کو ذلیل
	و رسوا کرے گا۔

فقہ اور فتاویٰ کی کتابوں میں نکاح یا ردّۃ کے ابواب میں شیعوں کے بارے میں جو لکھا گیا ہے اس کے مطالعہ کے بعد اس میں شک نہیں رہتا کہ ان کے واجب الاحترام مصنفین کی نظر سے شیعہ مذہب کی بنیادی کتابیں بالکل نہیں گزریں اس لیے شیعوں کے بارے میں بس وہی باتیں لکھی ہیں جو مشہور عام تھیں یا تاریخ کی کتابوں میں جن کا کچھ تذکرہ کیا گیا ہے ـــــ فتاویٰ عالمگیری جو اب سے قریباً تین سو سال پہلے عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ حکومت میں فقہ کے ماہر علماء و اصحاب فتویٰ کی ایک جماعت نے مرتب کیا تھا اُس کے مطالعہ سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے ـــــ اور علامہ ابن عابدین شامی جن کا زمانہ اب سے قریباً صرف ڈیڑھ سو سال پہلے کا ہے اُن کی کتاب "رد المحتار" جو فقہ حنفی کی مستند ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے، اس میں بھی شیعوں کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ مذہب کی کتابیں ان کی نظر سے بھی نہیں گزریں ـــــ اس سے زیادہ عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے (جن کا زمانہ اب سے قریباً چار سو سال پہلے کا ہے) اپنے بیسیوں مکتوبات میں مذہب شیعہ اور شیعوں کے بارے میں کلام فرمایا ہے اس کے علاوہ اس موضوع پر ان کا فارسی زبان میں ایک مستقل رسالہ بھی ہے جو انھوں نے علمائے ماوراء النہر تائید میں لکھا تھا (یہ رسالہ "رد روافض" کے نام سے اُن کے مجموعۂ مکتوبات کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے) ان سب کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ مذہب کی بنیادی کتابیں حضرت مجدد علیہ الرحمہ کو بھی نہیں ملی تھیں ـــــ پھر اس کے قریباً ایک صدی بعد بارھویں صدی ہجری کے وسط میں جب حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا قیام مدینہ منورہ میں تھا تو انھوں نے اپنے استاد شیخ ابو طاہر کردیؒ کی فرمائش پر حضرت مجددؒ کے اس رسالہ "رد روافض" کا عربی ترجمہ کیا اور اس پر اپنی طرف سے جا بجا تعلیقات بھی لکھیں[1]، اس کے علاوہ شاہ

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہؒ کا یہ عربی رسالہ ابھی تک طبع نہیں ہوا تھا۔ مختلف کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے تھے ابھی حال میں مولانا ابو الحسن زید دہلوی نے اپنے اہتمام سے اس کو شائع کرایا ہے، اس کے ساتھ حضرت مجددؒ کا اصل فارسی رسالہ "رد روافض" بھی شامل ہے۔ اس کا نام "المجموعۃ السنیۃ" ہے ـــ شاہ ابو الخیر اکیڈمی ـــ شاہ ابو الخیر مارگ بمبئی ۲ سے طلب کیا جا سکتا ہے۔ کتب خانہ الفرقان سے بھی طلب فرمایا جا سکتا ہے۔ پتہ: کتب خانہ الفرقان لکھنؤ۔

صاحب نے شیعیت کے خلاف مذہب اہل سنت کے اثبات میں دو ضخیم کتابیں بھی تصنیف فرمائیں جو مشہور و معروف اور مطبوع ہیں ــــ ازالۃ الخفا اور قرۃ العینین ــــ اور یہ دونوں کتابیں شاہ صاحب کی وسعت علم، دقت نظر اور قوت استدلال کا آئینہ ہیں ــــ لیکن ان سب چیزوں کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ مذہب کی بنیادی کتابیں "الجامع الکافی" وغیرہ (جن کے مطالعہ کے بغیر مذہب شیعہ سے پوری واقفیت نہیں ہو سکتی) ان کو بھی نہیں ملی تھیں ــــ ہمارے نزدیک ایسا اسی وجہ سے ہوا کہ ان کتابوں کی طباعت کے دور سے پہلے یہ کتابیں صرف خاص خاص شیعہ علماء کے پاس ہی ہوتی تھیں اور وہ اپنے ائمہ معصومین کے تاکیدی حکم کِتمان کی تعمیل میں دوسروں کو نہیں دکھلاتے بلکہ ان کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے تھے ــــ اس دور میں علمائے اہل سنت میں سے بعض خاص ہی حضرات اپنی غیر معمولی کوششوں سے ان کتابوں کو کسی طرح پا سکے ان میں شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے "تحفۂ اثنا عشریہ" کے مصنف شاہ عبدالعزیز بھی ہیں ــــ بعد میں جب دینی مذہبی کتابیں پریس کے ذریعے چھپنے لگیں اور مذہب شیعہ کی یہ کتابیں بھی چھپ گئیں تب بھی ہمارے علمائے کرام نے ان کے مطالعہ کی طرف توجہ نہیں کی سوائے ان چند حضرات کے جنکو اپنے مخصوص مقامی حالات یا کسی خاص وجہ سے ان کے مطالعہ کی ضرورت کا احساس ہوا، انھوں نے مطالعہ کیا اور پھر اپنی تصنیفات کے ذریعہ دوسروں کو بھی واقف کرانے کی کوشش کی، لیکن یہ افسوسناک واقعہ ہے کہ ہمارے علمی حلقوں میں ان تصنیفات سے بھی بہت کم فائدہ اٹھایا گیا اسی لیے ایسا ہے کہ ہمارے اس دور کے علمائے اہلسنت میں بھی شاذ و نادر ہی ایسے حضرات ہیں جنکو شیعہ مذہب کے بارے میں ایسی واقفیت ہو جس کو واقفیت کہا جا سکے ــــ اور جب علماء کا یہ حال رہا تو ہمارے عوام اور آج کی صحافتی اصطلاح میں "دانشور" کہلانے والے حضرات کا کیا ذکر اور کسی سے کیا شکایت!

اس عام ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب روح اللہ خمینی صاحب کی قیادت میں

ایران میں یہ انقلاب برپا ہوا، اور انھوں نے اس کو "اسلامی انقلاب" کا نام دے کر اور پورے عالم اسلام بلکہ پوری دنیا میں بھی انقلاب برپا کرنے کا نعرہ لگا کر اپنا ساتھ دینے کے لیے ساری دنیا کے مسلمانوں کو پکارا اور اس کے لیے پروپیگنڈے کے وہ سب وسائل و ذرائع استعمال کیے جن کا اوپر ذکر کیا گیا، تو یہ بات معلوم اور آشکارا ہونے کے باوجود کہ امام خمینی نہ صرف یہ کہ شیعہ ہیں بلکہ شیعوں کے اُس درجہ کے مذہبی پیشواؤں میں ہیں جن کو "آیۃ اللہ" کہا جاتا ہے۔ ہندو پاکستان اور بعض دوسرے ملکوں کے بھی ایک خاص ذہن رکھنے والے حلقوں کی طرف سے ایسے جوش و خروش سے اس کا استقبال اور خیر مقدم کیا گیا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان حضرات کے نزدیک اس انقلاب کے نتیجہ میں ایران میں عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے نمونے کی "حقیقی اسلامی حکومت" قائم ہو گئی ہے جس کے ولی الامر (امیر المومنین) امام روح اللہ خمینی ہیں۔ پھر اس انقلاب اور خمینی صاحب کی یادگار میں اخباروں رسالوں کے خاص نمبر نکالے گئے، ان میں نظم میں اور نثر میں خمینی صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے زمین و آسمان کے جو قلابے ملائے گئے، اور عام قارئین کے دلوں میں ان کی عظمت و تقدس کا جو نقش قائم کرنے کی کوشش کی گئی اس کا کچھ اندازہ ان نمبروں کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔

پھر یہ حلقے چونکہ اہل سنت ہی میں شمار ہوتے ہیں اور خاص کر اُن جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک خاصی تعداد جن کو آج کل "اسلام پسند" کہا جاتا ہے ان کے معروف زعما اور قائدین کو دین کا رازداں اور دینی رہبر سمجھتی ہے اس لیے ان کے اس رویہ سے ان بیچاروں کا یہ عقیدہ بن گیا ہے کہ "آیۃ اللہ روح اللہ خمینی" اس وقت اسلام اور عالم اسلام کے گویا امام ہیں۔ ابھی حال میں پٹنہ سے شائع ہونے والا اس نوجوان طبقہ کا ترجمان ایک ماہنامہ نظر سے گزرا اس سے اندازہ ہوا کہ اس بارے میں ذہنی ضلال و فساد کس حد تک پہنچ چکا ہے۔

اس سب کے باوجود راقم سطور بھی سمجھتا ہے کہ ان حلقوں کی طرف سے یہ جو کچھ ہوا "شیعیت"، امام خمینی کی شخصیت، خاص کر ان کی مذہبی حیثیت اور ان کے برپا کیے

ہوئے انقلاب کی نوعیت و حقیقت سے ناواقفی کے ساتھ "حبك الشيء يعمي ويصم" کے فطری قانون کے مطابق اسلامی حکومت کی تمنا اور اس کے بے تابانہ اشتیاق کے نتیجہ میں ہوا۔ اس لیے اس عاجز نے اپنا دینی فریضہ اور ان دینی بھائیوں اور عزیزوں کا اپنے پر حق سمجھا کہ ——— امام خمینی اور ان کے برپا کیے ہوئے انقلاب کی نوعیت و حقیقت اور شیعیت، خاص کر اس کی اصل بنیاد مسئلہ امامت سے ان حضرات کو اور عام مسلمانوں کو واقف کرنے کی اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کی جائے کہ دراصل یہی مسئلۂ امامت اس ایرانی انقلاب کی مذہبی و فکری بنیاد ہے۔

——— ہم پہلے امام خمینی صاحب کے برپا کیے ہوئے انقلاب کے بارے میں عرض کریں گے اس کے بعد خمینی صاحب کی شخصیت اور ان کی مذہبی حیثیت کے بارے میں، اور آخر میں شیعیت کے بارے میں جو ضرورت کے مطابق کسی قدر مفصل اور طویل ہوگا۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل ٥

نوٹ:- مذکورہ بالا تین عنوانات ایرانی انقلاب کی نوعیت، امام خمینی کی شخصیت و مذہبی حیثیت، اور شیعیت سے متعلق جس مقالہ کا ذکر اس ابتدائیہ میں کیا گیا ہے، اس کا صرف وہ حصہ ناظرین کرام آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرما سکیں گے جس کا تعلق اول الذکر دو عنوانوں سے ہے ——— تیسرے عنوان (شیعیت) سے متعلق جو لکھا گیا ہے، اس کے مضامین اور نوعیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو قسطوں میں تقسیم کر کے شائع نہ کیا جائے اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس کو الفرقان میں شائع نہیں کیا جائے گا ——— کوشش کی جائے گی کہ یہ پورا مقالہ جلد ہی کتابی شکل میں شائع ہو جائے۔ خواہشمند حضرات کو کتاب کی تیاری کی اطلاع ان شاء اللہ الفرقان ہی کے ذریعہ ہو جائے گی۔ ناظرین کرام بھی اس کی تیاری اور تاثیر اور عند اللہ مقبولیت کے لیے دعا فرمائیں۔

محمد منظور نعمانی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۸۴ء یوم الجمعہ

ایرانی انقلاب کی نوعیت اور اس کی بنیاد

خمینی صاحب کے برپا کیے ہوئے اس انقلاب کی نوعیت کو سمجھنے اور اس کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ یہ اُس طرح کا انقلاب نہیں ہے جیسے صحیح یا غلط، اچھے یا برے حکومتی انقلابات دنیا کے ملکوں خاص کر اسلامی ممالک میں سیاسی نظریات کے اختلاف یا صرف اقتدار کی ہوس یا اسی طرح کے دوسرے عوامل ومحرکات کی بنیاد پر ہوتے رہے یا ہوتے رہتے ہیں — خمینی صاحب کا برپا کیا ہوا یہ انقلاب مذہب شیعہ کی اساس و بنیاد عقیدہ امامت، اور اسی سلسلہ کے دوسرے عقیدے امام آخر الزماں (مہدی منتظر) کی غیبت کبریٰ اور اس غیبت کبریٰ کے زمانے میں ولایت فقیہ کے اس نظریے کی بنیاد پر برپا ہوا ہے جس کو خمینی صاحب نے مذہب شیعہ کی مختلف کتب حدیث کی بہت سی روایات سے استدلال کرتے ہوئے اپنی کتاب "ولایۃ الفقیہ او الحکومۃ الاسلامیہ" میں پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے یہی اس کتاب کا موضوع اور مدعا ہے — اور خمینی صاحب کی یہ کتاب ہی گویا اس انقلاب کی مذہبی و فکری بنیاد ہے — لیکن اس کو سمجھنے کے لیے شیعیت خاصکر اس کی اساس و بنیاد عقیدہ امامت سے واقف ہونا ضروری ہے، اس لیے اپنے ناظرین کو اس عقیدہ سے متعارف اور واقف کرانے کے لیے پہلے اس عقیدہ ہی کے بارے میں اجمال و اختصار کے ساتھ کچھ عرض کیا جاتا ہے۔ واللہ الموفق

عقیدۂ امامت کا اجمالی بیان

مذہب شیعہ کی بنیادی کتابوں اور اُن کے ائمۂ معصومین کے ارشادات سے گویا انہی کی زبان سے مسئلۂ امامت کا تفصیلی بیان تو انشاء اللہ ناظرین کرام اسی مقالہ میں آگے اپنے مقام پر ملاحظہ فرمائیں گے، یہاں تو صرف اتنا عرض کر دینا اس وقت کے مقصد کے لیے کافی ہے کہ شیعہ حضرات کے نزدیک جس طرح نبی و رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر اور نامزد ہوتے ہیں (امت یا قوم اُن کا انتخاب نہیں کرتی) اسی طرح نبی کے بعد اُن کے جانشین و خلیفہ امام بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے مقرر اور نامزد ہوتے ہیں، وہ نبی ہی کی طرح معصوم ہوتے ہیں اور نبی و رسول ہی کی طرح ان کی اطاعت امت پر فرض ہوتی ہے۔ اُن کا درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر اور دوسرے سب نبیوں سے بالاتر ہوتا ہے، وہی امت کے دینی و دنیوی سربراہ اور حاکم ہوسکتے ہیں، اور امت پر بلکہ ساری دنیا پر حکومت کرنا اُن کا اور صرف ان کا حق ہوتا ہے ان کے علاوہ جو بھی حکومت کرے وہ غاصب و ظالم اور طاغوت ہے (خواہ وہ قرن اول کے ابو بکر و عمر اور عثمان (رضی اللہ عنہم) ہوں یا اُن کے بعد کے زمانوں کے خلفاء و سلاطین اور ملوک یا ہمارے زمانے کے ارباب حکومت، بہر حال مذہب شیعہ کے اس بنیادی عقیدۂ امامت کی رو سے یہ سب غاصب و ظالم اور طاغوت ہیں، حکومت صرف اللہ تعالیٰ کے نامزد کیے ہوئے ائمہ معصومین کا حق ہے) اور جس طرح نبی پر ایمان لانا اور اس کو نبی ماننا شرط نجات ہے اسی طرح اِن اماموں کی امامت کو تسلیم کرنا اور ان کو اللہ کا مقرر کیا ہوا امام معصوم اور حاکم ماننا بھی نجات کی شرط ہے ——— اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے اس دنیا کے خاتمہ تک یعنی قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بارہ ۱۲ امام نامزد ہیں، اِن سب کو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نامزد فرمایا ہے ——— پہلے امام حضرت علی مرتضیٰ تھے، ان کے بعد ان کے

بڑے صاحبزادے حضرت حسن، اُن کے بعد کے لیے اُن کے چھوٹے بھائی امام حسین (رضی اللہ عنہم) پھر اُن کے بعد انہی کی اولاد میں ترتیب وار نو اور حضرات ــــ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیا ہوا امام و خلیفہ اور امت کا دینی و دنیوی سربراہ و حاکم تھا (اگرچہ حالات کی ناسازگاری سے ایک دن کے لیے بھی ان کو حکومت حاصل نہ ہو سکی ہو۔)

ان میں سے پہلے گیارہ امام ــــ حضرت علی مرتضیٰ سے لیکر گیارھویں امام حسن عسکری تک ــــ اس دنیا میں جاری اللہ تعالیٰ کے عام نظام موت و حیات کے مطابق وفات پا گئے۔ گیارھویں امام حسن عسکری کی وفات ۲۶۰ھ میں ہوئی (جس پر قریباً ساڑھے گیارہ سو سال گزر چکے ہیں) شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے (اور یہ اُن کے بنیادی عقائد میں اور جزو ایمان ہے) کہ اُن کے ایک بیٹے صغر سنی ہی میں معجزانہ طور پر غائب ہو گئے، اور "سُرَّ مَن رأیٰ" کے ایک غار میں روپوش ہو گئے، اب قیامت تک انہی کی امامت اور حکومت کا زمانہ ہے، اس پوری مدت تک کے لیے وہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے امام زماں اور امت کے دینی و دنیوی سربراہ اور حاکم ہیں۔

شیعہ صاحبان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اُن کے غائب اور غار میں روپوش ہو جانے کے بعد چند سال تک اُن کے خاص محرم راز سفیروں کی اُن کے پاس خفیہ آمد و رفت بھی ہوتی تھی، اُن کے ذریعہ اُن کے پاس شیعہ حضرات کے خطوط اور درخواستیں بھی پہنچتی تھیں اور انہی کے ذریعہ اُن کے جوابات بھی آتے تھے ــــ مذہب شیعہ کی کتابوں میں اس چند سالہ زمانے کو غیبت صغریٰ کا زمانہ کہا گیا ہے

اس کے بعد سفیروں کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا اور امام غائب سے رابطہ قائم کرنے کا کسی کے لیے بھی کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ (اس کو اب گیارہ سو سال ہو چکے ہیں) شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ وہ اسی طرح روپوش ہیں اور کسی وقت (جو اُن کے ظہور کے لیے مناسب ہو گا) غار سے نکل کر تشریف لائیں گے ــــ

جب بھی ایسا وقت آئے ـــــ اس وقت تک کا زمانہ شیعہ حضرات کی خاص اصطلاح میں غیبتِ کبریٰ کا زمانہ کہا جاتا ہے۔

ملحوظ رہے کہ مذہب شیعہ کی رو سے یہ عقیدۂ امامت، توحید، رسالت اور عقیدۂ آخرت کی طرح اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اس کے نہ ماننے والے توحید، رسالت و آخرت کے منکرین ہی کی طرح غیر مومن، غیر ناجی اور جہنمی ہیں ـــــ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس کے بارے میں مذہب شیعہ کی بنیادی کتابوں کی تصریحات اور ان کے ائمہ معصومین کے ارشادات ناظرین کرام انشاء اللہ اپنے موقع پر اسی مقالہ میں ملاحظہ فرمائیں گے ـــــ اس وقت تو عقیدۂ امامت اور امام آخر الزماں کی غیبت کبریٰ کا یہ اجمالی بیان صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ امام خمینی کے برپا کیے ہوئے ایرانی انقلاب کو اس کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا تھا ـــــ اسی لیے ہم نے اس عجیب و غریب عقیدہ پر یہاں کوئی تنقید بھی نہیں کی ہے، صرف وہ بیان کر دیا ہے جو ان حضرات کا مسلمہ عقیدہ ہے اور مذہب شیعہ کی بنیادی کتابوں اور ان کے ائمہ معصومین کے ارشادات سے معلوم ہوا ہے۔

"الحکومۃ الاسلامیہ" کی روشنی میں ایرانی انقلاب کی بنیاد

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے خمینی صاحب کی کتاب "الحکومۃ الاسلامیہ" ان کے برپا کیے ہوئے اس انقلاب کی مذہبی و فکری بنیاد ہے۔ قریباً ڈیڑھ سو صفحہ کی اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بارھویں اور آخری امام (مہدی منتظر) کی غیبت کبریٰ کے اس زمانے میں جس پر ہزار سال سے زیادہ گزر چکے ہیں اور بقول امام خمینی ہو سکتا ہے کہ ہزاروں سال کا زمانہ اسی طرح اور گزر جائے۔ فقہاء یعنی شیعہ مجتہدین کا حق بلکہ ان کی ذمہ داری اور ان کا فرض ہے کہ وہ امام آخر الزماں (امام غائب) کے نائب اور قائمقام کی حیثیت سے حکومت کا نظام اپنے ہاتھ میں لینے کی جد و جہد کریں اور جب ان مجتہدین میں کوئی ایسا فرد جو اس کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہو اٹھ

لے حاشیہ اگلے صفحہ پر

مقصد کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور جد و جہد کرے تو وہ معاشرے اور حکومت سے متعلق معاملات میں امام ہی کی طرح بلکہ خود نبی و رسول کی طرح واجب الاطاعت ہوگا، اسی کتاب میں **ولایۃ الفقیہ** کا عنوان قائم کرکے خمینی صاحب نے لکھا ہے:

واذا نہض بامر تشکیل الحکومۃ فقیہ عالم عادل فانہ یلی من امور المجتمع ما کان یلیہ النبی (ص) منہم، ووجب علی الناس ان یسمعوا لہ ویطیعوا، ویملک ھذا الحاکم من امر الادارۃ والرعایۃ والسیاسۃ للناس ما کان یملکہ الرسول (ص) وامیر المومنین (ع) (الحکومۃ الاسلامیہ ص۴۹)

اور جب کوئی فقیہ (مجتہد) جو صاحب علم ہو عادل ہو حکومت کی تشکیل و تنظیم کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو اس کو معاشرے کے معاملات میں وہ سارے اختیارات حاصل ہوں گے جو نبی کو حاصل تھے اور سب لوگوں پر اس کی سمع و طاعت واجب ہوگی۔ اور یہ صاحب حکومت فقیہ و مجتہد حکومتی نظام اور عوامی و سماجی مسائل کی نگہداشت اور امت کی سیاست کے معاملات میں اسی طرح مالک و مختار ہوگا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علی علیہ السلام مالک و مختار تھے۔

نیز اسی کتاب میں آگے امام خمینی نے ایک موقع پر تحریر فرمایا ہے:

ؔ (حاشیہ صفحہ گذشتہ) امام خمینی نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے "الحکومۃ الاسلامیہ" میں لکھا ہے:

قد مرّ علی الغیبۃ الکبریٰ لامامنا المہدی اکثر من الف عام وقد تمر الوف السنین قبل ان تقتضی المصلحۃ قدوم الامام المنتظر (ص۲۶)

ہمارے امام مہدی کی غیبت کبریٰ پر ایک ہزار سال سے زیادہ گزر چکے اور ہوسکتا ہے کہ ہزاروں سال اُس وقت کے آنے سے پہلے اور گزر جائیں جب مصلحت کا تقاضا اُن کے ظہور کا ہو اور وہ تشریف لائیں۔

انّ الفقهاء هم اوصياء الرسول (ص)	فقہاء (یعنی مجتہدین) ائمہ معصومین کے
من بعد الائمه وفي حال غيابهم	بعد اور ان کی غیبت کے زمانے میں
وقد كلفوا بالقيام بجميع ما	رسول خدا کے وصی ہیں اور وہ مکلف
كلف الائمه (ع) بالقيام به	ہیں اُن سب امور و معاملات کی انجام
ص ۷۵	دہی کے جن کی انجام دہی کے مکلف ائمہ

الغرض امام خمینی کے ذریعہ ایران میں جو انقلاب برپا ہوا اُس کی یہی مذہبی اور فکری بنیاد ہے، اور اُن کی حیثیت دوسرے ملکوں کے قائدین انقلاب اور سربراہان حکومت کی نہیں بلکہ مذہب شیعہ کی اساس و بنیاد عقیدۂ امامت اور امام آخر الزمان کی غیبت کبریٰ اور اس غیبت کبریٰ کے زمانے میں "ولایت فقیہ" کے اصول و نظریے کی بنیاد پر وہ شیعوں کے بارھویں امام معصوم (امام غائب) کے قائم مقام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی اور اس حیثیت سے امام اور نبی ہی کی طرح واجب الاطاعت ہیں، اور اُن کے سارے اقدامات اور ساری کارروائیاں اسی حیثیت سے ہیں ——

جہاں تک ہمارا مطالعہ اور ہماری اطلاع ہے انھوں نے اپنی اس حیثیت پر پردہ ڈالنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی ہے اور ان کی اس حیثیت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ پورے عالم اسلام بلکہ ساری دنیا کو اپنے زیر حکومت اور تحت اقتدار لانے کی جدوجہد کریں۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ امام خمینی نے "ولاية الفقيه" کے نظریہ کے بارے میں (جو اس انقلاب کی بنیاد ہے) جو کچھ "الحكومة الاسلامية" میں لکھا ہے اُس میں پوری صفائی کے ساتھ اس کا اظہار ہے کہ اس نظریہ کی بنیاد پر صرف وہ شیعہ فقیہ و مجتہد ہی امت کا امام و سربراہ حکومت ہو سکے گا جو عقیدۂ امامت اور امام آخر الزمان کی دنیا میں موجودگی اور گیارہ سو سال سے ان کی غیبت کبریٰ کے زمانے میں "ولایت فقیہ" کے نظریے کو بھی تسلیم کرتا ہو۔

کیا اس کے بعد اس میں کسی شک شبہ کی گنجائش ہے کہ اس انقلاب کو "خالص اسلامی" انقلاب کہنا اور اجتماعات اور کانفرنسوں میں "ثورة اسلامية لا شيعية

ولا سنیہ" کے نعرے لگوانا ایسا فریب ہے جس میں صرف وہی لوگ مبتلا ہو سکتے ہیں جنھوں نے اس انقلاب کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنے کی بھی کوشش نہ کی ہو ــــ حالانکہ جیسا کہ عرض کیا گیا خود امام خمینی کی کتاب "الحکومۃ الاسلامیہ" کا مطالعہ ہی اس کے لیے کافی ہے۔

ایرانی انقلاب کی نوعیت کے بارے میں ہم اتنا ہی عرض کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس کے بعد خمینی صاحب کی شخصیت بالخصوص اُن کی مذہبی حیثیت کے بارے میں اختصار ہی کے ساتھ وہ عرض کرتا ہے جو ان کی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے۔

کسی تحریک خاص کر کسی انقلاب کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے اس کے قائد کے نظریات و معتقدات کا جاننا جیسا ضروری ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس طرف سے غفلت وہی شخص جائز سمجھ سکتا ہے جس کے نزدیک ایمان اور عقیدے کی کوئی اہمیت نہ ہو وہ بس حکومت اور اقتدار ہی کو دین و ایمان سمجھتا ہو۔

ابھی نصف صدی بھی نہیں گزری ہے کہ ہمارے اسی ملک میں علامہ عنایت اللہ مشرقی اور ان کی خاکسار تحریک کا غلغلہ بلند تھا، اُن کا فلسفہ اور ان کی دعوت یہی تھی کہ مادی قوت اور اقتدار و حکومت ہی حقیقی ایمان و اسلام ہے اور اس بنا پر ہمارے اس زمانے میں "مؤمنین صالحین" کا مصداق وہ یوروپین اقوام ہیں جن کے پاس قوت و اقتدار ہے، اُن کی ضخیم کتاب "تذکرہ" جو ان کی دعوت و تحریک کی بنیاد تھی اُس میں اسی نظریہ اور فلسفہ کو قرآن پاک سے بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی ــــ ہم میں سے جنھوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے ان کو یاد ہو گا کہ ایک خاص ذہن رکھنے والا نوجوان طبقہ کیسے جوش و خروش سے ان کی دعوت پر لبیک کہہ رہا تھا اور اُن کے لشکر میں شامل ہو رہا تھا ــــ دراصل ملت میں ایسے لوگوں کا وجود ہمارے لیے سامان عبرت ہے۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد إذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة إنك أنت الوهاب

امام خمینی اپنی تصانیف میں

امام روح اللہ خمینی، صاحب تصانیف عالم ہیں، مجھے اُن کی دو کتابیں دستیاب ہوسکیں جو اُن کی تصانیف میں خاص اہمیت رکھتی ہیں —— ایک "الحکومۃ الاسلامیہ" جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اور جیسا کہ عرض کیا گیا یہ ان کی انقلابی تحریک اور دعوت کی بنیاد ہے اور اُن کی شخصیت اور مذہبی معتقدات کو جاننے کے لیے کبھی بڑی حد تک یہی کتاب کافی ہے —— دوسری کتاب "تحریر الوسیلہ" یہ غالباً اُن کی سب سے بڑی تصنیف ہے، اس کا موضوع فقہ ہے، یہ بڑی تقطیع کی دو ضخیم جلدوں میں ہے، ہر جلد کے صفحات ساڑھے چھ سو کے قریب ہیں۔ یہ بلاشبہ اپنے موضوع پر بڑی جامع اور مبسوط کتاب ہے۔ طہارت یعنی استنجا اور غسل و وضو سے لیکر وراثت تک کے تمام فقہی ابواب پر حاوی ہے، زندگی میں جو مسائل لوگوں کو پیش آتے ہیں راقم سطور کا خیال ہے کہ ان میں کم ہی مسئلے ایسے ہوں گے جن کا جواب مذہب شیعہ کی رو سے اس کتاب میں نہ مل سکے، طرز بیان بہت ہی صاف اور سلجھا ہوا ہے بلاشبہ اُن کی یہ تصنیف اپنے مذہب میں اُن کے علمی تبحر اور بلند مقامی کی دلیل ہے۔

خمینی صاحب کے جو نظریات و معتقدات اُن کی ان کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوئے ہیں وہ انہی کی عبارتوں اور انہی کے الفاظ میں ان صفحات میں ناظرین کے سامنے پیش کیے جارہے ہیں —— مقصد صرف یہ ہے کہ جو حضرات نہیں جانتے اور اس لاعلمی کی وجہ سے اُن کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ جان لیں ——

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ٥

اپنے ائمہ کے بارے میں خمینی صاحب کے معتقدات

اس سلسلہ میں پہلی اصولی اور جامع بات تو یہ ہے کہ امام خمینی شیعوں کے فرقہ

اثنا عشریہ کے بلند پایہ مجتہد اور امام و پیشوا ہیں اس لیے مسئلہ امامت اور ائمہ کے بارے میں اثنا عشریہ کے جو مخصوص عقائد و نظریات ہیں، جو ان کے نزدیک جزو ایمان ہیں وہ سب امام خمینی صاحب کے بھی معتقدات ہیں، اور ایک راسخ العقیدہ اور راسخ العلم شیعہ مجتہد کی طرح وہ اُن پر ایمان رکھتے ہیں ــــــ ناظرین کرام ان شاء اللہ ان عقائد و نظریات کو پوری تفصیل کے ساتھ اسی مقالہ میں آگے اپنے مقام پر ملاحظہ فرمائیں گے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا جائے گا وہ مذہب شیعہ کی بنیادی کتابوں کی عبارات اور اُن کے "ائمہ معصومین" کے ارشادات ہوں گے ہم صرف ان کو نقل کریں گے اور اپنے ناظرین کے لیے اردو ترجمہ کی خدمت انجام دیں گے۔ اسی سے امام خمینی کے معتقدات کسی قدر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ناظرین کو معلوم ہو سکیں گے۔ اس وقت تو ہم خود اُن کی کتاب "الحکومۃ الاسلامیہ" ہی سے (جو اُن کی انقلابی تحریک دعوت کی بنیاد ہے) اپنے ائمہ کے بارے میں ان کے چند معتقدات ناظرین کرام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

کائنات کے ذرہ ذرہ پر ائمہ کی تکوینی حکومت | "الحکومۃ الاسلامیہ" میں "الولایۃ التکوینیۃ" کے زیر عنوان خمینی صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔

فان للامام مقاماً محموداً و درجۃً سامیۃً وخلافۃ تکوینیۃ تخضع لولایتہا وسیطرتہا جمیع ذرات الکون ص۵۲	امام کو مقام محمود اور وہ بلند درجہ اور ایسی تکوینی حکومت حاصل ہوتی ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے حکم و اقتدار کے سامنے سرنگوں اور تابع فرمان

لہ اس وقت ہمارا مقصد امام خمینی اور ان کے فرقہ شیعہ اثنا عشریہ کے عقائد سے ناواقفوں کو صرف واقف کرانا ہے۔ ان کے بارے میں بحث و تنقید اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے تاہم یہاں اتنا عرض کر دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ جمہور امت مسلمہ کے نزدیک یہ شان صرف اللہ تعالیٰ کی ہے کہ کائنات کے ذرہ ذرہ پر اس کی حکومت اور فرمانروائی ہے اور ساری مخلوق اس کے تکوینی حکم کے سامنے سرنگوں اور تابع فرمان ہے۔ یہ شان کسی نبی و رسول کی بھی نہیں۔ قرآن پاک کی بیشمار آیات میں اس کا اعلان فرمایا گیا ہے۔ لیکن خمینی صاحب اور اُن کے فرقہ اثنا عشریہ کا عقیدہ اور ایمان یہی ہے کہ کائنات کے ذرہ ذرہ پر یہ حکومت و اقتدار اُن کے ائمہ کو حاصل ہے۔

ائمہ کا مقام ملائکہ مقربین اور انبیاء و مرسلین سے بالاتر ہے

اسی عنوان "الولایۃ التکوینیۃ" کے تحت اور اسی سلسلۂ کلام میں خمینی صاحب آگے فرماتے ہیں:

وان من ضروریات مذھبنا	اور ہمارے مذہب (شیعہ اثنا عشریہ)
ان لائمتنا مقاماً لا یبلغہ ملک	کے ضروری اور بنیادی عقائد میں سے
مقرب ولا نبی مرسل ص۵۲	یہ عقیدہ بھی ہے کہ ہمارے ائمہ

معصومین کو وہ مقام و مرتبہ حاصل ہے جس تک کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل بھی نہیں پہنچ سکتا۔

ائمہ اس عالم کی تخلیق سے پہلے انوار و تجلیات تھے جو عرش الٰہی کو محیط تھے۔ ان کے درجہ اور مقام قرب کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا

اسی عنوان "الولایۃ التکوینیۃ" کے تحت اور اسی سلسلۂ کلام میں آگے خمینی صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

وبموجب ما لدینا من الروایات	اور جو روایات و احادیث (یعنی
والاحادیث فان الرسول	شیعی روایات و احادیث) ہمارے
الاعظم (ص) والائمہ (ع) کانوا	سامنے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ
قبل ھذا العالم انواراً فجعلھم	رسول اعظم ؐ اور ائمہ ؑ اس عالم کے
اللہ بعرشہ محدقین وجعل	وجود میں آنے سے پہلے انوار و تجلیات
لھم من المنزلۃ والزلفی ما لا	تھے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے
یعلمہ الا اللہ ص۵۲	عرش معلی کے گرداگرد کر دیا۔ اور

ان کو وہ مرتبہ اور مقام عطا فرمایا جس کو بس اللہ ہی جانتا ہے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

ائمہ سہو اور غفلت سے محفوظ اور منزہ ہیں

سہو و نسیان اور کسی وقت کسی معاملہ میں غفلت کا امکان بشریت کے لوازم میں سے ہے۔ انبیاء علیہم السلام بھی اس سے محفوظ نہیں۔ قرآن مجید میں بھی متعدد انبیاء علیہم السلام کے سہو و نسیان کے واقعات ذکر فرمائے گئے ہیں لیکن خمینی صاحب اپنے ائمہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

لا نتصور فيهم السهو او الغفلة	ان کے بارے سہو یا غفلت کا تصور
(الحکومۃ الاسلامیہ ص۹۱)	کبھی نہیں کیا جا سکتا۔

ائمہ کی تعلیمات قرآنی احکام و تعلیمات ہی کی طرح دائمی اور واجب الاتباع ہیں۔

خمینی صاحب نے اسی کتاب الحکومۃ الاسلامیہ میں ایک جگہ ائمہ کی تعلیمات اور اُن کے احکام کے بارے میں فرمایا ہے:

ان تعاليم الائمة كتعاليم القرآن	ہمارے ائمہ معصومین کی تعلیمات قرآن
لا تخص جيلاً خاصاً وانما هي	کی تعلیمات ہی کے مثل ہیں، وہ کسی
تعاليم للجميع في كل عصر ومصر	خاص طبقے کے اور خاص دور کے لوگوں
والى يوم القيامة يجب تنفيذها	کے لیے مخصوص نہیں ہیں، وہ ہر زمانے
واتباعها ص۱۱۳	اور ہر علاقے کے تمام انسانوں کے

لیے ہیں اور تا قیام قیامت ان کی تنفیذ اور اُن کا اتباع واجب ہے۔

اپنے ائمہ معصومین کے بارے میں خمینی صاحب کے یہ چند معتقدات صرف "الحکومۃ الاسلامیہ" سے پیش کیے گئے ہیں — اس کے بعد ہم خمینی صاحب اور اثنا عشریہ کے ایک دوسرے اہم اور بنیادی عقیدے پر گفتگو شروع کرتے ہیں۔

صحابہ کرام خاصکر شیخین کے بارہ میں خمینی صاحب کا عقیدہ اور رویہ

جو شخص شیعہ اثنا عشریہ کے مذہب سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہوگا وہ اتنا ضرور جانتا ہوگا کہ اس مذہب کی بنیاد ہی اس عقیدے پر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ ہی میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) کو اپنے بعد کے لیے خلیفہ و جانشین اور امت کا دینی و دنیوی امام اور سربراہ نامزد فرما دیا تھا اور انہی کی نسل میں سے گیارہ اور حضرات کو بھی، قیامت تک کے لیے اسی طرح

امام نامزد فرما دیا تھا ــــــ اور اس سلسلہ میں آپ نے آخری اور انتہائی درجہ کا اہتمام یہ فرمایا کہ حجۃ الوداع سے واپسی میں غدیر خم کے مقام پر ایک میدان کو صاف کرنے کا حکم دیا اور اپنے لیے ایک منبر تیار کرایا۔ اس کے بعد خصوصی اعلان اور منادی کے ذریعہ اپنے تمام رفقائے سفر کو (جن میں مہاجرین و انصار اور دوسرے حضرات سب ہی شامل تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے) اس میدان میں جمع ہونے کا حکم فرمایا جب سب جمع ہو گئے، تو آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا کے ــــــ تاکہ سب حاضرین دیکھ لیں ــــــ اپنے بعد کے لیے ان کے خلیفہ و جانشین اور امت کے دینی و دنیوی سربراہ و امام اور ولی الامر (یعنی حاکم و فرمانروا) ہونے کا اعلان فرمایا، اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ یہ میری تجویز نہیں ہے بلکہ اللہ کا حکم ہے اور میں اس حکم خداوندی کی تعمیل ہی میں یہ اعلان کر رہا ہوں ــــــ پھر آپ نے سب حاضرین سے اس کا اقرار اور عہد لیا ــــــ اس سلسلہ کی مذہب شیعہ کی مستند ترین روایات میں یہ بھی ہے کہ اس موقع پر آپ نے خصوصیت سے شیخین (حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما) سے فرمایا کہ تم "السلام علیک یا امیر المومنین" کہکر علی کو سلامی دو! چنانچہ ان دونوں نے اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اسی طرح سلامی دی (غدیر خم کے اس واقعہ (یا افسانے) کے بارے میں کتب شیعہ کی وہ روایات اور ان کے ائمہ معصومین کے وہ ارشادات جن میں پوری تفصیل سے وہ سب کچھ بیان کیا گیا ہے جو اجمالی طور پر اوپر کی سطروں میں عرض کیا گیا، انشاء اللہ ناظرین کرام اسی مقالہ میں آئندہ اپنے مقام پر ملاحظہ فرمائیں گے۔)

آگے کتب شیعہ کی روایات میں یہ بھی ہے کہ غدیر خم کے اس اعلان اور صحابہ کے اس اجتماعی عہد و اقرار کے قریباً اسّی دن ہی کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو (معاذ اللہ) ابو بکر و عمر اور ان کے ساتھ عام صحابہ نے سازش کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کیے ہوئے اس نظام کو جو آپ نے اپنے بعد قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم فرمایا تھا مسترد اور ملیامیٹ کر دیا، اور اپنے عہد

و اقرار سے منحرف ہو گئے اور حضرت علی کے بجائے ابو بکر کو آپ کا خلیفہ و جانشین اور امامت کا سربراہ بنا دیا ـــــ (معاذ اللہ) اس "غداری" اور "جرم عظیم" کی بنیاد پر کتب شیعہ کی روایات اور ان کے ائمہ معصومین کے ارشادات میں عام صحابہ اور خاص کر شیخین (حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما) کے لیے مرتد - کافر - منافق جہنمی - شقی بلکہ اشقی (اعلیٰ درجہ کے بدبخت) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور ان پر لعنت کی گئی ہے ـــــ (یہ روایات اور ان کے ائمہ معصومین کے یہ ارشادات بھی ناظرین کرام انشاء اللہ اسی مقالہ میں آگے اپنے موقع پر ملاحظہ فرمائیں گے)

اور اس میں کیا شک ہے کہ اگر غدیر خم کے اس افسانے کو (جو مذہب شیعہ کی اساس و بنیاد ہے) حقیقت اور واقعہ مان لیا جائے تو پھر شیخین اور عام صحابہ کرام (معاذ اللہ) ایسے ہی مجرم قرار پائیں گے اور ان ہی بد سے بدتر الفاظ کے مستحق ہوں گے جو شیعی روایات کے حوالہ سے اوپر لکھے گئے ہیں ـــــ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامت تک کے لیے قائم کیے ہوئے اس نظام کو، جو امت کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کے لیے آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم فرمایا تھا اور جس کے لیے اتنے اہتمام سے عہد و اقرار لیا تھا، غداری اور سازش کر کے تباہ و برباد کیا ان کے کفر و ارتداد اور جہنمی و لعنتی ہونے میں کیا شبہ ہے ـــــ بہرحال یہ دونوں باتیں عقل و نقل کے لحاظ سے لازم و ملزوم ہیں۔ اسی لیے شیعوں کے عام مصنفین اور علماء و مجتہدین کا رویہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنی روایات کے مطابق غدیر خم کے واقعہ کا ذکر کرتے ہیں اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد شیخین اور عام صحابہ نے جو کچھ کیا اس کی بنا پر وہ ان کو اپنے ائمہ کے ارشادات کے مطابق مرتد، کافر، منافق یا کم سے کم اعلیٰ درجہ کے فاسق و فاجر اور مستحق لعنت قرار دیتے ہیں۔

لیکن خمینی صاحب صرف شیعہ عالم و مجتہد یا شیعہ مصنف ہی نہیں ہیں بلکہ وہ ہمارے اس دور کی ایک عظیم سیاسی شخصیت اور ایک انقلابی دعوت و تحریک کے قائد بھی ہیں اور اس انقلابی تحریک میں ان کی اصل طاقت اگرچہ شیعہ ہیں لیکن غیر شیعہ

مسلمانوں کو بھی ممکن حد تک اس میں استعمال کرنا اُن کی سیاسی ضرورت ہے' اس لیے "الحکومۃ الاسلامیہ" میں انھوں نے اس سلسلہ میں یہ رویہ اختیار فرمایا ہے کہ وہ اپنے ذاتی عقیدہ وایمان کے تقاضے سے اور شیعی دنیا کو مطمئن رکھنے کے لیے کبھی غدیر خم کے واقعہ کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اپنے بعد کے لیے وصی اور خلیفہ وجانشین اور امت کے ولی الامر کی حیثیت سے حضرت علی مرتضیٰ کی نامزدگی کا ذکر کرتے ہیں اور بار بار کرتے ہیں لیکن اُس کے لازمی اور منطقی نتیجہ کے طور پر شیخین اور عام صحابہ کرام پر اللہ ورسول سے غداری اور کفر وارتداد کی جو فرد جرم عائد ہوتی ہے وہ سیاسی مصلحت سے صراحت کے ساتھ اُس کے ذکر سے اپنے قلم کو روک لیتے ہیں ـــــ اس معاملہ میں انھوں نے اتنی احتیاط ضروری سمجھی ہے کہ پوری کتاب "الحکومۃ الاسلامیہ" میں شیخین (حضرت ابوبکر اور حضرت عمر) کا کہیں نام تک نہیں آنے دیا ہے۔ حالانکہ اس کتاب کا موضوع ہی جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہے "اسلامی حکومت" ہے۔ اور اسلام کی تاریخ سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انہی دو حضرات کا دور خلافت اسلامی حکومت کا کامل اور مثالی نمونہ تھا[1] ـــــ لیکن خمینی صاحب کا رویہ یہ ہے کہ جہاں سلسلہ کلام میں تاریخی تسلسل کے

---

[1] راقم سطور یہاں اس واقعہ کا ذکر مناسب سمجھتا ہے کہ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی بنیاد پر جب برطانوی دور حکومت ہی میں ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کے سات صوبوں میں کانگرس کی حکومتیں قائم ہوئیں تو کانگرس کے رہنما مہاتما گاندھی جی نے ان حکومتوں کے کانگرسی وزیروں کے لیے اپنے اخبار "ہریجن" میں ایک ہدایت نامہ لکھا تھا جو اُس وقت کے دوسرے اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا اس میں انھوں نے ان وزیروں کو ہدایت کی تھی کہ وہ ابوبکر وعمر کے طرز حکومت کو مثالی رہنما کے طور پر اپنے سامنے رکھیں اور ان کے طریقہ کی پیروی کریں۔ (آگے گاندھی جی نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ مجھے تاریخ میں ان دو کے سوا کوئی مثال نہیں ملتی جس نے فقیری کے ساتھ ایسی حکومت کی ہو) گاندھی جی کا یہ ہدایت نامہ ہریجن کے جولائی یا اگست ۱۹۳۷ء کے کسی شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اس وقت ہدایت نامہ کا یہ مضمون اپنی یادداشت سے لکھا ہے۔ گاندھی جی کی اصل عبارت اخبارات کے ۱۹۳۷ء کے فائلوں میں آسانی سے تلاش کی جا سکتی ہے۔

لحاظ سے بھی ان کے دورِ خلافت کا تذکرہ ضروری تھا وہاں بھی ان کا نام تک ذکر کرنے سے پرہیز کیا ہے ـــــ اس کی دو مثالیں نذرِ ناظرین ہیں۔

ایک جگہ اسلامی حکومت کی ضرورت پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فقد ثبت بضرورة الشرع والعقل ان ما کان ضروریا ایام الرسول (ص) وفی عهد امیر المومنین علی بن ابی طالب (ع) من وجود الحکومة لا یزال ضروریا الی یومنا هذا۔
(الحکومة الاسلامیة ص ۲۶)

شریعت اور عقل کی رو سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے زمانے میں حکومت کا وجود جس طرح ضروری تھا اسی طرح ہمارے اس زمانے میں ضروری ہے۔

ایک دوسری جگہ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہ علماء جو دین کے امین ہیں ان کا کام صرف دین کی باتیں بتلانا نہیں ہے بلکہ اس پر عمل کرنا اور کرانا بھی ان کی ذمہ داری ہے، خمینی صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

وقد کان الرسول (ص) وامیر المومنین (ع) یقولون ویعملون
(ص ۷۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امیر المومنین علیہ السلام بتلاتے بھی تھے اور اس کو عمل میں بھی لاتے تھے۔

ان دونوں جگہوں پر اور اسی "الحکومۃ الاسلامیہ" میں اس کے علاوہ بھی بعض مقامات پر خمینی صاحب نے اسلامی حکومت کے سلسلہ میں عہدِ نبوی کے بعد حضرت علی مرتضیٰ ہی کے عہدِ حکومت کا ذکر کیا ہے اور شیخین اور حضرت عثمان کے ذکر سے ہر جگہ دانستہ پرہیز کیا ہے ـــــ یہ رویہ انھوں نے اسی لیے اختیار کیا کہ اگر وہ خلفاء ثلاثہ کی حکومت کو بھی "اسلامی حکومت" قرار دے کر یہاں ذکر کرتے جیسا کہ تاریخی تسلسل کا تقاضا تھا تو شیعہ جو ان کی اصل طاقت ہیں ان کو "ولایت فقیہ" کے منصب کے لیے نااہل قرار دیکر ان کے خلاف بغاوت کر دیتے ـــــ اور اگر خمینی صاحب اپنے عقیدہ و مسلک کے مطابق ان کے بارے میں صفائی سے اظہارِ رائے کرتے تو جو غیر شیعہ طبقے اسلامی

انقلاب کے نعرہ کی کشش یا اپنی سادہ لوحی سے اُن کا آلہ کار بنے ہوئے ہیں، ان کی ہمدردی اور اُن کا تعاون اُن کو حاصل نہ ہو سکتا۔

بہرحال خمینی صاحب کے اس رویہ سے شیخین اور حضرت عثمان کے بارے میں اُن کا باطن پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔ عرض کیا جا چکا ہے کہ خلافت و امامت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت علی مرتضیٰ کی نامزدگی کے شیعی عقیدے کا لازمی و منطقی نتیجہ ہے کہ شیخین اور عام صحابہ کرام کو معاذ اللہ ویسا ہی سمجھا جائے جیسا کہ شیعی روایات میں بتلایا گیا ہے۔

اب ناظرین کرام خمینی صاحب کی وہ عبارتیں ملاحظہ فرمائیں جن میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت علی مرتضیٰ کی اپنے وصی، خلیفہ و جانشین اور امت کے ولی الامر کی حیثیت سے نامزدگی کا مختلف عنوانات سے بیان فرمایا ہے

"الحکومۃ الاسلامیہ" میں شیعوں کے بنیادی عقیدے ولایت و امامت، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اپنے بعد کے لیے خلیفہ کی حیثیت سے حضرت علی مرتضیٰ کی نامزدگی کے بارے میں اپنا عقیدہ بیان کرتے ہوئے خمینی صاحب فرماتے ہیں:

نحن نعتقد بالولایۃ، و نعتقد ضرورۃ ان یعین النبی خلیفۃ من بعدہ و قد فعل	اور ہم ولایت (امامت) پر عقیدہ رکھتے ہیں اور ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے بعد کے لیے خلیفہ معین اور نامزد
الحکومۃ الاسلامیہ ص۱۸	

کرتے اور آپ نے ایسا ہی کیا۔

اسی سلسلہ کلام میں چند سطر کے بعد خمینی صاحب نے لکھا ہے کہ اپنے بعد کے لیے خلیفہ کو نامزد کر دینا ہی وہ عمل ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فریضہ رسالت کی ادائیگی کی تکمیل ہوئی۔ فرماتے ہیں:

وکان تعیین خلیفۃ من بعدہ..... عاملاً متمما و مکملاً لرسالتہ ص۱۹	اور اپنے بعد کے لیے خلیفہ کو نامزد کر دینا ہی وہ عمل تھا جس سے آپ کے فریضہ رسالت کی ادائیگی کی تکمیل ہوئی۔

یہی بات خمینی صاحب نے اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ دوسری جگہ ان الفاظ میں فرمائی ہے

بحیث کان یعتبر الرسول (ص) لولا تعیین الخلیفۃ من بعدہ غیر مبلّغ رسالتہ ص ۲۳	اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعد کے لیے خلیفہ نامزد نہ کرتے تو سمجھا جاتا کہ امت کو جو پیغام پہنچانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے ذمہ کیا گیا

تھا وہ آپ نے نہیں پہنچایا اور رسالت کا فریضہ ادا نہیں کیا۔

خمینی صاحب نے ان عبارتوں میں جو کچھ فرمایا ہے اس کی بنیاد ایک روایت پر ہے اس روایت کا مضمون معلوم ہونے کے بعد ہی خمینی صاحب کی ان عبارتوں کا پورا مطلب سمجھا جا سکتا ہے وہ روایت شیعہ صاحبان کی اصح الکتب "اصول کافی" کے حوالہ سے انشاء اللہ آگے اپنے موقع پر درج ہوگی یہاں اس کا صرف اتنا حاصل ذکر کرنا کافی ہے کہ امام باقر علیہ السلام نے بیان فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ کو یہ حکم ملا کہ اپنے بعد کے لیے علی کی امارت و خلافت کا اعلان کر دیں، تو آپ کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ اگر میں نے ایسا اعلان کیا تو بہت سے مسلمان مرتد اور میرے خلاف ہو جائیں گے اور مجھ پر تہمت لگائیں گے کہ یہ کام میں علی کے ساتھ اپنی قرابت اور رشتہ داری کی وجہ سے کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا حکم نہیں آیا ہے' اس لیے آپ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اس حکم پر نظر ثانی فرمائی جائے اور یہ اعلان نہ کرایا جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی کہ "یَا أَیُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَیْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ۔ الآیہ جس کا حاصل یہ ہے کہ اے رسول جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہ آپ لوگوں کو پہنچا دیجیے، اور اعلان کر دیجیے اور اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو آپ نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور فریضہ رسالت ادا نہیں کیا —— چنانچہ اس کے بعد ہی آپ نے غدیر خم کے مقام پر وہ اعلان فرمایا ——

اس سلسلہ کی روایات میں (جو انشاء اللہ ناظرین اسی مقالہ میں آگے ملاحظہ فرمائیں گے) یہ بھی ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر تم نے علی کی خلافت و امارت کا یہ اعلان نہیں کیا تو ہم تم پر عذاب نازل کریں گے۔ (نعوذ باللہ)

الغرض خمینی صاحب کی مندرجہ بالا عبارتوں میں انہی روایات کی بنیاد پر یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر آپ اپنے بعد کے لیے خلیفہ نامزد نہ کرتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ آپ نے رسالت کا حق اور فریضہ ادا نہیں کیا۔

ناظرین کرام خمینی صاحب کی اس سلسلہ کی چند تصریحات اور ملاحظہ فرمائیں:

والرسول الکریم (ص) ..... قد کلمہ اللہ وحیا ان یبلّغ ما انزل الیہ فیمن یخلفہ فی الناس وبحکم ھذا الامر فقد اتبع ما امر بہ وعین امیر المومنین علیاً للخلافۃ

(الحکومۃ الاسلامیہ ص۴۲-۴۳)

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے وحی کے طور پر کلام فرمایا اور اس میں یہ حکم دیا کہ جو شخص اُن کے بعد اُن کا خلیفہ و جانشین ہو گا اور حکومت کا نظام چلائے گا اُس کے بارے میں اللہ کا جو حکم اُن پر نازل ہوا ہے وہ لوگوں کو پہنچا دیں اور اس کی تبلیغ اور اعلان کر دیں۔ تو آپ نے اللہ کے اس حکم کی تعمیل کی اور خلافت کے لیے امیر المومنین علی کو نامزد کر دیا۔

آگے اسی کتاب میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

وفی غدیر خم فی حجۃ الوداع عینہ النبی (ص) حاکما من بعدہ ومن حینھا بدأ الخلاف الی نفوس القوم

(الحکومۃ الاسلامیہ ص۱۳۱)

اور حجۃ الوداع میں غدیر خم کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی علیہ السلام کو اپنے بعد کے لیے حکمراں نامزد کر دیا اور اسی وقت سے قوم کے دلوں میں مخالفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس سلسلہ میں خمینی صاحب کی اسی کتاب سے ایک عبارت اور پڑھ لی جائے، فرماتے ہیں:

قد عين من بعده والياً على الناس امير المومنين (ع) واستمر انتقال الامامة والولاية من امام الى امام الى ان انتهى الامر الى الحجة القائم (ع) صـ۹۵	اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد کے لیے امیر المومنین علیہ السلام کو لوگوں پر حاکم اور والی کی حیثیت سے نامزد کر دیا اور پھر امامت و ولایت کا یہ منصب ایک امام سے اگلے امام کی طرف برابر منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ الحجۃ القائم

(یعنی امام غائب مہدی منتظر) تک پہنچکر یہ سلسلہ اپنی نہایت کو پہنچ گیا۔

کیا کسی بھی ایسے شخص کو جس کو اللہ نے عقل و فہم سے بالکل ہی محروم نہ کر دیا ہو اس میں شبہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خلافت و امامت کے لیے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی نامزدگی کا وہ عقیدہ رکھتا ہو جو خمینی صاحب نے اپنی ان عبارتوں میں ظاہر کیا ہے (اور جو شیعیت کی اساس و بنیاد ہے) یقیناً اس کی رائے اور اُس کا عقیدہ شیخین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام صحابہ کرام کے بارے میں وہی ہو گا جو مذہب شیعہ کی مستند کتابوں کی روایات اور اُن کے ائمہ کے ارشادات کے حوالہ سے اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ معاذ اللہ انھوں نے غداری کی اور وہ مرتد اور لعنتی و جہنمی ہو گئے —— جیسا کہ بار بار عرض کیا گیا ہے مستند ترین کتب شیعہ کی یہ روایات اور ان کے ائمہ کے یہ ارشادات ناظرین کرام انشاء اللہ اسی مقالہ میں آئندہ اپنے موقع پر ملاحظہ فرمائیں گے۔

اس سلسلہ کی ایک مختصر سی روایت یہاں بھی پڑھ لی جائے —— شیعہ حضرات کی "اصح الکتب" "الجامع الکافی" کے آخری حصہ "کتاب الروضہ" میں اُن کے پانچویں امام ابوجعفر یعنی امام باقر (علیہ السلام) کا یہ ارشاد روایت کیا گیا ہے۔

كان الناس اهل ردة بعد النبى صلى الله عليه وآله وسلم الا ثلاثة فقلت ومن الثلاثة، فقال	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب لوگ مرتد ہو گئے سوائے تین کے (راوی کہتا ہے) میں نے عرض

المقداد بن الاسود و ابو ذر الغفاری وسلمان الفارسی رحمۃ اللہ علیہم و برکاتہ (فروع کافی جلد سوم کتاب الروضہ ص۱۱۵ طبع لکھنؤ)	کیا کہ وہ تین کون تھے ؟ تو انھوں نے فرمایا مقداد بن الاسود اور ابو ذر غفاری اور سلمان فارسی - ان پر اللہ کی رحمت ہو اس کی برکات ۔

اس عقیدے کے خطرناک نتائج

اس تحریری کاوش سے ہمارا مقصد خمینی صاحب کے مقاصد و معتقدات سے ان حضرات کو صرف واقف کرانا ہے جو ناواقف ہیں، ان پر بحث و تنقید اس وقت ہمارا موضوع نہیں، تاہم اس عقیدے کے بعض خطرناک اور دور رس نتائج کی طرف اُن ہی حضرات کی توجہ مبذول کرانا بھی ہم اُن کا حق سمجھتے ہیں۔ تاکہ وہ غور کرسکیں۔

اگر خمینی صاحب کی یہ بات تسلیم کرلی جائے (جو مذہب شیعہ کی اساس و بنیاد بھی ہے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت و امامت کے منصب کے لیے حضرت علی کو نامزد کردیا تھا اور غدیر خم کے مقام پر اس کا اعلان بھی فرمادیا تھا تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی تعلیم و تربیت اور کردار سازی میں ایسے ناکام رہے کہ اللہ کا کوئی پیغمبر بلکہ کوئی مرشد و مصلح بھی اتنا ناکام نہ رہا ہوگا ـــــ آپ نے ابتدائے دور نبوت سے وفات تک جن لوگوں کی تعلیم و تربیت پر محنت کی اور جو سفر و حضر میں ساتھ رہے، دن رات آپ کے ارشادات اور نصائح سنتے رہے ـــــ آپ کی آنکھ بند ہوتے ہی انھوں نے ایسی غداری کی کہ حکومت اور اقتدار پر قبضہ کرنے کی ہوس میں آپ کے قائم کیے ہوئے اس نظام ہی کو ملیامیٹ کردیا جو آپ نے قیامت تک کے لیے اللہ کے حکم سے امت کی اصلاح و فلاح کے لیے قائم فرمایا تھا اور جس کے لیے چند روز پہلے ہی اُن سب سے عہد و اقرار لیا تھا ـــــ کیا تاریخ میں کسی مصلح اور ریفارمر کی ناکامی کی ایسی مثال مل سکتی ہے ؟

اسی طرح اس عقیدہ کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ سارا دین ناقابل اعتماد ہو جائے گا

کیونکہ وہ انہی صحابہ کے واسطے سے امت کو ملا ہے، ظاہر ہے کہ جو لوگ ایسے ناخدا ترس اور ایسے نفس پرست ہوں اُن پر دین و ایمان کے بارے میں کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

اور خاص طور سے موجودہ قرآن تو قطعاً نا قابل اعتبار ٹھہرے گا کیونکہ یہ مسلّم ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کی ترتیب و اشاعت کا اہتمام و انتظام سرکاری سطح پر خلفاء ثلاثہ ہی کے زمانے میں ہوا تھا۔ اور خمینی صاحب کے عقیدے کے مطابق یہی تینوں حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کیے ہوئے نظام کو نیست و نابود کرنے کے اصلی ذمہ دار اور (معاذ اللہ) "اکابر مجرمین" ہیں ـــــ پھر تو قرین عقل و قیاس یہی ہے کہ اِن لوگوں نے (معاذ اللہ) اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اُس میں ہر طرح کی گڑبڑ اور تحریف کی ہوگی۔ جیسا کہ مذہب شیعہ کی معتبر ترین کتابوں کی سیکڑوں روایات اور ان کے ائمہ معصومین کے ارشادات میں بیان کیا گیا ہے ـــــ ناظرین کرام ان میں سے کچھ روایتیں اور ائمہ معصومین کے ارشادات انشاء اللہ اس مقالہ میں بھی آئندہ اپنے موقع پر ملاحظہ فرمائیں گے ـــــ

اس موقع پر خمینی صاحب کے بارے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ ہمارے اس زمانے کے عام شیعہ علماء کی طرح موجودہ قرآن ہی کو اصلی قرآن کہتے اور تحریف کے عقیدہ سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن اپنی کتاب "الحکومۃ الاسلامیہ" ہی میں انھوں نے ایک جگہ علامہ نوری طبرسی کا ذکر پورے احترام کے ساتھ کیا ہے اور اپنے نظریہ "ولایت فقیہ" پر استدلال کے سلسلہ میں ان کی کتاب "مستدرک الوسائل" کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے۔ (الحکومۃ الاسلامیہ صـ۲۶) حالانکہ خمینی صاحب جانتے ہیں اور ہر شیعہ عالم کو علم ہے کہ اِن علامہ نوری طبرسی نے قرآن کے محرّف ہونے کے ثبوت میں ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی ہے جس کا نام ہے "فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب" اس کتاب میں انھوں نے لکھا ہے کہ ہمارے ائمہ معصومین کی دو ہزار سے زیادہ روایتیں ہیں جو یہ بتلاتی ہیں کہ موجودہ قرآن میں تحریف ہوئی اور ہر طرح کی تحریف ہوئی ہے۔ اور ہمارے عام علمائے متقدمین کا یہی عقیدہ رہا ہے ـــ اس وقت ہم اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں، آگے یہ موضوع مستقل طور پر زیر بحث آئے گا۔ وباللہ التوفیق

خمینی صاحب بعض فقہی مسائل کی روشنی میں :

ابتک خمینی صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا وہ صرف ان کی کتاب "الحکومۃ الاسلامیۃ" ہی کی بنیاد پر لکھا گیا ہے، اور اس کا تعلق اصول اور اعتقادات سے ہے، اور وہی اہم ہے ــــ اب ذیل میں ان کی عظیم تصنیف "تحریر الوسیلہ" سے صرف دو تین ایسے فقہی مسئلے نقل کیے جاتے ہیں جن سے خمینی صاحب کی شخصیت اور مذہبی حیثیت کو سمجھنے میں انشاء اللہ ہمارے ناظرین کو مدد ملے گی۔

"تحریر الوسیلہ" جلد اول کتاب الصلوٰۃ میں ایک عنوان ہے "القول فی مبطلات الصلوٰۃ" (یعنی ان چیزوں کا بیان جن سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور ٹوٹ جاتی ہے) اس عنوان کے تحت دوسرے نمبر پر مسئلہ لکھا گیا ہے۔

ثانیھا التکفیر وھو وضع احدی	دوسرا عمل جو نماز کو باطل کر دیتا ہے وہ
الیدین علی الاخری نحو ما یصنعہ	نماز میں ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر
غیرنا، ولا باس حال التقیہ	رکھنا ہے جس طرح ہم شیعوں کے علاوہ
(تحریر الوسیلہ جلد اول ص۱۸۶)	دوسرے لوگ کرتے ہیں، ہاں تقیہ کی حالت

میں کوئی مضائقہ نہیں (یعنی از راہ تقیہ یہ بالکل جائز ہے)

اسی سلسلہ میں ۹ پر تحریر فرمایا ہے :-

تاسعھا تعمد قول آمین بعد	اور نویں چیز جس سے نماز باطل ہو جاتی ہے
اتمام الفاتحۃ الا مع التقیہ	وہ ہے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد بالقصد
فلا باس بہ	آمین کہنا۔ البتہ تقیہ میں جائز ہے کوئی
(تحریر الوسیلہ جلد اول ص۱۹۰)	مضائقہ نہیں۔

متعہ مذہب شیعہ کا مشہور مسئلہ ہے، خمینی صاحب نے تحریر الوسیلہ کتاب النکاح میں قریباً چار صفحے میں متعہ سے متعلق جزئی مسائل لکھے ہیں۔ ان میں کئی مسئلے خاص طور سے قابل ذکر ہیں لیکن بخوف طوالت اس باب کا صرف ایک آخری مسئلہ ہی نذر ناظرین کیا جاتا ہے۔

خمینی صاحب نے اسی مسئلہ پر متعہ کے بیان کو ختم فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمایا جائے۔

یجوز التمتع بالزانیۃ علی کراھۃٍ خصوصًا لوکانت من العواھر المشھورات بالزنا وان فعل فلیمنعھا من الفجور (تحریر الوسیلہ جلد دوم صفحہ ۲۹۲)	زناکار عورت سے متعہ کرنا جائز ہے مگر کراہت کے ساتھ خصوصًا جبکہ وہ مشہور پیشہ ور جسم فروش زانیات میں سے ہو اور اگر اس سے متعہ کرے تو چاہیے کہ اس کو بدکاری کے اس پیشہ سے منع کرے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خمینی صاحب نے یہ بھی تصریح فرمائی ہے کہ متعہ کم سے کم مدت کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے (مثلاً صرف ایک رات یا ایک دن، اور اس سے کم وقت یعنی صرف گھنٹہ دو گھنٹے کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے لیکن بہرحال مدت اور وقت کا تعین ضروری ہے ——— (تحریر الوسیلہ صفحہ ۲۹۰/ج ۲)

جیسا کہ عرض کیا تھا یہ مسائل بہرحال فروعی ہیں، ان کی وہ اہمیت نہیں ہے جو اصول اور معتقدات کی ہے، تاہم ان کے مطالعہ سے بھی خمینی صاحب کی شخصیت اور مذہبی حیثیت کو سمجھنے میں اُن حضرات کو مدد ملے گی جو سمجھنا چاہیں گے ——— واللہ الھادی وھو ولی التوفیق

اس کے آگے ہم شیعیت کے تعارف کے سلسلہ میں مذہب شیعہ کے اصل الاصول مسئلہ امامت اور بعض دوسرے اصولی مسائل پر کسی قدر تفصیلی گفتگو کریں گے اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس گفتگو میں ہمارے مخاطب اہل سنت میں سے وہ حضرات ہوں گے جو شیعہ مذہب سے واقف نہیں ہیں اور ان کو واقف ہونا چاہیے۔

نصاب تعلیم اور ملت کے اساسی مقاصد وضروریات

از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم

[ذیل میں ناظرین کرام نصاب تعلیم کے موضوع پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عباسیہ ہال میں منعقد ہونے والے مذاکرۂ علمی میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کا افتتاحی خطاب ملاحظہ فرمائیں، جس کا ذکر اداریہ میں کیا جا چکا ہے۔ اس تقریر کو دارالعلوم کے ایک فاضل و مدرس مولوی ابودجانہ تسنیم عثمانی ندوی نے ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے قلمبند کیا ہے۔ اور حضرت مولانا مدظلہٗ نے اس پر نظرثانی بھی فرمائی ہے ——— سجاد]

حضرات!

میں اپنی دینی، علمی اور تعلیمی برادری کے معزز اور عزیز ارکان کا اس برادری کے ایک حقیر خادم کی حیثیت سے اس برادری کے ایک تاریخی مرکز میں استقبال کرتا ہوں میں آپ حضرات کا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں، اور اس عباسیہ ہال میں — جہاں اس وقت آپ جمع ہیں — خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس عباسیہ ہال میں جس نے دور ماضی کے بڑے اعلیٰ اور بلند پایہ دینی و علمی مناظر دیکھے ہیں، اور جس کی مسند نشین سے اپنے عہد کے نامی گرامی، ملکی اور غیر ملکی فضلاء، زعماء، اور ماہرین تعلیم نے خطاب کیا ہے۔

حضرات!

آج کا موضوع نصاب تعلیم ہے، نصاب تعلیم کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر دوا رہ کی

کے ساتھ کوئی رائے قائم کر لی جائے، یا کسی عجلت اور جذباتیت کے ساتھ فیصلہ صادر کر دیا جائے، یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ نہ اس کو معصوم قرار دینا صحیح ہے، نہ اس کو کاملاً ناقص اور قابل ترک ثابت کرنا آسان ہے۔ حقیقت میں نصاب تعلیم کسی قوم کے فکری ارتقاد، اس کے علمی تجربوں، اس کے طریق فکر اور اس کی ذہنی صلاحیت کی بانڈی کا سرجوش ہوا کرتا ہے۔ نصاب تعلیم کسی قوم کے علمی مطالعہ، اس کی فکری سطح اور اس کی ذہنی صلاحیت کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ہوتا ہے، اس لیے کسی نصاب تعلیم پر اس قوم کے علمی تجربوں، اس ملت کی علمی نمائندگی کرنے والے گروہ کی نفسیات اور اس ملک کے ماحول سے الگ کر کے غور نہیں کیا جا سکتا۔ نصاب تعلیم اس ماحول کا ایک علمی اظہار ہوتا ہے، نصاب تعلیم کا بھی ایک ضمیر ہوتا ہے اور اس کی ایک روح ہوتی ہے جو اس کے پورے جسم میں سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے، نصاب تعلیم کچھ بے جوڑ چیزوں کے جمع کر دینے اور پڑھائی جانے والی چند کتابوں کے بے جان مجموعہ کا نام نہیں، نصاب تعلیم کسی ملت یا کسی علمی گروہ کے اپنی ضروریات کے احساس اپنے زمانہ کے تقاضوں کے سمجھنے اور پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کا ماحصل ہوتا ہے، اس لیے بڑی زیادتی ہوگی کہ کتابوں کی فہرست سامنے رکھ کر ہم رائے قائم کرتے چلے جائیں کہ یہ کتاب اچھی، یہ کتاب اچھی نہیں، یہ کتاب کامیاب، یہ کتاب ناکام، اس فن کا یہ حصہ زیادہ ہے یہ حصہ کم۔ یہ نصاب تعلیم کے ساتھ ہی نہیں، علمی حقائق کے ساتھ بھی ناانصافی ہوگی۔

یہ نصاب تعلیم جو ہندوستان میں صدیوں سے رائج تھا اور جس کی ایک ترمیم شدہ اور ترقی یافتہ شکل درس نظامی کی شکل میں ہے، جو استاذ العلما ملا نظام الدین (اور مجھے اس کے اظہار میں مسرت اور فخر ہے کہ آج ہم انھیں کے شہر میں بیٹھ کر اور ان کے مرکز علمی سے تھوڑے فاصلہ پر گفتگو کر رہے ہیں) کا مرتب کیا ہوا ہے، یہ نصاب درحقیقت ایران کا ساختہ پرداختہ ہے، یہ ایران کے ذہن کا انعکاس ہے، یہ نصاب اصلاً ایران کا عطیہ ہے جو ہندوستان کو ملا، اس لیے کہ جس عہد میں یہ نصاب تشکیل

ہو، وہ عہد حکمرانی اور سیاسی طاقت کے لحاظ سے تو ترکی النسل لوگوں کا عہد ہے، لیکن تہذیبی اور فکری حیثیت سے وہ ایرانیوں کا عہد ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کی یہ تقسیم ہے کہ اس کی سیاسی تاریخ ترکوں اور مغلوں کے زیر سایہ پروان چڑھی، لیکن ہندوستان کے علمی و فکری تاریخ ایرانیوں کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے اور اس پر حقیقت میں ایرانیوں کا اقتدار قائم رہا ہے، اس ملک میں سیاسی حیثیت سے مغل یا افغانی النسل خاندان حکمرانی کرتے تھے۔ ان سے پہلے ترک حکمرانی کرتے تھے، لیکن فکری اور ذہنی حیثیت سے یہاں ایرانی حکمرانی کرتے تھے، اور ایران حقیقت میں مشرق کا یونان ہے، ایران اور یونان میں مماثلت کی اتنی باتیں ہیں کہ اگر فلسفہ تاریخ کا کوئی طالب علم یہ ثابت کرنا چاہے کہ یونان کا مشرق میں بروز ایران کی شکل میں ہوا یا ایران کا مغرب میں بروز یونان کی شکل میں ہوا تو شاید غلطی نہیں ہوگی۔

ہمارے اس قدیم نصاب کا قوام (اور قوام ہی اصل چیز ہوتی ہے) ایران میں تیار ہوا ہے اور ایران کی کچھ خصوصیات ہیں، جن میں ذہانت، لطافت ذوق، ادبی حاسہ اور شاعری کا فطری ملکہ اس کی قومی و نسلی خصوصیت ہے، ان سب کے ساتھ ایک چیز اور ہے، وہ ہے جس کو ہمارے یہاں اردو میں "رائی کا پربت بنانا" کہتے ہیں اور مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے "الفرقان" کے شاہ ولی اللہ نمبر میں اس کو "بات کا بتنگڑ بنانے" کے بلیغ لفظوں میں ادا کیا ہے، یہ ایران کی صدیوں کی نسلی خصوصیت و وراثت ہے کہ وہ "رائی کا پربت" اور "بات کا بتنگڑ" بنا دیتا ہے۔ یہاں پر عرب کی فطرت اور عجم کی فطرت (اور آپ کو یہ معلوم ہے کہ عجم کا لفظ ہمارے قدیم لٹریچر میں جب بولا جاتا ہے تو اس سے مراد ایران ہی ہوا کرتا ہے) ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہے۔ عرب کی فطرت میں سادگی، ایجاز، واقعیت پسندی اور عملیت ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کے لیے عرب کی سرزمین اور عرب قوم کے انتخاب کرنے میں یہ حکمت بھی تھی۔

"ایجاز" لفظی ہی نہیں ہوتا، ایجاز لسانی ہی نہیں ہوتا، ذہنی ایجاز بھی ہوتا ہے، اور ذہنی ایجاز کو لسانی ایجاز پر ترجیح و فوقیت حاصل ہے، بعض قوموں اور

افراد کا ذہن ایجاز پسند ہوتا ہے اور بعض کا طوالت پسند ہوتا ہے۔ ذراسی چیز کو جب تک پھیلا کر ان کے سامنے نہ لایا جائے ان کا ذہن اس کا ادراک کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اس دین کو چونکہ قیامت تک رکھنا تھا اور مختلف ادوار اور مختلف ملتوں کے لیے اس کو آخری پیغام بننا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے عربوں کا انتخاب کیا کہ جو بات کے (اس کے حدود اور دائرہ میں رہتے ہوئے اور اسی کے درجۂ حرارت و برودت کے مطابق) سمجھنے کے عادی تھے، ذہن اس کو اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، پھر اس کو بے کم و کاست پہونچانے کی بھی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس لیے آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی حفاظت کے لیے بھی اور حدیث کی اشاعت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے عربوں ہی کا انتخاب کیا اور میرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ جہاں جہاں اسلام عربوں کے ذریعہ سے گیا ہے وہاں اپنی حقیقی شکل میں گیا ہے بلا تحریف، بلا غلو و مبالغہ کے گیا ہے اس کے ساتھ ایک خاص بات یہ ہے کہ ان ملکوں میں جہاں عرب اسلام کو لیکر گئے ہیں وہاں حدیث کی اشاعت ہوئی ہے اور جہاں غیر عرب عناصر کے ذریعہ سے اسلام گیا ہے وہاں حدیث بہت بعد میں آئی ہے اور آپ سراغ لگائیں گے تو کسی عرب ملک سے اس کا ربط ملے گا، عرب فطری طور پر غلو و مبالغہ سے مناسبت نہیں رکھتے تھے، ابن رشیق کی کتاب "العمدہ" میں آتا ہے کہ کسی نے حضرت سعید بن المسیب سے کہا کہ "ان اناسا یکرھون انشاد الشعر فی المسجد" انھوں نے کہا: "واللہ لقد نسکوا نسکا اعجمیا" کہنے والے نے کہا کہ بعض لوگ مسجد میں شعر پڑھنے کو مکروہ سمجھتے ہیں، تو انھوں نے کہا یہ عجمی زہد ہے، عربی زہد نہیں ہے، اس نسک اعجمی کا تعلق عبادات ہی سے نہیں، نسک عجمی کا تعلق علوم سے بھی، حقائق سے بھی، ان کی ترجمانی سے بھی، ان کی مقدار کے تعین سے بھی ہے۔ کتنی چیز ہو اور کس مقدار میں اس چیز کو لینا چاہیے اور اشیاء کا کیا تناسب ہو اس میں عربی دماغ صحیح تناسب کی طرف چلتا ہے، عجمی دماغ عدم تناسب کی طرف چلتا ہے، قرآن کہتا ہے "کان امرہ فرطا" یعنی وہ افراط یا تفریط میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس ایرانی ذہن کے خصائص میں سے ایک "دقت پسندی" ہے، یعنی وہ کسی بات کو سیدھی سادھی شکل میں سمجھنے اور پھر اس سے زیادہ آگے کی منزل یہ کہ اس کا ذوق لینے سے قاصر ہے، جب تک کہ کوئی بات پیچ دار طریقے سے نہ کہی جائے، اس میں گہرائی نہ ہو، اس وقت تک ایرانی ذہن اس کی قدر نہیں کرتا، آپ ایران کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو "موشگافی" کے وقت سے مجوسیت کے عہد سے لیکر اس عہد تک آپ سب جگہ یہ ذہن پائیں گے کہ وہ سیدھے سادے اسلام پر قانع نہیں ہے جب تک اس میں کوئی "فلسفیانہ گتھی" یا غلو ومبالغہ، افراط وتفریط شامل نہ ہو، اسی کا نقطۂ ارتقاء وہ ہے جو اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں۔

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

ایرانی ذہن کا دوسرا خاصہ ہے "احتمال آفرینی"، ہر چیز میں تعدد و تنوع، یعنی ایک چیز پر وہ کفایت نہیں کرتا۔ فرض کیجیے کہ یہ بات ہے کہ مصنف نے کتاب کی ابتدا کرتے ہوئے حمد وصلاۃ کیوں چھوڑ دیا؟ کتاب میں خطبۂ مسنونہ کیوں نہیں لکھا؟ عرب اس کی تاویل پر اکتفا کرے گا، لیکن ایرانی ذہن اس میں ایسی موشگافی سے کام لے گا اور ایسی دور کی کوڑی لائے گا کہ مصنف بھی سنے تو حیران رہ جائے اور بول اُٹھے کہ

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

یہ ذہن علمی حلقہ سے نکل کر قومی حلقہ میں آجاتا ہے، اور وہ لوگ بھی جو تعلیم وتعلم کا کام نہیں کرتے اسی طرح سوچنے لگتے ہیں۔ میں ایک لطیفہ بھی سناتا ہوں جس سے شاید کانوں کا ذائقہ بھی بدل جائے۔ کوئی عثمانی خلیفہ یا وزرائے سلطنت میں سے کوئی اہم شخص اپنی مملکت کے کسی حصہ میں گئے تو ان کے اعزاز میں وہاں توپ نہیں چلی، انھوں نے وہاں کے گورنر کو بلایا اور کہا کہ ہمارے اعزاز میں توپ کیوں نہیں چلی؟ یہ تو توہین ہوئی، انھوں نے کہا اس کے دس وجوہ ہیں ـــ انھوں نے بھی شاید کوئی کتاب نحو یا منطق کی پڑھی ہوگی ـــ انھوں نے کہا کیا؟ بتاؤ، انھوں نے کہا سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ بارود نہیں تھی! انھوں نے کہا کہ بس اب زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جب بارود

نہیں تھی تو اس کے بعد اب کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ یا ورنہ ہو تو تو پھر چل کیسے سکتی ہے؟ لیکن وہ صاحب تیار تھے کہ اس کے بعد بھی وجوہ بیان کریں، وہ عجمی آدمی تھا، اس نے غالباً منطق نہیں پڑھی تھی، اس نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، نہ میرے پاس فاضل وقت ہے نہ تمہارے پاس، آپ کسی عربی النسل عربی الذوق مصنف کی کتاب میں بلا وجہ اسباب و علل کی اتنی بھتات نہیں پائیں گے، یہ ایرانی ذہن ہے۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کسی نصاب کے متعلق کوئی رائے اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ اس پر زمان و مکان کے کیا اثرات پڑے ہیں، اس لیے کہ نصاب تعلیم کو نہ زمان سے علاحدہ کیا جا سکتا ہے نہ مکان سے۔

آپ سب کو معلوم ہے کہ پہلے ہندوستان میں وہ محور جس کے گرد سارا نصاب گردش کرتا تھا وہ فقہ کا علم تھا اس لیے کہ یہاں حکومت کرنی تھی، یہاں کا آئین اسلامی تھا، شریعت محمدی پر عمل ہوتا تھا، اس لیے عملی ضرورت یہ تھی کہ فقہ پر اچھی اور عمیق نظر ہو، تو سب سے پہلے ہندوستان میں جب نصاب درس جاری ہوا اس وقت فقہ کی اس پر حکمرانی تھی، فقہ کا حصہ اور اس کی چھاپ سب سے زیادہ گہری تھی، اس کے بعد اصول فقہ کا نمبر آیا، جب اصول فقہ نے ایران میں اور ایران سے باہر خاص حالات و اسباب کی بنا پر ترقی کی اور اس پر موشگافیاں ہوئیں، اور وہ ایک بہت بڑا علم بن گیا تو اصول فقہ کا حصہ بڑھا، پھر جب علامہ وجیہ الدین گجراتی[1]، مولانا عبد اللہ[2] و مولانا عزیز اللہ تلنبی (ملتانی) ایران گئے، اور وہاں کے بلند پایہ اساتذہ سے جن کو علوم حکمت میں توغل تھا پڑھ کر آئے، اس کے بعد امیر فتح اللہ شیرازی اور حکیم علی گیلانی ایران سے آئے تو جیسا کہ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے (آپ حضرات کی خدمت میں میرے والد ماجدؒ کا رسالہ "ہندوستان میں قدیم نصاب درس" جو جزو اول صفحات

---

[1] مولانا وجیہ الدین گجراتی نے ایران جا کر علامہ عماد الدین محمد بن محمود الطارمی سے تعلیم حاصل کی۔

[2] وہ ایران کے مشہور فاضل علامہ عبد اللہ یزدی کے شاگرد تھے۔

کے حوالہ کا نچوڑ ہے، پیش کیا گیا ہوگا، میں آپ حضرات سے یہ گذارش کروں گا کہ آپ اس پر ضرور ایک نظر ڈالیں انھوں نے ہندوستان میں ہر عہد کا نصاب مرتب شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے) کہ جب یہ ایرانی عنصر آیا تو ہندوستان پر اس کا گہرا اثر پڑا اس تعلق کی تجدید کبھی برابر ہوتی رہی؛ ہمارا موجودہ نصاب درس جس کو ملا نظام الدین کے ذریعہ توانائی اور زندگی ملی، وہ درحقیقت امیر فتح اللہ شیرازی کا پروردہ یا ساختہ پرداختہ ہے۔ ——— فکری طور پر بھی، ادبی طور پر بھی (اس کے شواہد آپ شعر العجم میں دیکھیں گے) ہندوستان کا ذہن اس نصاب کو قبول کرنے کے لیے جو درس نظامی کی شکل میں ہم کو ملا پورے طور پر تیار ہو چکا تھا۔

میں یہ بھی عرض کروں کہ درس نظامی اس زمانہ کے علماء کی ذہنی پرواز کا بہترین نمونہ ہے اور واقعہ یہ ہے کہ کہا جا سکتا ہے کہ کم سے کم اس عہد میں یعنی دسویں یا گیارھویں صدی تک دنیا کے کسی ایسے ملک کا ہم کو علم نہیں جہاں علم کے اندر اتنی گہرائی آگئی ہو، اتنی وسعت اور تنوع پیدا ہو گیا ہو؛ اور اس کے اندر گل کاریاں پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہو، ہم یہ بڑی حق تلفی اور ایک غیر علمی انداز فکر سمجھتے ہیں کہ درس نظامی کو آنکھ بند کر کے یہ کہہ دیں کہ یہ سراپا ناقص ہے، اس میں پھر ایک ہندوستانی مصنف کی دو اہم کتابوں کا اضافہ ہوا، (۱) سلم العلوم (۲) مسلم الثبوت جو دونوں ملا محب اللہ بہاری کی تصنیف ہیں، ہندوستان کے علمی حلقہ نے اس کو سینہ سے نہیں آنکھوں سے لگایا اور تنہا مسلّم کی بائیس شرحیں لکھی گئیں، اور جامعہ ازہر کو بھی مجبور ہونا پڑا کہ وہ مسلم الثبوت کو اپنے نصاب میں داخل کرے، اور سلّم کا حال تو یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہے کہ حمد اللہ اور ملا حسن اور پھر اس کے بعد کی شرحیں ساری کی ساری اس کی شرحیں ہیں یعنی گویا سلم ایک معیار فضیلت کے طور پر اور انسان کی ذہانت کے ایک پیمانہ کے طور پر ایک کتاب آئی اور پورے علمی حلقہ نے اس کے ساتھ اپنی گرویدگی کا بلکہ شیفتگی کا ثبوت دیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت تعلیم کا صرف ایک ہی نظام تھا، یہ تعلیم کی ثنویت دوئی نہیں تھی، ہندوستان میں دو متوازی نظام نہیں چل رہے تھے، تنہا یہی نظام تھا

قاضی، مفتی بھی پیدا کرتا تھا، مفسر و محدث بھی پیدا کرتا اور سول آفیسرز CIVIL OFFICERS
پیدا کرتا تھا، یعنی کوئی آدمی جو وزارت کے عہدہ تک پہونچے یا عدالت کے عہدہ
پر پہونچے، یا انتظامیہ کے کسی بڑے سے بڑے عہدہ پر پہونچے اس کا کچھ پڑھا لکھا ہونا
ضروری تھا، اور پڑھے لکھے ہونے کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ وہ جہاں تک پڑھ سکے
جہاں تک اس کے حالات اجازت دیں، یا اس کی ہمت ساتھ دے وہاں تک درس
نظامی پڑھے، لیکن آپ جس کے حالات پڑھیں گے تعلیم یافتہ لوگوں میں جس کا شمار تھا
معلوم ہوگا کہ کسی نہ کسی درجہ تک متوسطات تک یا ابتدائی کتابوں تک اس نے یہ
کتابیں ضرور پڑھی ہیں، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس علمی گروہ میں ایک خاص ذہن پیدا
ہوا، پھر ان کے اندر جو گویا پورے تعلیم یافتہ اور فاضل نہیں تھے ان کے اندر بھی
کسی نہ کسی درجہ میں یہ ذہن منتقل ہوا، پھر ان کے بعد ان کے ماحول پر اثر انداز ہوا،
اس کے بعد ماحول سے نکل کر پڑھی لکھی مسلمان آبادی پر اس کا اثر پڑا، اس کا اثر اگر
آپ دیکھنا چاہیں تو اس زمانہ کے علماء کے اختلافات کے میدانوں میں دیکھیں، اظہار
خیال کے طریقوں میں دیکھیں، ان کی تصنیفات میں دیکھیں، پھر یہ بات معاشرہ میں
آئی اس لیے کہ نصاب تعلیم پورے معاشرہ پر اثر انداز ہوتا ہے، جو نصاب تعلیم ماحول
و معاشرہ پر اثر انداز نہ ہو وہ ناکام نصاب تعلیم ہے، اور اگر اثر انداز ہو تو نازک
بات ہے، اس لیے ہمیں دونوں حقیقتوں کو سامنے رکھ کر دیکھنا چاہیے یہ فرض کر لینا صحیح
نہیں کہ نصاب تعلیم سے وہی افراد متاثر ہوتے ہیں جو مدرسہ سے تعلق رکھتے ہیں، فاضل
و عالم اگر مدرسہ سے نکل کر اپنے ماحول پر اثر انداز نہیں ہوتے اور ان کا احترام نہیں
ہوتا تو وہ مدرسہ ناکام ہے، وہ نصاب تعلیم ناکام ہے، اور اگر اس کا اثر پڑتا ہے تو
دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا اثر ہے، کہیں غلط اثر تو نہیں پڑ رہا ہے، میں یہ عرض کرنا چاہتا
ہوں کہ ان اثرات کو دیکھنے کے لیے آپ کو اس زمانہ کی تصنیفات دیکھنی چاہیے، ایک
دوسرے کی تردید میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کو دیکھنا چاہیے، مخالفت و تردید میں
آخری حد پر پہونچ جانا اپنی بات کو زیادہ سے زیادہ دلائل کے ساتھ منوانا، اور

اس پر اصرار کرنا اور اس میں احتمالات نکالنا، اس نصاب نے یہ ذہن پیدا کیا، اپنی ان تمام خوبیوں اور کمالات کے ساتھ لیکن "اذا ثبت الشئ ثبت بلوازمہ" یہ نصاب جب آیا تو اپنے پوری نفسیات کے ساتھ آیا، میں عرض کرتا ہوں کہ نصاب تعلیم کی بھی نفسیات (PSYCHOLOGY) ہوتی ہے، اور جس نصاب تعلیم کی نفسیات نہ ہو وہ پانی کی سطح پر ہے اندر نہیں اترا۔

اگر ایک عملی حقیقت کے طور پر سوچا جائے تو بات بہت سیدھی اور صاف ہے کہ نصاب تعلیم کا زندگی سے معاشرے سے اور طرز فکر سے اور یہاں تک کہ دینی تصورات سے اور ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کرنے سے اور یہاں تک عرض کرتا ہوں کہ قرآن و حدیث کے فہم سے بھی مستحکم ربط ہے، آپ اس سے اس کو جدا نہیں کر سکتے، اب آپ یہ دیکھیے کہ قرآن و حدیث ہی کا فہم ہے، آپ قدیم عہد کی تفسیریں دیکھیے اور پھر متاخر عہد کی تفسیریں دیکھیے، خاص طور پر جو بلاد عجم میں لکھی گئیں تو آپ کو کھلا ہوا فرق معلوم ہوگا، ان میں سادگی ہے، عملیت ہے، حقیقت پسندی ہے، قرآن مجید کے مقصد سے قرب، نبوت محمدی جو عرب میں آئی اس سے مناسبت ہے اور دوسری تفسیروں میں آپ دیکھیے گا تو وہ بات نہیں پائیے گا، بات صرف اتنی ہے کہ نصاب تعلیم انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے، خاص حالات میں بنتا ہے، خاص مقاصد اور مطمح نظر اور ضروریات کے پیش نظر بنتا ہے، اور اس میں ایک خاص عہد تک چلنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اگر اس کو ہم یوں کہہ لیں کہ وہ "جسم حیّ و نامی" ہے، جس کی حیات اور نمو ایک خاص عہد تک جاتی ہے، تو پھر اس کے بعد بات مختصر اور آسان ہو جاتی ہے، اگر اس کو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ معصوم چیز ہے یا آسمان سے نازل ہوا ہے، یا ایسے مقدس ہاتھوں کا مرتب کیا ہوا ہے کہ جس کے بعد اب اس پر غور کرنا ایک طرح کی بے ادبی ہے تو پھر کچھ کہنے کی گنجائش نہیں، اس مؤقر مجلس اور آپ جیسے حضرات کو جو پورے علمی ہندوستان کی نمائندگی کر رہے ہیں اس لیے تکلیف دی گئی ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ حقیقت پسندی کے ساتھ اور پورے انصاف و توازن کے ساتھ غور کریں کہ جو چیزیں ان میں سے اب قابل تبدیل

ہو گئی ہیں ان کو تبدیل کریں، لیکن وہ تبدیلی جو ہو وہ اللٹپ نہ ہو، وہ کسی جذبہ کے ماتحت یا کسی ردعمل کے نتیجہ میں نہ ہو، وہ بالکل علمی نقطہ نظر سے اور معروضی طریقہ پر ہو۔

دارالعلوم دیوبند نے اپنے صد سالہ اجلاس میں مجھے یہ اعزاز بخشا کہ نصاب تعلیم پر جو سیمنار تھا مجھے اس کی صدارت تفویض کی، میں نے کہا کہ حضرات میں آپ سے اول تو یہ بات کہتا ہوں کہ نصاب تعلیم کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے اسلاف ہم سے کہیں زیادہ حقیقت پسند اور ہم سے کہیں زیادہ وسیع النظر اور کہیں زیادہ فراخ دل تھے، اس لیے کہ ہمیں نصاب تعلیم کی پوری تاریخ میں نظر آتا ہے کہ برابر تبدیلیاں ہوتی رہیں، اور معیار فضیلت بھی بدلتا رہا، پہلے فقہ، پھر اصول فقہ پھر علوم حکمت اور حدیث بہت بعد میں آئی حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کوششوں سے اس کا سکہ چلا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ تضاد ہے تاریخ کا جس کو آپ حضرات کے سامنے رکھا جا سکتا ہے کہ جب تک ہندوستان میں ایک ہی حکومت تھی، یعنی صرف مسلمان ہی حکومت کر رہے تھے، صرف خاندان بدلتے تھے، خاندان غلامان آیا، پھر تغلق آئے، لودھی آئے، سوری آئے پھر مغل آئے، تو جب تسلسل تھا۔ اسلامی حکمرانی SOVEREIGNTY میں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کا تھا، اقتدار اعلیٰ ایک تھا، اس کا دین ہی نہیں بلکہ مذہب بھی ایک تھا یعنی مذہب فقہی بھی ایک تھا یعنی حنفی۔ آئین ایک تھا، یعنی شرع محمدی، اس کی زبان ایک تھی یعنی فارسی اور مذہبی زبان عربی تھی، اور تہذیب بھی ایک ہی تھی، یعنی ایرانی عربی ہندوستانی تہذیب کا آمیزہ، سب میں وحدت تھی اور تسلسل تھا، اس وقت تو نصاب تعلیم سو سو برس میں بدلتا رہا اور جب زمین و آسمان بدل گئے اور نہ وہ حکمرانی SONEREIGNTY رہی اور نہ وہ تہذیب رہی اور نہ وہ آئین رہا، اور مذہب بھی تزلزل میں پڑ گیا، اس وقت سے اس پر ایسی مہر لگی، ایسی مہر لگی کہ کوئی اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، کیا اس کی بنا پر ایک مؤرخ یہ بے لاگ فیصلہ نہیں دے سکتا کہ ہمارے اسلاف ہم سے زیادہ وسیع النظر تھے، اور ہم سے زیادہ حقیقت پسند اور زمانہ شناس تھے۔ ان کا ہاتھ اور ان کی انگلیاں زمانہ کی اور ملت کی نبض پر رہتی تھیں، اور ہماری انگلیاں نبض سے

ہٹ گئی ہیں اور ہمیں معلوم نہیں کہ نبض کس طرح چلتی ہے۔

دوسری بات میں نے یہ کہی اور ذرا کسی حد تک اپنے حدود سے تجاوز کر کے میں نے کہا کہ میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ اگر کسی مدرسہ میں اتفاقاً کسی دن رات کی باسی دال طلبہ کو کھانے کو دیدی جائے، تو اس کا کیا اثر ہوگا، کیا طلبہ شکایت نہیں کریں گے؟ حالانکہ کسی مدرسہ نے یہ اعلان نہیں کیا کہ ہم تازہ سے تازہ اور عمدہ سے عمدہ کھانا دیں گے، اس کی تو صرف یہ ذمہ داری ہے کہ بہتر سے بہتر تعلیم دے، تعلیم مہیا کرے، لیکن اس کے بعد بھی لوگ اس پر سخت احتجاج کریں گے کہ رات کی باسی دال دے دی گئی، تو میں کہتا ہوں کہ اگر ہم واقعی اس بات پر مطمئن ہوں کہ مثلاً ادبیات اور عربی زبان کی تعلیم میں فلاں کتاب زیادہ مفید ہو سکتی ہے، اور اس زمانہ کے بدلے ہوئے حالات میں جب کہ عرب دنیا سے ہندوستان کے ایسے روابط پیدا ہو گئے ہیں جو ہندوستان کی پوری ہزار سالہ تاریخ میں کبھی نہیں تھے، پھر دعوت کا ایک میدان نکل آیا، وہاں کے اسلامی قائدین اور یہاں کے بہت سے مخلصین اور علمائے ربانیین کی کوششوں سے، تو اب عربی زبان سکھانے کے لیے یہ طریقہ زیادہ مفید ہوگا، اور یہ نصاب زیادہ مفید ہوگا، تو آپ بتائیے کہ اس کو کوئی مدرسہ اس لیے نہیں اختیار کرتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے فلاں کتاب پڑھی تھی تو بتائیے کہ یہ کیا دیانت کے مطابق ہوگا؟ یہ طلبہ کے ساتھ انصاف ہوگا؟ یہ زمانہ کے ساتھ انصاف ہوگا؟ یہ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس باسی دال سے کہیں زیادہ ایک طرح کی کوتاہی ہے اور حق تلفی ہے کہ اگر لڑکے باسی دال کھائیں گے تو ان کے جو اصل مقاصد ہیں، جو مقصد ان کو مدرسہ کی طرف کھینچ کر لایا ہے اس کو کوئی نقصان نہیں پہونچے گا، لیکن مسلسل ان کو بہترین طریقۂ تعلیم سے محروم رکھنا اور اس پر اصرار کرنا یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

میں ان الفاظ کے ساتھ اس مؤقر مجلس کا افتتاح کرتا ہوں اور آپ حضرات کو دعوتِ فکر دیتا ہوں کہ آپ نصاب پر بالکل غیر جانب دارانہ طریقہ پر اس کے مختلف موضوعات پر آپ غور فرمائیں اور آپ کے سامنے صرف اپنے ان عزیز نوجوانوں کا

مستقبل ہو اور اس عہد کے تقاضے ہوں، اور ملت کے وہ اساسی مقاصد ہوں جن کا تابع اور خادم نصاب تعلیم ہے، اگر یہ نصاب تعلیم اس ملت کے اساسی مقاصد کے تابع اور خادم نہیں ہے تو اسلامی نصاب تعلیم نہیں ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی تقدس نہیں ہے (تقدس تو یوں بھی نہیں) وہ قابل احترام بھی نہیں۔ بس یہ دو چیزیں نوجوانوں کا مستقبل اور عہد کے تقاضے، اس سے بڑھ کر ملت کے اساسی اور کلی اور اصولی مقاصد جن کا نصاب تعلیم کو ایک ادنیٰ خادم ہونا چاہیے اور نصاب تعلیم کی اہمیت اور قیمت ساری یہ ہے کہ ان مقاصد کی تکمیل میں وہ علمی میدان میں مدد کرتا ہے، بس یہی حقیقت میں نصاب تعلیم کی معنویت اور قیمت ہے، نصاب تعلیم، ملت اور عہد سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، آثار قدیمہ کی کوئی چیز نہیں ہے کہ آپ میوزیم میں اس کو رکھیں اور دکھائیں کہ کسی زمانہ میں ایسا ہوتا تھا، نصاب تعلیم کو ملت کے ساتھ زمانہ کے ساتھ اور تقاضوں کے ساتھ مربوط رہنا چاہیے، اور یہ ہمارے لیے قرآنی نظریہ سے بھی، دعوتی نظریہ سے بھی اور عملی نظریہ سے بھی ضروری ہے۔

آخر میں آپ حضرات سے معافی چاہتا ہوں اگر کوئی لفظ ایسا نکل گیا ہو جس سے کسی درجہ میں بھی کسی کو کوئی تکلیف پہونچی ہو تو معاف فرمائیں۔

الفرقان کی ملکیت و دیگر تفصیلات کے متعلق اعلان

مطابق فارم ۴ دیکھیے قاعدہ ۸

مقام ———————— لکھنؤ

وقفہ اشاعت ———————— ماہانہ

اڈیٹر کا نام ———————— خلیل الرحمن سجاد ندوی

پرنٹر و پبلشر کا نام ———————— محمد حسان نعمانی

قومیت ———————— ہندوستانی

پتہ ———————— ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ

محمد حسان نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہیں۔

دستخط محمد حسان نعمانی

کاروانِ زندگی کا ایک مطالعہ

از مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی
استاد جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ و معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء

[مخدومنا حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی خود نوشت سوانح حیات "کاروانِ زندگی" کا تذکرہ الفرقان میں آچکا ہے۔ ذیل میں ناظرین کرام فاضل گرامی مولانا عبداللہ عباس ندوی کے قلم سے اس کتاب کے چند اہم پہلوؤں پہ تبصرہ ملاحظہ فرمائیں ——— مدیر]

"کاروانِ زندگی" میرے مخدوم و مربی حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی مدظلہم کی خود نوشت سوانح حیات ہے متوسط حجم کے ۴۰۸ صفحات کی اس کتاب میں مولانا نے اپنی زندگی کی پچاس سالہ (۱۹۱۵ء سے ۱۹۶۵ء تک کی) سرگزشت تحریر فرمائی ہے۔

اس خود نوشت سوانح سے پہلے مولانا کے قلم سے "شرق اوسط کی ڈائری"۔ "ترکی میں دو ہفتے" اور "نہر کابل سے نہر یرموک تک" کے عناوین کے سفرنامے بھی نکل چکے ہیں سفرناموں اور خود نوشت سوانح کا موضوع مصنف کی اپنی شخصیت ہوتی ہے، اور پوری کتاب اسی محور کے گرد گھومتی ہے، اس کی ابتدا "میں" سے ہوتی ہے، اور "أنا" اس کا لازمی جزء ہوتا ہے، لیکن مولانا کے یہاں یہ "میں" بہت مجروح اور بدرجۂ مجبوری صیغۂ متکلم کی حد تک ہے اور "أنا" سرے سے مفقود ہے، یہ بات اس لیے قابل ذکر ہے کہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا، کثرت سے ایسے مقالات نظر سے گذرے ہیں اور گزرتے رہتے ہیں جن کا موضوع کسی معاصر شخصیت یا اپنے عہد کے کسی نامور شخصیت

کا ذکر ہوتا ہے، لیکن مقالہ نگار اس میں اپنے تعلق کا بیان اس وسعت سے کرتے ہیں کہ یہ تمیز کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اصل تذکرہ صاحب مضمون کا ہے یا اس کا ذکر ہے جس کا مقالہ یا کتاب کا عنوان ہے۔

"کاروانِ زندگی" کے مصنف کے قلم سے اہل اللہ اور بزرگانِ ملت کی سیر و سوانح پر ایک دفتر تیار ہو چکا ہے، ان میں وہ بزرگانِ سلف بھی ہیں جو پچھلی صدیوں میں گزر چکے ہیں، جیسے حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان سے پہلے کے اصحاب دعوت و عزیمت نفوسِ قدسیہ، اور ان بزرگوں کی سوانح بھی مولانا نے مرتب کی ہے جن سے ان کا براہ راست تعلق رہا ہے اور جن کی شفقتیں اور دعائیں حضرت مصنف کے لیے سرمایۂ خیر و برکت رہی ہیں۔ جیسے حضرت مولانا محمد الیاسؒ، حضرت شاہ عبد القادر رائے پوریؒ، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، ان تذکروں میں بھی مولانا کا انداز بیان یہ ہے کہ جہاں اپنی ذات کی طرف اشارہ کیا ہے وہاں "حضرت نے اپنے ایک خادم کے نام خط میں تحریر فرمایا" "ایک مرتبہ ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا" کہکر اپنے آپ کو قاری کی نظر سے اوجھل کر دیا ہے، مثال کے طور پر چند جملے "حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت" سے نقل کرتا ہوں جس سے مولانا کے طرز و اسلوب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"لکھنؤ میں ۵۹ھ (۴۰ء کی ابتدا) سے دار العلوم ندوۃ العلماء کے مدرسین اور طلبہ مولانا کے اصول اور آپ کی ہدایت کے مطابق لکھنؤ کے قرب و جوار اور دیہاتوں میں کچھ کام کر رہے تھے اور تعطیلات اور مختلف جلسوں اور تقریبات کے موقعوں پر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے، مولانا کو بھی اس جماعت سے بڑا تعلق پیدا ہو گیا تھا، یہاں کے کام کی روداد کو بڑی دلچسپی سے سنتے اور جماعت کے افراد پر خاص شفقت فرماتے، رجب ۶۲ھ میں آپ نے لکھنؤ کے سفر کی دعوت قبول فرمائی"۔ (ص ۱۴۵)

مذکورہ بالا عبارت اگر اس طرح لکھی جاتی "لکھنؤ میں ۵۹ھ ہی سے میں نے

دار العلوم کے طلبہ اور بعض مدرسین کو آمادہ کر کے مولانا کے اصول اور آپ کی ہدایت کے مطابق لکھنؤ کے قرب و جوار اور دیہاتوں میں کام شروع کر دیا تھا، تعطیلات اور تقریبات کے موقعہ پر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور چند طلبہ کو اور اساتذہ میں سے اپنے احباب کو دعوت دیتا اور ان کو دعوت دیتا اور ان کو ساتھ لے جانے کی کوشش کرتا، مولانا کو بھی مجھ سے خاص طور پر اور میرے ساتھ میرے رفقاء سے بھی تعلق پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ میری دعوت پر رجب ۱۳۶۲ھ میں آپ نے لکھنؤ کا

سفر کیا" تو یہ عبارت واقعہ کے عین مطابق ہوتی، مگر مولانا کا مقصد تو اپنے آپ کو درمیان سے علاحدہ کرنا تھا، یہ صفت جس کو عربی میں "انکار ذات" کہتے ہیں، مولانا کی تحریر کی ایسی خصوصیت ہے جس کی نظیر سوائے مخصوص اہل اللہ اور بزرگان سلف کے کہیں اور مشکل سے ملے گی، اور یہ خصوصیت اس کتاب میں بھی موجود ہے جس کا موضوع خود ان کی ذات ہے اور اگر کتاب مصنف پر گزرے ہوئے واقعات کا مرقع ہے تو ان کا یہ اسلوب ان کے مزاج و افتاد کی تصویر ہے، یہ خصوصیت تو مصنف مدظلہ کی ہر تحریر میں جھلکتی ہے اور اس کتاب میں زیادہ نمایاں ہے۔

کتاب کا پہلا باب خاندان، وطن، ماحول، بچپن، عہد طفلی کے چند نقوش و تاثرات پر مشتمل ہے، یہ وہ موضوع ہے جس میں اگر مصنف کھل کر اور پورے جوش و قوت کے ساتھ اپنے خاندان کی برتری کا اظہار کرے، تو کوئی شخص انگشت نمائی نہیں کر سکتا کہ یہ خود نمائی یا خود بینی نہیں ہے، اس موضوع پر لکھنے والے عام طور پر یوں رقم انداز ہوتے ہیں کہ یہ عاجز ...... تو کچھ بھی نہیں ہے، ہمارے فلاں فلاں بزرگ ایسے اور ایسے تھے اور ان کی یہ خصوصیات تھیں، خاندان کی برتری، اور آباء اجداد کا ذکر کرتے وقت قدرتاً قلم میں جوش اور زبان میں گویائی کی قوت بڑھ جایا کرتی ہے۔ "فاذکروا اللہ کذکرکم آباءکم او اشد ذکراً" سے انسانی سرشت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کا ذکر بڑی وسعت اور فراخ دلی بلکہ مبالغہ کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

مولانا نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو قاری کی نگاہ اپنی ذات اور خاندان سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی غیبی امداد اور اس کے رحم وکرم کی طرف موڑ دی، کہ غیر شعوری طور پر قاری اس تذکرے کے بین السطور میں یہ پڑھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ سے کام لینا چاہتے ہیں اور اس کو کسی خدمت کے لیے منتخب فرماتے ہیں تو ظاہری اسباب کے برخلاف صرف اس کے رحم وفضل سے وہ باتیں سامنے آتی ہیں کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیونکر ہوا، اس کے امکانات، ظاہری حالات میں نہ تھے، اور ماحول کو دیکھتے ہوئے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی، خاندان کے ذکر میں اس کی کمزوریوں کا ذکر اور بے کم وکاست ایسی تصویر پیش کی گئی ہے۔ جو کوئی بھی بے رحم مؤرخ کسی غیر خاندان کے متعلق لکھ سکتا تھا، اور جو خوبی بیان کی گئی ہے وہ دولت ووجاہت، مرجعیت ومقبولیت کی نہیں، بلکہ اس بات کی کہ ان کمزوریوں اور نقائص کے باوجود اللہ تعالیٰ نے عقیدۂ توحید پر کاربند رکھا۔

یہاں پر راقم الحروف کی نگاہوں کے سامنے بعض ایسے خود نوشت تذکروں کے صفحات جھلک رہے ہیں جن کے لکھنے والوں نے فرضی داستان لکھ کر اپنے خاندان کی برتری کا سکہ اپنے زور قلم سے جمایا ہے، مگر ادب مانع ہے، اور ان کا تذکرہ کیا اشارہ بھی خود "کاروان زندگی" کے مصنف اور "الفرقان" کے سرپرست (مدظلہما) دونوں کے مزاج کے خلاف ہوگا،.... ورنہ "اشیا اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں" کے اصول پر ان کا اقتباس میرے مدعا کو واضح کرنے کے لیے مفید ہوتا۔

اس کے بعد کے ابواب میں حضرت مصنف نے اپنی زندگی کی سرگزشت اسی انداز میں سنائی ہے جو ان کی تحریر کی خصوصیت ہے، اور جس کا ادپر ذکر ہوا، البتہ چند باتیں اس کتاب میں نہیں لکھی گئی ہیں، اور مولانا اپنے قلم سے لکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ مصنف جو اپنا ذکر بھی صیغۂ مجہول میں کرتا ہو اس سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی سیرت کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرے گا، یا ان کا ذکر کرے گا جن کا تعلق اس کے شخصی کمالات سے ہے اور جن سے اس کی سیرت کی پختگی، عفاف واستغنا، توکل و

صداقت، پاس عہد، مروت و غم گساری کا پتہ چل سکتا ہے، لہٰذا وہ چند موٹی موٹی باتیں جو ان کی زندگی کا راز نہیں ہیں، اور جن سے ان کے سب جاننے والے واقف ہیں، ان کی طرف اشارہ اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ مصنف کی افتادِ طبع کو دیکھتے ہوئے توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ خود لکھیں گے، مثلاً

(۱) حجاز کے سفر کے سلسلہ میں ملاقاتوں اور علماء و ادباء کی مجلسوں کا ذکر تو آیا، مگر یہ نہیں لکھا، اور نہ لکھ سکتے تھے کہ اس سفر میں وہاں کی متعدد شخصیات نے مولانا کی مالی خدمت کرنا چاہی جس کو مولانا نے قبول نہیں فرمایا۔ خود راقم الحروف کے ذریعہ شیخ عمر بن حسن آل الشیخ (موجودہ وزیر تعلیمات اعلیٰ کے حقیقی چچا اور ہیئۃ الامر بالمعروف کے صدر) نے ایک بار اشرفیوں کی ایک تھیلی بھجوائی، جس میں سے مولانا نے صرف ایک اشرفی قبول کی تاکہ استنکاف و استکبار نہ سمجھا جائے اور باقی واپس کر دی،

سعودی ریڈیو سے معاوضہ کے نام پر ایک معقول رقم پیش کی گئی جو آپ نے وہاں کے ایک رفاہی ادارہ میں اسی وقت دے دی، ملک عبد اللہ بن حسین نے ایک معقول رقم پیش کی جو آپ نے فلسطین کے فنڈ میں وہیں دیدی، دمشق میں سوریہ یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعہ میں لکچرز کا معاوضہ آپ نے قبول نہیں فرمایا، جس کا ذکر مرحوم شیخ مصطفیٰ سباعی نے "رجال الدعوۃ والاصلاح" کے مقدمہ میں بھی کیا ہے، فیصل اوارڈ کا واقعہ تو خیر ۱۹۶۵ء کے بعد کا ہے، لیکن ۱۹۶۵ء سے پہلے بہتیرے ایسے مواقع آئے اور مولانا نے اس وقت اپنے استغنا کو قائم رکھا جبکہ انھیں پیسوں کی سخت ضرورت تھی، میری اطلاع کے مطابق (جو غلط نہیں ہے) مولانا مقروض بھی تھے، اور اکثر و بیشتر ان کے پاس رکشہ کا کرایہ بھی نہیں ہوتا تھا، جس سے وہ امین آباد سے ندوہ تک آسکیں، مولوی عبد المنان صاحب رائے پوری نے مجھے بتایا کہ حضرت رائے پوریؒ کو ان کے اس استغنا اور ضرورت کا اندازہ تھا وہ حکماً اور زبردستی رائے پور سے لکھنؤ کا کرایہ واپسی دے دیا کرتے تھے۔

(۲) حضرت مولانا اپنے قلم سے کیونکر لکھ سکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو

عفاف (عربی معنوں میں) کی وہ خصوصیت عطا فرمائی جو اس زمانہ میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے، میں اور میرے وہ ساتھی جو مولانا کے سفر و حضر میں، خلوت و جلوت میں، صحت و مرض کی حالتوں میں حاضر باش رہے ہیں اور جو اس تنہائی میں کبھی گھنٹوں ان کے پاس رہے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کے سوا، کوئی تیسرا نہ تھا پوری امانت داری کے ساتھ گواہی دے سکتے ہیں کہ آج تک کسی مسلمان کے حق میں کوئی کلمۂ بد ان کی زبان سے نہیں نکلا، غیبت تو بڑی چیز ہے، کسی ایسے شخص کے بارے میں جو کلمہ گو ہو اور جس کی شخصیت اور کردار پر لوگ برملا تنقیدیں کرتے ہوں، اس کا ذکر کبھی مولانا نے کبھی برائی سے نہیں کیا، اس بات کو مزید واضح کرنے کے لیے اور مولانا کے عام انداز کو سمجھنے کے لیے دو واقعے مختصراً عرض کرتا ہوں،

ایک مشہور عالم کی ایک کتاب بہت خوبصورت جلد میں سامنے آئی، مخدومی مولانا محمد منظور نعمانی نے اس کے فہرست مضامین دیکھ کر کتاب رکھ دی کہ مجھ سے یہ ...... برداشت نہیں ہوتا، مولانا نے صرف یہ تبصرہ کیا کہ "ذہانت بھی لوگوں سے کیا کیا لکھوا دیتی ہے"۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک مشہور ادیب جو اپنے حلقہ میں مشہور تھے کہ وہ بہت بخیل ہیں، انھوں نے ایک فیاضانہ اقدام کیا، تنہائی میں میں نے عرض کیا کہ ان صاحب نے کیسے یہ اقدام کیا، فرمایا ہاں لوگ ان کے اقتصادی ہونے کا بہت چرچہ کرتے تھے، مگر واقعہ اس کے خلاف ثابت ہوا، یہاں پر "بخیل" کا مذموم لفظ استعمال نہیں کیا،

ہاں اس شخص کے لیے مولانا کی مجلسوں میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی جس کی ذات سے دین کو بحیثیت مجموعی نقصان پہونچ رہا ہو، اور جو اس امت کا رشتہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توڑ رہا ہو، سابق صدر مصر جمال عبد الناصر سے اپنے نفرت و بغض کا اظہار مولانا نے برملا کیا، تحریر میں بھی کیا، برسر عام تقریر میں (مدینہ منورہ کی مجلس ثقافی کے عام جلسہ میں جمال عبد الناصر کے سیکڑوں ہمدرد اور ہم نوا شریک تھے) اظہار کیا اور عام مجلسوں میں بھی اپنی نفرت کا اظہار کیا اور اس وقت کیا جب اس کے

عروج کا زمانہ تھا، مغرب اقصیٰ سے لے کر خلیج کی ریاستوں تک "صوت العرب" کے
پروپگنڈوں سے کانوں پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی، اس کو یوں سمجھیے کہ ۱۹۳۷ء
سے ۱۹۴۷ء تک مسلمانان یوپی اور بہار میں جو مقام مسٹر جناح کا تھا کہ قائد اعظم
کے خلاف اگر کوئی بولا تو اس کو ہندو کا ایجنٹ سمجھا گیا، اور بہت سے "رہنما" تک
اپنے آپ کو نوجوانوں میں مقبول کرانے کے لیے جناح صاحب کی تائید کا دم بھرتے
تھے، یہی حال جمال عبد الناصر کا تھا، اس دور میں اس سے برملا نفرت کا اظہار
مولانا نے کیا، اور نہ تنہا مولانا اور ان کے قریبی خدام و اعزہ اور چند مخصوص احباب
تھے جو ان کی تائید کرتے، ورنہ مختلف جہات سے فقرے کسے جاتے اور "بلا وجہ
عداوت" کی تہمت لگائی جاتی، واقعہ یہ تھا کہ مولانا کی نشو ونما عربیت کے ماحول
میں ہوئی، وہ مصر اور مصر کی علمی، سیاسی، ادبی شخصیات سے اس درجہ متعارف رہے
ہیں جتنے ہم یہاں کے کوئی اردو کے ادبا، اور ہندو پاک کی شخصیات سے واقف ہوں،
وہاں کے متعدد ادیبوں سے براہ راست برسہا برس کا تعلق رہا ہے، ان کی نظر میں وہاں
کے "رندو پارسا" سب رہے ہیں، عبد الناصر کی دعوت قومیت نے اسلام کو آثار
قدیمہ کے عجائب خانہ کی ایک متاع ثابت کر دیا تھا، موضوع سے دور ہو جانے کا
خطرہ ہے ورنہ شہادتوں اور وثائق سے اس بات کی تفصیل پورے اعتماد سے پیش
کر سکتا ہوں۔

ایک بات اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے کہ جمال عبد الناصر کے عروج و اقبال
کے زمانہ ہی میں مولانا کو وہاں کی مجلس اوقاف اعلیٰ نے اپنا ممبر بنایا تھا، اس مجلس
کے ماتحت موتمر البحوث الإسلامية قائم ہوئی تھی، جو رابطہ عالم اسلامی کے
مقابلہ میں سامنے آئی تھی، اس مؤتمر البحوث نے سب سے پہلے ہندوستان سے
جس کو مدعو کیا تھا وہ مولانا تھے، اور اسی دعوت کی بناء پر مولانا کو حکومت ہند نے
پاسپورٹ بھی دیا تھا، اور مولانا سے یہ خواہش کی گئی تھی کہ وہ ان لوگوں کو نامزد کریں
جن کو مصر سے اس مؤتمر میں شرکت کی دعوت دی جایا کرے۔ اگر مولانا چاہتے تو

سعودی عرب سے کہیں زیادہ مصر میں آنکھوں پر بٹھائے جاتے، لیکن اختلاف کا دائرہ ان کی ذات نہیں تھا بلکہ عقیدہ تھا، جس کا سودا وہ نہیں کرتے تھے، مولانا کے انکار کے بعد ہندوستان کی دوسری شخصیات کو دعوت دی گئی، ...... اس تفصیل سے یہ اظہار مقصود ہے کہ عبدالناصر کی مخالفت یا اس سے نفرت کے اظہار میں اپنے جذبۂ انانیت یا شخصی مخالفت کا عنصر نہیں تھا، بلکہ اس کا نام ایک تحریک اور ازم بن چکا تھا، جس کی مخالفت بغض فی اللہ کے علاوہ کچھ نہ تھی، اور جو "عفا عنا" لسانی سے متعارض نہیں جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی مصلحت و حکمت میں ہم ظاہر بینوں کی عقل کام نہیں کر سکتی، ورنہ یہ دیکھ کر حیرت رہتی کہ ایک ایسے بے ضرر انسان سے کسی کو کیا کد ہو سکتی ہے جو کسی معاند یا بدخواہ کا ذکر بھی حرف کلمۂ خیر ہی سے کرتا ہو، مگر سنت الٰہی یہی رہی ہے، ورنہ صحابہ کرامؓ جیسی مقدس جماعت پر "تبرا" اور دشنام طرازی مذہب نہ بنتا، اس سنت سے مولانا کی ذات خالی نہیں رہی، اور نہ رہ سکتی تھی، معاند و حاسد پیدا ہوئے اور حسد و بغض کے زخم سے نکلا ہوا مواد تنقید دل کی شکل میں اخبارات و رسائل کے صفحات پر بہا، ایک انتہائی ذکی الحس دماغ پر اس کے اثرات کیا پڑے ہوں گے، جو غیروں کی بھی برائی نہ سن سکتا ہو۔ صبر کی بھٹی پر مولانا کی فطرت سلیم کا خالص سونا چڑھایا گیا، اور چمک کر نکھر کر نکلا، صبر بھی عجز و مجبوری کا صبر نہیں تھا، بلکہ ایک ایسے شخص کا صبر تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے قدرت بخشی تھی کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتا تھا، اور اس کے خدام (جس میں بلا تکلف عرض کرتا ہوں یہ کاتب الحروف بھی ہے) اگر ذرا بھی چشم و ابرو کا اشارہ پاتے تو "کالو اصاعاً بصاعین" کا معاملہ کر سکتے تھے، مگر اشارہ ملا بھی تو خاموشی اور صبر کا ــــــ صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہ کرامؓ کو جب عمرہ کا احرام کھولنا پڑا تو ان کے اندر ایسی کوفت تھی کہ ان کا جی چاہتا تھا کہ کسی کا سر حلق کرنے کے بجائے اس کے حلق پر استرہ چلا دیں، کچھ اس طرح کی کوفت سے مولانا کے خدام و تلامذہ کا سابقہ پڑا، جب ان کی زبان صرف مولانا کے احترام

یں خاموش تھی۔

(۴) مولانا نے اپنے سفر حجاز و مصر و شام میں ملاقاتوں، جلسوں اور تقریروں کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ نہیں بیان کیا کہ مولانا کے تعارف میں کس نے اور کتنے بلند الفاظ میں ان کی شخصیت کا اعتراف کیا۔ وہاں کے چوٹی کے ادبا، اور ازہر کے علماء نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ (جس کی توقع کم سے کم ہمارے ہندی ماحول میں نہیں کی جاسکتی تھی) مولانا کا تعارف کرایا، جن میں محض چند وہ اعترافات ہیں جو استاذ علی الطنطاوی، سید قطب شہید، احمد شرباصی، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے مولانا کی کتابوں پر تبصرے کی شکل میں کئے ہیں، مولانا نے ان قصائد کا ذکر نہیں کیا جو ان کی مدح میں کہے گئے۔ یہاں تک کہ سعودی عرب کے مشہور اور کہنہ مشق شاعر شیخ ابراہیم غزاوی نائب صدر مجلس شوریٰ نے تین قصیدے مولانا کی شان میں لکھے اور یہاں تک کہا کہ میں نے بادشاہوں کے قصیدے کہے ہیں، سربراہان حکومت کی مدح کی ہے، مگر آج ایک صاحب قلب و نظر عالم و داعی کی مدح کر کے اپنے لیے توشۂ آخرت جمع کر رہا ہوں[1]، مولانا نے ان کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا لیکن وہ بات لکھنا ضروری سمجھا ہے جو ڈاکٹر احمد امین نے "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین[2]" کی پہلی اشاعت کے موقعہ پر لکھا تھا کہ "اگر قارئین کو کہیں غموض نظر آئے تو ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ مصنف بہرحال ہندی نژاد شخص ہیں" حالانکہ ڈاکٹر احمد امین ہی کے پرچہ میں اور انھیں کے قدرداں ادیبوں نے اس کی پرزور تردید کر دی تھی، اور لکھا تھا کہ ہمیں وہ غموض کہیں نظر نہیں آیا جس کا ڈاکٹر صاحب نے خدشہ محسوس کیا ہے۔

صاحب سرگزشت عرصہ دراز تک مدرس رہے ہیں، اور اس عاجز راقم کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے مسلسل چار سال تک ان سے تلمذ کا شرف حاصل کیا ہے۔ اس لیے

---

[1] شیخ ابراہیم غزاوی کے قصائد کا مجموعہ عنقریب شائع ہونے والا ہے، جس میں یہ تینوں قصیدے ہیں۔
[2] اب اس کے اٹھارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

ان کے طریق تدریس پر کچھ اپنے تاثرات ظاہر کرتا ہوں، کیونکہ یہ حصہ کتاب میں موجود نہیں ہے، اور نہ مصنف اپنے قلم سے لکھ سکتے تھے۔

مولانا کا اختصاص 'قرآن کریم اور ادب عربی ہے' قرآن کریم کی تدریس میں میں نے کبھی ربط آیات اور نظم سُور کی تقریر مولانا سے نہیں سنی، حالانکہ مولانا نے قرآن کریم میں حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ سے تلمذ حاصل کیا ہے اور ان کے ترجمہ اور حاشیہ میں یہی عنصر نمایاں ہے، بلکہ دعوتی رنگ ہمیشہ غالب رہا، لغات کی تحقیق کبھی مولانا کے ذوق تدریس سے ہم آہنگ نہیں ہے، الفاظ کا شجرۂ نسب کبھی وہ بیان نہیں کرتے تھے، البتہ طلبہ کا ذہن قرآن کریم کی فطرت انسانی سے براہ راست اپیل کی طرف موڑ دیتے تھے، اور قرآن کریم کی تعلیمات جن کا تعلق سیرت سازی سے ہے، تقوی اور طہارت نفس سے ہے، وہ پہلو روشن کرتے، انبیائے کرام کا ذکر جہاں قرآن کریم میں آیا ہے اور ان کی محاکات کی گئی ہے وہاں اس طرح مزہ لے لے کر اور ایک آیت کو بار بار دہرا کر پڑھتے کہ بغیر بلاغت کے اصول بتائے ہوئے ہمارے جیسے موٹی سمجھ کے طلبہ بھی اس کی شیرینی محسوس کرتے۔

ادب عربی میں بھی تدریس کا انداز یہ تھا کہ "یہ عبارت خالص عربی نژاد قلم کی ہے" اس کو اگر ہم کہتے تو یوں کہتے مگر "ایک عرب نژاد ادیب یوں کہتا ہے"

سنا ہے کہ لکھنؤ کے قدیم شعراء اور نوابوں کی مجلسوں میں چلم بھرنے والے بھی ادب کا ذوق رکھتے تھے، اور اشعار کی لذت سے آشنا ہوتے تھے، شعر پر صحیح محاکمہ کرتے اور اس لفظ پر جھوم جھوم جاتے جو داد طلب ہوتا، ظاہر ہے یہ ملکہ ان کے اندر فنی موشگافیوں سے نہیں پیدا ہوتا تھا، اور نہ وہ اس کی لغوی بلاغت کی باریکیوں سے فنی طور پر آشنا تھے، صرف ادیبوں اور شعراء کی صحبتوں میں بیٹھنے سے اور ان کے پسند اور لطف اندوزی کو دیکھ کر خود بھی ادب کی چاشنی محسوس کرتے، ہمارے مخدوم و مربی مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کا انداز تدریس بھی ایسا تھا کہ ان کے مزہ لینے سے ہم بھی کسی شعر یا جملہ کی ادبیت کی چاشنی محسوس کرنے لگتے تھے، میرے استاذ محترم مولانا محمد ناظم ندوی نے اس کو

اس طرح بیان کیا کہ آم کے اوصاف پر کسی نے کئی جلدیں کتابیں پڑھی ہوں اور آم یہ چکھا نہ ہو، اس کو آم کی حقیقت اس شخص کے مقابلہ میں کچھ بھی معلوم نہ ہوگی جس نے اس کی ایک قاش چکھ لی ہو۔ مولانا کے اپنے انداز بیان سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ براہ راست ادبی فقروں یا شعر کی لذت چکھا رہے ہیں۔

سوانح حیات کا ایک لازمی جزء یہ بھی ہے کہ صاحب سوانح کے ذوق، معاشرت، معمولات، معاملات پر بھی روشنی ڈالی جائے، اس خود نوشت سوانح میں اس کا بھی فقدان ہے، سبب وہی ہے جو ابتدائی سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ؏

اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

اور جب اپنے بیان پر قلم اٹھایا بھی تو وہ باتیں حذف کر دیں جن میں قارئین کے لیے کوئی دعوت فکر و نظر نہ ہو، لہٰذا چند باتیں جو اس عاجز راقم السطور کے مشاہدہ میں آئی ہیں ان کو بہت ہی اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ مولانا انتہائی حساس ہیں، اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ ترین ذہانت کے ساتھ ذکاوت حس بھی دی ہے، لیکن اس ذہانت کا رخ تمام تر تعمیری ہے، کبھی بھی سیاسی قسم کی توڑ جوڑ، منصوبہ سازی اور مصلحت بینی کی طرف ان کا ذہن نہیں چلا، ذوق بہت پاکیزہ ہے، لباس کی اناقت تو نہیں، ہاں نفاست اور صفائی کو پسند کرتے ہیں، کتابیں اچھے خط میں لکھی ہوئی، بہترین طباعت اور خوبصورت جلد بندی کے ساتھ پسند فرماتے ہیں، الولی جلولی، درویشانہ یا مجذوبانہ انداز انھیں پسند نہیں ہے، دوسروں کی راحت رسانی کا خیال بہت رہتا ہے اور اس سے زیادہ یہ کہ کسی کا احساس مجروح نہ ہونے پائے، وہ ہر شخص کے دل کو آبگینہ سمجھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اس کو ٹھیس نہ لگنے پائے، معمولات برسہا برس سے یہ چل رہے ہیں کہ صبح ناشتہ کے بعد سے کام کے لیے بیٹھ جاتے ہیں، اور سوا کسی غیر معمولی مانع کے چار پانچ گھنٹے روزانہ مطالعہ و املا میں صرف ہوتا ہے، جمعہ کے روز سویرے سے مسجد جانے، اور عصر کے بعد خاص طور پہ خلوت یا مشغولی کا وقت ہوتا ہے۔

معاملات میں صرف ایک بات جانتے ہیں کہ ان کے ذمہ کسی کا حبہ باقی نہ رہے باقی رہا حساب کتاب، اشیاء کی قیمتوں، لین دین کے اندراجات سے بالکل مناسبت نہیں ہے، بلکہ ایک حد تک الجھن ہوتی ہے۔ احباب، معاصرین کا اکرام اس طرح کرتے ہیں جیسے کوئی خورد اپنے بزرگ کا کرے، اور اپنے چھوٹوں سے اس طرح ملتے ہیں جیسے ان کی برابری کا ہو۔ رہا بزرگوں کا احترام تو اہل اللہ کی خاص علامت ہے۔

آخر میں ندوہ کے تعلق سے مولانا کی خدمات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے اپنے قلم سے جو کچھ لکھا ہے اس کی تمثیل مجھے صرف انیسؔ کے اس شعر میں ملتی ہے ؎

"یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں — مولیٰ نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں"

مولانا نے یہ نہیں کہا کہ ندوہ صرف ظاہری لحاظ سے نہیں بلکہ فکری لحاظ سے بھی اپنی پیدائش کے روز سے آج تک ایک ایسا خواب تھا جس کی تعبیر میں اختلاف تھا، تعبیر کا ملنا تو دور کی چیز ہے، اس بیان میں نہ بانیٔ ندوہ حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی خدانخواستہ کوئی تنقیص ہے اور نہ علامہ شبلی نعمانیؒ کی جنھوں نے اس کو شہرت دی اور ادبی و تاریخی ذوق پیدا کیا، اور نہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی جن کی ذات بابرکت ندوہ کے اعلیٰ تخیل کی تجسیم تھی، چمن کا نقشہ بنانے والے، اس کی آبیاری کرنے والے، اس کے بیج ڈالنے والوں کی کوئی تنقیص اس بات میں نہیں ہوتی، اگر کہا جائے کہ نقشہ موجود تھا، پودے بھی نصب تھے، اگر دھوپ کی شدت سے سب کھلا گئے تھے، ایک دو پھول نکلے بھی تو وہ پورے چمن کو شاداب نہیں رکھ سکتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے اس باب میں اپنا ذکر جہاں جہاں کیا ہے، اس کتاب کے علاوہ وہاں "انکار ذات" کی خصوصیت نمایاں ہے۔ کہیں لکھتے ہیں کہ ندوہ نے ایک نصاب پیش کیا، حالانکہ حقیقت کے مطابق جملہ یہ ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے تنہا بغیر کسی کی مدد کے پورا نصاب خود مرتب کیا، اور پہلی مرتبہ تاریخ میں پہلی بار، ایک ہندی نژاد کی لکھی ہوئی کتابیں مصر و شام اور حجاز کے مدارس میں قبول کی گئیں، ندوہ اس وقت تک مصر سے کتابیں درآمد کرتا تھا، یہ برآمد کرنے کا خواب کس نے دیکھا تھا ——؟

ندوہ کی موجودہ زندگی اور رونق، علمی زندگی، طلبہ کی استعدادیں قابلِ شکر حد تک ترقی، طلبہ کی تعداد، عمارتیں، غیر ملکی ماہرینِ فن اور بین الاقوامی شہرت رکھنے والے اساتذہ کا ندوہ کے لیے اعتراف، یہ سب کس متورع غریب کا صدقہ ہے جس کے بغیر یہاں کی کلی کلی خوابِ ناز میں ہوتی؟

یہ باتیں مولانا نے اپنے قلم سے نہیں لکھی ہیں اور نہ وہ لکھ سکتے تھے، اس لیے مشتے از خروارے کے طور پر عرض کر دیا اور جو کچھ بھی لکھا ہے وہ قلم روک کر، اپنے آپ کو جذباتِ عقیدت و محبت کے دباؤ سے آزاد کر کے لکھا ہے۔ ورنہ مولانا کی شخصیت کا تصور کر کے سب سے پہلے یہ شعر لکھتا ؎

قمریاں پاسِ غلط کردۂ خود می دادند ورنہ یک سرو دریں باغ باندامِ تو نیست

آخر میں مولانا کے اسلوبِ نگارش کا تذکرہ اس لیے ضروری ہے کہ کسی کتاب کا مطالعہ یا تبصرہ بغیر اس کے مکمل نہیں ہو سکتا، مولانا کا اپنا اسلوب ہے جس میں عالمانہ سنجیدگی، ادبی شگفتگی اور کلاسیکل تحریر کا بانکپن بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ صدقِ احساس کی قوت، نپے تلے الفاظ میں تاثیر پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے یہ جملے" پھر ایسے افراد اور جماعت و ماحول سے بھی اس کا تعلق ہو جس کی مخصوص افکار و تصورات کی حمایت حمیت کی حد تک، اور ناپسندیدگی قلبی اذیت کی حد تک پہنچی ہوئی ہے":

"حضرت شیخ کی رمضان المبارک میں وہ کیفیت ہوئی کہ جسم ایک ایک بالشت اچھلتا اور رقت و جوش روئیں روئیں سے ابلتا تھا!"

تشبیہات میں ندرت جس کو شاعری کی اصطلاح میں "اعلیٰ تلاش" کہتے ہیں مولانا کی تحریر کا زیور ہے، اس کتاب کی صرف ایک تشبیہ سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"ہمارے مشورہ دینا خصوصاً ان لوگوں کا جو عمل اور قربانی دینے والوں کی صفِ اول میں نہیں ہیں اور جنھوں نے اپنی پوری زندگی وقف نہیں کر دی ہے مفید اور موثر نہیں ہوا کرتا، اور بہت سے داعی اور ذمہ دار اس کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے کوئی ایسا شخص امام کو لقمہ دے جو نماز میں شریک نہ ہو اور جس کے قبول کر لینے کو فقہا مفسدِ صلاۃ سمجھتے ہیں۔"

مولانا کے اردو اور عربی اسلوب پر مستقل مضمون کی ضرورت ہے، امید ہے کہ جو لوگ مولانا پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں وہ اس کام کو بخوبی انجام دیں گے۔

ہماری مایۂ ناز مطبوعات ۔ مصنفہ: مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ

اسلام کیا ہے؟

نہایت آسان زبان، بے حد دلنشین اور پراثر انداز میں اسلامی تعلیمات کا جامع اور مکمل خلاصہ۔ اردو ۸/- ہندی ۱۰/-

دین و شریعت

اس کتاب میں توحید، آخرت، رسالت، نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج، اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت اور احسان و تصوف کے مباحث پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۱۲/-

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ

امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے سوانح حیات آپ کے عرفانی اور ارشادی خصوصیات کا مفصل تذکرہ ۔ ۱۶/-

برکات رمضان

ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف، تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثیرات کا نہایت مؤثر اور شوق انگیز بیان ۳/۵۰

منتخب تقریریں

مولانا موصوف کی ایمان افروز اصلاحی و تبلیغی تقریروں کا مجموعہ ۱۰/-

تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات

تبلیغی جماعت کی اصل دعوت، بنیادی مقصد اور طریقہ کار کی وضاحت۔ ساتھ ہی جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات کی طرف سے تبلیغی جماعت پر لگائے جانے والے الزامات کا جواب اور بہتانوں کی حقیقت ۳/۷۵

میری طالب علمی

اس کتابچہ میں مولانا نعمانی دامت برکاتہم نے اپنی تعلیمی زندگی کے مختصر حالات بیان کیے ہیں۔ ۱/-

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

قرآنی ہدایات اور اس کی اہم تعلیمات کا ایک جامع مرقع جس میں سیکڑوں عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریح کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ ۱۶/-

تصوف کیا ہے؟

تصوف کے موضوع پر یہ کتاب انصاف و تحقیق اور مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے بہت ممتاز ہے۔ ۸/-

ملفوظات مولانا الیاسؒ

جن لوگوں نے حضرتؒ کو نہیں پایا وہ ان ملفوظات کے مطالعہ سے نہ صرف آپ کو بلکہ آپ کی تبلیغی تحریک کو بھی پوری طرح جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ ۶/۵۰

آپ حج کیسے کریں؟

نہایت آسان زبان میں حج کا طریقہ و احکام و مناسک بتانے والی بے نظیر کتاب ۹/-

آسان حج

پاکٹ سائز میں حج کیسے کریں کا خلاصہ۔ جو ہمہ وقت ساتھ رہ سکتی ہے۔ کم تعلیم یافتہ حضرات کے لیے خصوصاً معلم و رہنما ہے۔ ۳/- ہندی ایڈیشن ۳/-

فیصلہ کن مناظرہ

اکابر علماء دیوبند پر مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا تحقیقی جواب ۵/۵۰

انسانیت زندہ ہے

مولانا کی زندگی کے سبق آموز واقعات ۲/۵۰

آپ کون ہیں کیا ہیں اور آپ کی منزل کیا ہے

مولانا مدظلہ کی ایک تقریر جس میں دینی مدارس کے طلباء کے لیے ایک جامع پیغام ہے۔ ۱/۵۰

انقلاب ایران اور اس کی اسلامیت

از مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

ایران کے اسلامی انقلاب کی حقیقت اور اس کی اسلامیت کی اصل اس کتاب میں پڑھیے۔ ذاتی مشاہدات اور براہ راست معلومات پر مبنی خیالات کا مرقع۔ قیمت صرف ۷/-

قرآن صحیح پڑھیں

قرآن کریم کو صحیح پڑھنا بہت ضروری ہے۔ ہم اکثر تلاوت میں بہت سنگین غلطیاں کرتے ہیں۔ صحیح قرآن پڑھنے کے لیے اور تلاوت کی غلطیوں سے محفوظ رہنے کے لیے ہماری کتاب رہنمائے تلاوت یا قرآن کریم کی ایک ریڈر ضرور پڑھیں ۱۲/-

بریلوی فتنہ کا نیا روپ

از مولانا محمد عارف سنبھلی

ارشد القادری صاحب کی تصنیف زلزلہ کا تنقیدی جائزہ اور تحقیقی جواب۔ ساتھ ہی بریلوی فتنہ کی تاریخ اور اس کے تعارف پر ایک مفصل مضمون بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ۱۲/-

مکتوبات خواجہ محمد معصوم

مرتبہ: مولانا نسیم احمد فریدی

حضرت مجدد کے صاحبزادے اور خلیفہ خواجہ محمد معصومؒ کے مکتوبات جو ان کے ارشاد و ہدایت کے پورے کام کا آئینہ ہیں۔ ۱۶/-

اوراد فضیلہ

حضرت مولانا عبدالغفور عباسی نور اللہ مرقدہ کے صبح و شام کے چند معمولات و لطائف کا عجیب و غریب مجموعہ ۲/-

تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ

صحابہ کرام، تابعین، علماء و مشائخ کے ایمان افروز حالات و واقعات ۲/۵۰

صحبتے با اہل دل

مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

حضرت شاہ محمد یعقوب بھوپالی (عرف پیر نھے میاں) کی عرفانی اور اصلاحی مجالس کا مرقع اور ان کے ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ ۱۴/-

تذکرہ حضرت جی مولانا محمد یوسفؒ

ماہنامہ الفرقان کی بے حد مقبول اشاعت

حضرت مولانا مرحوم کی غیر معمولی، دینی اور ایمانی خصوصیات کا مرقع۔ ان کی مشہور تبلیغی دعوت کو سمجھنے کا مستند ذریعہ ۱۲/-

دربار نبوت کی حاضری

از مولانا مناظر احسن گیلانی

حج کے سفر کی عاشقانہ و مستانہ داستان مولانا موصوف کے البیلے طرز بیان میں پڑھیے۔ ۲/۵۰

تاریخ میلاد

از مولانا حکیم عبدالشکور مرزاپوری

مجلس میلاد کی مفصل تاریخ اس کے بارے میں علماء کی آراء نیز اس سلسلہ میں نقطۂ اعتدال کیا ہے۔ قیمت ۸/-

معمولات یومیہ

از حضرت ڈاکٹر مولانا عبدالحی دامت فیوضہم

اصلاح نفس کے سلسلہ میں روزانہ معمولات کا ایک مختصر نصاب۔ ۱/۵۰

قرآنی علاج

ہر قسم کی بیماریوں کا علاج قرآنی آیات کے ذریعہ ۱/۵۰

تبلیغ دین کے لیے ایک اہم اصول

تبلیغی کام کرنے والوں کے لیے بہت مفید ۱/-

منتخب کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
علم الفقہ	۵۵/-	مفاوضات رشیدیہ	۳/-	اسلامی حکومت کے نقش و نگار	۴/-
تعارف مذہب شیعہ	۱۵/-	مکاتیب رشیدیہ	۱۳/۵۰	غدر کے چند علماء	۴/-
اصح السیر	۴۵/-	مطالب رشیدی	۳۵/-	فاطمہ کا چاند	۶/-
تیسیر القرآن	۱۰/-	جواہر خمسہ	۲۵/-	پردہ کی باتیں	۴/-
الانور	۴۰/-	تذکرۃ الخلیل	۲۵/-	اسلامی معاشرت	۴/-
اصلاحی نصاب	۴۵/-	تاریخ اسلام (اکبر شاہ خاں)	۱۲۰/-	استاذ العربیہ	۱/۷۵
غریب تمدن	۱۵/-	مختصر تذکرۂ خلفاء راشدین	۴/-	ماہ رمضان	۴/-
فروع الایمان	۷/۵۰	بہجۃ القلوب	۳/۵۰	میدان حشر	۶/۵۰
ولی کامل	۹/-	ارشادات و مکتوبات مولانا الیاس	۱۲/-	مرنے کے بعد کیا ہوگا	۱۲/-
وصایا	۱۰/-	عربی بول چال اول -/۹ دوم	۱۶/-	حیات الصحابہ مکمل	۱۰۰/-
مکتوبات ماجدی	۴۰/-	بیان اللسان	۳۵/-	فضائل صدقات	۲۵/-
معاصرین	۲۰/-	قاموس القرآن	۳۰/-	تبلیغی نصاب اول -/۳۰ دوم	۳۵/-
محبوب العارفین	۴/۵۰	سیرت طیبہ	۱۵/-	اعتکاف	۱/۵۰
فتح حقانی	۸/-	کتاب الصرف	۶/-	احکام المیت	-/۵۰
فضائل اخلاق و اخلاص	۱/۷۵	کتاب النحو	۵/-	پریشانیوں کا شرعی علاج	۷/-
طریقۂ فاتحہ	۱/-	قاتلان حسین کی خانہ تلاشی	۴/-	عورت کیا کچھ کر سکتی ہے	۵/-
اسلام اور عہد حاضر	۱۰/-	حق پر کون ہے	۴/-	باطل شکن	۵/۵۰
اعمال قرآنی	۸/-	آداب المعلمین	۲/۲۵	کتاب الصلوٰۃ یا نماز کی عظمت	۱۰/-
اصلاح الرسوم	۸/-	آداب القرآن	۲/-	سیرت خلفائے راشدین	۱۰/-
الست کے لیے لمحۂ فکریہ	۱/۷۵	آداب المساجد	۳/۵۰	بدعت کی باتیں	۲۵/-

کمالک غیر سے

بحری ڈاک سے ۶۰/- روپے
(۴ پونڈ یا ۲۵ ریال)

ہوائی ڈاک سے ۱۳۵ روپے
(۹ پونڈ ۵۴ ریال، ۱۵ ڈالر)

چندہ سالانہ

ہندوستان میں ۲۵/-

پاکستان سے پاکستانی سکہ میں ۶۰/-

بنگلادیش سے ہندوستانی سکہ میں ۳۰/-

جلد (۵۲) | بابت مئی ۱۹۸۴ء مطابق شعبان ۱۴۰۴ھ | شمارہ (۵)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی روانہ کیا جائے گا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: کوشش کی جاتی ہے کہ الفرقان انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ ہو جائے اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں۔ اگر دوبارہ بھیجنے کے لیے دفتر میں پرچہ ہوگا تو ضرور بھیجا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار حضرات مبلغ ۴۰ روپے ہندوستانی سکہ میں کسی بھی ذریعہ دفتر الفرقان کو روانہ فرمائیں یا پاکستانی سکہ میں مبلغ ۶۰ روپے ناظم ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیج دیں۔

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلیشر نے نامی پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

گذشتہ شمارے میں ایرانی انقلاب اور اس کے قائد جناب خمینی کے متعلق حضرت والد ماجد مدظلہ کا جو مضمون شائع ہوا تھا، الحمد للہ کہ اس کا جو تاثر زبانی و تحریری طور پر اب تک ہمارے علم میں آیا ہے وہ بہت حوصلہ افزا اور لائق شکر ہے ـــــــ کتنے ہی حضرات اہل علم نے اس تاثر کا اظہار فرمایا ہے کہ بہت بڑا فریضہ جو پوری جماعت علماء کے ذمے واجب الادا تھا، ادا ہوا ہے۔ بہت سے بھائیوں نے جن میں سے بیشتر تعلیم یافتہ اور نوجوان طبقے سے تعلق رکھتے ہیں لکھا اور کہا کہ ہم بہت بڑی گمراہی سے نکل آئے۔ فللہ الحمد، ولہ الشکر

ان سطور میں اولاً تو اپنے تمام قارئین سے عموماً اور ایسے تمام حضرات سے خصوصاً خود اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے ہوئے عرض کرنا ہے کہ زیغ و ضلال اور تحریف و تلبیس کے اس دور میں دین اور امت کی حفاظت کے لیے ایک طرف تو دعاؤں کا اہتمام بھی کریں، اور دوسری طرف اس کی ہر وہ تدبیر بھی کریں جس کی رہنمائی اللہ کی کتاب، اور اس کے رسول کی کتاب زندگی سے اس بارے میں ملتی ہے اور جس کا بہترین اور کامل ترین عملی نمونہ صحابہ کرام کے طرز عمل میں ملتا ہے ـــــــ اور ثانیاً ایک سوال کا جواب عرض کرنا ہے جو ہمارے ایک دوست کے ذہن میں آیا ہے وہ سوال یہ ہے کہ

"ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" پڑھ کر حقیقت معلوم ہوئی کیسا مکر و فریب ہے یہ؟ الامان! الحفیظ!"

مگر ایک اشکال ذہن میں رہ رہ کر آتا ہے جس کا تشفی بخش جواب نہیں ڈھونڈ پا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر معاملہ ایسے صاف اور قطعی باطل کا ہے تو پھر ان میں یہ جانبازی، سرفروشی، اور شجاعت و قربانی کے اوصاف کہاں سے آ گئے؟

کیا آپ اس سلسلہ میں بھی میری۔ اور مجھ جیسے سیکڑوں لوگوں کی — رہنمائی کریں گے؟ جزاک اللہ"۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ سوال بہت اہم ہے؟ اور یہ بھی صحیح ہے کہ بہت سے ذہنوں میں یہ سوال آتا ہوگا۔ راقم سطور نے جب یہ سوال پڑھا تو دل پر چوٹ لگی اور اقبال کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر جاری ہو گیا ؎

دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

اور پھر ذہن کے پردے پر مسلمانوں کی تاریخ کے ایسے واقعات ابھرنے شروع ہوئے جو سرفروشی و جانبازی کی تاریخ کے شاہکار قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اور جن میں سے اکثر کے برپا کرنے والے لوگوں، فرقوں، قوموں اور تحریکوں کو امت کے تمام علماء نے باطل اور صرف باطل کا علمبردار قرار دیا ہے۔ ہماری تاریخ پہلی صدی میں ابھرنے والے پہلے عظیم فتنے مسیلمہ کذاب اور اس کے بعد خارجیوں سے لے کر حرم مکی میں چند سال قبل مہدویت کا لبادہ اوڑھ کر فتنہ و فساد برپا کرنے والوں تک ایسے خطرناک اور مہلک جانبازوں کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

جی چاہتا تھا کہ اس سوال کا جواب تفصیل سے دیا جائے اور عمل جراحی کر کے اس غلط فہمی کو ذہن و دماغ سے نکال پھینکنے کی بھرپور کوشش اس سوال کے جواب کے ضمن ہی میں کر ڈالی جائے جو اس قسم کے سوالات کی بنیاد ہے اور ساتھ ہی ان اعلیٰ اوصاف کے اپنے اور اپنی امت کے اندر پیدا کرنے، اور ان کے صحیح استعمال کی ضمانت کے لیے کس قسم کی تربیتی جد و جہد کی ضرورت ہے اس کی بابت بھی اپنی بساط کے مطابق کچھ عرض کیا جائے ...... ! لیکن اس شمارے میں گنجائش بہت کم رہ گئی ہے۔

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز تنگیِ داماں گلہ دارد

میں اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ اس سوال کے جواب میں کیا لکھوں کہ ان لم یصبہا وابل فطل کے مصداق مفصل نہ سہی مختصر ہی سہی، لیکن نہ ہونے سے تو بہتر ہے، اور پھر اہل عقل و فراست کے لیے تو اشارہ ہی کافی ہوتا ہے، بلکہ کبھی کبھی تو اجمال تفصیل سے زیادہ بلیغ اور مؤثر ہوتا ہے۔ کہ میرے ذہن میں سکھ فرقہ کی تاریخ اور اس کی جانبازیوں، قربانیوں، اور شجاعت و جفاکشی کے قصے تازہ ہونے لگے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آج کل ہمارے ملک میں سب سے زیادہ گونج انہی کی سنائی دے رہی ہے۔ بہرحال حالات سے باخبر شخص بہت آسانی سے ان کی مثال سے ہمارے مقصد و مدعا کو سمجھ سکتا ہے۔ ہمارا مقصد و مدعا مختصر الفاظ میں بس یہ ہے کہ قربانی اور جانبازی اور حمیت و تصلب اعلیٰ اوصاف ضرور ہیں لیکن معیارِ حق نہیں، معیارِ حق تو ہیں وہ مقاصد جن کے حصول کے لیے یہ اوصاف استعمال ہو رہے ہوں، وہ اصول و عقائد جن کی سربلندی مقصود ہو وہ جذبات جو ان سرفروشوں کے دل و دماغ میں موجزن ہوں ـــــ چستی و چاقی، ذہانت و ہوشیاری، پھرتی و چالاکی بلاشبہ اچھے اوصاف ہیں لیکن اگر وہ کسی بے گناہ کو دھوکا دینے، کسی کی جیب صاف کرنے، کسی کو جان، مال اور عزت سے محروم کرنے کے لیے استعمال ہوں، تو ایسے مجرم لوگ قابل قدر و ستائش نہیں، قابل نفرین و ملامت ہیں، اور انسانیت کے لیے رسوائی و عار کا باعث ہیں۔

الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر (مطبوعہ ۱۳۵۹ھ) میں ایک انتہائی گرانقدر مقالہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا اس میں بارھویں صدی ہجری میں ہندوستان کے سیاسی و اجتماعی حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا موصوف نے دو بڑے مہیب فتنوں اور اسلام کے خلاف ابھرنے والی دو خونی تحریکوں کا ذکر کیا تھا، ایک مرہٹوں کی تحریک جو جنوب کے ساحلی مرہٹواڑی علاقہ سے اٹھی تھی، اور

دوسری سکھوں کی تحریک جس کا مرکز شمالی ہند میں صوبۂ پنجاب تھا، مولانا نے اپنے مقالہ میں تاریخی حوالوں سے دونوں تحریکوں کے لرزہ خیز مظالم اور چیرہ دستیوں کی کچھ تفصیل بھی لکھی ہے۔

نہ اس پوری تفصیل کو یہاں نقل کرنا ممکن ہے اور نہ مناسب صرف یہ اشارہ کافی ہے کہ ان لرزہ خیز مظالم کے آئینہ میں اُس دور میں اس تحریک کے لوگوں کی شجاعت، بہادری، تصلب، سنگدلی اور خونریزی کی حیرت انگیز تفصیلات سامنے آتی ہیں۔ جہاں تک اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اس گروہ کی قربانیوں، دیدہ دلیریوں کا معاملہ ہے، جو ہمارا اصل موضوع سخن ہے تو بہتر ہے کہ اس پہلو کے بارے میں آپ مولانا گیلانی ہی کی زبانی سنیں، مولانا فرماتے ہیں:

"بہرحال قتل و غارت، و خونریزی و خوں خواری اس تحریک کی روح تھی، دماغوں کو اتنا مسحور کیا گیا تھا کہ جب فرخ سیر نے اپنے زمانہ میں سکھوں کی ان ظالمانہ چیرہ دستیوں کا قرار واقعی علاج کرنا چاہا اور عبدالصمد خاں تورانی صوبہ دار کشمیر اس مہم پر متعین ہوا جس نے بڑی دلیری سے بندا اور اس کے ساتھیوں پر قابو حاصل کر کے سب کو گرفتار کر کے دہلی روانہ کیا، بادشاہ کے پاس ہزارہا غریب و بےکس مسلمانوں کی فریاد و زاری کی عرضیاں پہونچی ہوئی تھیں، جب حکم دیا گیا کہ اب ان سے انتقام لیا جائے تو بقول طباطبائی اس وقت کا سماں عجیب تھا، لکھتے ہیں:

عجیب قسم کی سخت جانی اس گروہ سے متعلق سننے میں آئی یعنی مارے جانے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا، جلاد کی خوشامد کرنا کہ پہلے اسے قتل کیا جائے۔"

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا گیلانی نے جو کچھ لکھا ہے اسی کو ہم مذکورہ بالا سوال کے جواب کے طور پر پیش کرتے ہیں، مولانا اپنے مخصوص انداز میں رقم طراز ہیں:

کتنی عجیب بات ہے حق ہو یا باطل اس قسم کی قربانیوں اور دیدہ دلیریوں کے نظائر کی تاریخ میں کچھ کمی نہیں ہے. لیکن پھر بھی کچھ لوگ ہیں جو ہر چیز سے قطع نظر کر کے صرف کسی کے تصلب و استقلال یا جذبۂ قربانی کو اس کی صداقت کی دلیل بنا لیتے ہیں، کس لیے مرا؟ یہ نہیں دیکھتے. بلکہ کسی بات پر ہٹ کرتے ہوئے مر جانا بس یہی ان کے نزدیک، اس کے خیال کی صحت اور اس کے مسلک کی راستی کی کافی شہادت ہے، حالانکہ اگر حق و باطل کا یہی معیار ہے تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ابو جہل اور سید الشہدا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں یہ دیوانے کس بنیاد پر امتیاز پیدا کرتے ہیں؟ آخر ابو جہل نے قربانی کی کون سی ایسی قسم تھی جو پیش نہیں کی؟ مال لٹایا، گھر چھوڑا، در چھوڑا، اور بالآخر اپنے مسلک پر اصرار کرتے ہوئے بدر پہنچ کر اسی راہ میں اپنی جان بھی دیدی۔ پھر کیا واقعی محض اس لیے ابو جہل بجائے ابو جہل ہونے کے "ابو الحکم" قرار دیا جا سکتا ہے ____؟ جس نے بھی اپنی جان دے دی بس اس کے بلند کی رتبہ کا ان کے سامنے پھر کوئی ٹھکانا نہیں رہتا حالانکہ سچ پوچھیے تو ایک نہیں لاکھوں ہر زمانہ میں ہر ملک میں آپ کو ایسے آدمی مل سکتے ہیں اور ملتے رہتے ہیں اور اس وقت بھی مل رہے ہیں جو کسی بڑی چیز کے لیے نہیں، صرف پندرہ روپے ماہوار کے لیے فوجوں میں اس لیے بھرتی ہونے پر تیار ہیں کہ جب بگل بجا ہے ان کی گردن ان کے سروں سمیت اتار لی جائے، پھر کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ فوج کا ہر سپاہی قربانی و ایثار استقامت و استقلال کا پیکر مجسم اور مظہر اتم ہے؟ صرف اس لیے کہ بجائے کسی بڑے نصب العین کے عام فوجی سپاہیوں کے سامنے محض پندرہ روپے ہوتے ہیں جن کے لیے وہ اپنی جانوں سے بھی دستبردار ہو جاتے ہیں، انکی کوئی عظمت کسی دل میں نہیں پائی جاتی۔ یہی واقعہ ہے اور یہی فطرت کی شہادت ہے۔

بڑی جہالت ہے کہ کس لیے جان دی؟ اس سوال کی تحقیق کرنے سے پہلے لوگ غل مچا دیتے ہیں کہ فلاں نے جان دیدی اب اس سے زیادہ اس کی راست بازی کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟

آج بھی تحریکوں کی صداقت و عدم صداقت کا معیار جاہلوں میں صرف یہی چیز بنی ہوئی ہے کہ کبھی کبھی کسی مسلک کی تصدیق اس لیے کی جاتی ہے کہ اس پر چلنے والے بڑے منظم ہیں، بڑے اولوالعزم ہیں، ہندوستان ہی نہیں ہندوستان کے باہر بھی اپنے خیال کے پرچار میں دیوانہ وار مارے مارے پھرتے ہیں، کبھی کہا جاتا ہے کہ آخر جو نہ کسی سے کچھ لیتے ہیں، نہ مانگتے ہیں بلکہ اپنی جیب خاص سے اپنی وردیاں بناتے ہیں بیلچے خریدتے ہیں، کرایہ یا بلا کرایہ ریل گاڑیوں پر سفر کرتے ہیں، ہر بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا جانے پر ہر وقت تیار رہتے ہیں، نہ اپنی جائدادوں کی انھیں پروا ہے نہ اپنی اولاد کی فکر، جان عزیز ہر وقت ان کی مٹھی میں دھری ہے، معمولی اشاروں پر اسے آسانی پھینک دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ آخر اس سے بڑھ کر ان کی سچائی اور خدا کی مرضی کے مطابق ہونے کی اور کیا دلیل تلاش کی جاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بجائے خود یہ اچھے صفات نہیں ہیں لیکن لکڑی کاٹنے کے لیے جسے تیشہ دیا گیا، اگر بجائے لکڑی کے وہ مسجد کی دیوار کھودنے لگے تو اس میں تیشہ کی برائی نہیں، استعمال کرنے والے کی غلطی ہے، سعدی نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

ترا تیشہ دادم کہ ہیزم شکن   نہ گفتم کہ دیوار مسجد بکن

آپ یہ نہ دیکھیے کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے؟ بلکہ اس پر نظر کیجیے کہ وہ اپنے ہتھیاروں کو کن چیزوں پر چلا رہا ہے، تنظیم، اتحاد، ایثار، قربانی یہ قدرت کے اٹل قوانین ہیں جن کے بغیر اپنے نصب العین کی تکمیل میں مشکل ہی کوئی کامیاب ہو سکتا ہے۔ مگر بذات خود ان کی کوئی قیمت نہیں، اگر کسی اچھے بلند

نصب العین کے لیے انھیں استعمال کیا جائے تو یہ بہترین چیزیں ہیں، لیکن اگر شر و فساد، خونریزی و تباہ کاری، اضلال و تسویل، نوامیس شرعیہ کی توہین۔ اہل حق کی تحقیر کا ذریعہ انہی چیزوں کو بنایا جائے تو پھر ان صفات سے زیادہ بدتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

میرے خیال میں مولانا مرحوم کے مضمون کے پیش کردہ اس اقتباس سے ہمارا مقصد و مدعا بخوبی واضح ہو گیا ہوگا — اگر آپ ہمارے اس خیال سے متفق ہو چکے ہیں جو الحمد للہ کہ بے شمار دلائل و شواہد پر مبنی ہے۔ کہ ایرانی انقلاب درحقیقت اسلام اور مرکز اسلام کے خلاف اہل باطل اور دشمنان اسلام کی ایک منظم دجالی سازش ہے، تو مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں آپ خود سمجھ لیجیے کہ ان کی سرفروشیوں، جانبازیوں اور قربانیوں کی حقیقت اور نوعیت کیا ہے؟

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

اپنے خریداروں سے چند ضروری گذارشات

۱۔ ہر قسم کی خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

۲۔ اپنا پتہ اردو کے ساتھ صاف صاف انگریزی میں بھی ضروری لکھیں۔ تاکہ اسپیلنگ کی غلطی کی وجہ سے رسالہ گم ہونے کا خطرہ نہ رہے۔ ہو سکے تو اپنا پن کوڈ نمبر بھی لکھیں۔

۳۔ پاکستانی حضرات بالخصوص اپنا پتہ انگریزی میں بھی لکھیں کیونکہ خریداروں کے پتے سائیکلو اسٹائل کرائے جاتے ہیں۔ جس میں ڈاکخانے اور مقامات کی اسپیلنگ درست ہونے پر رسالہ کے گم ہونے کا احتمال نہیں رہتا۔

۴۔ جواب طلب امور کے لیے جوابی پوسٹ کارڈ ہی لکھیں ورنہ جواب کی ذمہ داری دفتر پر عائد نہیں ہوگی۔

۵۔ ختم مدت کی اطلاع ملتے ہی اپنا چندہ روانہ کر دیں۔

۶۔ ایجنسی کے خواہشمند حضرات دفتر سے رابطہ قائم کریں۔

ناظم ادارہ

موجودہ دور کا حقیقی بحران

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

۵ صفر ۱۴۰۳ھ ۱۹ نومبر ۱۹۸۲ء کو یہ تقریر متحدہ عرب امارات میں "العین" یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ سے بھرے ہوئے لکچر ہال میں کی گئی۔

عربی سے ترجمہ: از:- نور عظیم ندوی

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علیٰ سید المرسلین خاتم النبیین

ومن تبعھم باحسان ودعا بدعوتھم الیٰ یوم الدین ——— اما بعد:
اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا ہوں اور اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے یہاں آنے اور آپ جیسے تعلیم یافتہ اور سنجیدہ نوجوانوں سے ملنے کی توفیق بخشی اور آپ کو خطاب کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔ یہ ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے عرب اور مسلم نوجوان اس جزیرہ - جزیرہ نمائے عرب کے لائق فرزند ہیں، یہ شیروں کی اولاد ہیں قدیم ورثہ کے امین، عظیم الشان تاریخ کے مالک اور مستقبل کی امید ہیں، اور میرے لیے یہ ایک نادر اور بڑا مبارک موقع ہے ایسے مواقع ہر وقت اور ہر جگہ میسر نہیں آیا کرتے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا احساس اور اپنی ذمہ داری کا احساس مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں صاف گوئی سے کام لوں اور صراحت کے ساتھ گفتگو کروں، اور میں سمجھتا ہوں کہ عالم اسلامی کے اس حصہ میں جو

صدق وصفا اور حق وصداقت کا مرکز ومنبع رہا ہے اور جہاں سے عالم اسلامی نے بلکہ پورے عالم انسانی نے صداقت، صراحت اور بے باکی کی تعلیم حاصل کی ہے، جس نے زمانہ کے دھارے کو موڑ دیا اور تاریخ کو ایک نئی راہ اپنانے پر مجبور کر دیا، اس علاقہ کے ایک علمی مرکز میں میری صاف گوئی گوارہ کر لی جائے گی اور اس پر مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔

میرے دوستو اور عزیزو! آجکل بحرانوں (CRISIS) کی باتیں بہت کی جاتی ہیں آج کے تعلیم یافتہ حضرات اور انسانی مسائل ومشکلات سے دلچسپی رکھنے والوں کا یہ ایک پسندیدہ موضوع بن گیا ہے اور ایک فیشن سا بن گیا ہے کچھ لوگ اقتصادی بحران کی باتیں کرتے ہیں تو کچھ لوگ قیادت کے بحران کو موضوع سخن بناتے ہیں، کچھ لوگ سیاسی بحران پر داد سخن دیتے ہیں اور بات یہاں تک آگئی ہے کہ لوگ اسکول، راج مزدوروں اور اس سے بھی آگے بڑھ کر باورچیوں اور ڈرائیوروں کے بحرانوں پر طبع آزمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ سارے بحران اور یہ سب مسائل غیر اہم، ضمنی اور غیر حقیقی ہیں۔ ان میں کتنے ایسے ہیں جو محض خیال کی پیداوار ہیں۔

اس دور کا اصل بحران، اس کا اصلی اور حقیقی مسئلہ، انسانی اور عالمی مسئلہ یہ ہے کہ آج کی دنیا میں قوموں اور ملتوں کی سطح پر کوئی صالح، قابل تقلید نمونہ اور قابل اتباع مثال نظر نہیں آتی۔ میں افراد کی بات نہیں کر رہا ہوں، افراد ہر زمانہ میں اچھے ہیں اور اب بھی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری آپ کی یہ دنیا افراد کی سطح پر بہترین نمونوں سے خالی نہیں لیکن افراد تاریخ کے دھارے کو موڑ دینے کی طاقت وصلاحیت کم ہی رکھتے ہیں وہ کوئی موثر انقلاب برپا نہیں کر سکتے، ان کا دائرہ کار اور ان کے اثرات محدود ہوتے ہیں۔ تو اس زمانہ کا اصل مسئلہ اور حقیقی بحران یہ ہے کہ قوموں اور ملتوں کی سطح پر دنیا کے سامنے کوئی مثالی نمونہ نہیں ہے جس کی اقتدا کریں اور جس کے آثار قدم کو اپنے لیے سرمہ بصیرت سمجھیں،

جس کی وجہ سے آج دنیا کی قومیں اور ملتیں بکریوں کا ایسا ریوڑ بن کر رہ گئی ہیں جس کا کوئی رکھوالا، کوئی چرواہا نہیں۔

چھٹی صدی مسیحی میں بھی انسانی دنیا کا یہی حال تھا، انسانیت کی جان نکل چکی تھی، جسم کا ڈھانچہ رہ گیا تھا جس میں نہ روح تھی، نہ دھڑکتا ہوا دل، نہ حساس ضمیر، نہ انسانیت کی کوئی خوبی، نہ اخلاق، نہ دینی جذبہ کوئی آسمانی کتاب اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں محفوظ نہیں رہ گئی تھی، قیادت کا فقدان تھا، اور انسان جاہلانہ رسم ورواج کی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے، خون میں لت پت اندھیروں میں بھٹک رہے تھے، روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔

اللہ تعالیٰ کو انسانوں کی اس حالت پر رحم آیا اور اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانیت کی ہدایت کے لیے اسی جزیرہ نمائے عرب میں مبعوث فرمایا جس کے ایک حصہ میں آج ہماری ملاقات ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو نبوت ورسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ لیکن آپ کی بعثت بہت سے انبیاء کے برخلاف "بعثت مقرونہ" تھی، یہ دوہری بعثت تھی، آپ کی بعثت کے ساتھ ہی ایک امت کی بعثت بھی تھی۔

حضرات! مجھے معاف فرمائیں اور غیر ضروری جرأت وجسارت پر محمول نہ کریں اگر میں یہ کہوں کہ بہت سے قرآن کا مطالعہ اور اس میں غور و فکر کرنے والے اس نکتہ کی طرف دھیان نہیں دیتے کہ اللہ تعالیٰ اس امت کو ایسے صفات سے متصف کرتا ہے جو اللہ کی طرف سے کسی مبعوث اور کسی خاص مہم پر بھیجے جانے والے ہی پر صادق آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كنتم خير امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله (آل عمران ۱۱۰)	تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے لیے مبعوث کی گئی ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو، اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

آسمانی مذاہب اور آسمانی کتابوں کے تقابلی مطالعہ کے دوران مجھے کہیں نظر نہیں آیا کہ کسی امت کی اتنی دقیق اور اتنی واضح و مکمل صفت بیان کی گئی ہے اور امتوں کے درمیان اس قدر واضح خط فاصل کھینچ دیا گیا ہے۔ اس امت کو ایسی اہم اور عظیم بالشان ذمہ داری سونپی گئی ہے جس سے بلند و برتر صرف نبوت ہی کی ذمہ داری ہو سکتی۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دوہری بعثت تھی۔ یہ ایک امت کی بعثت کے ساتھ متصل و مربوط تھی۔

یہی وہ خاص بات ہے جس نے انسانیت کی قسمت بدل کر رکھ دی، یہ مذاہب کی تاریخ میں، قوموں اور ملتوں کی قسمتوں کی تاریخ میں، انسانیت کو نیا رخ دینے والے رجحانات و خیالات کی تاریخ میں ایک نیا تجربہ تھا۔

شاید کچھ محققین اور اصحاب علم اس تعبیر سے مانوس نہ ہوں اس میں انھیں غرابت محسوس ہو، یا انتہا پسندی نظر آئے لیکن میں خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مبارک سے استشہاد کرتا ہوں آپ نے صحابہ کرام کی ایک جماعت سے فرمایا "انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین (بخاری) (تم آسانیاں فراہم کرنے والے بنا کر مبعوث کیے گئے ہو دشواریاں پیدا کرنے والے بنا کر نہیں مبعوث کیے گئے) اور اس بعثت کی ذمہ داریوں کے احساس اور ایک خاص مہم پر مامور ہونے کے شعور سے صحابہ کرام اور تابعین کے سینے معمور تھے۔ ان میں کا ہر فرد، خواہ وہ علم و ثقافت میں کسی ممتاز درجہ تک نہ کبھی پہنچا ہو اپنے کو مبعوث سمجھتا تھا اور اسے اس کا احساس رہتا تھا کہ وہ اللہ کے سامنے قوموں اور ملتوں کی ہدایت اور انسانیت کے نیک یا بد انجام کا جوابدہ ہے۔

ایرانی سپہ سالار اعظم رستم نے حضرت ربعی بن عامرؓ سے سوال کیا کہ آخر وہ کون سی ضرورت تھی یا کون سا جذبہ تھا جو تم لوگوں کو جزیرۃ نمائے عرب سے نکال کر یہاں تک لے آیا؟ تو انھوں نے جو حیرت انگیز و بے مثال اور تاریخ کی وسیع و عریض فضاؤں میں گونج

جانے والا جملہ کہا تاریخ نے اسے محفوظ (RECORD) کرلیا ہے اور ہمیں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ سفراء، شہنشاہوں کے فرستادوں یا حکومتوں کے نمائندوں نے شہنشاہوں، سربراہان مملکت اور قوموں اور ملکوں کی زمام اختیار سنبھالنے والوں کے سامنے، ان کے دربار میں کبھی ایسی بات کہی ہو، ایسا جواب دیا ہو!!

انھوں نے پہلے رستم کے نقطۂ نظر کو غلط قرار دیا اور اس پر تنقید کی، گویا وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہم کو کوئی ضرورت یہاں نہیں لائی ہے ہم اپنی کسی غرض یا کسی فائدہ کے لیے یہاں نہیں آئے ہیں، تاریخ نے ان کے تاریخی کلمات کو، اور کلمات ہی نہیں ان کے لہجہ اور آہنگ تک کو محفوظ کرلیا ہے اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں آج بھی ان کی آواز — اعتماد اور قوت سے بھرپور آواز سن رہا ہوں۔ وہ کہہ رہے ہیں "ان اللہ ابتعثنا" اللہ نے ہمیں ایک خاص مقصد کے لیے ایک خاص مہم کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔

حضرات! ذرا اس قوت ایمانی اور اس خود اعتمادی کا تصور کیجیے جس سے اس بدوی، اعرابی مسلمان کا سینہ معمور تھا، دیکھیے کہ وہ ہر طرح کے احساس کمتری (INFIRIORITY COMPLEX) سے کتنے دور تھے۔ رستم، ایرانی افواج کا سپہ سالار اعظم، تخت شاہی پر بیٹھا ہوا ہے اور یہ بدوی اپنے گھوڑے سے اترتا ہے اور ایرانی قالینوں کو روندتا ہوا، اس مصنوعی آرائش اور جھوٹی شان و شوکت کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور رستم کے سامنے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو جاتا ہے —— پھر جب رستم سوال کرتا ہے کہ تم یہاں کس لیے آئے ہو؟ تو اس کے سیکڑوں جواب ممکن تھے۔ ہم بھوک سے مجبور ہو کر یہاں آئے ہیں، یہ سب سے کمتر درجہ کی بات تھی، اس سے اونچے درجہ کی بات یہ ہو سکتی تھی کہ ہم کو ذلت و اہانت کے احساس اور ردعمل نے یہاں تک پہنچایا ہے وہ افسوسناک اور تکلیف دہ صورت حال جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں اس نے ہمیں باہر نکلنے پر مجبور کیا ہے اور ہم تمہاری طرف سے روا رکھے جانے والے ظلم و

ستم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں —— یا اس طرح کی ہزار باتیں ممکن تھیں —— لیکن نہیں! وہ کہتے ہیں اور پورے فخر اور خود اعتمادی کے ساتھ اور پورے اطمینان و سکون کے ساتھ کہتے ہیں، جیسے ان کے دل میں ایمان کے جذبات ابل رہے ہوں، اور وہ نہیں، قوت ایمانی ان کی زبان سے بول رہی ہو —— کہ نہیں —— ہم کوئی غرض لیکر، یا کسی مجبوری کے تحت نہیں آئے ہیں —— ہم کو اللہ نے بھیجا ہے!!

یہی قوت ایمانی اور یہی خود اعتمادی چھٹی صدی مسیحی اور پہلی صدی ہجری میں اسلام کے پیغام کی امانت سنبھالنے والوں کی پہلی صفت کا امتیاز تھا۔ یہ امت جو اپنے ایمان میں بے مثال تھی، اپنی خود اعتمادی میں بے مثال تھی، اپنی سیرت و کردار میں بے مثال تھی۔ انسانیت پر رحمت میں، انسانی خاندان کے ساتھ تعلق و اتصال میں، روئے زمین کے ہر حصہ میں انسان جن حالات میں زندگی گذار رہے تھے، ان کا دکھ درد محسوس کرنے میں بے مثال تھی، اس کی بعثت ایک نیا تجربہ تھا، یہ بعثت اجتماعی بعثت تھی جس کی لڑی میں سارا عرب پرو دیا ہوا تھا، پھر یہ عرب دنیا کے پیشوا اور رہنما بن گئے، رسالت کے حامل و امین بن گئے، اور دنیا کی تاریکیوں میں ہدایت کے مشعل بردار بن کر سامنے آئے جنھوں نے تاریخ کا رخ موڑ دیا اسے ایک نئی ڈگر پر ڈال دیا۔ چھٹی صدی مسیحی میں تاریکی، ضلالت اور گمراہی اس قدر وسیع اور ہمہ گیر تھی کہ صالح افراد اس میں اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے۔ قرآن خود شہادت دیتا ہے کہ یہود، جو اللہ کے غضب کے مستحق قرار دیئے گئے تھے ان میں بھی نیک اور صالح افراد موجود تھے:۔

من اھل الکتاب امۃ قائمۃ یتلون آیات اللہ آناء اللیل وھم یسجدون۔ یؤمنون باللہ والیوم الآخر،	انہی اہل کتاب میں ایک جماعت قائم ہے یہ لوگ اللہ کی آیتوں کو اوقات شب میں پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں یہ اللہ اور قیامت

يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر ويسارعون في الخيرات واولئك من الصالحين

(آل عمران ۱۱۳، ۱۱۴)

کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں اور اچھی باتوں کی طرف دوڑتے ہیں یہی لوگ نیکو کاروں میں سے ہیں۔

لیکن انسانی معاشرہ اور انسانی قافلہ کی رفتار پر ان کا کوئی اثر نہیں تھا، کیونکہ وہ صرف چند افراد تھے۔ اس زمانہ میں تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب اس امت کی بعثت کا رہین منت ہے جس نے ایمان، عقیدہ، اخلاق، صدق وصفا، عزم وعمل، شجاعت وسخاوت اور ایثار وقربانی میں مثال قائم کر دی تھی۔

اس وقت ہماری آپ کی دنیا میں جو بہت بڑا اور بھیانک خلا نظر آرہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں کوئی ایسی امت نہیں ہے جسے دنیا کی قومیں اپنا اسوہ اور نمونہ بنا سکیں۔ قومیں افراد کو خاطر میں نہیں لاتیں، خاص طور سے وہ قومیں جنھیں آج کی دنیا میں سیادت وقیادت حاصل ہے وہ صالح افراد کو کوئی اہمیت نہیں دیتیں۔ ایسے صالح افراد عربوں میں دوسری مسلم اقوام میں اور تقریباً ہر قوم میں موجود ہیں لیکن یہ مغربی اقوام ان کا وزن نہیں محسوس کرتیں۔ ان کو کسی ایسی مثالی قوم کا انتظار ہے جس کے اندر قیادت کی صلاحیت ہو، جو انسانیت کی رہنمائی کر سکے، جو عقیدہ کی قوت وصلاحیت میں، جذبۂ ایثار وقربانی میں، زندگی کی سادگی میں اور خواہشات واغراض سے بلندی میں دوسری اقوام سے ممتاز ہو، جو ان مغربی اقوام کی سیادت وقیادت اور علوم وفنون میں ان کی برتری کے باوجود ان کی اندھی تقلید پر آمادہ نہ ہو،

یہ یورپی قومیں، بلکہ آج کی انسانی دنیا ان اقوام کی طرف مائل نہیں ہو سکتی بلکہ ان کی طرف سر بھی نہیں اٹھا سکتی۔ جو ان سے کسی صفت میں ممتاز نہ ہو، جو اپنے کو ان سے کمتر سمجھتی ہو، اور جن خواہشات اور لذتوں کی اہل یورپ عبادت

کرتے ہیں انھیں دیکھ کر اس کے منھ میں پانی بھر جاتا ہو۔

میرے دوستو اور بھائیو! میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو اللہ نے جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں، جو مال و دولت دی ہے، خوشحالی اور آرام و آسائش کے وسائل دیے ہیں، لمبی چوڑی حکومتیں دی ہیں اور انھوں نے علوم و فنون میں جو ترقی کی ہے اگر اللہ تعالیٰ اس کا کئی گنا مسلمانوں کو دیدے جب بھی آج کی دنیا مسلمانوں کو اور عربوں کو کوئی اہمیت نہیں دے گی۔ آج کی مغربی قوموں کو اپنے اوپر ناز ہے وہ اپنے کو دنیا کا قائد اور تہذیب و تمدن کا امام سمجھتی ہیں وہ یہ بھی دیکھ رہی ہیں کہ دنیا آج ان کے دستر خوان کی زلہ ربا ہے۔ کوئی امیر کبیر کسی یورپی یا امریکی شہر میں جائے اور وہاں دولت کے ڈھیر سے کھیلے، عالی شان محل تعمیر کرائے، عیش و عشرت کی زندگی گزارے اور الف لیلہ کی تاریخ تازہ کردے جب بھی کوئی یورپی اس کے سامنے اپنا سر خم نہیں کرے گا، اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے گا تک نہیں، لیکن وہی یورپی کسی ایسے آدمی کو دیکھے جو اگرچہ فقیر و محتاج ہو لیکن ان خواہشات نفسانی سے بلند ہو جنکی اہل یورپ بتوں کی طرح یا ان سے بھی بڑھ کر پوجا کرتے ہیں۔ کسی ایسے آدمی کو دیکھے جس کی نگاہوں کو یہ چمک دمک یہ رنگ و نور، یہ مصنوعی تمدن کے جلوے یہ کھوکھلی شان و شوکت یہ جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری خیرہ نہیں کرتی، بلکہ ان کے مقابلہ میں پوری قوت سے کھڑا ہو جائے جیسے تیرہ و تار سمندر میں روشنی کا مینار (LIGHT HOUSE) کھڑا رہتا ہے۔ جو اس تمدن کا مذاق اڑائے، اسے گٹھلی کی طرح پھینک دے اور اس کو اس پر یقین و ایمان ہو اور اس کا اعلان بھی کرے کہ وہ ایک پیغام کا ایک رسالت کا امین ہے انسانیت کا نجات دہندہ ہے، جو یہ اعلان کرے کہ دنیا میں آگ لگی ہوئی ہے اور وہ آگ بجھانے والا (FIRE BRIGADE) ہے۔ پوری دنیا وبائی امراض کا شکار ہے اور وہ طبی سہولتیں بہم پہنچانے (AMBULANCE SERVICE) آیا ہے تو یہ خود اعتمادی، یورپی، ہندستانی، چینی، جاپانی، ہر ایک کو اسلام کی صلاحیتوں

اور خوبیوں پر غور کرنے کے لیے ایک بار نہیں ہزار بار مجبور کرے گی۔

ساتویں صدی مسیحی میں اسلام نے جو خلا پر کیا تھا وہ قدرت و صلاحیت کے اوصاف سے متصف اسی قیادت کا خلا تھا۔ پوری امت "مبعوث" تھی اس کے ہر فرد کے ہاتھ میں مشعل تھا جو تاریکیوں کے سمندر میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا اور جیسا کہ حضرت عقبہ بن نافع نے کہا تھا۔

"اللہ! اگر سامنے یہ سمندر نہ ہوتا تو میں تیری راہ میں جہاد کرتا ہوا دنیا کے آخری سرے تک پہنچ جاتا۔"

(کامل۔ ابن اثیر ج ۳ ص ۴۳)

یہی نور ایمانی یہی خود اعتمادی اور یہی قوت ان پہلے مسلمانوں کے دلوں میں جاگزیں تھی، اور مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ان کی بعثت ہوئی ہے اور محتاط الفاظ استعمال کریں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھیجے گئے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی تو یہ مسلمان رسول کی رسالت کو دنیا میں پھیلانے کے ذمہ دار تھے۔ بہرحال ان میں ہر آدمی یہ سمجھتا تھا کہ یہ اس کی ذمہ داری ہے اس کے ہاتھ میں ایک قیمتی امانت ہے؛ انسان کے مستقبل کی امانت۔ انسان کی قسمت کی امانت اور انسانی تہذیب و تمدن کی زندگی کی امانت۔

یہی چیز تھی جس نے امت اسلامیہ کی قدر و قیمت متعین کی اس کا کردار متعین کیا۔ اور قوموں کی سیاسی و اقتصادی کشمکش کی دنیا میں اسے قیادت کا منصب عطا کیا۔ آج حقیقت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم قومی و ملی سطح پر قابل تقلید نمونہ اور مثال بن کر دکھائیں۔ آج کی دنیا۔ جیسا کہ ابو العلاء المعری نے کہا تھا: "یا نفس جدی دھرک ھازل" (معری نے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ) سنجیدگی اختیار کرو، تمہارا زمانہ تو مذاق کر رہا ہے۔

آج کی دنیا، آج کا زمانہ بھی غیر سنجیدہ ہے، لوگ عیش زندگی گزار رہے ہیں۔ اخبارات میں آپ حماقتوں کے قصے پڑھتے ہیں، یہ اخبارات روزنئی حماقتوں کی کہانیاں

بیکر آتے ہیں اور المیوں کے بھی، اور بڑی افسوسناک بات یہ ہے کہ مذاق سنجیدہ مصیبت بن گیا ہے۔ المیہ (TRAGEDY) طربیہ (COMEDY) بن گیا اور طربیہ المناک ہو گیا، فلسطین میں یہی ہو رہا ہے اور لبنان میں، بیروت میں یہی ہو رہا ہے یہ صرف اس لیے کہ ہماری طاقت و قوت جاتی رہی اور ہماری سنجیدگی جاتی رہی، ہمارے اندر نہ صحیح ایمان رہا نہ خود اعتمادی رہی۔ زمانہ ملت اسلامیہ کو دستگیری کے لیے۔ رہنمائی کے لیے پکار رہا ہے، وہ مدد، مدد کی آواز لگا رہا ہے۔ یورپ خود اپنے تمدن کے بوجھ تلے ہانپ رہا ہے اور جیسے کہ قرآن میں آیا ہے کہ اس پر بوجھ لادو جب بھی اور نہ لادو جب بھی ہانپ رہا ہے۔ یورپ کا تمدن اب چند گھسے پٹے جملوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، اس کا ترکش تیروں سے خالی ہو چکا ہے، اس کے یہاں اب کسی نئی، اچھی اور مفید چیز کے ملنے کی امید نہیں۔ یورپ کے ماہرین، علماء اور سائنس داں جو کچھ دنیا کو دے سکتے تھے وہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں دے چکے اور آج کا یورپ انھیں کے سہارے زندگی گذار رہا ہے۔ اب اس کے اندر جدت و نادرکاری ہے، نہ اس کی صلاحیت، نہ مسائل و مشکلات کے جرأتمندانہ حل کی صلاحیت نہ تقلید اور لگے بندھے ڈھرّے (ROUTINE) سے آزاد عبقریت اور نہ اقدام کرنے کی ہمت و جرأت۔

تو — میرے دوستو! آج کی دنیا میں ایک خلا ہے۔ میں کسی اور خلا کا وجود تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں جس کا پر کرنا ضروری ہو۔ آج کی متمدن دنیا کا واحد خلا، ایک ایسی امت کا خلا ہے جو اپنے پاس ایک پیغام رکھتی ہو، سیرت و کردار رکھتی ہو جس کے پاس ایمان کی دولت ہو، وقار اور سنجیدگی ہو، عزم و عزیمت ہو۔ جہاد کی روح ہو، مردانگی کے جوہر ہوں، فروسیت اور ایثار و قربانی کا جذبہ ہو۔

آج انسانی دنیا کے نقشہ پر پایا جانے والا خلا صرف یہی ہے اور اس خلا کو صرف مسلم قوم پر کر سکتی ہے۔ یہ امت اسلامیہ ساتویں صدی اور اس کے بعد کی صدیوں میں انسانیت کے قافلہ کی قیادت کر چکی ہے، اور آج بھی یہی قیادت کی صلاحیت رکھتی ہے اس کے پاس اسلام کا انسانی پیغام ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ امت اپنے

پیغام کی قدر و قیمت جان لے، اس کی وسعت و عظمت کا اندازہ کر لے۔ اپنی قوت و طاقت کے اصل سرچشموں کو سمجھ لے، اور اپنی ذمہ داری کا احساس و شعور ان کے اندر زندہ ہو جائے ——— لیکن ہم ——— ہم غافل ہیں، بھولے ہوئے ہیں ——— یہ امت یہ اسلامی، عربی امت کب بیدار ہوگی؟ کب نئے سرے سے رسالت کی امانت لیکر اور روشنی کا مشعل لیکر آگے بڑھے گی روشنی کا منبع صرف اسلام ہے، یہ روشنی قرآن کی آیتوں اور سیرت کے صفحات میں محفوظ ہے اور ہم لوگ پوری دنیا کے انسان عربوں کی طرف نظریں لگائے ہوئے منتظر ہیں، اس کو قیادت کا اہل اور اسلام کے پیغام کا امین سمجھتے ہیں۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
بہ امید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

میں اس وقت ——— اگرچہ ایک معمولی آدمی ہوں ——— پوری انسانیت کی نمائندگی کر رہا ہوں، میرے کان دلوں کی دھڑکنیں سن رہے ہیں، انسانی ضمیر کے احساسات کی آہٹیں سن رہے ہیں، مجھے یورپ و امریکہ والوں اور پوری دنیا کے دل و دماغ میں گذرنے والے خیالات کی دھمک سنائی دے رہی ہے۔ اور اگر زندگی کے دھارے میں شامل ہو جائیں تو آپ بھی سن سکتے ہیں۔

میں نوجوانوں سے خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ ایمان کی طاقت سے اپنے دلوں کی بیٹریاں چارج (CHARG) کرالیں اور سنجیدگی، وقار، شہامت، فردیت اور خواہشات اور خودغرضی سے بلندی کی عادت ڈالیں، ان کو مال و دولت، منصب و جاہ اپنا غلام نہ بنا سکے وہ صرف اللہ کے بندے بن جائیں تاکہ پوری قوت اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکیں: ان اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ الناس الی عبادۃ اللّٰہ من ضیق الدنیا الی سعتھا ومن جور الادیان الی عدل الاسلام
اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس مہم کے لیے مبعوث کیا ہے کہ لوگوں کو ——— جو چاہے ——— انسانوں کی عبادت سے نکال کر اللہ کی عبادت تک، دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعتوں میں، اور مذاہب عالم کے مظالم سے بچا کر عدل اسلام کی پناہ میں پہنچا دیں۔

خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

سیرت النبیؐ کا پیغام
مسلمانوں اور غیر مسلموں کے نام

(تیسری اور آخری قسط)

[اس عنوان کے تحت بندہ کی ایک تقریر کی دو قسطیں جنوری اور فروری ۸۴ء کے شماروں میں شائع ہوئی تھیں، اب اس کی آخری قسط پیش خدمت ہے۔ بہتر ہوگا کہ سلسلۂ کلام کو مربوط کرنے کے لیے اس کے مطالعہ کے وقت ان دونوں پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔]

محترم حضرات! میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ انسانوں کے لیے فطری اور لازمی طور پر خدائی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ پھر اس کے بعد میں نے عقل و فطرت ہی کی ترجمانی کرتے ہوئے ان چند صفات کا ذکر کیا تھا جو انسانوں کی اصلاح و تربیت کے لیے آنے والی خدائی رہنمائی میں لازماً ہونی چاہئیں۔ اس کے بعد میں نے اس بارے میں گفتگو شروع کی تھی کہ وہ صفات قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملنے والی رہنمائی میں کس حد تک موجود ہیں؟ اس سلسلہ میں اب تک میں نے دو صفتوں پر گفتگو کی ہے۔ (۱) بلا کسی تفریق کے تمام انسان اس کے مخاطب ہوں۔ (۲) انسان کی فطرت کے ساتھ اس رہنمائی کا معاملہ مثبت ہو۔

انتہائی محدود وقت میں آپ کے اس بھائی نے جو کچھ اس سلسلہ میں عرض کیا ہے موضوع کی اہمیت اور وسعت کو دیکھتے ہوئے وہ کچھ بھی نہیں، لیکن امید ہے کہ آپ حضرات کے دل اس بارے میں مطمئن ہو گئے ہوں گے کہ یہ دونوں صفتیں صرف ایک رہنمائی میں پائی جاتی ہیں، اور وہ رہنمائی وہ ہے جو آخری اور مکمل شکل میں قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانیت کو ملی ہے، جسے اسلام کہتے ہیں ___ اب آئیے بقیہ صفات کی روشنی میں اس رہنمائی کا جائزہ لیا جائے۔

ان دو صفات کے بعد جس تیسری صفت کا میں نے ذکر کیا تھا وہ ہے ہمہ گیری اور جامعیت، اس کی وضاحت میں تفصیل سے کر چکا ہوں، مختصراً ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ انسانی زندگی کے بے شمار گوشے، اور اس کی لاتعداد حیثیتیں اور ذمہ داریاں ہیں۔ اس کی زندگی کا ایک اہم حصہ وہ ہے جسے ہم روحانی و ملکوتی کے نام سے ادا کرتے ہیں، اور دوسرا وہ ہے جسے ہم جسمانی و مادی کا نام دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک پہلو انفرادی ہے اور ایک اجتماعی، اس کی زندگی میں جذبات، و خواہشات کا بھی حصہ ہے اور اخلاق و معاملات کا بھی، دل کا بھی دماغ کا بھی، دنیا کا بھی آخرت کا بھی، خوشی کا بھی غم کا بھی، محبت کا بھی نفرت کا بھی، خلوت کا بھی جلوت کا بھی، ___ اسی طرح اس کی حیثیتیں اور حالتیں بے شمار ہیں ___ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ جو رہنمائی اتنی متنوع بلکہ بے شمار حیثیتیں اور ضروریات رکھنے والے انسانوں کی اصلاح و تربیت کی مدعی ہو اس کے لیے ضروری ہو گا کہ اس میں ان سب کے بارے میں واضح ہدایات اور عملی نمونہ ہو، اگر ایسا نہ ہوا تو اس سے پوری انسانی زندگی کی اصلاح نہیں ہو سکے گی۔ پہلے ایک سرسری سی نظر قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملنے والی خدائی رہنمائی پر اس پہلو سے ڈال لیجیے۔

قرآن مجید کے ایک طالب علم کی حیثیت سے آپ سے عرض کرتا ہوں کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ، کوئی حالت، کوئی حیثیت ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں قرآن مجید میں واضح ہدایات نہ ہوں، تقریر کافی طویل ہو چکی ہے ___ انسانی زندگی کے تمام

گوشوں کے متعلق قرآنی رہنمائی کے ذکر کے لیے یہ تو کیا، ہفتوں اور مہینوں کا وقت بھی ناکافی ہے ـــــ صرف نمونہ کے طور پر اخلاق و معاشرت کے شعبہ میں چند قرآنی و نبوی ہدایات آپ کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں جن سے تفصیلات کا علم تو کیا اندازہ بھی بدستور مشکل ہی رہے گا، ہاں اس باب میں خدائی رہنمائی کے مزاج کا اندازہ شاید آسان ہو جائے۔ انسان جب آنکھ کھولتا ہے تو سب سے پہلے اپنے والدین سے سابقہ پڑتا ہے ـــ اس دنیا میں اس کے آنے کا سبب اس کے والدین ہی ہیں، ہماری پرورش میں ہمارے والدین جو تکلیفیں اٹھاتے ہیں وہ ہر شخص کی اپنی "آپ بیتی" ہے اس لیے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کے مقام کی عظمت اور ان کے حقوق کی نزاکت کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے، وہ تنہا اس رہنمائی کی سچائی کی دلیل بننے کے لیے کافی ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:[1]

"تمہارے پروردگار کا یہ حکم ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرنا، اور والدین کے ساتھ اچھے سے اچھا معاملہ کرنا، اگر تمہاری زندگی ہی میں ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے کسی بات پر اف بھی نہ کرنا، نہ انہیں جھڑکنا، اور نہ ہمیشہ ان سے نرم اور اچھے انداز سے ہی بات کرنا، اور ان کے ساتھ تواضع و محبت بھرا معاملہ کرتے رہنا اور یہ دعا کرتے رہنا کہ اے اللہ جس طرح انھوں نے میرے بچپن میں مجھے شفقت کے ساتھ پالا ہے اسی طرح تو ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ فرما!" (سورہ بنی اسرائیل ۲۳-۲۴)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے:

"ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بہترین معاملہ کی ہدایت کی ہے. اس کی ماں نے اسے بڑی تکلیف کے ساتھ اپنے پیٹ میں رکھا، اور پھر بڑی تکلیف کے ساتھ جنم دیا ہے۔"

---

[1] گنجائش کی کمی کی وجہ سے آیات کا متن حذف کر دیا گیا ہے۔

اس بارے میں یہ بات خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو عبادت اور دعا وغیرہ حقوقِ خدائی میں شریک کرنا جسے شرک کہا جاتا ہے، ہمیشہ سے اللہ کے نزدیک سخت ناپسندیدہ، اور انسانی جرائم میں سب سے زیادہ سنگین ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن مجید کی سورۂ عنکبوت میں اس کی صاف ہدایت موجود ہے کہ اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں اور وہ اسے شرک کی دعوت دیں، بلکہ اس پر اولاد کو بزور مجبور کریں، تب بھی ان کی خدمت سے ہاتھ اٹھانا روا نہیں، ہاں، شرک کے بارے میں ان کی بات ہرگز نہ مانی جائے، لیکن ان کا ادب، ان کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کو مختلف موقعوں پر مختلف انداز سے بیان فرمایا ہے، کبھی فرمایا کہ ماں کے پاؤں تلے جنت ہے۔ کبھی فرمایا کہ اللہ کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے کسی نے پوچھا کہ میرے اچھے سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا تمھاری ماں، اس نے دریافت کیا پھر کون؟ پھر آپ نے فرمایا تمھاری ماں! اور تیسری بار بھی آپ نے ماں ہی کا ذکر فرمایا، چوتھی مرتبہ آپ نے باپ کا اور پھر درجہ بدرجہ دوسرے قرابت داروں کا ذکر فرمایا۔

خود آپ کے والدین تو بچپن ہی میں خدا کو پیارے ہو گئے تھے لیکن وہ بندیٔ خدا حیات تھی جس کا دودھ آپ نے پیا تھا، اس کا شوہر بھی بقید حیات تھا، آپ نے ان دونوں اور ان کی اولاد (جو آپ کے رضاعی بھائی بہن تھے) کے ساتھ زندگی بھر جو معاملہ کیا اسی سے اس بارے میں آپ کے ذاتی ذوق و مزاج کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اس کے کئی واقعات کتابوں میں موجود ہیں ——— حد یہ ہے کہ والدین کے دوستوں اور اہل تعلق و محبت کے ساتھ بھی اچھے معاملہ کی تاکید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر فرمائی ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ انسانی تعلقات، رشتے اور حیثیتیں بہت متنوع ہیں، ابھی میں نے صرف ایک تعلق اور ایک رشتے کے بارے میں خدائی رہنمائی کی بابت

عرض کیا ہے ـــــ دوسرے تمام رشتے داروں کا معاملہ یہ ہے کہ والدین کے بعد حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق انہی کو قرار دیا گیا ہے ـــــ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے "قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ" (جو بھلائی تم کرو تو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے ہے۔) تمام رشتہ داروں کے حقوق کی ادائگی اور ان کے ساتھ اچھے سلوک کے بارے میں انسانوں کے مزاج میں رسوخ پیدا کرنے کے لیے قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ممکن اسلوب کو اختیار فرمایا ہے ـــــ ترغیب و تشویق کے ذریعہ انسانی ضمیر کی تربیت اور مزاج سازی کو بھی اور قانون کے ذریعہ حقوق کے تحفظ کو بھی۔

اسی طرح انسانی زندگی کے جتنے گوشے ہیں، اور جتنے رشتے ہیں، اور جتنی حیثیتیں ہیں، ان سب کے بارے میں نہایت تفصیلی رہنمائی خدا کی اس رہنمائی میں موجود ہے ـــــ اس میں یہ بھی موجود ہے کہ انسان کو غصہ آئے تو وہ کیا کرے، خوشی ہو تو وہ کیا کرے، فتح و کامیابی حاصل ہو تو اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے، شکست یا ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو وہ کیا کرے۔ کیسے ملے، کیسے بیٹھے، کیسے بولے، کتنا بولے اور کیا بولے؟ اس کی خاموشی کیسی اور کس لیے ہو؟ سونا کیسے ہو اور جاگنا کس طرح ہو؟ بازار میں چلنا کس طرح ہو، معاملات اور خرید و فروخت کا کیا انداز ہو؟ اگر تم دولت مند ہو تو دولت کا استعمال کیسے اور کہاں ہو؟ اور اگر غریب ہو تو غربت میں تمھارے دل کی کیفیت اور تمھارے جذبات کیا ہوں؟ تم چھوٹے ہو تو بڑوں کے ساتھ تمھارا کیا رویہ ہونا چاہیے اور بڑے ہو تو چھوٹوں کے ساتھ کس طرح پیش آؤ؟ اگر بات کر رہے ہو تو بات کرنے کا انداز کیا ہونا چاہیے؟ اگر سن رہے ہو تو سننے کا طریقہ کیا ہونا چاہیے۔ مجلس میں بیٹھنے، اور مجلس سے اٹھنے اور مجلس سے کسی کو اٹھانے کا انداز کیا ہو؟ جوان ہو تو جوانی کی صلاحیتیں اور توانائیوں کا استعمال کہاں ہو؟ بوڑھے ہو تو بڑھاپے کی حسرتوں اور تمناؤں کا مرکز کیا ہو؟ دوستوں کے ساتھ دوستی کیسے نبھاؤ؟ اور دشمنوں کی دشمنی کے جواب میں تمھارا رویہ کیا ہو؟

یہ اور اسی طرح کی جتنی حالتیں ایک انسان پر اس دنیا میں آنکھ کھولنے کے بعد موت تک بلکہ پوری قوم پر، بلکہ پوری نسل انسانی پر گذر سکتی ہیں، اس میں ادنیٰ درجہ کا مبالغہ اور شاعری نہیں ہے کہ ان سب کے بارے میں مکمل اور ہمہ گیر رہنمائی ہمیں صرف خدا کی اس رہنمائی سے مل سکتی ہے جو قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانیت کو دی گئی ہے ——— آپ خود غور فرمائیں کہ جس رہنمائی میں یہ بھی کہا گیا ہو کہ رات کو سوتے وقت گھر کے چراغ کو بجھا دیا کرو کہ کہیں رات میں آگ نہ لگ جائے، اور یہ بھی کہا گیا ہو کہ کسی کے یہاں کھانے پر جاؤ تو نہ تو وقت سے پہلے پہنچ کر نیت خرابی کا ثبوت دو اور نہ بعد میں زیادہ دیر بیٹھ کر میزبان کے لئے تکلیف کا باعث بنو، بلکہ جس میں یہ بھی بتایا گیا ہو کہ چپل کس طرح پہنو، کنگھی کس طرح کرو! کپڑے کس طرح پہنو! اپنی ضروریات اور خواہشات کس طرح پوری کرو، بیت الخلا (TOILET) جانا ہو تو اس میں داخل کیسے ہو؟ اور وہاں سے کیسے باہر آؤ؟ جس میں یہ بھی بتایا گیا ہو کہ جماہی آئے تو منھ پر ہاتھ رکھ لیا کرو، اور یہ دعا پڑھ لیا کرو؟ اور جس میں یہ بھی بتایا گیا ہو کہ چھینک آئے تو اس طرح کیا کرو؟ ..... تو اس رہنمائی میں کیا انسانی زندگی کے ان اہم گوشوں کو تشنہ چھوڑ دیا گیا ہوگا جن کی اصلاح و درستگی پر انسانوں کی اصلاح و تہذیب اور معاشرہ کی فلاح و بہبود منحصر ہے؟ کیا اس میں روحانی پہلو کے بارے میں، انفرادی، خانگی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں تمدن اور نظام حیات کے بارے میں، بین الانسانی اور بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں کامیابی، خوش بختی اور سعادت کے ضامن طور طریقوں کا پوری تفصیل سے بیان نہیں کیا ہوگا؟

اس وقت جب کہ نصف شب گذرنے والی ہے اس سے زیادہ تفصیل میں جانا ناممکن نہیں، اگر اتنی معروضات سے آپ کے ذہن میں اسلام کو سمجھنے اور جاننے اور برتنے کی جستجو پیدا ہو جائے تو بس میں اسے ہی اپنی اس حقیر سی کاوش کا قابل شکر نتیجہ سمجھوں گا ——— اب میں چوتھی صفت کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں جس کے

بارے میں اپنا یہ خیال عرض کر چکا ہوں کہ اسے ہر اس رہنمائی میں ہونا چاہیے جو انسانوں
کی اصلاح و تربیت کی دعویدار ہو ___ اور وہ ہے محفوظیت، یعنی یہ کہ وہ اپنی اصلی
شکل میں محفوظ رہے۔

حضرات! میں یہ بات جس کا تعلق مذاہب کی تاریخ سے ہے، عرض کر چکا ہوں
اور اب پھر دوہراتا ہوں کہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات یقینی طور پر سامنے آتی
ہے کہ مختلف زمانوں اور علاقوں میں جو رہنمائیاں انسانیت کی اصلاح و تربیت کے لیے
آتی تھیں، وہ کچھ مدت کے بعد حذف و ترمیم اور کمی بیشی کا شکار ہو کر اساطیری روایات
و حکایات میں تبدیل ہو جایا کرتی تھیں ___ حالانکہ مستقل اور دائمی طور پر انسانیت
کی گتھیاں صرف ایسی رہنمائی کے ذریعہ سلجھ سکتی ہیں جس کی ترمیم و تبدیلی اور کمی بیشی
سے حفاظت کے لیے کوئی مضبوط اور مستقل انتظام ہو۔

اللہ نے اپنی کتاب ہدایت قرآن میں صاف صاف اور کئی جگہ اعلان فرما دیا ہے
کہ رہتی دنیا تک اس آخری رہنمائی کی اپنی اصلی شکل میں حفاظت ہمارے ذمے
ہے ___ ایک جگہ فرمایا ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون۔ اس
رہنمائی کو ہم نے بھیجا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ ایک اور جگہ
اس بارے میں خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر و تشویش کو دور کرتے ہوئے
فرمایا ہے۔ کہ قرآن کو مرتب کرنے اور محفوظ رکھنے کا کام ہم نے اپنے ہی ذمے رکھا ہے۔
یہی بات اللہ کی طرف سے جان کر خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کئی مختلف
موقعوں پر فرمائی ہے۔

حضرات! میں علم و تحقیق کی ایک خدمت سمجھتے ہوئے، آپ جیسے تعلیم یافتہ
اور باخبر حضرات کے سامنے یہ بات عرض کرنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتا، کہ
ڈیڑھ ہزار سال کے قریب، اس آخری خدائی رہنمائی کو آئے ہوئے ہو چکے ہیں لیکن
اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ، اپنے تمام جزئیات کے ساتھ، آج بھی وہ اسی
شکل میں محفوظ ہے جس شکل میں وہ اس وقت تھی جب وہ آسمان سے زمین پر آئی

تھی، نہ اس کا ڈھانچہ بدلا ہے نہ روح نہ قلب بدلا ہے نہ قالب۔

ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات اسے مبالغہ یا خوش فہمی و عقیدت کا نتیجہ سمجھ رہے ہوں، لیکن میں شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ اس خدائی رہنمائی کے دو وسیلے ہیں، ایک خدا کی کتاب، اور دوسرے خدا کے پیغمبر محمد کی ہدایت اور زندگی ـــــ اسلام کے اصلی شکل میں باقی رہنے کا مطلب دراصل ان دونوں کا محفوظ رہنا ہے اس لیے آئیے ان دونوں کا اس پہلو سے جائزہ لیں۔

خدا کی کتاب قرآن، وہ واحد خدائی کتاب ہے جس میں کسی تبدیلی یا کمی بیشی کو راہ نہیں ملی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قرآن مجید آہستہ آہستہ وقتی حالات و ضروریات کے مطابق نازل ہوتا رہا، اور آپ کی نگرانی میں چند مخصوص صحابہ آپ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق آیتوں اور سورتوں کو اس وقت میسر ان چیزوں پر جن کو لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، لکھتے رہے۔ ان کے علاوہ عام صحابہ اپنے طور پر اپنے ذوق و شوق سے قرآن لکھنے کا اہتمام بھی کرتے رہے۔ ہزاروں لوگوں نے اسے حسب توفیق و استطاعت زبانی یاد بھی کیا، پھر جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہو گئے اور خدائی رہنمائی کے مطابق انسانوں کی تربیت اور ان کی قیادت و سیاست کی ذمہ داری ابو بکر صدیق پر پڑی تو اپنے ساتھیوں کے مشورہ سے انھوں نے ایک مکمل نسخہ مرکز خلافت کی نگرانی میں لکھوایا، اور اسی کی نقلیں ہی پوری امت میں پھیلتی رہیں۔ ان کے بعد حضرت عمر کا دور آیا تو ان کی حیات میں اس نسخہ کی ایک لاکھ سے زیادہ نقلیں دنیا میں پھیلی گئیں ـــــ پھر حضرت عثمان کا زمانہ آیا تو یہ خبر ملنے پر کہ مختلف ملکوں کے لوگ الگ الگ انداز اور لہجہ سے پڑھتے ہیں، اور آئندہ چل کر اس معمولی سے اختلاف کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔ انھوں نے ایک ہی رسم الخط میں قرآن لکھوا کر اسی کو پوری دنیا میں پھیلایا، اور اب تک پوری دنیا میں جہاں جہاں مسلمان خود یہ قرآن چھاپ رہے ہیں، اگرچہ اب خود عربی کا رسم الخط بہت بدل چکا ہے لیکن قرآن مجید آج تک صرف اسی

پرانے رسم الخط میں لکھا جا رہا ہے۔ ایک شوشے یا نقطے کی، یا ایک حرف کی تبدیلی بھی اس میں نہیں ہوتی ہے —— دنیا میں لاکھوں آدمی اسے پورا زبانی یاد کرتے ہیں اور ہر سال رمضان میں اسے سنتے اور سناتے ہیں۔ نہ جانے کتنی کوششیں اس کو بگاڑنے کی، اس کو بدل دینے کی، اس میں کچھ کمی بیشی کی ہوئی ہیں، ہوتی رہتی ہیں، اور ہوتی رہیں گی۔ ع

پر بات خدا کی جہاں تھی وہیں رہی

قرآن کے ایک طالب علم کو یہ بھی معلوم ہے کہ کون سی آیت، کون سا حصہ، یا کون سی سورت کس موقع پر خدا کی طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری گئی، کون سی آیت سفر میں اتری اور کون سی حضر میں؟ کون سی رات میں اور کون سی دن میں؟ کس آیت کے پیچھے کیا خاص واقعہ اور اس کا کیا پس منظر ہے؟ اسے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سی آیت کس موقع پر پڑھی، آپ کون سی سورت کس نماز کی کس رکعت میں پڑھتے تھے؟ کس آیت کو پڑھنے یا سننے کے بعد آپ اللہ کے سامنے سجدہ میں گر جاتے تھے، یا اس سے جنت کی دعا کرنے لگتے تھے، اور کس آیت کے بعد اللہ کے عذاب سے پناہ مانگنے لگ جاتے تھے۔ وہ یقین کے ساتھ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ فلاں آیت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ان کے ساتھیوں میں سے فلاں نے اس طرح تشریح کی۔ وہ یہ بھی بتا سکتا ہے کہ فلاں آیت پر محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح عمل کیا؟ کس آیت کو کس طرح پڑھا؟ کہاں آپ رکے اور کہاں آپ نہیں رکے۔

ابھی چند روز ہوئے ہمارے دار العلوم ندوۃ العلماء میں ملک و بیرون ملک کے کچھ عیسائی پادری آئے تھے —— میں انھیں دار العلوم کی سیر کرانے نکلا تو خاص طور پر مسجد لے گیا جہاں سیکڑوں بچے قرآن مجید حفظ کرنے میں مشغول تھے، انھوں نے بچوں کو ایسی محنت کرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہ یہ بچے کیا کر رہے ہیں؟ میں نے کہا! "قرآن یاد کر رہے ہیں؟" ان میں سے ایک نے کہا کیا مطلب؟ زبانی یاد کر رہے ہیں؟

میں نے کہا کہ ہاں! زبانی یاد کر رہے ہیں، ان میں سے ایک خاتون بولیں! کہ کیا پورا قرآن یاد کر رہے ہیں؟ میں نے کہا ہاں! اس پر اس خاتون نے پوچھا کہ اس میں کتنا وقت لگتا ہے۔ میں نے کہا اوسطاً دو سے تین سال تک، اس پر اس نے عجیب تأثر بھرے انداز میں کہا

OH, I SEE THAT IS THE WAY!

ارے اب سمجھ میں آیا، یہ ہے طریقہ!

میں نے قصداً اس سے پوچھا! کس چیز کا طریقہ، آپ کی مراد کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا:

THIS IS THE WAY TO SAVE THE HOLY BOOK!
A GREAT EFFORT INDEED! I APPRECIATE!

(یہ ہے طریقہ مقدس کتاب کی حفاظت کا! بلاشبہ یہ ایک عظیم کوشش ہے، میں اس کی بہت قدر کرتی ہوں!)

حضرات! یہ تو قرآن مجید کے بارے میں میں نے عرض کیا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کے اقوال و ہدایت کا حال بھی سن لیجیے! آپ کی ۲۳ سالہ نبوت کی زندگی کا ایک ایک لمحہ، اس میں آپ کی سرگرمیوں کا ایک ایک قدم، اور انسانیت کی رہنمائی کی غرض سے آپ کا فرمایا ہوا ایک ایک کلمہ اسی طرح محفوظ ہے، کہ اس پر ایک ہلکی سی نگاہ ڈالنے والا آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں اپنے والدین اور اپنے بچوں اور گھر کے لوگوں کے بارے میں اتنی زیادہ مکمل اور ہمہ جہتی معلومات نہیں رکھتا، جتنی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں رکھتا ہوں۔ پھر جو کچھ بیان کرنے والوں نے بیان کیا ہے اسے آنکھ بند کر کے قبول بھی نہیں کر لیا جاتا بلکہ اس کے لیے اس کی روایت اور متن (TEXT) دونوں کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے، اسی وجہ سے دونوں کی تنقید کے اصول بھی مقرر کیے گئے ہیں متن کی تنقید کے بھی اور روایت کرنے والوں کے معیار کی تنقید کے بھی، جن کی تعداد پہلی

تین صدیوں میں برابر بڑھتی چلی گئی ہے۔ یہ روایت کرنے والے بلا مبالغہ مجموعی طور پر ایک لاکھ سے زیادہ ہیں، ان سب کے حالات زندگی، روایت کے معاملہ میں ان کی احتیاط یا بے احتیاطی، حافظہ، افتاد طبع اور عام کردار وغیرہ کی مکمل تفصیلات مرتب کی گئی ہیں، اور ان کی روشنی میں ماہرین فن ان کی روایت کی ہوئی حدیثوں کا درجہ متعین کرتے ہیں۔

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور اقوال و ہدایات کا ایک ایک جزء تو پورے طور پر محفوظ ہے ہی، ان کو ہم لوگوں تک پہنچانے میں جن لوگوں کا حصہ رہا ہے ان کے بھی حالات زندگی محفوظ ہیں، اور اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں کہ جس طرح قرآن کی مانند کوئی انسانی بلکہ خدائی کتاب محفوظ نہیں، اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کسی اور رہنما کی زندگی اور اس کی ہدایات بھی کلی طور پر محفوظ نہیں۔

ایران کے قدیم مجوسی مذہب کے بانی زرتشت کو اپنا مرکز عقیدت قرار دیتے ہیں، مگر اس کی تاریخی شخصیت ایسی مجہول اور غیر واضح ہے کہ اس کی جائے پیدائش یا سال پیدائش کے بارے میں، قومیت اور خاندان کے بارے میں زبان اور مذہب کے بارے میں، سال وفات اور جائے وفات کے بارے میں کوئی بات ذمہ دارانہ طور پر نہیں کہی جا سکتی ——— حد یہ ہے کہ بہت سے مغربی مصنفین سرے سے اس کے وجود ہی کو خیالی دنیا کی ایک چیز سے زیادہ باور نہیں کرتے۔

ہندو مذہب میں جن کرداروں کے نام آتے ہیں، ان میں سے بہتر اور غنیمت وہ ہیں جو مہابھارت اور رامائن کے ہیرو ہیں، مگر ان کے بارے میں یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ کس زمانہ کے، کس دور کے اور کس صدی کے واقعات ہیں ——— بقول ایک مورخ متھالوجی سے آگے بڑھ کر تاریخ کے میدان میں ان کا گذر بھی نہیں۔

بہر حال قصہ مختصر! اپنی اصلی شکل میں محفوظ رہنے کی جو صفت ہے وہ اس رہنمائی میں ضرور ہونی چاہیے جو مستقل طور پر پوری دنیا کی اصلاح کی دعویدار ہو صرف خدا کی

اس رہنمائی میں ہے جو قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانیت کو ملی ہے ۔ یعنی اسلام۔

میں نے شروع میں جن چند صفات کی بابت یہ عرض کیا تھا کہ انھیں انسانوں کے لیے آنے والی خدائی رہنمائی میں لازماً ہونا چاہیے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ وہ طاقت ہونی چاہیے جس کے ذریعہ اس رہنمائی کو عملی طور پر انسانی زندگی میں نفوذ مل سکے، اور وہ محض نظری فلسفہ بن کر نہ رہ جائے۔ میں نے اسی صفت کے اجمالی ذکر کے ساتھ ہی اس طرف اشارہ بھی کر دیا تھا کہ یہ طاقت صرف ایمان اور تقوے کی طاقت ہے۔

انسانی نفسیات سے جو لوگ واقف ہیں، اور اپنے گرد و پیش اور تاریخ کا مطالعہ غور سے کرنے کے جو لوگ عادی ہیں، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس دنیا میں انسان کو واقعی طور پر نیک، طبیعت اور پاکباز بنانے کی تدبیر صرف یہ ہے کہ انسان کے دل میں اس کے پیدا کرنے والے کی عظمت اور محبت راسخ ہو جائے اور اس کے دل و دماغ میں اس خدا کے راضی ہو جانے کو عین کامیابی اور ناراض ہو جانے ہی کو حقیقی ناکامی سمجھنے کا ذوق پختہ ہو جائے یہی واحد طاقت ہے جو انسان کے اندرون کو بدل سکتی ہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی اوپر سے بہت خوش اخلاق، اور بہت وقت اور زبان کا پابند بھی ہو، اور اندر سے، اپنی اصلی زندگی میں جہاں دفتری آداب و رسوم، اور کاروباری مصلحتیں اسے خوش اخلاقی پر مجبور نہیں کرتیں، وہ انتہائی مکروہ کردار کا آدمی ہو، بات بات پر الجھ جانا، اور فضولیات میں اپنا اور دوسروں کا وقت گنوانا اس کا شیوہ ہو، اپنے باپ اور اپنی ماں کے ساتھ تو وہ سیدھے منھ بات نہ کرے، نہ ان کی خدمت میں ایک منٹ صرف کرے مگر جب وہ بینک یا ڈاکخانہ یا اپنے شوروم میں اپنی کرسی پر بیٹھے تو ہر آنے والے سے بہت اخلاق سے پیش آئے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قانون کے ڈر سے، رسوائی کے ڈر سے، پریشانی کے خوف سے، سزا کے تصور سے وہ چوری نہ کرے، لیکن اس کی

طبیعت میں سخاوت، ایثار، ہمدردی اور خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلا دینے کے جذبات صرف قانون کے ڈر سے پیدا نہیں ہو سکتے، صرف ایک طاقت ہے، ایمان و تقویٰ کی طاقت، جو انسان کی بداخلاقی کو خوش اخلاقی سے، بخل کو سخاوت سے، سنگدلی کو نرم دلی سے، خودغرضی و نفسانیت کو خلوص و ہمدردی سے، خیانت والے مزاج کو دیانت والے مزاج سے، بے صبری اور جلد بازی کو صبر و بردباری سے بدل سکتی ہے، کل بھی یہی طاقت تھی جس نے یہ کام کیا تھا، آج بھی یہی طاقت ہے جو یہ کام کر سکتی ہے اور کر رہی ہے، اور رہتی دنیا تک یہ کام صرف یہی طاقت انجام دے سکتی ہے۔

آپ سب جانتے ہیں کہ وہ معاشرہ اور قوم جس میں کہ خدا کی اس رہنمائی کے ذریعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کی اصلاح و تربیت کے کام کا آغاز کیا تھا وہ جہالت، پسماندگی، باہمی تفرقہ و انتشار، اخلاقی انحطاط ہر لحاظ سے پستی کی ہر حد سے گذری ہوئی تھی، شراب اور جوا، اس قوم کی گھٹی میں داخل تھا، قتل و غارت گری اس کا قومی مزاج تھا، اپنی اولاد کو زندہ درگور کر دینا ان کا مستقل شیوہ تھا، عورت ہوس پرستوں کے ہاتھ میں کھلونا بنی ہوئی تھی، اس کا معاشرہ میں نہ کوئی مقام تھا نہ حیثیت، عقل، دین، عزت، جان اور مال یہ پانچوں انسانی جواہر مکمل طور پر برباد ہو رہے تھے۔ یہ پس منظر آپ سب جانتے ہوں گے، اور یہ بھی آپ نے سنا ہو گا کہ یہی وہ قوم تھی جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تربیت کے مرحلہ سے گذرنے کے بعد انسانیت کی تاریخ میں پہلی بار کامل انسانی معاشرہ اور مکمل انسانی زندگی کا عملی نمونہ پیش کیا۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ اپنی سادہ سی مسجد میں تشریف فرما تھے۔ ایک عورت آئی اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول مجھ سے بدکاری کا ناپاک کام ہو گیا ہے، اب مجھے سزا دے کر خدا کے عذاب سے بچا دیجئے، آپ نے بہت کوشش کی کہ آپ اسے ٹال دیں۔ بالآخر اس کے بار بار کے اصرار پر آپ نے حقیقت واقعہ معلوم کرنے کے بعد فرمایا کہ اچھا فی الحال تو تم واپس جاؤ، جب بچہ پیدا ہو جائے تب آنا۔ چند ماہ بعد وہ عورت ایک دن پھر آئی،

آج اس کی گود میں ایک نومولود بچہ بھی تھا، آپ نے اس کو پھر یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ ، ابھی نہیں! جب یہ بچہ بڑا ہو جائے، اور دودھ چھوٹ جائے اور کچھ کھانے لگے تب آنا، دو سال کے بعد پھر وہ عورت حاضر خدمت ہوئی اس طرح کہ اس کا بچہ روٹی کا ٹکڑا لیے ہوئے کھا رہا تھا، اور پھر اس کی خوشامد کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی شدہ بدکار کے لیے اللہ کی مقرر کردہ سزا اس پر جاری کروائی یعنی یہ کہ اسے پتھر مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

سوچیے کہ وہ کون سا جذبہ یا خیال تھا جس نے اس عورت کو خود آکر اعتراف جرم بلکہ اعلان جرم کرنے پر مجبور کیا، اور پھر بار بار موقع ملنے کے باوجود اس نے آخر قانون کو اپنے اوپر جاری کرا لینے کو، اور پتھروں کی مار سے مرنے کو چین و سکون اور عافیت والی زندگی پر کیوں ترجیح دی، قانون خود اس تک نہیں پہنچا تھا، اس نے اصرار کر کے قانون کا فیصلہ اپنے اوپر خود نافذ کروایا تھا؟ آخر کیوں؟ اسی لیے، اور خدا کی قسم صرف اسی لیے کہ کل کو کائنات کے مالک کے سامنے حاضری ہو گی، اعمال کی باز پرس ہو گی، اور پھر وہاں کی سزا انتہائی سخت اور دائمی ہو گی جو اس لیے اس سے نجات حاصل کرنے کی خاطر یہاں کی چند روزہ زندگی اور عارضی عزت کی قربانی اس عورت کے لیے آسان ہو گئی۔

میرے دوستو! یہ تو میں نے ایک واقعہ سنایا ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کے حلقہ بگوشوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے اوپر ہو چکی تھی، اتنی بڑی تعداد میں قانونی سزا کے اجراء کی نوبت مشکل سے ۱۰-۵ لوگوں پر آئی ہو گی اور وہ بھی سب کے سب اپنے اعتراف سے، گواہیوں کے بل پر زبردستی اور بادل نخواستہ نہیں۔

عرب قوم شراب کی جتنی دلدادہ اور وہاں کے عوام و خواص اس لال پری کے جیسے متوالے تھے اس کا اندازہ لگانا بھی آسان نہیں ——— لیکن جس دن خدا نے اپنے بھیجے ہوئے رہنمائے انسانیت پر یہ ہدایت نازل کی کہ شراب ناپاک چیز ہے، اس سے بالکلیہ بچنا کامیابی کے حصول کے لیے ضروری ہے، اس دن پوری اسلامی بستی کی حالت عجیب تھی، تاریخ کا بیان ہے کہ جس وقت یہ خدائی ہدایت آئی، حضرت ابو عبیدہ کے گھر پر کچھ لوگ

جمع تھے، اور شراب کا دور چل رہا تھا، کہ ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ شراب حرام ہو گئی سوال و جواب کے بغیر لوگوں نے یکایک جام و سبو ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور جیسے جیسے خبر پھیلتی گئی، لوگ اپنے اپنے گھروں سے شراب کے برتن اٹھا اٹھا کر باہر پھینکتے گئے، یہاں تک کہ مدینے کی گلیوں میں شراب بہنے لگی، دیکھتے ہی دیکھتے سارے ملک عرب سے بادہ پرستی کا نام و نشان مٹ گیا ـــــ اور یہ سب قانون کی طاقت سے نہیں، ایمان و تقوے کی طاقت سے ہوا، قانون جتنا بے اثر ہے، اور انسانوں کی اندرونی اصلاح و تربیت کے بغیر صرف قانون کے سہارے معاشرہ کی تطہیر اور جرائم کی انسداد کی ہر کوشش کس قدر ناکام رہتی ہے، اس زمانہ کے انسانوں کو، خصوصاً ہم ہندوستانیوں کو اس کا جو تجربہ ہے اس کے بعد کسی مثال کے ذریعہ، قانون اور ایمان کی طاقت کا تقابل (COMPARISON) بالکل غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اور اب مجھے یہ عرض کرنے میں ذرہ برابر تردد نہیں کہ ایمان و تقوے کی یہ طاقت اور اندرونی نفسیاتی تبدیلی کی اس صلاحیت سے اصل کام اسلام ہی نے لیا ہے۔ اور آج بھی اس کی اصلاحی مہم کا اصل دارومدار اسی پر ہے۔ افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ اسلام کے بہت سے مخلصین اس پہلو پر زور دینے کے بجائے اور اس طاقت کے نتائج دنیا کو عملی طور پر دکھانے کی جدوجہد کرنے کے بجائے صرف قانونی پہلو پر زور دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک عام آدمی کے کان میں اسلام کی دعوت کا نام آتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے کوڑے اور ہتھکڑیاں، اور خنجر و تیغ کی ہولناک تصویریں آنے لگتی ہیں ـــــ اور کچھ عجیب اور انتہائی ادھورا سا تصور اسلام کے بارے میں اس کی عقل میں جم جاتا ہے۔

یقیناً اسلام مجرموں کو جرائم کی سزا دیتا ہے۔ اور جو لوگ انسانی معاشرہ کی حقیقی کمزوریوں اور اس میں باقی رہ جانے والے شرپسند عنصر پر نظر رکھتے ہیں اور خیالی دنیا میں نہیں رہتے وہ تربیتی و اجتماعی مصلحت سے ان سزاؤں کو معاشرہ کی اصلاحی مہم کا ایک جزو بھی سمجھتے ہیں لیکن اسے کُل نہیں سمجھتے! بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جن کا علاج الیکٹرک شاک کے بغیر یا اس حصے کو کاٹ کر جسم سے الگ کیے بغیر نہیں ہوتا، لیکن نہ ہر بیماری ایسی

بیماری ہوتی ہے، اور نہ مرض کے ابتدائی مرحلے میں یہی علاج آخری علاج ہوتا ہے۔

اسلام کا حال تو یہ ہے کہ وہ خالص انسانی و دنیاوی حیثیت والے شعبوں مثلاً عائلی و ازدواجی زندگی کو درست کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی دنیا کے فوائد و برکات کو بیان کر کے نہیں بلکہ آخرت کی فکر پیدا کر کے، اخلاق و معاشرت کی اصلاح چاہتا ہے تو وہ بھی جنت کا شوق دلا کر، بدمعاملگی سے بچانا چاہتا ہے تو وہ بھی دوزخ کی آگ اور اللہ کی پکڑ کا خوف دلا کر...... اور یہ اس لیے کہ ایمان و تقوے اور آخرت کی فکر میں ہی اتنی طاقت ہے جو اعمال و اخلاق میں انقلاب لے آئے ـــــ اس کے علاوہ کسی مفاد کے حصول کی لالچ اور کسی نقصان سے بچنے کی فکر میں یہ طاقت نہیں ـــــ اسی نفسیاتی حقیقت کا عمیق فہم اور طرزِ اصلاح میں اس کی سو فیصد تطبیق انبیاء علیہم السلام کی اصلاحی مہم کا مابہ الامتیاز وصف ہے۔

اس مسئلہ پر گفتگو کو یہیں روکتا ہوں، میرا یہ مدعا خدا کرے کہ آپ سمجھ گئے ہوں کہ جس ایمانی و روحانی طاقت کے بغیر انسانوں کی اصلاح و تربیت کی کوشش کو واقعی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی وہ سب سے زیادہ جس رہنمائی میں پائی جاتی ہے، اور جس رہنمائی نے اس سے ایک زندہ اور انقلاب آفریں طاقت کے طور پر کام لیا ہے وہ صرف وہی ہے جس کا نام اسلام ہے۔

جو سات صفات میں نے شروع میں عرض کی تھیں، ان میں سے چھٹی صفت یہ ہے کہ جس شخص کے ذریعہ انسانوں کی تربیت و اصلاح کی ضامن رہنمائی انسانوں کو ملے وہ خود انسان ہو تا کہ اس رہنمائی کو عملی طور پر ایک مجسم انسانی زندگی کی شکل میں دیکھ کر اس کی نقل کرنا ممکن ہو۔ اسی لیے خدا نے جتنے بھی نبی بھیجے وہ سب انسان ہی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن شریف میں ارشاد فرمایا ہے: وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیہم من اھل القری ” (ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے تھے وہ بشر ہی تھے آبادیوں کے رہنے والے، ہم ان پر اپنی ہدایت نازل کرتے تھے۔) ـــــ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی صاف کہہ دیا تھا: "انی عبد اللہ آتانی الکتاب وجعلنی نبیا" (میں اللہ کا بندہ ہوں،

اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی، اور نبی بنایا، لیکن عام طور سے انسانوں کے دل و دماغ میں نبوت کا ایسا مافوق الفطرت تصور ہوتا تھا کہ انھیں انسانوں کو نبی تسلیم کرتے ہوئے بہت الجھن کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اسی کج ذہنی کی وجہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انسان ہونے کا اعلان اتنی صفائی اور شدت سے اور بار بار کیا کہ یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے روشن ہو گیا۔

میرا خیال ہے آپ میں سے کسی کو اس بارے میں ذرہ برابر شک نہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انسان تھے، بھوک، پیاس، سردی گرمی ہر انسان کی طرح آپ کو محسوس ہوتی تھی، جسمانی کیفیت اور تقاضوں کے اعتبار سے بھی آپ ایک انسان ہی تھے، اور اسی لیے آپ کی رہنمائی سے انسان فیضیاب بھی ہوئے۔ ورنہ اگر معاملہ خدا یا فرشتے یا اوتار کا ہو تو ظاہر ہے کہ میرے یا آپ کے اندر ایسے رہنما کی عقیدت و محبت، اور اس کے اتباع کے جذبہ کی کوئی گنجائش نہیں جو کہ ہماری جنس کا نہ ہو اور جس کی خلقت و ماہیت ہم سے مختلف ہو اور جس کے طبعی تقاضے اور فطری ضروریات و کیفیات ہم سے جداگانہ ہوں۔

ساتویں اور آخری صفت میں نے یہ ذکر کی تھی کہ جو شخص خدائی رہنمائی کا لانے والا ہو اس کا ذاتی عمل اس کی ایک ایک چیز کا عملی نمونہ ہو۔ ورنہ محض اچھے آدرش، اچھے اصول، اچھے نظریے، اچھی باتیں تو ہر شخص ہر وقت پیش کر سکتا ہے۔ اور باتوں اور نظریوں سے باتیں اور نظریے ہی، زندگی جس چیز سے بنتی ہے وہ خود زندگی ہے۔

غریبوں اور معذوروں کی مدد انسانیت کی معراج ہے، بیماروں کی تیمارداری، بیواؤں کی خبر گیری اور یتیموں پر شفقت بنیادی انسانی حقوق اور فرائض میں شامل ہیں۔ دشمنی کا جواب دوستی سے اور نفرت کا جواب محبت سے دو، جو تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے اس کے سامنے اپنا بایاں گال بھی پیش کر دو، کوئی تمہیں ایک میل بیگار لے جائے تو اس کے ساتھ دو میل چلے جاؤ، تم اپنے بھائی کو ستر دفعہ معاف کرو، گمراہوں کو راہ دکھاؤ، مہمان کے سامنے جو کچھ ہو وہ بھی جان سے اس کا اکرام کرو...... اور اس قسم کی سیکڑوں نصیحتیں اور اصول ہم دن رات سنتے رہتے ہیں بلکہ خود کہتے بھی رہتے ہیں لیکن ہماری زندگیوں اور ہمارے سماج پر اس کا ذرہ برابر اثر نہیں پڑتا۔ اسی لیے کہ کہنے والوں نے کوئی عملی نمونہ پیش نہیں کیا ہے۔ ماضی قریب اور ماضی

بعد میں جتنے رہنماؤں نے انسانیت کی رہنمائی کا نعرہ بلند کیا ہے، ان سب کے نام ذہن میں تازہ کر لیجیے، ان میں سے کوئی ایک اس معیار پر پورا اترا ہے۔ آدھا چوتھائی بھی نہیں اترتا ہے۔

——— لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور شخصیت کا جو باب سب سے زیادہ عظیم اور جو پہلو سب سے زیادہ روشن ہے وہ یہی ہے۔ آپ نے جو کچھ کہا، سب سے پہلے اس کا مکمل ترین نمونہ اپنی زندگی سے پیش کیا۔

انسان کے اخلاق اور اس کے اصلی کردار سے سب سے زیادہ اس کی بیوی واقف ہوتی ہے ——— ہم آپ کے سامنے آپ کی دو بیویوں کی شہادتیں نقل کرتے ہیں، پہلی گواہی حضرت خدیجہ کی ہے ——— جو آپ کو خدائی رہنمائی کا منصب ملنے سے پہلے پندرہ سال آپ کے ساتھ گزار چکی تھیں ——— اور اچھی طرح آپ کی سیرت کے ایک ایک گوشے سے بخوبی واقف ہو چکی تھیں، اور اسی لیے جب ایک دن اچانک اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے سے آپ کی ملاقات انتہائی عجیب و غریب طریقے پر ہوئی، اور اس نے آپ کے سپرد نبوت کی گراں بار ذمہ داری کی تو آپ گھبرائے ہوئے اپنے گھر واپس آئے، اور حضرت خدیجہ سے سارا قصہ سنایا، تو انھوں نے فوراً کہا!

"آپ رشتے داروں کا حق پورا کرتے ہیں، مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں، مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے ہیں، حق کی طرف داری کرتے ہیں، مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں، اس لیے آپ کو خدا ہرگز تنہا نہ چھوڑے گا۔"

حضرت خدیجہ کے بعد نام آتا ہے حضرت عائشہ کا، جو ذہانت اور مزاج شناسی میں نادرۂ روزگار تھیں، اور جنھیں نو سال آپ کے ساتھ، آپ کی زندگی کے آخری دور میں گزارنے کا موقع ملا تھا، ان سے کسی پوچھنے والے نے پوچھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی سیرت کیا تھی، انھوں نے اس کا وہ جواب دیا جس سے زیادہ جامع اور مکمل جواب ہو نہیں سکتا، انھوں نے کہا "آپ کی عملی سیرت" قرآن تھی، یعنی جو رہنمائی خدا کی طرف سے آپ کتابی شکل میں قرآن کے ذریعہ لے کر آئے تھے، آپ کی زندگی اس کا عملی نمونہ تھی اور بس! اس اجمال کی تفصیل کے لیے پورے قرآن کی تشریح اور پوری سیرت کا بیان درکار ہے، آپ نے صرف اللہ سے دل لگانے، اسی کی عبادت کرنے، اسی سے مدد مانگنے، اسی کی طاقت و قدرت پر اعتماد رکھنے اور اسی کے نظام کے مطابق اپنی زندگی گزارنے اور جدوجہد جاری رکھنے کی ہدایت دی، تو خود اس کا وہ نمونہ پیش کیا جس سے زیادہ بلند نمونہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے نماز جیسی عبادت کا حکم انسانوں کو دیا تو خود اس کا یہ معیار پیش کیا کہ دن بھر کی نفلوں، سنتوں اور فرائض کے علاوہ رات کی تنہائی میں رات رات بھر یا رات کے اکثر حصے میں نمازیں پڑھتے، کبھی کبھی اتنی لمبی نماز پڑھتے کہ آپ کے پائے مبارک میں ورم آجاتا، آپ نے لوگوں کے لیے سال میں تیس دن کے روزے رکھنے کو ضروری قرار دیا، اور خود یہ کیفیت تھی کہ کوئی ہفتہ اور کوئی مہینہ

روزوں سے خالی نہ تھا، آپ نے ایثار و قربانی کے، سادگی و قناعت کے، امانت داری و صداقت شعاری کے اور عفو و درگذر و پاس عہد کے اصول سکھائے تو خود اپنے کردار سے ان کے ایسے بلند نمونے پیش کیے جو رہتی دنیا تک اپنی مثالیت میں منفرد رہیں گے۔ آپ مرض الموت میں ہیں، بیماری کی سخت تکلیف ہے، نہایت بے چینی ہے، اسی حال میں آپ کو یاد آتا ہے کہ گھر میں کچھ اشرفیاں پڑی ہیں، حکم ہوتا ہے کہ انھیں اہل حاجت کو دے دیا جائے۔ کیا محمد اپنے رب کے پاس اس حال میں حاضر ہوگا کہ اس کے پیچھے اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں؟

ایک دن کا واقعہ ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوپہر کے وقت مسجد نبوی میں آکر بیٹھ گئے، دوپہر کے وقت صحابہ کرام کا عام معمول مسجد نبوی میں حاضر ہونے کا نہیں تھا، تھوڑی دیر کے بعد حضرت ابوبکر بھی آنکلے، انھوں نے عمر سے پوچھا کہ عمر! اس وقت یہاں کیسے آئے؟ عمر نے جواب دیا! بھوک سے بیتاب ہو کر نکل آیا ہوں۔ ابوبکر نے یہ سن کر کہا کہ عمر! میں تو اسی وجہ سے آیا ہوں! یہ دونوں جاں نثاران رسول وہیں بیٹھ گئے، اور اپنے اللہ سے عرض حال کرنے لگے، تھوڑی دیر کے بعد ان دونوں کی اور ہر باہوش انسان کی سب سے زیادہ محبوب ہستی بھی وہیں آگئی، اور اس وقت ان دونوں کو وہاں بیٹھے دیکھ کر پوچھا کہ تم لوگ اس وقت یہاں کیسے آئے؟ ابوبکر صدیق نے عرض کیا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے ہم دونوں بھوک سے بیتاب ہو کر نکلے ہیں، اور اس وقت انسانیت کی تاریخ میں فقر و مسکنت اور زہد و قناعت کی تعلیم دینے والے تمام رہنماؤں کی تاریخ میں مثال قائم کر دی ان کلمات نے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے، آپ نے ابوبکر کی یہ بات سن کر ارشاد فرمایا، "اور میں بھی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بھوک کی جو مصیبت تمھیں اس وقت یہاں لائی ہے وہی میں بھی مبتلا ہوں"۔ —— اور پھر یہ تینوں ابو ایوب انصاری کے گھر گئے، ابو ایوب انصاری نے حقیقت بھانپ کر جی جان سے ان مقدس مہمانوں کی میزبانی شروع کی، تھوڑی ہی دیر میں وہ کھانا تیار کروا کے لے آئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت رکھ کے فرمایا: اسے فاطمہ کو بھجوا دو، کئی دن سے اسے بھی کھانا نصیب نہیں ہوا ہے۔

حضرات یہ حال تھا محمد رسول اللہ کا، اور آپ کے اہل خانہ اور آپ کے قریبی ساتھیوں کا!

آپ نے دشمنوں کے لیے بھی محبت اور خیر خواہی کے اپدیش بہت سنے ہوں گے خاص کر ہمارے اہنسا کے فلسفہ والے اس ملک میں تو یہ باتیں بہت جانی پہچانی ہیں —— مدینہ میں ایک موقع وہ آیا تھا جب مکہ کے آپ کے دشمن مدینہ میں آپ پر حملہ آور ہوئے، اور نوبت یہ پہنچی کہ آپ کے چچا حضرت حمزہ کو ان دشمنوں نے مار دیا، دشمنوں میں ایک عورت تھی ہندہ، عجیب دل تھا اس عورت کا! اس نے حضرت حمزہ کی لاش کی بے ادبی کی، ان کے سینے کو چاک کیا، ان کا کلیجہ نکال کر چبایا، کان ناک کاٹ کر

ہار بنایا، لڑائی کے بعد آپؐ نے یہ منظر دیکھا اور بے تاب ہو گئے ــــ زمانہ آگے بڑھا، حالات بدلے اور ایک دن وہ آیا کہ مکہ و مدینہ کا یہ مظلوم انسان فاتح بن کر مکہ میں داخل ہوا، تو اس دن پھر وہی عورت سامنے آئی، اور یہاں بھی گستاخی سے باز نہیں آئی لیکن پھر بھی حضور کچھ تعرض نہیں فرماتے، نظر انداز فرماتے ہیں، یہ معاملہ دیکھ کر وہ پکار اٹھتی ہے اے محمد! آج سے پہلے تمہارے خیمہ سے زیادہ کسی خیمہ سے مجھے نفرت نہ تھی لیکن آج تمہارے خیمہ سے کسی کا خیمہ مجھے محبوب نہیں۔

حضرات! الگ ان تک میں بیان کر سکتا ہوں؟ اور کہاں تک آپ سن سکتے ہیں؟ جس ذوق و شوق کے ساتھ اتنی طویل تقریر آپ نے سنی ہے، اس کا میرے دل پر بہت اثر ہے، مختصراً اتنی بات ذہن نشین کر لیجیے گا کہ زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں جس طرح مکمل، فطری اور ہمہ گیر رہنمائی صرف اللہ کی کتاب اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آئے ہوئے دستور حیات میں ملتی ہے۔ اسی طرح اس کے ہر ہر جزء پر عمل کر کے انسانیت کے سامنے رکھنے والا صرف ایک رہبر اعظم ہے اور وہ وہی ہے جس کے نام پر آج یہ اجتماع ہو رہا ہے۔

اب آخر میں ایک بات صاف صاف الفاظ میں اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں سے اور اپنے دوسرے بھائیوں سے اسی طرح صراحت اور صفائی کے ساتھ عرض کرنی ہے۔ اگر میں اسے نہیں کہوں گا تو خود اپنے ساتھ بھی ایسی زیادتی اور خیانت کا مرتکب ہوں گا جس کی سزا میرے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔

اپنے مسلمان بھائیوں سے مجھے یہ کہنا ہے کہ اتنے عظیم رہنما محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور اتنی بلند رہنمائی "اسلام" کی نمائندگی کے جو تقاضے اور جو ذمہ داریاں ہم پر آتی ہیں ہم انہیں محسوس کریں۔ اگر اسلام کی یہ تعلیمات اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے یہ حسین و جمیل نقوش ہماری اپنی زندگی کے اندر عملی طور پر داخل نہ ہوئے تو نہ ہم خود حقیقی طور پر مسلمان ہوں گے، اور نہ اسلامی زندگی دنیا والوں کے سامنے آئے گی اور ہم دوہرے مجرم ہوں گے، دنیا کے لوگ اسلام کے بارے میں جو رائے قائم کریں گے وہ نہ کوئی تقریر سن کر اور نہ کوئی تحریر پڑھ کر، وہ تو اسکولوں کالجوں میں، دوکانوں اور بازاروں میں، گلیوں اور سڑکوں میں، انتخابی تقریبوں اور غمی کی مجالس میں کھیتوں اور باغوں میں، دفتروں اور محکموں میں ریل اور بس میں، چلتے پھرتے مسلمان مردوں اور عورتوں، جوانوں اور بوڑھوں کو دیکھ کر اپنی رائے قائم کریں گے۔

ایک سفر میں میری ملاقات ہالینڈ کے کچھ انگریزوں سے ہوئی، ان سے گفتگو شروع ہوئی تو میں نے اسلام کی بعض خصوصیات کے بارے میں ان کو غور کرنے کی اور اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی دعوت دی، ان میں سے ایک نے تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ دیکھیے! اپنی توانائی اور وقت برباد نہ کیجیے یورپ میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہے جو مسیحیت سے، اور اس کی وجہ سے ہر مذہب سے مایوس

بڑھ چکے ہیں، اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انھیں مسیحیت اور دوسرے مذاہب کے اصول و نظریات میں کچھ ایسا مایوس کن نقص نظر آیا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے کسی مذہب کے ماننے والوں کی زندگی میں ان اصول و نظریات کا رنگ نہیں دیکھا، لہٰذا اسلام کی خوبیوں کے بارے میں مطمئن کرنے کے بجائے بس آپ ہمیں سچے مسلمان دکھا دیجیے، اور یقین رکھیے کہ ہم اس کے بعد ماننے میں دیر نہیں کریں گے۔ اس لیے مجھے جو بات اس وقت اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں سے عرض کرنی ہے کہ ہمیں اس کی سنجیدہ اور جان توڑ کر محنت کرنی ہے کہ اسلام کی ہر تعلیم ہماری زندگیوں میں رچ بس جائے۔ اس کے لیے میں اس مقصد کے لیے کی جانے والی ایک ایسی جدوجہد کے بارے میں مشورہ بھی دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں جس کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ ہر طبقہ، ہر معیار اور ہر سن و سال کے لوگ اس کو اختیار کر کے اسلام کو اپنی زندگی میں اتار سکتے ہیں۔ جماعتیں بنا بنا کر اپنے خرچ اور اپنی ذات اور اپنے اوقات کو لے کر نکلنا، مسجدوں کے ماحول میں، مسجد کے کاموں کو زندہ کرنے کی مشق کرنا، اور کچھ دن ۲۴ گھنٹے مکمل اسلامی طرز زندگی کے مطابق گذارنے کی مشق کر کے اسی طرز پر مستقل زندگی گذارنا اور دوسروں کو اسی جدوجہد میں لگاتے رہنے کی ترغیب دیتے رہنا، یہ ہے وہ جدوجہد جو الحمدللہ کہ ہر جگہ ایک خاص نظام کے ماتحت جاری ہے، ہم آپ اس میں اپنی اس بنیادی ضرورت کی تکمیل کے لیے حصہ لیں، یہ تو وہ بات ہے جو مجھے اپنے مسلمان بھائیوں سے عرض کرنی تھی، اور یہی ان کے لیے سیرت النبی کا پیغام ہے۔

اپنے غیر مسلم بھائیوں سے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ہم مسلمان کہلانے والوں کی غالب اکثریت اسلام کی صحیح تصویر نہیں پیش کر رہی ہے۔ کسی کی زندگی کو دیکھ کر آپ اسلام کے بارے میں جو رائے قائم کریں گے وہ میں یہ یقین کیسے آپ کے دل میں بٹھا دوں کہ مطابق واقعہ نہیں ہوگی۔ اس لیے میرا جی چاہتا ہے کہ آپ براہ راست اسلام کے بارے میں غور کریں، سوچیں، دریافت کریں۔ اگرچہ میں یہ جانتا بھی ہوں اور مانتا بھی ہوں کہ کسی مذہب کے بارے میں غور کرنے کا اصل فطری طریقہ یہی ہے کہ اس کے ماننے والوں کی زندگی اور عملی کردار کو دیکھا اور جانچا جائے، اور اسی لیے میں نے خود اپنے کو اور اپنی اسلامی برادری کو صحیح اسلامی سانچہ میں ڈھالنے والے کام کو دوسرے ہر کام پر ترجیح بھی دی ہے، لیکن اس کے باوجود دل سے آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ہم مسلمانوں میں اکثر سچے اور معیاری مسلمان نہیں ہیں۔ اس لیے ہمیں دیکھ کر اسلام کے بارے میں رائے قائم نہ کیجیے، بلکہ اسلام کے بارے میں براہ راست جاننے اور سوچنے کی کوشش کیجیے۔

اللہ تعالیٰ مجھے، آپ کو، اور پوری انسانیت کو راہ سعادت کو سمجھنے اور اسے اختیار کرنے کی توفیق دے۔ آمین

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

از مولانا محمد منظور نعمانی

- اسلام کیا ہے؟ — ۸/-
- دین و شریعت — ۱۰/-
- قرآن آپ سے کیا کہتا ہے — ۱۶/-
- ملفوظات مولانا الیاسؒ — ۶/۵۰
- معارف الحدیث مکمل مجلد — ۱۵۰/-
- تذکرہ مجدد الف ثانیؒ — ۱۶/-
- تصوف کیا ہے؟ — ۸/-
- شیخ وہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور علماء حق پر اس کے اثرات — ۶/-
- کلمہ طیبہ کی حقیقت — ۳/-
- برکات رمضان — ۲/۵۰
- آپ حج کیسے کریں — ۹/-
- آسان حج اردو — ۳/-
- 〃 ہندی — ۳/-
- منتخب تقریریں — ۱۰/-
- مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف — ۱۰/-
- فیصلہ کن مناظرہ — ۵/۵۰
- شاہ اسماعیل شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات — ۲/۵۰
- تبلیغی جماعت جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات — ۲/۷۵
- قادیانی کیوں مسلمان نہیں — ۶/-
- قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ — ۲/-
- کفر و اسلام کے حدود اور قادیانیت — ۲/-
- آپ کون ہیں؟ کیا ہیں اور آپ کی منزل کیا ہے؟ — ۲/۵۰
- انسانیت زندہ ہے (عکسی) — ۲/۵۰

از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

- تجلیات ربانی مکتوبات مجدد الف ثانی مکمل — ۳۰/-
- مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ — ۱۶/-
- تذکرہ خواجہ باقی باللہ — ۷/۵۰
- تذکرہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ — ۲/۵۰
- دعائیں شیخ شہاب الدین سہروردیؒ — ۲/-

دیگر مصنفین کی تصانیف

- صحبتے با اہل دل — ۱۴/-
- رہنمائے تلاوت عکسی — ۱۲/-
- تاریخ میلاد — ۴/-
- بریلوی فتنہ کا نیا روپ — ۱۲/-
- تذکرہ شیخ الحدیثؒ — ۲۰/-
- تذکرہ حضرت مولانا یوسفؒ — ۱۲/-
- انیس سوال — ۲/۵۰
- تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ — ۲/۵۰
- انقلاب ایران اور اس کی اسلامیت — ۷/-

معریٰ و مترجم قرآن مجید و حمائلیں

معریٰ قرآن مجید

- حوالہ ۵۳ ۱۶ سطری — ۲۵/-
- حوالہ ۱۳۶ عکسی حافظی ۱۵ سطری — ۲۵/-
- 〃 ۱۳۶ عکسی حافظی نعمانی اعلیٰ کاغذ — ۲۶/-
- 〃 ۶۳ ۱۸ سطری — ۲۰/-
- قرآن مجید پنج نعمانی خوش مہری از نولکشور — ۲۵/-
- حوالہ ۱۲۶ ابجور عکسی حافظی اعلیٰ کاغذ و طباعت دیدہ زیب جلد — ۳۶/-
- حوالہ ۳ اعلیٰ کاغذ و طباعت ۱۳ سطری خوبصورت فینسی جلد — ۴۵/-
- حوالہ ۳ انتہائی اعلیٰ کاغذ و طباعت ہر صفحہ پر ابر ابر دار، دلکش مضبوط فینسی ڈبی جلد، جہیز میں دینے کے لیے خاص تحفہ — ۴۰/-
- حوالہ ۱۲۳ حمائل حافظی پنج نعمانی — ۲۰/-

مترجم قرآن مجید

- حوالہ ۱۰ قرآن مجید مترجم عکسی ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانویؒ — ۵۰/-
- حوالہ ۶۲ رحمانی عکسی قرآن مجید مترجم — ۳۰/-
- سعید نما قرآن مجید مترجم بہ دو ترجمہ ترجمہ اول مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ ترجمہ دوم مولانا اشرف علی تھانویؒ — ۶۰/-
- ۲ قرآن مجید مترجم متوسط سائز — ۲۶/-
- ۳۴ قرآن مجید مترجم خورد سائز — ۲۰/-
- ۳۲۵ قرآن مجید مترجم عکسی — ترجمہ مولانا فتح محمد صاحب — ۵۵/-

حضرت مولانا صدیق احمد باندوی زید مجدہم کی کچھ گراں قدر تالیفات

کتاب	قیمت
آداب المعلمین	۲/۵۰
آداب المتعلمین	۴/-
فضائل نکاح	۲/۵۰
حق نما	۱/۲۵
احکام المیت	-/۶۰

حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب دامت برکاتہم کی چند مایہ ناز تصانیف

کتاب	قیمت
اصول تبلیغ	۴/-
اجتہاد اور تقلید	۶/-
ملفوظات (دسٹرائیک)	۳/-
مواعظ اول	۶/-
ملفوظات مکمل سیٹ	۱۸/-
شریعت وتصوف اول ۱۲/- دوم	۸/-
ذکر الٰہی	۵/-
ذکر النبی	۵/-
فضیلت علم	۵/-

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کی کچھ کتابیں

کتاب	قیمت
قاموس القرآن	۳۵/-
بیان اللسان	۳۰/-
سیرت طیبہ	۱۵/-
کلام عربی	۵/-

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا مقبول و معروف سیٹ

تعلیم الاسلام کا قاعدہ ۵۰/- تعلیم الاسلام
اول ۲۵/- دوم ۵۰/- سوم ۱/- چہارم ۲/۵۰

مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی چند بے نظیر تصانیف

کتاب	قیمت
بیاض اشرفی	۱۲/۵۰
مزید المجید	۶/-
مجالس الحکمہ	۱۵/-
اشرف الجواب مکمل مجلد	۳۳/-
اصلاحی نصاب	۴۵/-
بہشتی زیور (مدنی)	۳۵/-
" تبلیغی	۳۰/-
شریعت اور طریقت	۲۰/-
حسن العزیز مکمل ۲ جلد	۵۰/-
تسہیل المواعظ مکمل (۵ جلد)	۸۰/-
فیوض الخالق	۳/-
پردے کے شرعی احکام	۳/۲۵
احکام اسلام عقل کی روشنی میں	۱۱/-
اعمال قرآنی	۸/-
دین کی باتیں	۱۲/-
اشرف المواعظ	۱۳/-

ترجمہ قرآن کا مکمل نصاب (از مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی مرحوم)

کتاب	قیمت
رحمانی قاعدہ عربی	۱/۲۰
رحمانی قاعدہ اردو	۱/۲۰
مفتاح القرآن اول ۲۰/- دوم ۲۰/- سوم ۳ چہارم ۳/۱۵ پنجم ۳/۶۰	
مکمل سیٹ	۱۲/۶۰
معلم القرآن	۲/۵۰
مکمل مجلد	۶/۵۰

شب برات، رمضان، روزہ اور حج سے متعلق کتابیں

کتاب	قیمت
شب برات	-/۷۵
شب برات کی حقیقت	۳/-
رویت ہلال کے بارے میں ریڈیو وٹیلیفون کا شرعی حکم	۱/۴۰
برکات رمضان	۳/۵۰
ماہ رمضان	۳/-
رمضان اور اس کے روزے	۱/۴۵
کتاب الصوم و الحج (معارف الحدیث جلد چہارم)	۱۹/-
فضائل رمضان	۳/-
فضائل روزہ	-/۴۰
اعتکاف	۱/۵۰
آپ حج کیسے کریں	۹/-
آسان حج اردو ۳/- ہندی	۳/-
رفیق حج	۶/۵۰
معلم الحجاج	۱۵/-
فضائل حج	۹/-
حج اور اس کی دعائیں	-/۷۵
حج کی باتیں	۳/-
آئینہ حرم	۲۵/-
حج کے چند مشاہدات و احساسات	۳/-
دربار نبوت کی حاضری	۳/۵۰
دیار حبیب	۱۲/-
رہبر حج مجلد	۳/۵۰
نصائح حج مع تکملہ	۲/۵۰

تصانیف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی		مختلف موضوعات پر اہم کتابیں			
ارکان اربعہ	۲۲/-	تفسیر بیان القرآن	۲۴۰/-	تبلیغی نصاب اول جلد سہ اول سوم	
دستور حیات	۱۶/-	تفسیر ابن کثیر مکمل چار جلد	۲۰۰/-	(شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ)	۳۰/-
کاروان زندگی	۲۵/-	تفسیر ماجدی ۱ پارہ ۵ تا ۱۱	۵۵/-	الانور	۴۰/-
سیرت سید احمد شہید مکمل	۴۰/-	تدوین حدیث (مولانا مناظر احسن گیلانیؒ)	۴۸/-	آئینہ ملفوظات	۲۰/-
پرانے چراغ مکمل	۴۳/-	ترمذی شریف مکمل مترجم عکسی	۱۵۰/-	اصحاب النبی	۱۸/-
سوانح حضرت شیخ الحدیث	۲۰/-	الفقیہ الحدیث (مولانا محمد منظور نعمانی)	۱۲/-	مکتوبات حضرت علی	۱۰/-
دریائے کابل سے یرموک تک	۱۶/-	حصن حصین	۱۲/۵۰	تذکرہ مشائخ دیوبند (مفتی عزیز الرحمن صاحب)	
تاریخ دعوت و عزیمت مکمل ۵ جلد	۱۲۶/-	رسول رحمت (مولانا ابو الکلام آزاد)	۸۰/-	طب روحانی	۱۲/-
تزکیہ احسان و تصوف و سلوک	۱۰/-	سیرت النبی عکسی اردو		تقویۃ الایمان مکمل (شاہ اسمٰعیل شہیدؒ)	۲۰/-
نبی رحمت	۳۵/-	(از علامہ ابن ہشام)	۱۲۵/-	" " مختصر	۲/۵۰
ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں	۷/-	رحمۃ للعالمین مکمل عکسی		کلیات امدادیہ	۲۰/-
مذہب و تمدن	۷/-	(قاضی سلیمان منصور پوری)	۷۵/-	(حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکی)	۳۰/-
عالم عربی کا المیہ	۱۳/-	رسالۃ الکتاب (مفتی عزیز الرحمن)	۴۰/-	خطبات الاحکام	۱۲/۵۰
منصب نبوت	۱۳/-	مختصر سیرت نبویہ		ایمان کیا ہے	۱۱/۵۰
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر	۱۵/-	(مولانا عبد الشکور فاروقیؒ)	۱۰/-	مکاتیب رشیدیہ	۱۳/۵۰
معرکۂ ایمان و مادیت	۸/-	غنیۃ الطالبین		جواہر خمسہ	۲۵/-
پاجا سراغ زندگی	۱۲/-	(حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ)	۵۰/-	تذکرہ ائمہ اربعہ	۱۸/۵۰
مشرق وسطیٰ کی ڈائری	۱۸/-	شریعت یا جہالت عکسی		تبلیغ دین مکمل (امام غزالیؒ)	۱۲/-
دو ہفتے مغرب اقصیٰ مراکش میں	۶/-	(محمد [illegible] حقانی صاحب)	۴۵/-	تقدیر کیا ہے	۱۲/۵۰
نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں	۸/-	فتاوی رحیمیہ مکمل چار جلد		مکتوبات و بیاض یعقوبی	۱۱/-
مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں	۱۱/-	(مفتی سید عبد الرحیم لاجپوری)	۱۶۵/-	سیرت عائشہؓ	۱۶/-
سوانح حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری	۱۵/-	علم الفقہ (مولانا عبد الشکور فاروقی)	۵۵/-	اسوۂ صحابیات	۶/-
کاروان مدینہ	۱۲/-	فتاوی دار العلوم دیوبند	۳۲/-	ارض القرآن	۲۶/-
اسلامیت و مغربیت کی کشمکش	۱۸/-	جدید مسائل کے شرعی احکام (مولانا مفتی محمد شفیع صاحب)	۱۳/۲۵	آداب زندگی	۵/۵۰
جب ایمان کی بہار آئی	۱۲/-	ازواج مطہرات	۲۲/-	طب نبوی	۱۸/-
مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی	۱۲/-	تلبیس ابلیس اردو	۴۵/-	مقالات صوفیہ	۸/-

ضیاء القرآت ۲/۵۰
فاتح بیت المقدس ۳/-
زکوٰۃ کے مسائل ۱/۶۰
کرامات امدادیہ ۲/-
مودودی صاحب کے غلط نظریات ۷/-
فاتحہ کا صحیح طریقہ ۵/-
پردے کی حقیقت ۲/۵۰
آئینہ نماز ۴/۵۰
وعظ بے نظیر ۸/-
قربانی ۲/-
نماز کی اہمیت ۱/۵۰
سہیل حدیث ۳/۵۰
زلزلہ در زلزلہ ۱۰/-
تکفیر کے پردے میں ۸/-
تقریر کیسے کریں (مولانا کاظم ندوی)
اول ۳/۲۰ دوم ۴/- سوم ۸/-
زور معجزات ۲/۵۰
بچوں کی قصص الانبیاء، اول ۵/-
" " دوم ۶/-
" " سوم ۲/۵۰
ام الامراض ۵/۵۰
بدنظری کا علاج ۳/-
بدعت کی باتیں ۲۰/-
عربی بول چال عکسی از عبد الرحمن امرتسری
" " اول ۵/۵۰
" " دوم ۶/-

عربی بول چال عکسی از ڈاکٹر سید محمد امین مصری
اول ۹/- دوم ۱۶/-
مکتوبات شیخ اول (مکتوبات تصوف) ۱۴/-
" " سوم ۴/-
مسائل سجدۂ سہو ۴/-
نعتیں و سلام ۲/۵۰
القاموس الجدید اردو عربی ۲۷/-
" " عربی اردو ۲۰/-
ارشد القادری کی شریعت کا جائزہ ۴/-
کیا مردے سنتے ہیں ۶/-
رسالہ سماع پر تبصرہ ۶/-
بچوں کا بہشتی زیور ۴/۵۰
شان رب العالمین ۴/۵۰
تجہیز و تکفین کے احکام ۲/-
قصص الاولیاء مکمل ۳ جلد مجلد ۶۰/-
فضائل تجارت ۵/۵۰
مسنون دعائیں ۳/-
چار ستارے ۱۰/-
آپ بیتی مولانا عبد الماجد دریابادی ۳۰/-
میاں بیوی کے حقوق ۳/-
رسول اللہ کے تین سو معجزات ۶/-
مشکل کشا ۸/-
ارکان اسلام ۷/-
جنت کی کنجی ۱۲/-
اللہ والوں کے بچیس قصے -/۶۰
تعارف مذہب شیعہ ۱۵/-

مذہب شیعہ کے چالیس بنیادی عقیدے ۳/-
شیعوں کے ۱۱ اہم سوالات کے فیصلہ کن
جوابات ۳/-
شیعہ حضرات کے ۳۶ سوالات کے جوابات ۳/-
عقد ام کلثوم ۳/-
راہ نجات ۳/-
اسلام اور شیعہ مذہب ۴/-
اسلام کے چار رکن ۶/۵۰
باطل شکن ۴/۵۰
توحید کا خنجر ۱۲/-
حق پر کون ہے ۴/-
صحیفہ اولیاء ۹/-
تحدید نسل اور اسلامی تعلیمات ۱۰/-
روضۃ الادب ۷/-
موت کا جھٹکا ۱۸/-
دوزخ کا کھٹکا ۸/-
حضرت مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت ۱۴/-
ارشادات و مکتوبات مولانا الیاس ۱۲/-
وصایا ۱۰/-
معرفت الٰہیہ ۲۵/-
تعبیر نامہ خواب ۱۵/-
انوار معصومیہ ۳۵/-
فتاویٰ عبد الحی ۲۵/-
صراط مستقیم اردو (شاہ اسمٰعیل شہید) ۱۳/-
" " کلاں ۲۰/-
حیات امداد ۱۸/-

ملنے کا پتہ: الفرقان بک ڈپو ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

ممالک غیر سے
بحری ڈاک سے ۶۰/-
(۴ پونڈ یا ۲۵ ریال)
ہوائی ڈاک سے ۱۳۵/-
(۹ پونڈ ۵۴ ریال، ۱۵ ڈالر)

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

اس مشترک شمارہ کی قیمت ۵/-

چندہ سالانہ
ہندوستان میں ۲۵/-
پاکستان سے پاکستانی سکہ میں ۶۰/-
بنگلہ دیش سے ہندوستانی سکہ میں ۳۰/-

جلد ۵۲ بابت جون و جولائی ۱۹۸۴ء مطابق رمضان و شوال ۱۴۰۴ھ شمارہ ۶-۷

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی روانہ کیا جائے گا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں اگر وہ بارہ بھیجنے کے لیے دفتر میں پرچہ ہوگا تو ضرور بھیجا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار حضرات: مبلغ ۵۰ روپے ہندوستانی سکہ میں کسی بھی ذریعہ سے دفتر الفرقان لکھنؤ کو روانہ فرمائیں یا پاکستانی سکہ میں ۶۰ روپے ناظم ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیج دیں۔

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں غربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۝

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی الی رحمۃ اللہ

۔ا شعبان (۱۲ مئی) شنبہ کا دن تھا، راقم سطور نماز مغرب سے فارغ ہوا تھا کہ دار العلوم ندۃ العلماء کے استاذ اور اس کے عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے مدیر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی نے فون پر تبلایا کہ دہلی سے ٹیلی فون سے اطلاع ملی ہے کہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب انتقال فرما گئے۔۔ خبر سنکر قرآن مجید کی تعلیم و تلقین کے مطابق یہی کلمہ زبان پر آیا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن (جس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں، وہی ہمارا خالق و پروردگار اور مالک و حاکم ہے، اور ہماری حیات و موت اور سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے، اور ہم سب یہاں کی زندگی پوری کر کے اسی کی طرف لوٹنے والے اور اسی کے حضور میں حاضر ہونے والے ہیں) اس کلمہ نے اپنی موت بھی آنکھوں کے سامنے کر دی، اور سوچنے لگا کہ یہی دن (بظاہر جلدی ہی) میرے لیے بھی آنے والا ہے۔ اُس وقت میری سب سے بڑی طلب اور حاجت یہ ہو گئی کہ رب کریم رحم و کرم کا معاملہ فرمائے۔ اس خیال کے آتے ہی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مفتی صاحب کے لیے اور خود اپنے لیے مغفرت و رحمت کی دعا میں مشغولیت نصیب ہو گئی ——

اس عاجز نے اسی کو اُن کے ساتھ دیرینہ تعلق کا حق اور اُس دوسرے عالم میں جہاں وہ پہنچ گئے، اُن کی ممکنہ خدمت اور راحت رسانی کا وسیلہ سمجھا۔ اللہ تعالیٰ آئندہ بھی اُن کے حق کے مطابق اس کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْن۝

مفتی صاحب سے تعارف اور تعلق :-

اب سے اکسٹھ سال پہلے ۱۳۴۳ھ میں جب راقم سطور ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تو پہلی دفعہ اسی وقت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو دیکھا تھا، وہ اس وقت ۲۳۔ ۲۴ سال کے جوان تھے۔ دو سال پہلے ۱۳۴۱ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کر چکے تھے۔ اس وقت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ عہدہ کے لحاظ سے دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم تھے، لیکن اہتمام کا سارا کام وہی انجام دیتے تھے۔ اس لیے عملاً گویا وہی مہتمم تھے۔ ان کا دستور تھا کہ دارالعلوم کے فضلاء و فارغین میں جو بھی استعداد کے لحاظ سے ممتاز ہوتے وہ معین المدرس کی حیثیت سے ان کو دارالعلوم میں لے لیتے اور ابتدائی درجات کی تعلیم و تدریس کا کام ان سے لیتے۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب علمی استعداد کے لحاظ سے بہت ممتاز تھے، تعلیم کے آخری سال یعنی دورۂ حدیث میں انھوں نے اپنی پوری جماعت میں اعلیٰ نمبر حاصل کر کے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی تھی، اس لیے ان کو معین المدرس کی حیثیت سے دارالعلوم میں لے لیا گیا تھا ــــــ ان کے دادا ماجد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس زمانہ میں دارالعلوم کے مفتی تھے۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ان کی نگرانی میں افتاء (فتویٰ نویسی) کا کام بھی کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان کو نائب مفتی بھی کہا جاتا تھا۔

میرے مزاج میں فطری طور پر کم آمیزی ہے۔ جو دارالعلوم کی طالب علمی کے اس زمانہ میں حد سے بڑھی ہوئی تھی، بے ضرورت کسی سے ملنے ملانے کا بالکل معمول نہیں تھا۔ میں اپنی طالب علمی کے آخری مرحلے میں دیوبند گیا تھا۔ اس لیے صرف انہی اکابر اساتذہ سے اس زمانہ میں اس عاجز کا تعلق رہا جن کے یہاں میرے اسباق ہوتے تھے۔ اس لیے اس زمانہ میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا۔ بس اتنا ہی جانتا تھا کہ یہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے ہیں معین المدرسی

اور نائب مفتی ہیں۔

شعبان ۱۳۴۴ھ میں دار العلوم کی میری طالب علمی کا دور ختم ہو گیا اور میں دورۂ حدیث کا امتحان دے کر مکان آ گیا ۔۔۔۔ اپنی جس فطری کم آمیزی کا اوپر ذکر کیا ہے اس کی وجہ سے میں اس بات سے تقریباً بے خبر رہا کہ دار العلوم میں اوپر کی سطح پر کچھ اختلافات ہیں، پھر میرے مکان پر آ جانے کے بعد جلدی ہی اخبارات اور بعض دوسرے ذرائع سے معلوم ہونے لگا کہ ان اختلافات نے سنگین صورت اختیار کر لی، اور اس کے نتیجہ میں اس وقت کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث استاذنا حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے ساتھ دیگر متعدد اکابر اساتذہ نے دار العلوم سے تعلق قطع کر لیا۔ ان حضرات کے ساتھ جن نوجوان اساتذہ نے دار العلوم سے قطع تعلق کیا تھا ان میں مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور مفتی عتیق الرحمن عثمانی بھی تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد یہ سب حضرات گجرات ضلع سورت کی بستی ڈابھیل کے مدرسہ "تعلیم الدین" میں اجتماعی طور پر بلا لیے گئے۔ اور اس کے بعد سے وہ مدرسہ "جامعہ اسلامیہ" ہو گیا اور اس طرح دار العلوم کے اختلاف کے اس شر سے یہ خیر پیدا ہوا کہ گجرات میں کم از کم تعلیم کی سطح پر دار العلوم دیو بند جیسا ہی ایک "جامعہ اسلامیہ" قائم ہو گیا ۔۔۔۔ حضرت مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ اس وقت اس قافلہ کے ساتھ تشریف نہیں لے گئے۔ دیو بند ہی میں اپنے مکان پر اور اپنی مسجد کے حجرہ ہی کو اپنی قیام گاہ بنا لیا۔ لیکن مفتی عتیق الرحمن صاحب قافلہ کے ساتھ تشریف لے گئے اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریس کے علاوہ افتاء کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد رہی ۔۔۔۔ کچھ عرصہ کے بعد آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے مستعفی ہو کر چلے آئے اور پھر چند سال کلکتہ میں قیام فرمایا یہاں درس قرآن اور خطابت و موعظت خاص مشغلہ رہا۔ کلکتہ کے اسی قیام ہی

کے زمانے میں ایک تصنیفی اشاعتی ادارے کے قیام کا خاکہ بنایا اور پھر اس کام کے لیے مستقل دہلی آ گئے اور اپنے قدیم رفقاء مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے اشتراک و تعاون سے یہ ادارہ "ندوۃ المصنفین" کے نام سے قرول باغ دہلی میں ۱۳۵۷ھ (۱۹۳۸ء) میں قائم کیا اور اس کا ماہنامہ "برہان" جاری کیا۔ ادارہ کے انتظام کی ذمہ داری خود سنبھالی ـــــ الفرقان ۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) میں بریلی سے جاری ہو چکا تھا۔ لیکن کئی سال تک اس کی طباعت دہلی میں ہوتی تھی۔ راقم سطور ہر مہینہ اس کی کاپیاں لے کر چھپوانے کے لیے خود دہلی جاتا تھا۔ ندوۃ المصنفین قائم ہو جانے کے بعد سے مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا قیام قرول باغ ہی میں رہتا۔ یہ عاجز اُس زمانے میں جب بھی دہلی جاتا، ان حضرات کی ملاقات کے لیے قرول باغ ضرور جاتا اور کبھی کبھی دن کا زیادہ وقت وہیں گزرتا۔

ملک کی تقسیم کے فیصلے کے بعد ۱۹۴۷ء میں دہلی میں جو فسادات ہوئے اور دلی کے مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی اس میں "ندوۃ المصنفین" بھی برباد ہو گیا تھا۔ قرول باغ مسلمانوں سے بالکل خالی ہو گیا تھا۔ اور بظاہر اسباب ندوۃ المصنفین کے بقا کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن فی الحقیقت اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے اور بظاہر اسباب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی دانشمندی عزم و ہمت اور مولانا حفظ الرحمٰن کی جدوجہد سے وہ پھر قائم ہوا۔ جامع مسجد کے علاقہ میں اس کے لیے ایک مناسب مکان حاصل کر لیا گیا۔ بفضلہ تعالیٰ وہ اسی میں قائم ہے۔ اس کا ماہنامہ "برہان" مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی ادارت میں جاری ہوا تھا، اب تک انہی کی ادارت میں جاری ہے۔ بعد کے اس دور میں بارہا ایسا ہوا کہ کسی ضرورت سے دہلی جانا ہوا تو "ندوۃ المصنفین" ہی میں قیام کیا۔ راقم سطور ۱۳۸۵ھ (۱۹۶۵ء) میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا رکن منتخب کر لیا گیا تھا، اس کے دو سال بعد ۱۳۸۷ھ میں مفتی صاحب بھی اس کے رکن منتخب

ہو گئے۔ اُس وقت سے دار العلوم کی مجلس شوریٰ اور عاملہ کے جلسوں میں برابر ساتھ
شرکت ہوتی رہی ـــــ ۱۹۶۵ء میں مجلس مشاورت قائم ہوئی اس میں بھی
اُس وقت تک ساتھ رہا جب تک کہ راقم سطور اور اس کے اصل بانی ڈاکٹر
سید محمود نے استعفا دے کر بے تعلقی اختیار نہیں کی۔

قریباً نصف صدی کے اس قریبی تعلق میں میں نے مفتی صاحب کے بارے
میں جو کچھ جانا اس کو مختصر الفاظ میں اس طرح عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ نہایت
ذہین، فہیم و فطین اور معاملہ فہم عالم دین تھے۔ تقریر اور تحریر پر یکساں قدرت
تھی۔ موقع پر ضرورت کے مطابق بات کرنے کی اللہ تعالیٰ نے خاص صلاحیت
عطا فرمائی تھی۔ اگر "ندوۃ المصنفین" کی انتظامی ذمہ داری نہ سنبھالی ہوتی اور
اپنے کو انھوں نے تدریس و تصنیف جیسے علمی کاموں میں مشغول کیا ہوتا تو وہ حدیث
و تفسیر وغیرہ علوم دینیہ کے درجہ اول کے اساتذہ اور صف اول کے مصنفین میں
ہوتے۔ لیکن ماشاء اللہ کان وما لم یشأ لم یکن۔

وہ حافظ قرآن بھی تھے۔ اور قرآن مجید بہت ہی اچھا پڑھتے تھے۔
رمضان مبارک میں وہ تراویح تو قریب کی مسجد میں قرآن مجید سنانے والے امام ہی
کے پیچھے پڑھتے تھے۔ لیکن نوافل میں اپنا قرآن مجید ختم کرنے کا معمول تھا۔ جو
غالباً اُن کی اس علالت تک جاری رہا، جس کا انجام اب ان کے سفر آخرت
پر ہوا۔

قریباً سوا دو سال ہوئے دار المصنفین اعظم گڑھ میں اسلام اور مستشرقین
کے موضوع پر عالمی مجلس مذاکرہ تھی۔ مفتی صاحب نے اس میں شرکت فرمائی تھی۔
وہ اس سے فارغ ہو کر ہاوڑہ دہرہ دون ایکسپریس سے واپس آ رہے تھے
دوسرے رفقاءِ سفر کے علاوہ ان کے خاص رفیق مولانا سعید احمد اکبر آبادی
بھی ساتھ تھے ـــــ بارہ بنکی کا اسٹیشن آنے سے پہلے، بات کرتے کرتے مفتی
صاحب پر فالج کا حملہ ہو گیا۔ ٹرین جب بارہ بنکی اسٹیشن پہونچی تو مولانا

اکبرآبادی نے فون کے ذریعہ لکھنؤ کے اسٹیشن ماسٹر کو مفتی صاحب کے بارے میں بتلایا اور کہا کہ ان کو لکھنؤ اتار کر اسپتال پہونچانا ہوگا۔ اس لیے جب ہماری گاڑی لکھنؤ پہونچے تو اسٹیشن پر ڈاکٹر اور ایمبولنس موجود ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب گاڑی لکھنؤ اسٹیشن پہونچی تو مفتی صاحب کو اتار کر ایمبولنس کے ذریعہ یہاں کے بلرامپور ہسپتال میں داخل کیا گیا ـــــ مولانا علی میاں جو اعظم گڑھ سے مفتی صاحب سے پہلے تشریف لا چکے تھے اور "دارالعلوم ندوہ" میں مقیم تھے۔ ان کو اسی وقت اطلاع ہوگئی وہ اسی وقت اسپتال تشریف لائے اور دارالعلوم کے چند سعادت مند طلبہ کی ڈیوٹی مفتی صاحب کی خدمت و تیمارداری کے لیے مقرر کردی۔ مجھے دیر رات گے بعد دارالعلوم ہی سے اس کی اطلاع ملی۔ میں صبح بعد نماز فجر ان کو دیکھنے کے لیے ہسپتال گیا۔ اس وقت ان کی حالت بہت ہی نازک اور بظاہر بے ہوش کن تھی، بول بالکل نہیں سکتے تھے، اپنے ارادہ سے جسم کے کسی حصّہ کو حرکت بھی نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ انھوں نے مجھ کو پہچان لیا۔ میں نے اس وقت تسلّی کی جو بات کہنا مناسب سمجھی وہ کہی۔ اور اندازہ ہوا کہ انھوں نے میری بات سمجھ لی۔ قریبًا ایک ہفتہ لکھنؤ کے اس ہسپتال میں قیام رہا، حالت کچھ بہتر ہوگئی۔ ان کے صاحبزادے اور داماد اطلاع ملنے پر دوسرے ہی دن آ گئے تھے۔ یہاں کے ڈاکٹروں کے مشورہ سے طے ہوا کہ مزید علاج کے لیے ان کو دہلی لے جایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ـــــ طویل عرصہ تک دہلی کے ایک ہسپتال میں زیر علاج رہے اور حالت تدریجًا بہتر ہوتی رہی، یہاں تک کہ ہسپتال سے ان کو گھر لے آیا گیا۔ اور آنے جانے والوں سے معلوم ہوتا رہا کہ نقل و حرکت تو اب بھی مشکل ہے لیکن دماغ صحیح کام کرنے لگا ہے اور بات بھی کرتے ہیں۔

جب وہ لکھنؤ ہسپتال میں تھے تو ان کی حالت دیکھ کر شدت کے ساتھ یہ احساس بار بار ہوا کہ قریبًا نصف صدی کے اس تعلق کے زمانہ میں مختلف معاملات

کے بارے میں رائے کا اختلاف بھی ہوا۔ اور اس کا کافی امکان ہے کہ میری
کسی بات سے ان کو اذیت پہونچی ہو، یا میں نے ان کی غیبت کی ہو یا سنی
ہو، یا دل میں کوئی بدگمانی آئی ہو، اس لیے حتی الوسع زندگی ہی میں آخرت
کے لیے اپنے معاملہ کو صاف کر لینا چاہیے۔ لیکن یہ خطرہ ہوا کہ اس طرح کی
بات سے ان کو یہ محسوس نہ ہو کہ ہم لوگوں کو ان کے بارہ میں مایوسی ہے۔
اس لیے اس وقت دل کے اس داعیہ کو دبایا اور کچھ عرض نہیں کیا ——— پھر
جب عرصہ کے بعد یہ معلوم ہو گیا کہ وہ دہلی میں ہسپتال سے گھر لے آئے گئے ہیں
اور حالت کافی بہتر ہے تو میں نے ان کی خدمت میں اس سلسلہ میں عریضہ لکھا۔ اور
آخرت کے لیے معاملہ کی صفائی اور معافی کی درخواست کی ——— قریباً تین مہینے
کے بعد مفتی صاحب کا لکھا ہوا خط پہونچا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ
آپ کا خط تو وقت پر پہنچ گیا تھا۔ لیکن گھر والوں نے اس سے پہلے مجھے دینا
مناسب نہیں سمجھا، آج ہی میں نے دیکھا ہے۔ آگے مفتی صاحب نے وہ لکھا
تھا جو ان کے شایان شان تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس احسان کی بہتر سے بہتر
جزا عطا فرمائے۔

اب سے کچھ دنوں پہلے ان کی طبیعت پھر زیادہ خراب ہوئی۔ معلوم ہوا تھا
کہ ضعف بڑھ رہا ہے ——— ۱۰؍شعبان ۲۳؍مئی کو اچانک وہ اطلاع ملی جو اوپر
ذکر کی جا چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔
ناظرین کرام سے بھی اسی دعا کی درخواست ہے۔ اس عاجز پر بھی احسان ہوگا۔

ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

یہ شمارہ

جون و جولائی ۱۹۸۲ء (رمضان و شوال ۱۴۰۲ھ) کا مشترک شمارہ ہے۔ سلسلۂ رمضان کی وجہ سے جولائی کا شمارہ جون کے ساتھ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ گذشتہ شمارے میں اس کی اطلاع نہ دی جا سکی ——— ناظرین کرام نوٹ فرمالیں
اگلا شمارہ ماہ اگست ۱۹۸۲ء (ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ) میں شائع ہوگا ——— (ادارہ)

مولانا محمد ثانی حسنیؒ

تیری رحمت کی ہوا گھر گھر چلے

رحمتِ حق آئی قسمت ور چلے
سجدہ ریزی کو خدا کے گھر چلے

نعمتوں سے گود بھر لے خوش نصیب
زاہدانِ باصفا بڑھ کر چلے

وا ہوئے در بزمِ رحمت کے تمام
اہلِ درد و سوز کھنچ کھنچ کر چلے

گلشنِ رحمت کی ہر دم سیر کی
اپنے دامن کو گلوں سے بھر چلے

رہ گئے محروم ہم ہی کم نصیب
جھاڑ کر دامن کو اپنے گھر چلے

شمع کی مانند اس کی بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

قدر نعمت کی نہ کچھ ہم کر سکے
بوجھ عصیاں کا لیے سر پر چلے

ہائے رے حسرت نصیبی وائے غم
کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے

نور سمٹا چاندنی پھیکی پڑی
سر چھپانے کو مہ و اختر چلے

ماہِ رحمت کے شب و روز و سحر
ہر طرف تم نور برسا کر چلے

تم سے ملتی تھی دلوں کو تازگی
تم چلے ارمان سارے مر چلے

الفراق اے ماہ رمضاں الفراق
زخم دل پر کیا لگے نشتر چلے

آئے رحمت کو لیے ہر سال تو
تیری رحمت کی ہوا گھر گھر چلے

ایک جھونکا تیری رحمت کا ادھر
بہرِ الطاف اے کرم گستر چلے

ہوں نہ ہوں یہ لطف کے دن پھر نصیب
اور دورِ بادۂ کوثر چلے

اور کبھی، کچھ اور کبھی، کچھ اور کبھی
جانے کب دربند ساقی کر چلے

ساقیا اب لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

(ماخوذ از ماہنامہ رضوان لکھنؤ مولانا محمد ثانی حسنی نمبر)

رمضان المبارک

انوار و انعامات

[حضرت ڈاکٹر عبد الحی عارفی دامت برکاتہم کے اصلاحی افادات و ارشادات اس سے پہلے بھی الفرقان کے ذریعہ اس کے ناظرین تک پہنچائے جاتے رہے ہیں۔ آج کی صحبت میں رمضان مبارک سے متعلق حضرت ممدوح کی ایک مجلسی تقریر نذر ناظرین کی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے استفادہ اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔]

حضرت ڈاکٹر عبد الحی صاحب مدظلہ نے رمضان شریف کے متعلق ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ الحمد للہ۔ اللھم لک الحمد والشکر۔ اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ آج ہم اور آپ پھر کچھ دیر کے لیے اللہ جل شانہٗ اور ان کے نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے لیے جمع ہو گئے ہیں جو ہمارے لیے انشاء اللہ بڑا سرمایۂ سعادت ہے۔

بہت سی باتیں جاننے کے پیچھے نہ پڑیے بس جتنی بات معلوم ہے اس پر ہی عمل ہو جائے تو یہ بڑے کام کی بات ہے۔ ہماری عبادات و طاعات بھی کچھ رسمی صورت کی ہو کر رہ گئی ہیں۔ اور اس بدحواس زندگی میں اور نفسانی و شہوانی ماحول میں ان کی حقیقت اور اہمیت جیسی ہونی چاہیے ہمارے دلوں میں نہیں ہے۔ اس لیے پہلے تو اللہ پاک سے دعا کریں کہ یا اللہ جب آپ نے توفیق دی ہے۔ تو آپ ہی ان عبادات کی اہمیت برکات و تجلیات اور ان کے ثمرات، فہم سلیم و توفیق اعمال صالحہ اور حیات طیبہ عطا فرما دیں۔

یہ شعبان کا آخری جمعہ ہے انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ ہفتے کے بعد ماہ مبارک
رمضان شریف کا آغاز ہو رہا ہے۔ کاش ہم کو اپنے ایمان کی عظمت و قدر و منزلت
ہوتی تو اس ماہ مبارک کی سعادتوں سے بہرہ ور ہونے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے۔
یہ اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم ہے کہ ہمارے ضعف ایمان اور ناکارہ اعمال کو از سر نو
قوی اور کامل ترین بنانے کے لیے رمضان المبارک کے چند گنتی کے دن عطا فرمائے
ہیں۔ اس لیے ان کو غنیمت سمجھ کر ہمیں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ان ایام معدودہ
کی قدر کرنا چاہیے۔ یوں تو اللہ جل شانہ نے ہماری دنیا و آخرت کے سرمایہ کے لیے
ہم کو چند فرائض و حقوق واجبہ کا مکلف بنایا ہے مگر اس ماہ مبارک میں چند نوافل
و مستحبات کے اضافہ کے ساتھ ہم کو زیادہ سے زیادہ حلاوت ایمانی اور اعمال کی پاکیزگی
اور اپنے حصول رضا کا موقع عطا فرمایا ہے اس کی قدر کرو اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھاؤ
اور اس کے شروع ہونے سے پہلے اپنے ظاہری و باطنی اعضاء کو خوب توبہ استغفار سے
پاک و صاف کر لو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ نے اپنے محبوب نبی الرحمہ
کی امت پر اس لیے یہ احسان و انعام فرمایا ہے کہ ان کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم اپنی
امت کے فائز المرام ہونے پر خوش ہو جائیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس اعلان
کا مصداق بنیں۔ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ اس لیے ہمارے ذمہ بھی شرافتِ
نفس کا تقاضا یہی ہے کہ ہم بھی اللہ تعالیٰ اور اپنے آقائے نامدار نبی الرحمہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنے حتی الامکان کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں
اس لیے ہم اس وقت عہد کر لیں کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم اس ماہ مبارک کے تمام لمحات،
شب و روز اسی احتیاط و اہتمام میں گذاریں گے جو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک
مقبول اور پسندیدہ ہے۔ اس لیے ابھی چند روز باقی ہیں ہم ابھی سے اس کی تیاری
شروع کر دیں۔ احتیاط اس بات کی تمام ظاہری و باطنی گناہوں سے بچیں گے اور
اہتمام اس بات کا کہ زیادہ سے زیادہ نیک کام کریں گے اور عبادات و طاعات میں
مشغول رہیں گے۔ یوں تو سب دن اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں ہر وقت اور ہر آن انھیں

کی مشیت ہی کارفرما ہے اور ہماری تمام عبادات و ریاضات انہیں کے لیے ہیں اور وہی ہم کو ذوق و توفیق دیتے ہیں اس کا صلہ رحمت فرما دیا گیا مگر امتیان نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا لامتناہی احسان خصوصی یہ ہے کہ فرمایا یہ مہینہ میرا ہے اور اس کا صلہ میں خود دوں گا۔ اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ جو صلہ اور اجر اس ماہ کے اعمال کا وہ بے حد و بے حساب ہوگا اور یہ بے حد و بے حساب ہونا اللہ تعالیٰ علیم و خبیر کے علم میں ہے اس احسان شناسی کے جذبہ کو قوی کرنے کے لیے تو کیا ہی اچھا ہم کو بھی عزم بالجزم کر لینا چاہیے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم جو کچھ بھی کریں گے وہ محض رب العالمین ہی کو خوش کرنے کے لیے پھر دیکھیے کہ اس عزم کے صلہ میں تائید الٰہی کس طرح ہمارے شامل حال رہتی ہے انشاء اللہ ہم خود مشاہدہ کر لیں گے۔

تہیہ کر لیجیے کہ اب ایک پاکیزہ و محتاط زندگی گذاریں گے۔ آنکھوں کا غلط انداز نہ ہونے پائے۔ سماعت میں فضول باتیں نہ آنے پائیں۔ بے کار باتوں میں مشغول نہ ہوں۔ اخبار بینی سے زیادہ شغف نہ ہونے پائے اس کے علاوہ تمام غیر ضروری تعلقات بھی کم کر دیں۔ ایسی تقریبات میں شرکت بھی نہ ہو جہاں شریعت کے خلاف کام ہوں تو انشاء اللہ پاک و صاف رہیں گے اور یاد رکھو کہ ناپاکیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا کس قدر بڑا احسان ہے کہ اپنے گنہگار غفلت زدہ بندوں کو پہلے ہی متنبہ کر دیا کہ جیسے ہی رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہو تم اپنے عمر بھر کے تمام چھوٹے بڑے گناہ معاف کرا لو تاکہ تم کو اپنے مربی حقیقی سے صحیح و قوی تعلق پیدا ہو جائے اور اگر تم نے ہماری مغفرت واسعہ و رحمت کاملہ کی قدر نہ کی تو پھر تمہاری تباہی و بربادی میں کوئی کسر باقی نہ رہے گی۔ اب اس اعلان رحمت پر کون ایسا بدنصیب بندہ ہے جو اس کے بعد محروم رہنا چاہے گا۔ اس لیے ہم سب لوگ یقیناً بڑے خوش نصیب ہیں کہ رمضان المبارک کا مہینہ اپنی زندگی میں پا رہے ہیں۔ اب تمام جذبات عبدیت کے ساتھ اور قوی ندامت کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوں اور اس ماہ مبارک کے تمام برکات و انوار و تجلیات الٰہیہ سے مالامال

ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس کی زیادہ سے زیادہ توفیق ہم سب کو عطا فرمائے۔ آمین۔

جی بھر کر، دو دن، تین دن، چار پانچ دن اپنے تمام گناہ عمر بھر کے جتنے یاد اور تصوّر میں آسکیں اور جہاں جہاں نفس و شیطان سے مغلوب رہے ہو۔ چاہے وہ دل کا گناہ ہو۔ آنکھ کا، زبان کا یا کان کا سب ندامت قلب کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دو اور کہو کہ اب وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔ یا اللہ ہم کو معاف کر دیجیے۔ یا اللہ ہم سے غفلت و نادانی کی وجہ سے نفس و شیطان کی شرارت سے عمداً و سہواً جو بھی گناہ کبیرہ و صغیرہ صادر ہو چکے ہیں جو ہماری دنیا و آخرت کے لیے انتہائی تباہ کن ہیں اور جن کی شامتِ اعمال کا خمیازہ ہم روز بھگت رہے ہیں، اپنی مغفرت کاملہ اور رحمت واسعہ سے سب معاف فرما دیجیے، ہم انتہائی ندامت قلب کے ساتھ آپ کی بارگاہ میں منت و سماجت کے ساتھ دست بدعا اور سر بسجدہ ہیں۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝ ہر وہ بات جو قابل مواخذہ ہو معاف فرما دیجیے۔ دنیا میں، قبر میں، برزخ میں، حشر میں، پل صراط پر جہاں جہاں کبھی مواخذہ ہو سکتا ہے سب معاف فرما دیجیے اور یا اللہ اب آپ جتنی زندگی آئندہ عطا فرمائیں وہ حیاتِ طیبہ ہو، اعمال صالحہ کے ساتھ ہو۔ یا اللہ ہمارے ایمان کو مضبوط اور قوی فرما دیجیے۔

انشاء اللہ تعالیٰ حسب وعدۂ الٰہی ہماری یہ دعا ضرور قبول ہو گی۔ اب خبردار! اپنی گذشتہ غفلتوں اور کوتاہیوں کو اہمیت نہ دینا ازیادہ فکر ارنہ کرنا۔ مایوس و ناامید نہ ہونا۔ جب ان کا وعدہ ہے تو سب انشاء اللہ معاف ہو جائے گا۔ لیکن ہاں۔ چند گناہ ایسے ہیں جن کی معافی مشکل ہے مسلمان مشرک تو ہوتا نہیں لیکن کبھی کبھی یہ ممکن ہے کہ پریشان ہو کر عالم اسباب کی کسی قوت کو مؤثر سمجھ لیا ہو، دنیاوی وسائل و ذرائع کے سامنے اس طرح جھک گئے ہوں جس طرح ایک مومن کو جھکنا نہ چاہیئے تو یا اللہ آپ یہ سب لغزشیں بھی معاف کر دیجیے۔ بس اب مغفرت کا معاملہ ہو گیا اب ان کی رحمتِ واسعہ طلب کرو۔

اسی طرح ایک ناقابلِ معافی گناہ کبیرہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے کھوٹ اور کینہ ہو، کینہ رکھنے والے کے متعلق حدیث میں ہے کہ ایسا شخص شب قدر کی تجلیات، مغفرت اور قبولیت دعا سے محروم رہے گا۔ عام تعلقات میں اپنے اہل وعیال، عزیز واقارب، دوست احباب، سب پر ایک نظر ڈالو اور دیکھو کہ ان میں کسی کی طرف سے دل میں کسی قسم کا کھوٹ کینہ اور غصہ تو نہیں ہے کسی کی حق تلفی تو نہیں ہوئی ہے کسی کو ہماری ذات سے تکلیف تو نہیں پہنچی ہے۔ اللہ پاک اس وقت تک راضی نہیں ہوتے جب تک ان کی مخلوق ہم سے راضی نہیں ہو جاتی دیکھو اگر تم اس معاملہ میں حق بجانب اور دوسرا باطل پر ہے تو پھر جب تم اللہ پاک سے مغفرت چاہتے ہو تو اس کو معاف کر دو اور اگر تمھاری زیادتی ہو تو اس سے جا کر معافی چاہ لو۔ اس میں کوئی شرم کی بات نہیں اگر بالمشافہ ہمت نہ ہو تو ایک تحریر لکھ کر اس کے پاس بھیج دو کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے اس میں اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ دلوں کو صاف رکھنا چاہیے۔ اس لیے ہم اور آپ ابھی آپس میں دل صاف کر لیں اور ایک دوسرے کو معاف کر دیں۔

اس کے بعد ان سے نہ بدخواہی کرو نہ دل میں انتقام لینے کا خیال کرو۔ اپنی بیوی بچوں پر بھی نظر ڈال لو کہ وہ کہیں تم سے ناراض تو نہیں یعنی ان کے ساتھ کوئی بے جا تشدد یا زیادتی تو نہیں کی ہے۔ اگر ایسا ہے تو ان سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں بلکہ خوش اسلوبی سے ایسا برتاؤ کرو جس سے وہ خوش ہو جائیں۔ اسی طرح بھائی بہن عزیز واقارب غرض کسی سے کسی قسم کی بھی رنجش ہے تو تم ان کو معاف کر دو۔ اس لیے کہ تم بھی آخر اللہ میاں سے معافی چاہتے ہو۔

لغو اور فضول باتوں سے پرہیز کرو۔ لغو باتیں کرنے سے عبادت کا نور جاتا رہتا ہے۔ لغو باتیں کیا ہیں۔ جیسے فضول قصے کسی کا بے فائدہ ذکر، سیاسی امور پر بحث یا خاندان کی باتیں اگر شروع ہو جائیں تو اس میں غیبت ہونے کا امکان ضرور ہی ہوتا ہے۔ پھر اخبار بینی یا کوئی اور بے کار مشغلہ ان سب سے بچتے رہو صرف میں

دن گنتی کے ہیں، اگر کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو کلام پاک پڑھو۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھو۔ اور دینی کتب کا مطالعہ کرو۔

رمضان شریف میں دو عبادتیں سب سے بڑی ہیں ایک تو کثرت سے نمازیں پڑھنا (اس میں تراویح کی نماز بھی شامل ہے اور اس کے علاوہ تہجد کی چند رکعات ہو جاتی ہیں۔ پھر اشراق، چاشت اور اوابین کا خاص طور پر اہتمام ہونا چاہیے) دوسرے کلام پاک کی کثرت جتنی بھی توفیق ہو۔

کلام اللہ پڑھنے سے کئی فائدے نصیب ہو جاتے ہیں۔ تین چار عبادتیں اس میں شریک ہوتی ہیں اور یہ بہت باعث برکت ہیں۔ یعنی دل میں عقیدت، عظمت و محبت اور یہ خیال کر کے پڑھنے سے کہ اللہ پاک سے ہم کلامی کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ یہ دل کی عبادت ہے، زبان بھی تکلم کرتی ہے یہ زبان کی عبادت ہے، کان سنتے جاتے ہیں اور آنکھیں کلام الٰہی کی عبادت کے نقوش کی زیارت کرتی ہیں تو ان تمام اعضاء کو عبادات میں جداگانہ ثواب ملتا ہے۔ ان اعضاء کا اس سے زیادہ اور کیا صحیح مصرف ہو سکتا ہے اور یہ سعادتیں ہی نہیں بلکہ ان میں تجلیات الٰہی مضمر ہیں۔ نور حاصل ہوتا ہے اور نور کے معنی روشنی کے نہیں بلکہ طمانیتِ قلب ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب و رضا ہے۔

جب تلاوت سے تکان ہونے لگے تو بند کر دیں اور پھر چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے کلمہ طیبہ کا ورد رکھیں۔ دس پندرہ بار لا الٰہ الا اللہ تو ایک بار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے رہیں۔ ان متبرک ایام میں اگر ذکر اللہ کی عادت ہو گئی تو پھر انشاء اللہ ہمیشہ اس میں آسانی ہو گی۔

اسی طرح درود شریف کی بھی کثرت رکھیے۔ اُن محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کی بدولت ہمیں یہ سب دین و دنیا کی نعمتیں مل رہی ہیں۔ استغفار بھی کرتے رہیے پھر بھی جب یاد آ جائیں چند بار کر لیا کریں ماضی کے پیچھے زیادہ نہ پڑیے اب مستقبل کو سوچیے مستقبل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاعات و عبادات میں زیادہ سے زیادہ

وقت گزاریئے۔ اس طرح ایک مومن روزہ دار کی ساری ساعتیں عبادت ہی میں گذرتی ہیں۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

اگر تم کسی دفتر میں کام کرتے ہو تو تہیہ کر لو کہ تمہارے ہاتھ سے، زبان سے، قلم سے خدا کی مخلوق کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ کسی کو دھوکہ نہ دو۔ کسی ناجائز غرض سے اس کا کام نہ روکو۔ کوئی بات شریعت کے خلاف نہ ہو۔ روکے رکھو اپنے آپ کو اگر تم تاجر ہو تو صداقت و امانت سے کام کرو کسی قسم کے ایسے لالچ یا نفع سے کام نہ کرو جس سے کسی کو کوئی نقصان پہونچے یا تمہارا معاملہ کسی کی ایذا کا سبب بن جائے۔

آنکھیں گناہوں کا سرچشمہ ہیں۔ ان کو نیچا رکھیں۔ بدنگاہی صرف کسی پر بری نگاہ ڈالنا ہی نہیں بلکہ کسی کو حقارت کی نظر سے دیکھنا، حسد کی نظر یا برائی کی نظر سے دیکھنا بھی آنکھوں کا گناہ ہے۔

روزہ داروں کے بارہ میں کہتے ہیں کہ بات بات پر غصہ آتا ہے۔ گھر کے اندر یا گھر کے باہر کہیں بھی ہو۔ یہ بات اچھی نہیں ہے۔ روزہ تو بندگی و شکستگی پیدا کرتا ہے۔ عجز و نیاز پیدا کرتا ہے۔ پھر یہ روزہ کا بہانہ لے کر بات بات پر غصہ اور لڑنا جھگڑنا کیسا؟ روزہ درماندگی کی چیز ہے۔ اس میں تو اضع پیدا ہونی چاہیے کوئی خلاف مرضی بات کرے تو اس سے نرمی سے بات کرو۔ جھک جانا چاہیے۔ جھک جانے میں بڑی فضیلت ہے۔ تیس دن تک یہ کر لیجیے۔ اس میں نفس کا بڑا مجاہدہ ہو جاتا ہے جو تمام عمر کام آتا ہے۔ یہ عادت بڑی نعمت ہے جو ان دنوں میں آسانی سے ہاتھ آجاتی ہے۔

رمضان کی راتیں عبادتوں میں گذارنے سے دن میں بھی سچائی اور دیانت سے کام کی عادت ہو جاتی ہے۔ وہ اہتمام کریں کہ مسجدوں میں باجماعت نمازیں ادا کریں اور اگر توفیق اور فرصت مل جائے تو بڑے کام کی بات بتا رہا ہوں۔ تجربہ کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ نماز عصر کے بعد مسجد ہی میں بیٹھے رہیں اور اعتکاف کی نیت کر لیں۔ قرآن شریف پڑھیں۔ تسبیحات پڑھیں غروب آفتاب سے پہلے سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم اور کلمہ تمجید سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر پڑھتے رہیں اور

قریب روزہ کھولنے کے خوب اللہ پاک سے مناجات کریں، اپنے حالات و معاملات پیش کریں۔ دنیا کی دعائیں مانگیں۔ آخرت کی مانگیں، فراغت قلب اور عافیت کاملہ کی دعائیں مانگیں۔

اکثر دیندار عورتیں اس بات کی شکایت کرتی ہیں کہ ان کو روزہ افطار کرنے سے قبل عصر اور مغرب کے درمیان تسبیحات پڑھنے یا دعائیں کرنے کا موقع نہیں ملتا کیونکہ یہ وقت ان کا باورچی خانہ میں صرف ہو جاتا ہے۔ کھانا تیار کرنے میں مشغول رہتی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ وقت بھی عبادت میں گزرتا ہے مروزہ رکھتے ہوئے وہ کھانا تیار کرنے کی مشقت گوارہ کرتی ہیں جو اچھا خاصہ مجاہدہ ہے۔ پھر روزہ داروں کے افطار اور کھانے کا انتظام کرتی ہیں جس میں ثواب ہی ثواب ہے اور جن عبادات میں مشغول ہونے کی تمنا کرتی ہیں یہ ان کی تمنا خود ایک عمل نیک ہے۔ جس پر بھی انشاء اللہ ثواب ملے گا۔ پھر یہ بھی ممکن ہے غروب آفتاب سے آدھ گھنٹہ قبل انتظامات سے فارغ ہونے کا اہتمام کرلیں تو پھر ان کو بھی یکسوئی کے ساتھ رجوع الی اللہ ہونے کا موقع مل سکتا ہے اور اگر نہ بھی ملے تو ثواب انشاء اللہ ضرور مل جائے گا لیکن شرط یہ ہے کہ وہ شریعت وسنت کے مطابق اپنی زندگی بنائیں۔ صرف نماز روزہ ہی اللہ کے فرائض نہیں ہیں اور بھی فرائض ہیں اور بھی احکامات ہیں ان کا پورا کرنا بھی ضروری ہے مثلاً وضع قطع لباس و پوشاک سب شریعت کے مطابق ہو۔ پردہ کا خاص اہتمام ہو، بے پردہ باہر نہ نکلیں، اور ویسے بھی شریعت نے جن کو نامحرم بتایا ہے ان سے بے تکلف ملنا جلنا بھی گناہ ہے اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپس میں جب ملیں بات چیت کریں تو فضول تذکرے نہ چھیڑیں ایسے تذکرے میں عورتیں ضرور غیبت کے سخت گناہ میں مبتلا ہو جاتی ہیں، نام و نمود کے لیے کوئی بات نہ کریں یہ بھی گناہ ہے اگر ان باتوں کا اہتمام نہ کیا تو باقی اور عبادات سب بے وزن ہو جاتی ہیں اور اس سے مواخذہ کا قوی اندیشہ ہے۔ خوب سمجھ لو۔

اس ماہ مبارک میں ہر عمل نیک کا ستر گنا ثواب ملتا ہے چنانچہ جہاں اور عبادات

وغیرہ ہیں وہاں اس ماہ مبارک میں صدقہ وخیرات خوب کرنا چاہیے۔ اپنی حیثیت کے مطابق جس قدر ممکن ہو یہ سعادت بھی حاصل کر لے۔ یہ بھی خوب سمجھ لیجیے کہ اس ماہ مبارک میں جس طرح نیک اعمال کا بے حد و بے حساب اجر و ثواب ہے اسی طرح ہر گناہ کا مواخذہ و عذاب بھی بہت شدید ہے۔ عیاذاً باللہ۔

اپنے مرحوم اعزہ و آباؤ اجداد اور احباب کے لیے ایصالِ ثواب کرنا بھی بہت بڑے ثواب کا کام ہے اور بہترین صدقہ ہے۔ میں اپنے ذوق اور قلبی تقاضہ سے ایک بات کہتا ہوں جس کا جی چاہے عمل کرے یا نہ کرے۔ ہم پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق کے بعد والدین کے حقوق واجب فرمائے ہیں انھوں نے پالا پرورش کیا۔ دعائیں کیں، راحت پہنچائی اور جب تک تم بالغ نہیں ہوئے تمھارے کفیل رہے اور جب تم بالغ ہوئے تو تم نے ان کی کیا خدمت کی ہوگی؟ تو دیکھو جتنا سرمایہ ہے اپنے زندگی بھر کے اعمالِ حسنہ کا اور طاعات نافلہ کا سب نذر کرد و اپنے والدین کو۔ ان کا بہت بڑا حق ہے کیونکہ والدین کو اللہ تعالیٰ نے مظہر ربوبیت بنایا ہے۔ اس عملِ خیر کا ثواب تمھیں بھی اتنا ملے گا جتنا دے رہے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ یہ تمھارا ایثار ہے اور اس کا بہت بڑا ثواب ہے۔ میں تو اپنی ساری عمر کی تمام عبادات و طاعات نافلہ اور تمام اعمالِ خیر اپنے والدین کی روح پر بخش دیتا ہوں اور سمجھتا ہوں ہوں کہ اب بھی حق ادا نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت واسعہ سے قبول فرمالیں۔ اپنی عبادات نافلہ کا ثواب احیاء و اموات دونوں کو منتقل کیا جا سکتا ہے۔

اس ماہ مبارک میں لیلۃ القدر ہے۔ لیلۃ القدر کیا چیز ہے۔ کلام پاک میں ہے کہ تم کیا جانو لیلۃ القدر کیا چیز ہے۔ ہزار مہینوں سے بہتر رات ہے۔ کہاں پاؤ گے ہزار مہینے جہاں خیر ہی خیر ہو! اللہ تعالیٰ کا یہ ہم پر انعام عظیم ہے اور انھیں کے خزانہ لامتناہی میں اس خیر کا سرمایہ ہے۔ رمضان شریف کے مہینہ کا ہر دن تو شب قدر کے انتظار ہی میں ہے ؎

ہر شب شب قدر است گر قدر بدانی

اور اس انتظار میں اور اس کے اہتمام میں وہی ثواب ہر روز ملے گا جو شبِ قدر میں ہے۔ اگر شبِ قدر ۲۷ رمضان کو ہے تو جو روزہ پہلے رکھا وہ شبِ قدر ہی کی جانب تو ایک قدم ہے۔ اسی طرح دوسرا روزہ رکھا۔ تیسرا رکھا تو یہ سارے شبِ قدر سے قریب ہونے کا ذریعہ ہیں یا نہیں؟ جس طرح مسجد میں جانے پر ہر قدم پر ثواب ملتا ہے اسی طرح پہلے روزہ سے شبِ قدر تک ہر لمحہ پر انشاء اللہ ثواب ملے گا بشرطیکہ ہم اس کے حریص ہوں۔ اب ہم لوگوں کو ایک رات شبِ قدر ہے اور اس کی قدر کرنی چاہیے۔

شبِ قدر کے متعلق یہ بات بھی ہے کہ اس کا وقت غروبِ آفتاب سے طلوعِ فجر تک رہتا ہے اس لیے اس کا ضرور اہتمام رکھنا چاہیے جس قدر ممکن ہو نوافل و تسبیحات اور دعاؤں میں کچھ اضافہ ہی کر دینا چاہیے۔ ساری رات جاگنے کی بھی ضرورت نہیں جس قدر تحمّل ہو بہت ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ یہ مہینہ میرا ہے تو یہ ایک ذریعہ ہے اپنے بندوں کو اپنا بنانے کا۔ اب ہم لوگ بھی اس محبت کا حق ادا کریں اور یہ امید رکھیں کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہمارا تعلق اللہ میاں سے قوی ہو جائے گا۔

یہ تو خلاصہ ہے رمضان شریف کے اعمال کا۔ لیکن یہ تو ذاتی طور پر تمھاری عبادات ہوئیں۔ اب دین کے مطالبات اور بھی ہیں تمام مومنین مومنات مسلمین مسلمات کے لیے دعائیں کرو۔

حدیث شریف میں ہے کہ اگر کوئی مسلمان روزانہ ستائیس دفعہ تمام مسلمانوں کے لیے دعائے مغفرت و رحمت کرے تو اس کی ساری دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ ایمان پر خاتمہ ہوتا ہے۔ رزق میں فراخت ہوتی ہے اور نہ جانے کتنی برکتیں حاصل ہوتی ہیں۔

مطالباتِ ایمانیہ کچھ اور آگے جاتے ہیں وہ یہ کہ جو مسلمان اس زمانہ میں زندقہ و الحاد کی طرف جا رہے ہیں ان کی ہدایت کے لیے بھی دعائیں مانگیں۔ اس لیے کہ یہ بھی تو امتیانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں دین کی عظمت، ہدایت اور دین کا فہم عطا فرمائیں اور صحیح و قوی ایمان اور اسلام عطا فرمائیں۔ پاکستان اور اہل

آگے صفحات کی ترتیب غلط ہو گئی ہے۔ ہندسہ سے صحیح ہیں اس کے مطابق پڑھیے!

ہم کو بچایئے اپنی رضائے کاملہ عطا کیجیے۔

یا اللہ آپ کا وعدہ ہے کہ یہ مہینہ آپ کا ہے۔ اس ماہ مبارک میں ہم کو اپنا بنا لیجیے۔ یا اللہ آپ مربی ہیں، رحیم ہیں، غفور ہیں ہماری پرورش کرنے والے ہیں۔ ہمارے رزاق ہیں، ہمارے کارساز ہیں۔ تو پھر یا اللہ ہم سے ہماری ان غفلتوں کو دور کر دیجیے۔ اپنا صحیح تعلق عطا فرمائیے۔ ہمارے سارے معاملات دین کے ہوں یا دنیا کے۔ یا اللہ سب آسان کر دیجیے۔ مرنے کے بعد برزخ کے تمام معاملات آسان کر دیجیے۔ یوم حساب کا معاملہ آسان کر دیجیے اور اپنی رضائے کاملہ کے ساتھ جنت میں داخل کر دیجیے۔

یا اللہ اپنے محبوب شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کی حیثیت سے حشر میں ہم پر اپنی رحمتیں نازل فرمائیے ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعتِ کبریٰ نصیب فرمائیے۔ ہمارے ظاہر کو بھی پاک کر دیجیے اور باطن کو بھی پاک کر دیجیے۔

یا اللہ ہمیں رمضان مبارک کے ایک ایک لمحہ کے انوار و تجلیات، چاہے ہم محسوس کریں یا نہ کریں، آپ سب عطا فرما دیجیے۔ یا اللہ ہمارے روزے اور عبادات چاہے ناقص ہی ہوں آپ اپنے فضل سے قبول فرما لیجیے اور کامل اجر عطا فرمائیے۔

یا اللہ جو دشواریاں، بیماریاں، پریشانیاں جن میں ہم مبتلا ہیں اور آنے والے خدشات آفات ہیں ان سب سے ہم کو محفوظ رکھیے۔ یا اللہ کھانے پینے کی چیزوں میں گرانی روز افزوں ہوتی جا رہی ہے۔ ملاوٹ ہو رہی ہے، وبائیں آرہی ہیں۔ بیماریاں پھیل رہی ہیں سب سے حفاظت فرمائیے، ہم کو پاکیزہ اور افضل غذائیں عطا فرمائیے۔ یا اللہ ایمان والوں کے لیے آج کل کا معاشرہ (تہذیب و تمدن کی لعنتوں کا ماحول) جہنم کدہ بنا ہوا ہے اس کو گلزار ابراہیم بنا دیجیے۔ ہماری تمام حاجات پوری فرمائیے۔ ہم کو اسلام پر قائم رکھیے اور ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمائیے۔ آمین۔ بحق سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

پاکستان کی سلامتی کے لیے بھی خوب دعائیں مانگیں۔

بطور لطیفہ یہ بات سمجھ میں آئی کہ:۔
رمضان المبارک کے تین عشرے اس دعا کے مصداق ہیں
رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ
۱۔ پہلا عشرہ رحمت کا۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً
۲۔ دوسرا عشرہ مغفرت کا۔ وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً
۳۔ تیسرا عشرہ دوزخ سے نجات کا۔ وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ

(واللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ)

رمضان کے متبرک مہینہ میں یہی دعائیں مانگنی ہیں کہ

یا اللہ آپ نے اس متبرک ماہ میں جتنے وعدے فرمائے ہیں اور آپ کے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی بشارتیں دی ہیں۔ یا اللہ ہم ان سب کے محتاج ہیں آپ ہم کو سب ہی عطا فرما دیجیے۔

یا اللہ ہم لوگ جو توبہ استغفار کریں وہ سب قبول کر لیجیے۔ ہمارے متعلقین، دوست احباب کو توفیق دیجیے کہ وہ آپ کی عبادات و طاعات میں مشغول ہوں۔ ہم میں جو جو خامیاں ہیں سب کو دور کر دیجیے۔ ہم کو قوی سے قوی ایمان عطا فرمائیے۔ زیادہ سے زیادہ اعمال صالحہ کی توفیق دیجیے۔ یا اللہ ہماری آنکھوں، کانوں، زبان اور دل کو لغویات سے پاک رکھیے۔ یا اللہ ان میں اپنے ایمان کا نور عطا فرمائیے۔

یا اللہ سب مسلمین مسلمات پر رحم فرمائیے۔ تمام ملکوں میں جہاں جہاں مسلمان بے راہ روی پر پڑ گئے ہیں، ان کے دلوں میں نفاق پیدا ہو گیا ہے اس کو دور فرما دیجیے ان کو اتباع سنت اور شریعت کی توفیق عطا فرما دیجیے۔ ان کو اپنا بنا لیجیے، ان کو توبہ استغفار کی توفیق عطا فرما دیجیے۔

یا اللہ ہم یہ دعائیں آپ کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں۔ اس ماہ مبارک کی برکت سے قبول فرما لیجیے۔ یا اللہ جو مانگ سکے وہ بھی دیجیے اور جو نہ مانگ سکے وہ بھی دیجیے۔ جس میں ہماری بہتری ہو دین و دنیا کی فلاح ہو یا اللہ وہ سب ہم کو عطا کیجیے، نفس و شیطان سے

گاہے گاہے باز خواں

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ

کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ مسلمان اپنے طریقِ کار پر از سرِ نو غور کریں؟

[ذیل میں جو مضمون آپ ملاحظہ فرمائیں گے وہ اڑتیس سال قبل ۱۳۶۶ھ (اوائل ۱۹۴۷ء) میں اس وقت لکھا گیا تھا جبکہ غیر منقسم ہندوستان دوراہے پر کھڑا تھا اور یہاں ایک نیا دور شروع ہونے والا تھا، ملت اسلامیہ ہندیہ کی کشتی کو موجوں کے تھپیڑوں سے بچانے اور اس کے لیے عزت و وقار کا مقام حاصل کرنے کے لیے مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والی جماعتوں کی طرف سے مختلف کوششیں کی جارہی تھیں ——— ان حالات میں عام مسلمانوں اور خصوصاً ان کے خواص اور قائدین کی توجہ اس بارے میں قرآن مجید کے بیان کردہ قطعی بے لاگ اور وہی خدائی نظام کی طرف منعطف اور مبذول کرانے کے لیے ہی یہ مضمون لکھا گیا تھا۔

آج بھی ہندوستان بلکہ پورے عالم میں ملت اسلامیہ کے مسائل اور ان کو حل کرنے کے لیے مسلمانوں کی تحریکوں اور کوششوں کا حال وہی ہے جس سے متاثر ہو کر اور جس کی اصلاح کے لیے یہ مضمون لکھا گیا تھا اس لیے اسی دعوت کی تجدید کی غرض سے یہ پھر شائع کیا جارہا ہے ——— مدیر]

ہندوستان کی سیاست جس رُخ پر نہایت تیز رفتاری سے جا رہی ہے اور اس سے جو نئے نئے حالات پیدا ہو رہے ہیں اور اس ملک کے بالخصوص مسلم اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کا مسئلہ جس قدر نازک اور ان کا مستقبل جس قدر بھیانک ہوتا جا رہا ہے اس سے ہر باخبر اور صاحب فہم و فکر مسلمان کسی نہ کسی درجہ میں پریشان ہے اور مسلمانوں کے قومی مسائل سے تعلق و دلچسپی رکھنے والی مختلف جماعتیں اپنی اپنی صوابدید کے مطابق ان مشکلات کو حل کرنے اور ان پر قابو پانے کے لیے مصروف جد و جہد بھی ہیں ——— لیکن خیالات و نظریات کے بڑے بڑے اختلافات کے باوجود ان سب کے طرز فکر اور طریق کار میں ایک عجیب وحدت اور یکسانیت بھی ہے اور وہ یہ کہ سب کے سب معاملہ پر صرف مادی پہلو ہی سے غور کرتے ہیں اور اس کے لیے جو کوشش بھی اس سلسلہ میں ہماری مشہور اور قابل ذکر قومی جماعتوں کی طرف سے ہو رہی ہیں وہ سب مادی تدبیروں ہی کی مختلف صورتیں ہیں اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر بالفرض اس ملک کی کسی دوسری قوم کو (جو خدا سے بالکل ناآشنا اور ایمان کی دولت سے محروم ہو بلکہ جو دشمن دین و ایمان ہو) ایسے حالات پیش آجائیں جو اس وقت ہم مسلمانوں کو درپیش ہیں تو یقیناً وہ قوم بھی وہی سب کچھ کرے گی جو ہماری قومی اور سیاسی جماعتیں عام طور سے اس وقت کر رہی ہیں اور اس کی پالیسی بالکل وہی ہوگی جو آج ہماری ہے ——— الغرض یہ بات خواہ کتنی ہی رنج و افسوس کے قابل ہو اور ہمارے قومی کارکنوں کو خواہ کتنی ہی کڑوی لگے مگر یہ ایک غیر مشتبہ حقیقت اور ناقابل انکار واقعہ ہے کہ ہماری قومی اور سیاسی پالیسی کا رشتہ انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی سے گویا کٹ چکا ہے اور کم از کم زندگی کے اس نہایت اہم شعبہ میں ہم دنیا کی خدا فراموش اور مادہ پرست قوموں کے پورے پورے پیرو ہو گئے ہیں۔ انہی کی طرح سوچتے ہیں اور انہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں ——— اگر اس صاف گوئی سے آپ کے دل پر چوٹ لگے یا اس حقیقت میں آپ کو کوئی شک شبہ ہو تو للہ تھوڑی دیر کے لیے دل و دماغ کو ماحول کے اثرات اور جذبات سے صاف

کر کے ہماری مندرجہ ذیل گزارشات پر غور کیجیے۔

ساری دنیا کی خدا ناآشنا قوموں اور نبوت کی روشنی سے محروم تمام طبقوں کا طریقہ یہ ہے کہ ان پر جو حالات آتے ہیں اور دنیا میں جو انقلابات برپا ہوتے رہتے ہیں وہ ان کا کوئی خاص تعلق اللہ کے ارادہ اور مشیت سے نہیں سمجھتے اور اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جو خاص قوانین کارفرما ہیں (مثلاً قانونِ تکوین، قانونِ ابتلا، قانونِ مکافات وغیرہ وغیرہ) وہ چونکہ ان کو بالکل نہیں جانتے اور اس عالم کے تمام چھوٹے بڑے واقعات کو وہ سلسلۂ اسبابِ ظاہری کا نتیجہ سمجھتے ہیں اس لیے صرف ظاہری تدبیروں اور مادی کوششوں ہی سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں ——— مثلاً ان میں سے کسی قوم پر کوئی دوسری طاقت اگر حملہ کر دے اور اس کو شکست دے کے اس کے ملک پر قبضہ کر لے تو اس کے زعماء اور مفکرین اس سانحہ پر صرف اس طرح سے غور کریں گے کہ ہمارے دشمن کی فوجیں تعداد میں ہم سے زیادہ اور زیادہ منظم اور زیادہ تربیت یافتہ تھیں، ان کے پاس سامانِ جنگ ہم سے زیادہ اور ہم سے بہتر تھا، بحری، بری اور ہوائی ذرائع رسل و رسائل میں ان کو برتری اور فوقیت حاصل تھی، میدانِ جنگ، جغرافیائی حیثیت سے دشمن کے لیے سازگار اور ہمارے لیے ناسازگار تھا وغیرہ وغیرہ۔

الغرض دنیا کی تمام خدا ناشناس قومیں اپنی مغلوبیت اور شکست کے اسباب و وجوہ پر صرف اسی طرح سے غور کرتی ہیں اور اس کے لیے ان کی جد و جہد صرف ظاہری تدبیروں، اسباب و وسائل کی تیاریوں اور مادی کوششوں ہی میں منحصر رہتی ہے ——— اور کون باخبر اور حقیقت شناس اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اس وقت ہم مسلمانوں کی قومی پالیسی بھی معمولاً بالکل یہی ہے۔ یہی ہمارے قائدین کا طرزِ فکر ہے اور یہی طریقِ عمل ہے اور ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا بتلایا ہوا طریقہ اس سے بالکل اور بنیادی طور پر مختلف ہے۔

ان کے فکر و نظر کا اولی اور اساسی نقطہ یہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اور کسی فرد یا قوم پر جو اچھے بُرے حالات آتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ سلسلہ اسباب ہی کے راستے سے آتے ہیں لیکن درحقیقت وہ سب ایک علیم و خبیر اور حکیم و بصیر قادرِ مطلق ہستی کے

حکم سے ہوتے ہیں۔ لہٰذا دنیا کے ہر واقعہ کے متعلق ہمیں اسی یقین و اذعان کی بنیاد پر سوچنا اور اسی کے مطابق طریق کار اختیار کرنا چاہیے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اس کو باقی رکھنا یا ختم کر دینا یا بدل دینا صرف اسی کے دست قدرت میں ہے اور وہ اگر چاہے تو ظاہری اسباب و وسائل کی نامساعدت کے باوجود سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ اسباب و وسائل کی کمی اور کمزوری کی تلافی اپنی غیبی مدد سے کر کے بہتوں کے مقابلہ میں تھوڑوں کو، زور آوروں کے مقابلہ میں کمزوروں کو، اسباب و سائل میں برتری رکھنے والوں کے مقابلہ میں بے وسیلوں اور ساز و سامان سے تہیدستوں کو اپنی خاص مدد سے کامیاب کر سکتا ہے اور اس بارہ میں اس کی خاص سنت اور خاص قانون ہے۔

اور انبیاء علیہم السلام کی سچائی اور رہنمائی پر ایمان و یقین رکھنے والوں اور ان کے طریقہ پر کام کرنے والوں نے بارہا اسی دنیا میں اللہ تعالیٰ کے اس خاص "قانون فطرت" کا تجربہ بھی کیا ہے ——— قرآن مجید میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے زور آور اور سرکش مخالفوں اور فرعون و نمرود جیسے طاقتور حکمرانوں کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ درحقیقت اسی سنت اللہ کی مثالیں ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی اس سنت اور نصرت کی کارفرمائی کے لیے کچھ اصول اور شرائط ہیں، جن کا تعلق عقائد و خیالات، اعمال و اخلاق، سیرت و کردار غرض انسان کی پوری زندگی سے ہے اور جس کا ایک مختصر اور جامع عنوان "ایمان والی زندگی" ہے تو اگر کوئی قوم اور امت اجتماعی طور پر ان اصول پر کاربند ہو جائے اور انھیں اصولوں کے ماتحت جد و جہد کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ یہ اختصاصی معاملہ کرتا ہے کہ تعداد میں کمی اور اسباب و وسائل میں کمزوری کے باوجود اپنی غیبی مدد سے اس کو کامیاب اور فتحمند کر کے اس دنیا میں بھی عزت و سربلندی کا مقام عطا فرما دیتا ہے۔

لیکن پھر اس کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ اگر یہ قوم کسی وقت اس راہ سے منحرف ہو جائے اور اس کا طرز زندگی بدل جائے تو پھر اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی

بدل جاتا ہے۔ اول اول تو اس کو متنبہ کرنے اور چونکانے کے لیے اس پر مصیبتیں بھیجی جاتی ہیں، دکھوں اور تکلیفوں میں مبتلا کیا جاتا ہے، لیکن اگر وہ ان انتباہی کارروائیوں سے بھی کوئی سبق نہ لے اور اپنے حال کو درست نہ کرے تو پھر اس کے لیے دنیا میں مستقل ذلت و پستی اور تباہ حالی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے (یہودیوں کے متعلق قرآن مجید نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اسی سنت اللہ کی مثال ہے)

بہر حال دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور قوموں کے اچھے بُرے حالات، بالخصوص کتاب و پیغمبر سے وابستگی رکھنے والی امتوں کے عروج و زوال کے متعلق یہ ہے انبیاء علیہم السلام کے طرز فکر اور طریق کار کا اوّلین اور اساسی نقطہ ______ بےشک وہ ترک اسباب اور ترک تدابیر کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ حدود اللہ کے اندر تمام ممکن اسباب و تدابیر کے استعمال کا اور استطاعت کی آخری حد تک جد و جہد کا سبق دیتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کو ان اسباب سے بالاتر اور اس کے ارادہ اور مشیت کو اصل کارفرما یقین کرتے ہیں اور اس لیے اس کی رضا جوئی اور اس کی خاص مدد کے استحقاق کو سب سے بڑی اور بنیادی تدبیر اور اصل فیصلہ کن کوشش سمجھتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے بتلائے ہوئے اس طرز فکر و طریق کار کو اور زیادہ مفصل اور واضح طور پر سمجھنے کے لیے قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات پر غور کیجیے:۔

(۱) قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (آل عمران ع ۳)	کہو، اے اللہ ملک و بادشاہت کے حقیقی مالک! تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے ملک لے، جسے چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے، تیرے ہی قبضہ میں ہے ہر بھلائی، تو بےشک ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے

---

(۲) اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ	اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب

لَکُمْ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْۢ بَعْدِہٖ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

(آل عمران ع ۱۷)

نہ ہو سکے گا اور اگر وہ تمہاری مدد نہ کرے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے، اور اللہ ہی پر اعتماد اور توکل کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔

---

(۳) مَا یَفْتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَۃٍ فَلَا مُمْسِکَ لَہَا وَمَا یُمْسِکْ فَلَا مُرْسِلَ لَہٗ مِنْۢ بَعْدِہٖ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝

(فاطر ع ۱)

اللہ جس رحمت کا دروازہ لوگوں کے لیے کھولے تو پھر کوئی اس کو روکنے والا نہیں، اور وہ جس نعمت کو روک لے تو پھر کوئی اس کو کھینچنے والا نہیں اور وہ بڑے زور والا اور حکمت والا ہے۔

---

(۴) اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ۝

(یٰسٓ ع ۵)

اس کا معاملہ تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو کرنا چاہتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا، بس وہ ہو جاتی ہے پس پاک ہے وہ ذات جس کے قبضہ میں ہر چیز کی بادشاہی اور فرماں روائی ہے اور تم سب (مرنے کے بعد) اسی کی طرف لوٹو گے۔

---

(۵) وَکَمْ مِّنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃًۢ بِاِذْنِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (بقرہ ع ۳۳)

اور کتنی ہی چھوٹی جماعتیں غالب آئی ہیں بڑی جماعتوں پر، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ان آیات میں بتلایا گیا ہے کہ کسی فریق کو حکومت دے کر بالاتر کر دینا اور کسی سے حکومت چھین کے بالاتری کے مقام سے اس کو گرا دینا، کسی کو عزت اور

برتری دینا اور کسی کو ذلیل اور پست کر دینا، سب اللہ ہی کے حکم اور ارادہ سے ہوتا ہے اور ہر بھلائی اسی کے اختیار میں ہے اور اس کو سب کچھ کرنے کی قدرت حاصل ہے آج اس نے جس کو اونچا کیا ہے وہ کل اس کو نیچا بھی کر سکتا ہے، اور جس کو آج اس نے کچھ دیا ہے وہ اس دینے کے بعد چھین لینے اور چھین لینے کے بعد پھر عطا فرما دینے پر بھی قدرت رکھتا ہے —— (۲) اور اگر وہ تمہاری مدد کرنا چاہے تو پھر دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت تمہاری کامیابی کو نہیں روک سکتی —— (۳) وہ اگر کسی کو اپنے انعام و رحمت سے نوازنا چاہے تو کسی کی ہستی نہیں جو اس میں حائل ہو سکے —— (۴) وہ تمہارے سارے اسباب و وسائل سے بے نیاز ہے۔ اس کی مشیت کا ایک ادنیٰ اشارہ اور بس اس کا ارادہ ہی سب کچھ کر دے سکتا ہے۔ سب کچھ اس کے اختیار میں ہے —— (۵) بارہا اس دنیا میں ایسا ہوا ہے کہ اس کے حکم و ارادہ سے اور اس کی غیبی مدد سے بہت تھوڑے سے آدمیوں نے بہت بڑی بڑی فوجوں کو شکست دے دی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس دنیا میں اس کے ارادہ اور مشیت کی کارفرمائی، اور کسی کو حکومت دینے اور کسی سے حکومت چھین لینے اور اپنی مدد سے جس کو چاہے اس کو غالب کر دینے کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی یہ شان بیان فرمانے کے ساتھ ساتھ قرآن کریم یہ بھی صاف صاف بتلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ خاص غیبی مدد کیوں کر حاصل ہوتی ہے اور اس کی خصوصی عنایات اور فضل و رحمت اور تائید و نصرت کے استحقاق کے کیا اصول اور کیا شرائط ہیں۔

مندرجہ ذیل آیات پر غور کیجیے:۔

(۱) وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

اور (اپنی کمزوری اسباب و وسائل کی کمی کے خیال سے) ہمت نہ ہارو اور (اب تک تم پر جو گزر چکی اس کا) غم نہ کرو اور تم ہی بالاتر

(آل عمران ع ۱۴) ہو گے اگر تم ہو ایمان والے[1]

---

(۲) وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (الروم ع ۵)

اور حق ہے ہم پر مدد ایمان والوں کی۔

---

(۳) إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ ۝ (الحج ع ۵)

یقیناً اللہ تعالیٰ دفاع کرے گا اپنے ایمان والے بندوں کی طرف سے (یعنی ان کی حمایت کرے گا دشمنوں کے مقابلہ میں) اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں اور نہ ماننے والوں کو نہیں چاہتا۔

---

(۴) وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ (الحج ع ۶)

اور یقیناً اللہ تعالیٰ مددگار ہوگا اُن بندوں کا جو اُس کے دین کی مدد کریں بیشک اللہ تعالیٰ قوت اور غلبہ والا ہے۔

---

[1] واضح رہے کہ قرآن و سنت کی خاص اصطلاح میں "مومنین" سے مراد اللہ کے وہ خاص بندے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی لاشریک الوہیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لائیں اور اس ایمان کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزاریں ــــ لیکن جو لوگ اپنے کو مسلمان کہیں اور اپنی زندگیوں کو اللہ و رسول کے احکام کے تابع نہ بنائیں (جیساکہ آج کل اکثر مسلمانوں کا حال ہے)، تو قرآن کی وسیع اصطلاح میں ایسوں کا نام "منافق" ہے۔ پس موجودہ مسلمان قوم کو "مومنین" کا مصداق سمجھ کر اس جیسی آیات کے وعدہ کا مستحق سمجھنا محاورات قرآن سے ناواقفی ہے۔ موجودہ مسلمان قوم تو اپنی اکثریت کے اعتبار سے ان آیات قہر کی مصداق ہے جن میں دین سے بے اعتنائی برتنے والوں اور خدا اور رسول کی نافرمانی کرنے والوں کو دنیا و آخرت میں ذلت و خواری کی سزا دینے کا اعلان فرمایا گیا ہے۔ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

(۵) وَاَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيرُ ۝ (الحج ع ۱۰)

پس قائم کرو نماز اور ادا کرتے رہو زکوٰۃ اور مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ اللہ سے وہ تمہارا کارساز ہے پس بڑا اچھا کارساز اور بڑا اچھا مددگار ہے

---

(۶) وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (المائدہ ع ۳)

اور اللہ نے فرمایا ہے میں تمہارے ساتھ ہوں (یعنی میرا فضل اور میری مدد تمہارے ساتھ ہے) اگر تم قائم کرتے رہے نماز اور ادا کرتے رہے زکوٰۃ اور ایمان لائے میرے رسولوں پر اور ان کی تعظیم و توقیر کرتے رہے اور اپنا مال و دولت اللہ کے کاموں اور دین کی ضرورتوں میں خرچ کرتے رہے۔

---

(۷) وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ (النور ع ۷)

اور جو اطاعت کریں اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اور ڈریں اللہ سے اور بچیں اس کی نافرمانی سے تو وہی کامیاب ہوں گے۔

(پھر دو آیتوں میں اس مضمون کو اور زیادہ مؤکد فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے)

(۸) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ

اللہ کا وعدہ ہے ان سے جو ایمان لاویں تم میں سے اور نیک اعمال کریں، ان کو ضرور زمین میں حکومت دیگا جیسا کہ ان سے پہلوں کو حکومت بخشی تھی اور ان کے لیے ان کے اس دین (اسلام)

الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا
(النور ع ۷)

کو قوت دے گا جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ان کے خوف و خطر کو امن و اطمینان سے بدل دے گا۔

---

(۹) اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝
(یونس ع ۷)

جو لوگ ایمان لاویں اور تقویٰ اختیار کریں ان کے لیے (اچھی انعام والی زندگی کی) بشارت ہے دنیا میں اور آخرت میں، اللہ کی باتیں یقیناً پوری ہونے والی اور اٹل ہیں (دنیا اور آخرت میں یہ انعام والی زندگی ملنا)

---

(۱۰) لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ (النحل ع ۴)

اور نیکوکاروں کے لیے اس دنیا میں بھی بہتری ہے اور دار آخرت تو ان کے لیے بہت ہی اچھا ہے۔

---

(۱۱) مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً (النحل ع ۱۳)

جو عمل صالح کریں مرد یا عورت اور وہ ایمان والے ہوں تو ہم اُن کو اچھی زندگی بخشیں گے۔

---

(۱۲) وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ۝
(بقرہ ع ۲۴)

اور اللہ سے ڈرو (اور اس کی نافرمانیوں سے بچتے رہو) یقیناً اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

---

(۱۳) إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ هُمْ مُّحْسِنُونَ (النحل ع ۱۶)

اللہ تعالیٰ تقویٰ والوں اور نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔

---

(۱۴) وَمَن يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۚ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ○ (الطلاق ع ۱)

اور جو اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی نہ کریں وہ ان کے واسطے نکالے گا کوئی راہ اور دیگا ان کو اپنی نعمتیں وہاں سے جہاں سے انھیں گمان بھی نہ ہوگا اور جو اعتماد کریں اللہ پر تو اللہ ان کو کافی ہے یقیناً اللہ جس طرح چاہے اپنا کام پورا کرنے والا ہے اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے

---

(۱۵) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (بقرہ ع ۱۸)

اے ایمان والو صبر و ثبات اور نماز سے قوت پکڑو یقیناً اللہ صبر و ثبات والوں کے ساتھ ہے۔

---

(۱۶) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○ (آل عمران آخری آیت)

اے ایمان والو مضبوطی سے حق پر اور راہ حق میں جمے رہو اور جماتے رہو اور گھات میں لگے رہو اور اللہ سے ڈرتے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچتے رہو تاکہ تم فلاح یاب ہو جاؤ۔

---

(۱۷) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ

بیشک وہی لوگ جو ایمان والے ہیں

هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أُولَئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَةَ اللهِ (بقرہ ع ۲۷)

اور جنھوں نے ہجرت کی (یعنی دین کی خاطر اپنے گھر اور اپنے چین و آرام کو چھوڑا) اور اللہ کے راستہ میں جدو جہد کی وہی اللہ کی خاص رحمت کی امید کریں۔

اور سورۂ صف میں اللہ و رسول پر صحیح طریقہ سے ایمان لانے والوں اور راہ خدا میں جان و مال سے کوشش کرنے والوں کو جنت عطا کرنے کا وعدہ دینے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے:-

(۱۸) وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ (الصف ع ۲)

اور (اور آخرت کی اس جنت کے علاوہ اور اس سے پہلے اسی دنیا میں) ایک دوسری نعمت بھی تم کو عطا ہوگی جس کو تم بہت چاہتے ہو یعنی اللہ کی خاص مدد اور (اس کے نتیجہ میں ملنے والی) قریبی فتح اور اے رسول آپ ایمان لانے والوں کو اس کی خوشخبری سنا دیجیے۔

---

(۱۹) وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُطِيعُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللهُ إِنَّ اللهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (التوبہ ع ۹)

اور ایمان والے اور ایمان والیاں باہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں (ان کے اوصاف یہ ہیں) حکم کرتے ہیں بھلائی کا اور روکتے ہیں بُرائی سے اور قائم کرتے ہیں نماز اور اطاعت کرتے ہیں اللہ و رسول کی، یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ عن قریب ہی اپنی خاص رحمت سے نوازے گا۔ بیشک اللہ بڑا زور والا اور حکمت والا ہے۔

---

(۲۰) وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝
(المائدہ ع ۸)

اور جو ساتھ پکڑ لیں اللہ کا اور اللہ کے رسول کا اور ایمان والوں کا تو بس اللہ کی جماعت ہی غالب آنے والی ہے۔

---

(۲۱) وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝
(الصّافات ع ۵)

اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب رہنے والا ہے۔

---

(۲۲) وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ
(اعراف ع ۱۲)

اور اگر بستیوں والے ایمان اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

---

(۲۳) وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى
(ھود ع ۱)

اور میں تمہیں پیغام دیتا ہوں کہ اپنے گناہ معاف کراؤ اپنے رب سے، پھر رجوع ہو جاؤ اس کی طرف وہ تم کو خوش عیشی دے گا ایک مقررہ وقت تک۔

---

(۲۴) وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ۝ (ھود ع ۵)

(اور حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم والوں سے کہا) اے میری قوم اپنے پروردگار سے اپنے گناہ معاف کراؤ پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ تم پر خوب بارش برسا دے گا جس سے

تمہاری بہت سی تکلیفیں دور اور بہت سی مشکلیں حل ہوں گی اور پیداوار میں
زیادتی ہوگی، اور اپنی خاص مدد سے تمہاری قوت میں اضافہ کردے گا
اور دیکھو اس راہ سے نہ پھرو مجرم بن کر۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قوم اللہ کے فضل و انعام اور اس کی خاص رحمت و نصرت اور اس کی غیبی تائید کی مستحق اس وقت ہوگی جب کہ اس میں یہ اوصاف ہوں ____ حقیقی ایمان، اللہ کے دین کی نصرت و خدمت، اقامت صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ، اللہ کے ساتھ پوری وابستگی، انبیاء علیہم السلام کی ہدایت و رہنمائی پر کامل یقین، ان کی تعظیم و توقیر اور ان کی ہدایت کے مطابق مال و دولت کو راہ خدا میں خرچ کرنے کی عادت، اللہ و رسول کی اطاعت، تقوے والی زندگی، حسن عمل، اللہ کا خوف و خشیت، استعانت بالصبر والصلوٰۃ، دین کے واسطے اپنا گھر اور اپنا چین و آرام اور اپنی مرغوبات و مالوفات کو چھوڑنا، راہ خدا میں جدوجہد کرنا اور جان و مال کی قربانی سے دریغ نہ کرنا، بھلائیوں کو پھیلانے اور برائیوں کو مٹانے کی کوشش کرنا، اللہ و رسول کا ساتھ پکڑ لینا اور بس ان کی طرف اور ان ہی کے زیر فرمان ہو جانا، ان ہی کے سپاہی بن جانا، سابقہ گناہوں سے معافی مانگ کے آئندہ کو اللہ ہی کی طرف رجوع ہو جانا۔

پس جس قوم اور جس امت میں بحیثیت مجموعی یہ اوصاف موجود ہوں اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ آخرت میں جنت اور نہایت راحت و سرور والی زندگی کے علاوہ اس دنیا میں بھی اس قوم کو عزت کی اور چین و امن کی زندگی اور اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں کامیابی اور برتری عطا ہوگی ____ بہرحال اللہ تعالیٰ کی اس خاص غیبی مدد اور خصوصی عنایت و رحمت کے ظہور کے لیے (جو تعداد میں کمی اور اسباب و وسائل کی کمزوری کے باوجود کسی قوم کو غالب اور بالاتر کر دیتی ہے) اس قوم میں ان مذکورۂ بالا اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔

اور ظاہر ہے کہ کسی قوم میں ان اوصاف کے ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں اگر دو چار بھی ان اوصاف کے حامل ہوں تو قوم ان اوصاف کی حامل

سمجھی جائے گی، بلکہ جب تک کسی قوم کی اکثریت میں اور خصوصاً اس کے نمایاں عناصر اور سربرآوردہ افراد میں اور خاص کر جد و جہد کرنے والے طبقہ میں یہ اوصاف عام نہ ہوں اس وقت تک وہ قوم ان اوصاف والی قوم نہیں سمجھی جائے گی اور اس وجہ سے یہ انعامی وعدے اس کے حق میں پورے نہ ہوں گے اور عزت و شوکت اور غلبہ و حکومت والی موعود زندگی اس کو حاصل نہ ہوگی —— ہاں اس کے صالح افراد کو آخرت میں اپنے صلاح و تقوے کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اس دنیا میں بھی ان کو انفرادی طور پر "حیوٰۃ طیبہ" اور نعمت و رحمت والی زندگی کسی شکل میں عطا فرما دے گا۔ چاہے دوسرے بے بصیرت اور حقیقت ناشناس لوگ اپنے حیوانی اور سراسر مادی نقطۂ نظر کی وجہ سے ظاہری فقیری میں ان کے شاہانہ چین و اطمینان اور روحانی و قلبی راحت و سرور کا اندازہ نہ کر سکیں۔

بہر حال فضل و انعام کے طور پر کسی قوم کو مِن حیثُ القوم عزت کا مقام اور امن و چین والی بہتر زندگی اس وقت عطا ہوتی ہے جب کہ اس قوم کی زندگی مذکورۂ بالا ایمانی خصائص کی آئینہ دار ہو۔ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی سنت و عادت یہی بتلائی ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ٥ (اور اللہ کی سنت اور اس کے قانون میں تبدیلی نہیں ہوتی)

نیز قرآن مجید ہی سے اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا دوسرا پہلو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی قوم اللہ و رسول کو ماننے اور ان کے احکام کو تسلیم کر لینے کے بعد نافرمان ہو جائے یا اپنی خواہش اور مرضی سے دین کے کچھ حصوں پر عمل کرے اور کچھ کو پس پشت ڈال دے تو پھر وہ قہر و غضب کی مستحق ہو جاتی ہے اور اس عدول حکمی اور نافرمانی کی سزا میں اللہ تعالیٰ اپنی بہت سی نعمتیں اس سے چھین لیتا ہے اور طرح طرح کی بلاؤں اور مصیبتوں کو اس پر بھیجتا ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے دشمنوں سے اسے ذلیل اور پامال کراتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیتوں پر غور کیجیے۔

(۱) سورہ بقرہ کے دسویں رکوع میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ کا یہ حال بیان

فرمانے کے بعد کہ ہم نے ان کو یہ یہ احکام دیے تھے اور انھوں نے ان احکام کو قبول کر کیا اور مان لیا تھا لیکن اس کے بعد اپنی ذاتی خواہش سے انھوں نے فلاں ایک حکم کی تو تعمیل کی مگر اس کے علاوہ دوسرے تمام احکام کے خلاف عمل کیا ــــ (بہر حال اُن کی یہ روداد عمل بیان کرنے کے بعد) قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے :-

(۱) فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

(بقرہ ع ۱۰)

پس جو لوگ تم میں سے ایسا کریں تو اُن کی جزا سوا اس کے اور کیا ہے کہ ذلت و خواری ہو اس دنیوی زندگانی میں اور قیامت کے دن ڈھکیل دیے جائیں گے نہایت سخت عذاب میں اور اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہے تمھارے

---

(۲) فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

(النور ع ۹)

پس جو لوگ خلاف چلتے ہیں اس کے حکم سے انھیں ڈرنا چاہیے کہ آجائے ان پر کوئی بڑی مصیبت یا پہونچے انھیں سخت دکھ والا عذاب[1]

---

(۳) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (انفال ع ۶)

یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں ہے بدلنے والا کسی نعمت کا جو بخشی ہو اس نے کسی قوم کو جب تک کہ نہ بدلیں وہ اپنے

---

[1] اس کے بعد متصل یہ آیت ہے ۔ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ اس کے خط کشیدہ ٹکڑے سے صاف ظاہر ہے کہ اوپر والی آیت میں جس "فتنہ" اور "عذاب الیم" کا ذکر ہے اس سے مراد دنیوی عذاب اور دنیا میں آنے والے مصائب ہیں ۔

(۴) وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (طٰہٰ ع ۷)

اور جو لوگ روگردانی کریں اور بے رخی برتیں میری نصیحت سے تو ان کے واسطے (اس دنیا میں) زندگی ہے تنگی اور بے چینی اور بے اطمینانی کی اور قیامت کے دن اٹھائیں گے ہم ان کو اندھا۔

---

(۵) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ (سجدہ ع ۲)

اور کون زیادہ ظالم اور جفاکار ہے اس شخص سے جس کو نصیحت اور یاد دہانی کی گئی اس کے رب کی آیات سے مگر اس نے پھر بھی بے رخی برتی ہم مجرموں سے ضرور انتقام لینے والے ہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے اسی دستور اور اس کی اسی سنت کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب کوئی قوم اللہ کے بھیجے ہوئے دین حق کو پالوا لے، اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے احکام تسلیم کرلے، اور اس کے بعد عملاً اس کے خلاف چلے (جو موجودہ مسلمانوں کا عام حال ہے) تو مرنے کے بعد عالم آخرت کے سخت عذاب کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس دنیا میں بھی اس کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ ۱ اس کے دشمنوں سے اس کو ذلیل اور پامال کرایا جاتا ہے اور ۲ طرح طرح کی مصیبتیں اور قسم قسم کے فتنے اس پر مسلط کیے جاتے ہیں اور ۳ اس کو جو نعمتیں پہلے ملی ہوتی ہیں (ایمانی طرز زندگی کے بجائے غیر ایمانی طریقہ زندگی اختیار کرلینے کے جرم میں) وہ نعمتیں اس سے چھین لی جاتی ہیں ———— اور ۴ اللہ کی ہدایت و نصیحت سے روگردانی اور اس کی ناقدری کی پاداش میں زندگی کی راہیں اس پر تنگ کردی جاتی ہیں اور پھر بے چینی اور بے اطمینانی کے حالات اس پر مسلط کردیے جاتے ہیں ———— ۵ اور جب کسی قوم کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اللہ کی باتوں اور اللہ کے احکام کو بار بار یاد دلانے کے باوجود وہ ان سے اثر نہیں لیتی بلکہ بے رخی ہی برتتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی انتقامی شان کا ظہور ہوتا ہے اور پھر اس مجرم قوم کو اس کی خدا فراموشی کا مزہ چکھایا جاتا ہے۔

نیز قرآن مجید ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عتاب ابتداءً اس لیے ہوتا ہے اور یہ مصائب اس واسطے بھیجے جاتے ہیں کہ غافل اور بدمست قوم ہوش میں آئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع و انابت اور توبہ و استغفار کر کے اللہ کو راضی کرنے والی زندگی اختیار کرے۔ سورۂ سجدہ کی جو آیت اوپر نمبر (۵) پر نقل کی گئی ہے اس سے پہلی ہی آیت میں ہے۔

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ (السجدہ ع ۲)	اور ہم آخرت کے بڑے عذاب کے علاوہ اور اس سے پہلے ضرور ان کو چکھائیں گے اس سے کم درجہ کا عذاب (اس دنیا ہی میں) شاید کہ وہ باز آجائیں۔

نیز سورۂ روم کی ایک آیت میں بھی خدا فراموشی اور بدکرداری کی سزا میں آنے والی بلاؤں کا یہی مقصد بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝	پھیل گیا فساد خشکی اور تری میں آدمیوں کی بداعمالیوں سے تاکہ چکھائے انھیں ان کی بعض بداعمالیوں کی سزا شاید وہ باز آجائیں۔

پھر قرآن مجید ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان عتابی کارروائیوں کے ظہور سے بھی قوم میں رجوع و انابت نہ پیدا ہو، اور وہ شیطانی اعمال اور غیر ایمانی طور طریقوں کو چھوڑ کر ایمان و اطاعت والی زندگی اختیار نہ کرے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسی بدنصیب قوم کو بالآخر ہلاک و برباد کر دیا جاتا ہے اور صفحۂ ہستی کو اس کے وجود سے پاک کر دیا جاتا ہے۔ سورۂ انعام میں ایسی ہی غافل اور بدمست رہنے والی بعض قوموں پر بلائیں اور مصیبتیں آنے پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہ ہونے والی امتوں کی بربادی اور تباہی کی داستان اس طرح بیان فرمائی گئی ہے:-

آگے دو صفحوں کی ترتیب غلط ہو گئی ہے ہندسے صحیح ہیں ہندسوں ہی کے مطابق پڑھیے!

میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ دشمنوں کے مقابلہ میں اس کی کوئی مدد نہیں کی جاتی۔ وہ ذلیل ہوتی ہوتی ہے اور ٹھوکریں کھاتی ہے —— پھر اگر ان آفتوں اور ذلتوں سے بھی وہ سبق نہ لے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع و انابت نہ کرے اور خدا فراموشی اور بدمستی ہی کی راہ پر چلتی رہے تو پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ بالکل تباہ و برباد کر دی جاتی ہے اور اس کی جڑ تک کاٹ دی جاتی ہے۔

افسوس! انبیاء علیہم السلام کی ہدایات سے ہماری دوری اور قرآنی تعلیمات سے ہماری بیگانگی اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ نہایت مہیب اور لرزہ خیز قومی واقعات اور بڑے بڑے مصائب و ابتلاآت کے وقت بھی ہم کو انبیاء علیہم السلام کا یہ سبق یاد نہیں آتا اور اپنے قومی مسائل پر کبھی ہم اس روشنی میں غور نہیں کرتے —— اس وقت بھی جب کہ یہ سطریں سپرد قلم کی جا رہی ہیں ہماری قوم کے سامنے نہایت اہم اور دور رس مسائل ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا مشکل نظر آ رہا ہے اور بڑے سخت خطرات کے سُرخ و سیاہ بادل سر پر منڈلاتے نظر آ رہے ہیں (اور بعض صوبوں میں یہ "خطرات" "خونی واقعات" بن کر ظاہر بھی ہو چکے ہیں) اور ہماری قوم کے تمام طبقے ان حالات سے متاثر اور سخت متفکر بھی ہیں لیکن اللہ سے دوری اور دل و دماغ کی گمراہی کا یہ عالم ہے کہ خالص مادہ پرست اور خدا نا آشنا قوموں کی طرح وہ تدبیریں تو سب کی جا رہی ہیں جو ہمارے مادہ پرست دماغوں میں آ رہی ہیں اور جو عصر حاضر کی ملحد قوموں سے ہم نے سیکھی ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام نے ایسے حالات کے لیے جو کچھ بتلایا تھا، ہماری قومی مجلسوں میں کبھی بھولے سے بھی اس کا تذکرہ نہیں آتا گویا کہ ایسے اہم معاملات کے متعلق اللہ اور اُس کے رسول اور اس کی کتاب نے ہم کو کچھ بتلایا ہی نہیں ہے یا (معاذ اللہ) ہماری دانائی اور سیاسی مہارت اتنی ترقی کر چکی ہے کہ اس دائرہ میں ہمیں ان سے رہنمائی حاصل کرنے کی حاجت ہی نہیں رہی۔

موجودہ مسلمان قوم میں اگر کچھ لوگ گمراہی کے اس درجہ تک پہنچ چکے ہوں تو ان سے

فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا
تَضَرَّعُوا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ
وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ
فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ
شَيْءٍ ۝ حَتّٰى إِذَا فَرِحُوْا بِمَا
أُوْتُوْا أَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً
فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ
دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ط
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
(الانعام ع ۵)

پس جب آئی ان پر ہماری طرف سے
سختی تو وہ کیوں نہ گڑگڑائے (اور
کیوں انھوں نے رجوع و انابت کی راہ
اختیار نہ کی) لیکن سخت ہو گئے اُن کے
دل اور شیطان نے ان کی بداعمالیوں کو
ان کی نظروں میں اچھا کر کے دکھلایا پھر
جب وہ (اپنی بدمستی اور طغیانی میں) بھول
گئے ان نصیحتوں کو جو انھیں کی گئی تھیں
تو ایک دفعہ کھول دیے ہم نے اُن پر ہر
چیز کے دروازے یہاں تک کہ جب وہ
خوب اترا لیے ان چیزوں پر جو انھیں
دی گئی تھیں (اور ان کی غفلت و بدمستی حد کو پہونچ گئی) تو ہم نے دفعۃً انھیں اپنی
سخت گرفت میں لے لیا تو وہ بالکل حیرت زدہ اور درماندہ ہو کے رہ گئے پھر اس
عذاب سے اس ظالم قوم کی جڑ کٹ گئی اور وہ نیست و نابود کر دی گئی اور حمد ہے
اللہ رب العالمین کے لیے۔

الغرض قوموں کے عروج و زوال، ان کی خوشحالی و بدحالی اور اُن کی بقا و فنا کے
متعلق یہ ہے انبیاء علیہم السلام کا لایا ہوا خاص فلسفہ اور قرآن مجید کا بتلایا ہوا خاص
راز کہ جب کوئی قوم ایمان و اطاعت والی زندگی اختیار کر لیتی ہے جو اللہ کو محبوب ہے
تو وہ قوم اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت و عنایت کی مستحق ہو جاتی ہے اور پھر حق تعالیٰ اس
دنیا میں بھی اس کی خاص نصرت فرماتے ہیں جس کی وجہ سے اس کو عزت و وقار والی زندگی
حاصل ہوتی ہے اور اس کے دشمن و بدخواہ اس کے مقابلہ میں زیر ہوتے ہیں۔

لیکن پھر یہی امت اگر خدا فراموش ہو جائے اور نافرمانی کی زندگی اختیار کر لے تو پھر اللہ
تعالیٰ کا رویہ بھی اس کے ساتھ بدل جاتا ہے، اس کو طرح طرح کی مصیبتوں اور پریشانیوں

تو بیشک کچھ کہنا نہیں ہے لیکن ہزار غفلتوں کے باوجود ہماری قوم کا سواد اعظم یقیناً اتنا گمراہ اور اللہ ورسول سے اس قدر دور نہیں ہوا ہے۔ اسی نیک گمانی کی بنیاد پر اس سے عرض کرنا ہے کہ اپنے قومی معاملات ومسائل میں آخر ہم کب تک اللہ ورسول کی ہدایت سے غافل وبے پرواہ رہیں گے اور قرآن مجید کی روشنی میں سوچنے سے ہم کب تک گریز کرتے رہیں گے؟ اور کیا بظاہر حالات میں اس کا کوئی بھی امکان ہے کہ اپنے موجودہ مادہ پرستانہ رویہ سے کبھی ہم ان مشکلات پر قابو پاسکیں گے، اور اپنے مسائل کو اپنی منشاء کے مطابق طے کرا لینے میں کامیاب ہو جائیں گے ——— کیا آپ اس بدیہی حقیقت سے بھی ناواقف ہیں کہ صرف ظاہری اسباب وتدابیر اور مادی کوششوں کے ذریعہ کامیابی حاصل کرنے کا امکان جب ہی ہوتا ہے جبکہ مادی اسباب ووسائل میں بالاتری یا کم از کم برابری حاصل ہو اور ظاہر ہے کہ مسلمانان ہند (بالخصوص اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں) کو یہ پوزیشن حاصل نہیں ہے۔ وہ تعداد میں بھی بہت کم ہیں اور دولت وصنعت اور تنظیم و تعلیم وغیرہ کے لحاظ سے بھی نہایت پسماندہ ہیں اس لیے اگر صرف ظاہری تدابیر اور مادی کوششوں ہی پر انحصار رہا (جو آج تک ہماری قومی پالیسی ہے) تو ظاہر ہے کہ انجام دائمی ذلت وناکامی کے سوا کچھ کبھی نہ ہو گا۔ پس ہماری موجودہ مشکلات کا بھی کوئی حل اس کے سوا نہیں ہے کہ ہم دین کو مقصد حیات اور نجات آخرت کو اصل سطح نظر بنا کے قرآن مجید اور اسوۂ نبوی کی رہنمائی میں اپنی قومی پالیسی از سر نو مرتب کریں۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم اور اولین فریضہ ہمارا یہ ہوگا کہ موجودہ مسلمان قوم میں وسیع پیمانہ پر دین وایمان والی زندگی اور وہ اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کریں، جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص عنایت ورحمت اور غیبی تائید ونصرت کا وعدہ ہے ——— اس کے بعد نہ صرف یہ کہ اللہ کی مدد سے موجودہ مصائب وابتلاآت اور مستقبل کے خطرات ہی سے نجات پاسکیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کی سنت ازلیہ اور اس کے کھلے کھلے وعدوں پر ایمان رکھتے ہوئے ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ پھر ہم ہی بالاتر کر دیے جائیں گے اور تاریخ کا ورق ایک دم الٹے گا اور اس کی تکمیل کے لیے اس عالم اسباب میں جن اسباب ووسائل

کی ضرورت ہوگی اللہ تعالیٰ دیکھتے ہی دیکھتے اپنی خاص قدرت سے ان سب کو ہمارے لیے مہیا فرمادے گا جیسا کہ اپنے ایمان والے بندوں کے ساتھ اس دنیا میں بارہا وہ یہ معاملہ کرچکا ہے۔

ہماری اس گذارش سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیے کہ ہمارے نزدیک دین کا اصل مقصد اس قسم کی دنیوی مشکلات ومصائب سے نجات حاصل کرنا اور اس حیات دنیا میں عزت ووقار والی زندگی تک پہنچنا ہے اور ہم انھیں مقاصد کے حصول کے واسطے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع وانابت اور دین کی طرف رجعت کا مشورہ مسلمانوں کو دے رہے ہیں۔ حاشا وکلّا!

ہمارا ایمان ہے کہ دین کا اصل موضوع اور اولین مقصد اپنے خالق ومالک کی رضا جوئی اور مرنے کے بعد عالم آخرت میں نجات وفلاح حاصل کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع وانابت اور اس کی عبادت واطاعت اور قوم میں اصلاحی کوشش اور دینی زندگی پیدا کرنے کی جد وجہد یہ سارے کام خالصاً لوجہ اللہ اور صرف اس لیے اور اسی نیت سے ہونے چاہئیں کہ مرنے کے بعد والی اس ابدی زندگی میں جو کبھی ختم نہ ہوگی اللہ کے عذاب سے ہم بچ سکیں اور اس کی رضا اور مغفرت ورحمت کے مستحق ہوسکیں ——— بہرحال دینی زندگی اور دینی دعوت کا اصل موضوع ومقصد یہی ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے اور بلاشبہ انبیاء علیہم السلام نے نجات آخرت ہی کے مسئلہ کو انسانیت کا سب سے اہم مسئلہ قرار دیا ہے اور اسی کو ان بزرگواروں نے دینی دعوت کی بنیاد بنایا ہے لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی بتلایا ہے کہ جو قوم اللہ کی رضا جوئی اور نجات اخروی کی فکر میں یہ دینی زندگی اختیار کرے گی تو اللہ تعالیٰ اس کو بخشش اور انعام کے طور پر آخرت کے طفیل میں اس دنیا میں بھی "حیات طیبہ" (عزت اور چین والی زندگی) عطا فرمائیں گے اور پردۂ غیب سے اس کی مشکلات حل فرماتے رہیں گے اور اس کے دشمنوں اور بدخواہوں کے مقابلہ میں اس کی نصرت وحمایت ہوتی رہے گی۔

پس ہم دینی قوم کو اس کی موجودہ مشکلات ومصائب سے نجات حاصل کرنے اور

حیات طیبہ اور عزت و وقار کے مقام تک پہنچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع و انابت اور دین کی طرف بازگشت کی جو دعوت دے رہے ہیں اس کی حیثیت صرف یہی ہے اور ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ دینی زندگی اور دینی دعوت میں دینی ہونے کی شان اُسی وقت ہے جب کہ اس سے اصل غرض اللہ کی رضا جوئی اور نجات و فلاح اُخروی ہو، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت و نصرت کا وعدہ بھی اسی شرط کے ساتھ مشروط ہے ورنہ اگر کوئی قوم اور کوئی جماعت دنیوی فلاح و ترقی اور اس حیات دنیا ہی میں عزت و برتری حاصل کرنے کے لیے اسلامی طریقوں کو اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ایسے لوگ سخت مجرم ہیں جو دنیا ہی کو اصل سطح نظر بنائیں یا آخرت کے مقابلہ میں اس کی زیادہ فکر کریں۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ (القیامۃ ع ۱)

پس تم لوگ دنیا کو چاہتے ہو اور آخرت کو چھوڑے ہوئے ہو۔

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى (الاعلیٰ)

بلکہ تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو حالانکہ آخرت اس سے بدرجہا بہتر اور زیادہ باقی رہنے والی ہے۔

پس ہماری دینی دعوت کا پہلا مطالبہ اپنی مسلمان قوم سے یہ ہے کہ دنیا کی خدا ناآشنا عقبیٰ فراموش اور دنیا پرست قوموں کی طرح صرف اس دنیا میں عزت و چین کی زندگی اور علوّ و بالاتری کا مقام حاصل کرنے کو جس طرح اس نے اپنا اصل سطح نظر بنالیا ہے اور تمام تر قومی و سیاسی مساعی کا نصب العین قرار دے لیا ہے اور صرف دنیوی مفادات پر دوسروں سے لڑنے جھگڑنے کی جو پالیسی اُس نے اختیار کر رکھی ہے وہ اس کی شانِ ایمان و اسلام کے قطعاً منافی ہے لہٰذا جلد سے جلد وہ اس سے دستبردار ہو جائے اور خالص دنیا پرستی کے اس محاذ سے ہٹ کر انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تعلیم کے مطابق رضاء الٰہی اور فلاح اُخروی کو اپنا اصل مقصود و نصب العین بنائے اور اس کے حصول کے لیے اللہ کی عبدیت اور ایمان و اطاعت والی زندگی اختیار کرے اور

اسی زندگی کی داعی اور "پیام بر" بن کر کل انسانیت کی ہمدردی و خیر خواہی کے صادق جذبہ کے ساتھ وہ اقوام عالم کے سامنے آئے اور پھر دیکھے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کیسی مدد کرتا ہے ـــــ اور جب تک، یہ نہیں ہوتا اور موجودہ مسلمان قوم اپنی زندگی اور اپنی پالیسی میں یہ بنیادی تبدیلی نہیں کرتی تو پھر بہار اور گڈھ مکتیشر وغیرہ میں جو کچھ ہو چکا ہے اگر اس سے دس گنا بھی اور ہو جائے اور ہر ہر صوبہ میں ہو تو پھر اللہ کو ہماری کوئی پروا نہیں۔ اس کی ذات اس سے پاک اور بالاتر ہے کہ خالص دنیاوی اور مادی جھگڑوں میں ہماری مدد اور حمایت کرے ـــــ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

لہٰ جس وقت یہ مضمون لکھا گیا تھا اس سے کچھ ہی پہلے بہار کے بعض علاقوں میں اور یوپی میں گڈھ مکتیشر (ضلع میرٹھ) میں مسلمانوں کے قتل عام کے واقعات ہو چکے تھے، جس سے قدرتی طور پر ہندستان کے باشعور مسلمان بہت متأثر تھے۔

دعوتی جدوجہد کے کچھ اہم اصول

[دین کی خدمت و دعوت کا کام جتنا عظیم اور مبارک کام ہے، اتنا ہی نازک اور مشق طلب بھی ہے، چنانچہ اس کی شدید ضرورت ہے کہ اس میں قربانی اور عملی جدوجہد کی مقدار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اس کے اصول و آداب سیکھنے اور اس کی بصیرت حاصل کرنے کی طالبانہ کوشش میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

ذیل میں ایک داعی الی اللہ کا مکتوب پیش کیا جا رہا ہے۔ جو اپنے اختصار کے باوجود انتہائی مفید اور ضروری امور پر مشتمل ہے۔ خدا کرے کہ اس سے کما حقہ فائدہ اٹھایا جائے۔ ناظرین کرام سے اور خصوصاً دینی جدوجہد میں مصروف عمل احباب سے گذارش ہے کہ اس کو بار بار پڑھا جائے، اور اس میں بیان کردہ اصولوں پر خوب غور و فکر کیا جائے۔ اور پھر اس کی اپنائی کوشش کی جاتی رہے کہ یہ اصول مستقل طور پر ہمارے مزاج کا جزو بن جائیں۔

—— "ہمت مرداں مدد خدا" —— مدیر]

محترمی و معظمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ،

یہ عمل عظیم (دعوۃ و تبلیغ) بہت نازک اصولوں پر چلتا ہے، اس میں نفس کی اصلاح اُسی وقت ہے جب ان اصولوں کا لحاظ رکھا جائے۔ ایمانی صفات بھی اپنے اندر ان اصولوں پر کام کرنے ہی سے جگہ پکڑتی ہیں۔ اگر ان کا لحاظ نہ رکھا جائے تو یہ چھ نمبر محض بیان کرنے سے فائدہ نہ ہوگا۔ وہ اصول حسب ذیل ہیں:۔

(۱) تواضع اختیار کرنا اپنے کلام میں۔ اُٹھنے بیٹھنے میں، کھانے پینے میں، معاملات

میں اور معاشرت میں غرضیکہ ہر چیز میں تواضع ظاہر ہو رہی ہو۔ تقریر اور بیان میں تواضع زیادہ ضروری ہے۔ اپنے کو بڑا اور دوسروں کو چھوٹا سمجھ کر بات نہ کہے بلکہ اپنے کو چھوٹا بنا کر بات کہے، البتہ چونکہ بات بڑے کی یعنی اللہ تعالےٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کہہ رہا ہے اس لیے بات قوت سے اور عظمت سے کہے، بات میں ہلکا پن نہ ہو بلکہ بڑے کی بات بڑی بنا کر کہے۔ اس کی مشق کرنا گو مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ بات کہنے میں ملامت کا پہلو نہ ہو اور کسی پر اعتراض یا تنقید یا تنقیص لازم نہ آئے۔

اس تواضع میں سے یہ بھی ہے کہ اگر کوئی دوسرا ہمارے اوپر اعتراض کرے تو تحمل اور بردباری سے برداشت کرے خفگی اور ناراضی ظاہر نہ کرے۔ یہ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے سردار سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت ہے۔ اس میں بڑی ترقی دعوت کا کام کرنے والے کے لیے ہے۔ اور اگر کوئی ہم میں کسی اصول یا صفت کی کمی بتلائے مثلاً علم یا ذکر اللہ یا عبادت یا اخلاق یا اخلاص یا جذبۂ قربانی میں کمی بتلائے تو اس کا اقرار تقصیر ضروری ہے کہ بے شک ہم میں یہ چیز پُوری نہیں ہم مقصر ہیں۔ اور اس ناصح کا ممنون منت ہو کہ اُس نے توجہ دلائی اور حق تعالےٰ سے دعا مانگے کہ اللہ تعالےٰ ان صفات میں زیادتی کرے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ "میرا دوست وہ ہے جو میری غلطی پر مجھ کو متنبہ کرتا رہے"۔ اس میں نفس سنورتا ہے۔ اور مخالف سے بھی حق کے قبول کرنے کی توفیق پیدا ہوتی ہے۔ آج مخالف سے حق بات سُننا بھی دشوار ہو گیا ماننا تو ناممکن سا ہونے لگا۔

اس میں شک نہیں کہ علم کی حقیقت حال کے حکم کو پہچاننا اور اُس پر عمل کرنا ہے جو قُربِ خداوندی اور معرفتِ الٰہی کا سبب ہے۔ ذکر الٰہی کی حقیقت قلب کی حضوری اور عظمت و کبریائی سے دب جانا ہے۔ اخلاق کی حقیقت دشمن پر احسان کرنا اور معاف کرنا ہے۔ اخلاص کی حقیقت اپنے نفس کی شرارت سے ہر وقت خوف زدہ ہوتے ہوئے قبولیت عمل پر بے اطمینان ہونا ہے۔ جذبۂ قربانی کی حقیقت اپنی جان سے حکم کو قیمتی جانتے ہوئے اُس کے پُورا کرنے میں جان کو قربان کر دینا ہے۔ اس لیے اگر کوئی توجہ

دلائے تو فوراً اپنی تقصیر سامنے آجائے۔ لیکن شیطان اس اقرار تقصیر سے روکے گا اور بدلہ لینے کا جذبہ پیدا کرے گا۔ اگر اپنی کوتاہی نظر نہ بھی آئے تب بھی اپنے کو کوتاہ اور مقصر سمجھتے رہنا ہے، اسی میں ترقی اور اصلاح ہے۔

(۲) دوسری اصولی چیز دوسروں کو اچھی نظر سے دیکھنا ہے، کلمہ کی نسبت کا لحاظ مسلمانوں میں رکھنا ہے تاکہ اس کلمہ کی عظمت دل میں بڑھتی رہے اور اسلام پر چلنا آسان ہوتا رہے اگر مسلمانوں کی تحقیر دل میں آئے گی تو کلمۂ توحید کی عظمت کم ہوتی چلی جائے گی لیکن گناہ کو جو مسلم کرتا ہے اچھا نہیں سمجھنا بلکہ اس سے پوری نفرت کرنی ہے، یہ داعی کا کمال ہوگا کہ دونوں کو اپنے اپنے محل پر اتارے۔ اسی کو سیکھنا ہے۔

اپنے ساتھیوں کا اکرام بھی خوب کرنا ہے اس سے اخلاق میں حقیقت آئے گی یہ امر بڑی دشوار ہے، ساتھی کی غلطی پر ٹوکنا بڑی حکمت چاہتا ہے جب تک وہ طریقہ اور حکمت نہ آجائے اس وقت تک نہ ٹوکے بلکہ دعا، اور عمومی مذاکروں پر اکتفا کرتا رہے اگر اپنے اندر خرابیاں آتی ہیں وہ اکثر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اکرام نہ کرنے کی وجہ سے آتی ہیں۔

داعی ہمیشہ امتحان اور ابتلاء میں رہتا ہے کبھی اپنوں سے اذیت پہنچتی ہے کبھی غیروں سے۔ اس سے اس کی ترقی ہے اور اصلاح بھی۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ مومن کے لیے ہر دو حال بہتر ہے، اگر سراء (خوشی) کی حالت آتی ہے تو شکر کرتا ہے اور اگر ضراء (پریشانی) کی حالت آتی ہے تو صبر کرتا ہے اس لیے گھبرانا نہ چاہیے۔ ہر حال میں اپنی دعوت میں لگا رہے، البتہ اپنے رب کے غصہ اور ناراضگی سے ڈرتا رہے اور اپنی لغزشوں پر توبہ و استغفار کرتا رہے اور محروم ہو جانے کا خوف لگا رہے تو انشاءاللہ تعالیٰ کامیاب ہے۔

(۳) اس کام کے کرنے کے مواقع پہچاننا بھی ضروری ہے کہ کس موقع پر کس طرح کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کا تاج عطا فرمایا تو شروع کے تین سال آپؐ نے پورے اخفاء کے ساتھ دعوت کا کام انجام دیا۔ اس کے

بعد آیت اظہار کی فاصدع بما تؤمر ...... نازل ہوئی، اس کے بعد آپ نے قریش کو صفا پہاڑ پر جمع فرما کر دعوت دی لیکن جو اسلام میں آگئے اُن کو یہی سکھلایا کہ وہ اخفا کے ساتھ دعوت دیں اور اپنے متعارفین کو دعوت دیں، چنانچہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اکیلے گئے اور اپنے دوستوں کو جا کر دعوت دی، یہ انفرادی دعوت تھی اور جو اسلام میں آئے تھے وہ دار ارقم میں اخفا کے ساتھ مشورہ اور تعلیم کرتے تھے اُن کی تعلیم اخلاق اور توحید کی پائی جاتی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو اخلاقی چیزیں صداقت، امانت، ہمدردی اور تعاون وغیرہ بتلاتے تھے، جس کا پتہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے چلتا ہے جس کو انھوں نے نجاشی بادشاہ کے سامنے کیا جس میں بادشاہ نے پوچھا کہ تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیا تعلیم دیتے ہیں؟ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی انفرادی دعوت ہے انفا کے ساتھ تعلیم و مشورہ ہے جو دار ارقم میں جمع ہو کر چلتا تھا کہ مکہ میں انفرادی دعوت اور اخفا کے ساتھ تبلیغ رہی پھر مدینہ منورہ کی ہجرت کے بعد اجتماعی دعوت کا دور آیا اور اس کے اسباب پیدا ہو گئے البتہ ہجرت سے پہلے مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ میں اخفا کے ساتھ دعوت دیتے تھے اور تعلیم کرتے تھے اور قرآن سکھاتے تھے اور سنت سکھاتے تھے۔ اس سے بہت سے اصول کام کرنے کے معلوم ہو جاتے ہیں کہ کس موقع پر کس طرح کرنا ہے۔ نیز حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ مکرمہ نہیں رہنے دیا بلکہ اپنے قبیلہ کو روانہ کر دیا۔ ایسے ہی عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ جو پہلے چھ سال کے بعد اور دوسرے سات سال کے بعد مدینہ منورہ میں آئے اور اتنی مدت تک صرف ایک کلمہ توحید ہی کی دعوت اپنے قبیلہ میں دیتے رہے۔ اس سے بھی اصول نکلتے ہیں اس لیے دعوت میں موقع شناسی بہت ضروری ہے۔ ایسے ہی مردم شناسی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جن کی عمر نو دس سال کی تھی دعوت دی اور انھوں نے عرض کیا کہ میں اپنے والد سے مشورہ کر لوں تو آپؐ نے اخفا کا حکم دیا کہ والد کو خبر نہ ہو چاہے اسلام لاؤ یا نہ لاؤ۔ اس سے بھی بہت بڑا اصول مستنبط ہوتا ہے

اور مردم شناسی کا سبق ملتا ہے۔ آپ پر ایمان لانے والے شروع میں ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو آپ کے پہلے سے خاص دوست تھے اور زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو آپ کے گود لیے متبنیٰ تھے، اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو آپ کی زوجہ تھیں، اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو آپؐ کی پرورش میں تھے یہ چار ہیں۔ اس سے پتہ چلے گا کہ پہلے دعوت کس کو دی جاتی ہے؟ یعنی اس کو کہ جو اپنے قریب ہو اور اُس کے اسلام قبول کرنے کی زیادہ امید ہو۔

غرض یہ کہ پوری سیرتِ نبویؐ اور سیرت صحابہؓ ہمارے سامنے ہونی چاہیے ورنہ ایسی غلطی ہو جاتی ہے کہ جس کا نبھانا دشوار ہو جاتا ہے اور ایسی مشکل پیش آجاتی ہے کہ جس کا تحمل دشوار ہو جاتا ہے۔

یہ حکمت کا راستہ ہے ورنہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور جو جملہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اطمینان اور تسلی دینے کے لیے غار ثور میں فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا، یہ جملہ ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ اور عمرو ابن عبسہ رضی اللہ عنہ کو کیوں نہیں فرمایا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس وقت بھی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ ایسے موقع سے بہت سے اصول مستنبط ہوتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حرم پاک سے دار ارقم میں لے جا رہے تھے کس حکمت کے ساتھ لے گئے اور یوں فرمایا کہ اگر راستہ میں کوئی شخص مجھے پہچاننے والا ملے گا تو میں پیشاب کے بہانے کہیں بیٹھ جاؤں گا اور تم آگے چلتے رہنا۔ حالانکہ خدا کی مدد ساتھ تھی، اسی لیے اس جذبہ میں آکر کہ میں حق پر ہوں اور میرے ساتھ اللہ کی مدد ہے حکمت فراموش نہیں کرنی چاہیے اور اپنے جذبہ پر اندھا دھند عمل نہیں کرنا چاہیے بلکہ جوش کے ساتھ ہوش ضروری ہے۔ اگر ہوش نہیں تو جوش سے نقصان کا زیادہ اندیشہ ہے۔ آج ہم اللہ تعالیٰ کے غیبی نظام سے ناواقف ہونے کی وجہ سے محض اپنے کو حق پر سمجھ کر جوش میں آکر ایسی بات کہہ جاتے ہیں یا کر جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہوتی ہے اور پھر ایسی مصیبت میں

مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جس کو برداشت نہیں کر سکتے آج دنیا میں بہت سے اسی غلطی میں مبتلا ہیں اور پھر یہ انتظار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری مدد کیوں نہیں آتی جبکہ ہم حق پر ہیں۔ حق بات کے کہنے کے لیے یا حق پر عمل کرنے کے لیے اسلوب بھی حق چاہیے اور موقع بھی صحیح چاہیے۔ اس کا پہچاننا ہی حکمت ہے۔ آج اکثر اوقات اسلوب کی غلطی ہوتی ہے، اور موقع شناسی میں غلطی ہوتی ہے۔ اس دعوت میں اس کی مشق ضروری ہے۔ اور اگر اس کی مشق نہیں ہے تو ہمیں دعوت دینی کبھی نہیں آتی۔ موقع کا پہچاننا بہت ضروری ہے۔

تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تاریخ دعوت جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہے بہت غور و خوض اور فکر عمیق سے پڑھنی چاہیے۔ پھر احادیث نبوی جو اس کی تفسیر ہے اور جس کے بغیر قرآن سمجھنا محال ہے، پوری حاصل کی جائے۔ اور صحابۂ کرامؓ کی سیرت جو اس کا حاشیہ ہے اس کے بغیر بھی سمجھنا دشوار ہوتا ہے، سامنے ہو۔ اور عقل سلیم کو کام میں لایا جائے۔ بغیر عقل سلیم کے ان تینوں چیزوں کے سمجھنے میں آدمی بھٹک جاتا ہے اور گمراہ ہو جاتا ہے۔ اور عقل سلیم صفاتِ ایمان کے حصول پر یعنی تقویٰ، توکل، زہد، قناعت، صبر، شکر، صداقت، امانت، عدل، انصاف، خشیت، انابت اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل محبت سے حاصل ہوتی ہے اور قلب سلیم ہی قرآن اور حدیث کو اور صحابہؓ کی سیرت کو صحیح سمجھتا ہے، ورنہ جہل بسیط سے جہل مرکب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور خلق خدا کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ اس سے دنیا میں سب سے زیادہ فساد پھیلا۔ کچھ سمجھنے میں غلطی ہوئی اور کچھ موقع محل پہچاننے میں۔ فقط والسلام

غیر معتدل الایام علاقوں میں

اوقات نماز و روزہ کا مسئلہ

از مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

سورج، اور اس کے اثرات کے کرۂ ارضی پر نمودار ہونے نہ ہونے کے اعتبار سے دنیا کو یا زمانہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ معتدل الایام ۲۔ غیر معتدل الایام

معتدل اور غیر معتدل کی تعریف

معتدل الایام وہ زمانہ یا علاقے کہلائے جا سکتے ہیں جس کے اندر سال کے تمام دنوں میں تمام نمازوں کے مقررہ اوقات، اوقات متعین کرنے والی علامتوں کے پائے جانے سے آتے جاتے ہوں، ایشیا، افریقہ اور جنوبی یورپ کے اکثر حصے ایسے ہی ہیں جنھیں معتدل الایام علاقے کہا جا سکتا ہے (جو ۴۸ درجہ عرض البلد شمالی کے تحت آتے ہیں، کم و بیش یہی صورت عرض البلد جنوبی کی جانب بھی ہے مگر ترتیب معکوس)

غیر معتدل الایام = وہ زمانہ یا علاقے کہلائے جا سکتے ہیں جس کے اندر سال کے تمام دنوں میں سب نمازوں کے اوقات نہ آتے جاتے ہوں، یعنی وہ مقررہ علامات نہ پائی جاتی ہوں جن کے پائے جانے پر شریعت نے روزوں اور نمازوں کے اوقات کے آنے جانے کا دارو مدار رکھا ہے۔

شمالی یورپ، انگلینڈ وغیرہ ایسے علاقوں میں شامل ہیں جہاں پر سال کے کچھ حصوں

میں سورج غروب ہونے کے بعد جلد ہی نکل آتا ہے۔ (اگرچہ بعض خطے دنیا میں ایسے بھی ہیں کہ جہاں کچھ مہینوں تک سورج بالکل نہیں غروب ہوتا۔ اسی طرح کچھ مہینے بالکل نہیں نکلتا) یعنی شفق غائب ہونے سے پہلے ہی صبح کی روشنی نمودار ہو جاتی ہے، یا بالفاظ دیگر پوری رات آسمان پر ہلکی روشنی پھیلی رہتی ہے اور مکمل تاریکی چھانے نہیں پاتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عشاء کی نماز کا وقت (یا عشاء کے وقت کی مقررہ علامت کا ظہور) نہیں ہونے پاتا کہ صبح ہو جاتی ہے۔ اور اسی کا یہ بھی اثر ہے کہ صبح صادق کی ابتداء کا تعین یعنی سحری کے وقت کی انتہا کا علم مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے عشاء کی نماز اور روزہ کی ابتداء دشوار ہو جاتی ہے۔

غیر معتدل علاقوں کا حکم

ایسے زمانہ اور ایسے علاقوں کے اوقات نماز و روزہ کے بارے میں قدیم زمانے کے فقہاء نے بھی کلام کیا ہے۔ بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جب عشاء کا وقت ہی نہیں آتا تو نماز عشاء بھی فرض نہ ہوگی (کیونکہ وقت سبب ہے اور سبب نہیں پایا گیا) لیکن محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ ایسے علاقہ کے لوگوں پر اس زمانہ میں بھی نماز عشاء فرض ہے (کیونکہ اوقات دراصل علامتیں ہیں، نہ کہ اسباب) اور اسی پر تمام محتاط علماء کا فتویٰ ہے[۱]۔ مگر نماز فرض ہونے کی صورت میں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ایسے علاقے میں غیر معتدل ایام کے اندر کس وقت نماز عشاء پڑھی جائے گی؟ اور کب تک مغرب کا وقت سمجھا جائے گا اور کب تک سحر کا وقت سمجھا جائے؟؟

غیر معتدل علاقوں میں دو صورتیں ممکن ہیں

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے یہ بھی ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ ایسے علاقوں میں عموماً دو صورتیں پیش آئیں گی (اور دونوں کے احکام الگ الگ ہوں گے) ۱) وہ زمانہ جس میں تمام نمازوں کے اوقات اپنی مقررہ علامتوں کے پائے جانے کی بنیاد پر آتے ہوں۔

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے فتح القدیر لابن ہمام ج۱ ص۱۵۶، الطحطاوی شرح الدر ج۱ ص۱۹۱ تا ۲۶۶، رد المحتار ج۱ ص۲۴۲ تا ۲۴۷

(۲) جس میں کچھ نمازوں یا تمام نمازوں کے اوقات نہ پائے جاتے ہوں، یعنی اوقات کا تعین کرنے والی علامات نہ پائی جاتی ہوں۔

پہلی صورت کا حکم پہلی صورت یعنی جس زمانہ میں، جس جگہ سب نمازوں کے تمام اوقات اپنے اپنے مقررہ شرعی معیارات (علامات) کے مطابق پائے جاتے ہوں۔ اس میں تمام نمازوں کا صحیح اوقات پر مقررہ علامات کے لحاظ سے ہی ادا کرنا ضروری ہے۔ خواہ اس میں دو نمازوں یا دو سے زیادہ اوقات کے درمیان فاصلہ کم اور بہت کم رہ جاتا ہو یا زیادہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جس زمانہ میں دن بہت چھوٹا ہو یا بڑا۔ اسی طرح رات بہت چھوٹی ہو یا بڑی۔ لیکن اگر تمام نمازوں کے اوقات مقررہ آرہے ہیں تو نمازوں کا اپنے وقت میں ہی پڑھنا ضروری ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا[۱] (اللہ تعالیٰ نے نماز کو اوقاتِ مقررہ پر مسلمان کے ذمہ لازم کیا ہے)

اس آیت میں وقت مقررہ کے مختصر یا طویل ہونے نہ ہونے جیسی کسی قید کے ساتھ نماز کے حکم کو مقید نہیں کیا گیا۔ اس عموم و اطلاق کا تقاضہ ہے کہ جس نماز کا جو وقت مقرر کیا گیا ہے۔ اگر وہ پایا جارہا ہے، تو وہ وقت خواہ مختصر ہو یا طویل۔ اس نماز کا اسی مقررہ وقت میں۔ عذر شرعی نہ ہو تو پڑھنا ضروری ہوگا۔ نیز اس بات پر پوری امت کا اجماع بھی ہے یہی حکم عام طور پر ان فتاوی اور رسالوں میں بھی مذکور ملتا ہے۔ جن کا اصل مقصد اسی قسم کے "غیر معتدل ایام" مکان و زمان کا حکم بیان کرنا ہے۔[۲]

یہ مسئلہ چونکہ منصوص اور اجماعی ہے اس لیے اس پر مزید کلام کرنے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی اس کا تقاضہ یہ ہوا کہ اگر اتنا وقت بھی مل جاتا ہے کہ

---

[۱] سورۃ النساء آیت ۱۰۳ [۲] مثلاً دیکھیے مولانا محمد یعقوب صاحب کاوی مقیم انگلینڈ کا مفید اور معلومات افزا رسالہ "برطانیہ میں صبح صادق" ص ۱۵، ۱۶

وضو وطہارت کے علاوہ صرف فرض نماز پڑھی جا سکتی ہے تو اتنے ہی وقت میں فرض پڑھ لینا ضروری ہے اور بلا عذر شرعی دیر لگانا کہ نماز کا وقت نکل جائے جائز نہ ہوگا، اور وقت نکل جانے کے بعد پڑھی گئی نماز قضا ہوگی نہ کہ ادا (چاہے نیت ادا نماز کی ہی کی گئی ہو) اور بلا عذر قضا کرنے پر جیسا کہ واضح ہے گناہ ہوگا، اس بات کی تائید علامہ طحطاوی (شارح درمختار) کے کلام سے بھی ہوتی ہے، جو ایک خاص سلسلہ میں اخصول نے نقل کیا ہے۔[ع] (...... وبقیۃ وقت العشاء وان قصر جدًا) بعض اوقات اس میں عملاً کچھ دشواری ہوگی بالخصوص عشاء کا وقت مختصر نصف شب کے قریب آنے کے زمانہ میں۔ مگر صرف ایسی دشواری کی وجہ سے فریضہ نماز کو وقت مقرر سے مؤخر یا مقدم کرنے کا جواز نہ ہوگا۔ چنانچہ وقت سے پہلے پڑھی گئی نماز کا وقت آجانے پر لوٹانا ضروری ہوگا اور وقت گذرنے کے بعد پڑھی گئی نماز قضا ہوگی۔ یہاں ایک ضروری اصل کا بیان کر دینا شاید نامناسب نہ ہوگا، وہ یہ کہ جن مصلحتوں یا اعذار کو شریعت نے علت کا درجہ دیا ہے اور اس علت کی موجودگی میں کوئی رخصت یا حکم دیا ہے تو بس وہ رخصت (سہولت) یا حکم ان ہی مصلحتوں یا اعذار کی موجودگی میں شریعت کی طرف سے ہوگا۔ جب کہ وہ علت پائی جاتی ہو ورنہ نہیں ہوگا، مثلاً شریعت نے مشقت کی بنا پر رخصت کے لیے سفر اور مرض کو علت کا درجہ دیا ہے کہ ایسی حالت (مرض اور سفر) کی موجودگی میں مسافر اور مریض کو تو رمضان المبارک میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہوگی لیکن اس کر

ع صرف فرض نماز کا: وقت ملنے کی صورت میں فرض نماز سے قبل و بعد کی سنتیں اس عذر شرعی کی وجہ سے نہ پڑھنے پر ترک سنت کا مواخذہ نہ ہوگا (انشاء اللہ) کیونکہ جب ممتاز فقہاء کا ایک بڑا گروہ فرض نماز کا وقت مقررہ نہ ملنے کی صورت میں، فرض نماز تک ساقط ہو جانے کا قائل ہے تو سنتوں کا مسئلہ تو اس سے کم اہم ہے۔ نیز اس کی ایک طرح کی تلافی دوسرے اوقات میں کی جا سکتی ہے کہ مثلاً غیر مکروہ اوقات میں نفل نمازیں پڑھی جائیں۔ ع طحطاوی علی الدر صفحہ ۲۶۶ / ۱۷۰

قیاس کرتے ہوئے اسی درجہ کی بلکہ اس سے بھی بڑی کسی دوسری **مشقت** کی موجودگی میں (اگر وہ علت نہیں ہے تو) رمضان المبارک میں روزہ نہ رکھنے کی رخصت حاصل نہ ہوگی۔ مثلاً گرمی کے موسم میں کوئی کسان گرم ملک میں دن بھر ہل چلانے اور زمین جوتنے کی وجہ سے مشقت میں مبتلا چاہے مسافر سے زیادہ ہو جائے لیکن اسے (کسان کو) عام حالات میں رخصتِ افطار حاصل نہ ہوگی۔ کیونکہ اس مشقت کو "علت" کا درجہ شرعاً حاصل نہیں ہے۔ یہ اصول یوں تو کم و بیش ہر قابلِ ذکر اصول فقہ کی کتاب میں ملتا ہے، لیکن سب سے زیادہ با وضاحت اور قابلِ اطمینان پیرایۂ بیان میں احقر کی نظر سے شاہ ولی اللہؒ کی حجۃ اللہ البالغہ اور شیخ عبد الوہاب خلاف مرحوم کی "علم اصول فقہ" میں گذرا[1]۔ واقعہ یہ ہے کہ فقہاء کا قرآن و سنت سے اخذ کردہ یہ اصول بڑا ہی حکیمانہ ہے کہ شریعت کی حفاظت کا ذریعہ ہے ورنہ معمولی عذروں کی بنا پر بھی رخصت حاصل کی جاتی اور شریعت کا ہر حکم پامال ہوتا۔ حاصلِ کلام یہ کہ اگر کسی نماز کا وقت اتنا بھی مل جاتا ہو کہ صرف فرض ادا کیے جاسکیں تو وہ نماز اسی وقت میں پڑھنا ضروری ہوگی۔ چاہے وقت پر ادا کرنے میں پریشانی ہی کیوں نہ ہو۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ رات کو نیند آجائے اور اس کی وجہ سے نماز عشاء وقت پر نہ پڑھی جاسکے (تو از روئے حدیث صحیح، ایسا شخص انشاء اللہ تاخیر نماز پر گنہگار نہ ہوگا)۔ یہ مذکورہ بالا حکم پہلی صورت جبکہ نمازوں کے اوقات پائے جائیں کا ہوا۔

دوسری صورت کا حکم

دوسری صورت یعنی جس زمانہ اور جس علاقہ میں تمام نمازوں یا کچھ نمازوں کے اوقات نہ پائے جائیں۔ یا

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے حجۃ اللہ ج۱ ص۱۲۳ و علم اصول الفقہ ص۶۶-۶۲، موخر الذکر کتاب میں بہت تفصیل اور وضاحت کی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ یہاں نقل کر دینا مناسب ہوگا "قرر الاصولیون ان الاحکام الشرعیۃ تدور وجوداً وعدماً مع عللہا لا حکمہا ...... فمن کان فی رمضان علی سفر ... لہ ان یفطر او جو دعلتہ ...... وان کان فی سفرہ لا یجد مشقۃ ...... ومن کان فی رمضان ... ولا مسافر لا یباح لہ ان یفطر وان کان عاملاً فی منجم او مصنع و یجد من

یوں کہہ لیجیے کہ وہ علامات نہ پائی جائیں جس سے نماز یا نمازوں کے وقت کی شرعاً تعین ہوتی ہے تو اس جگہ اور اس زمانہ میں اس نماز یا نمازوں کا پڑھنا ضروری ہوگا یا نہیں؟ یہی وہ سوال ہے جس کا جواب دینا اس وقت اصلاً مطلوب ہے۔

قدیم زمانہ سے علماء کی بحث جیسا کہ شروع میں ذکر ہوا اس مسئلہ پر کئی صدی سے علماء بحث کرتے چلے آرہے ہیں اور نماز کے واجب ہونے نہ ہونے سے لیکر نماز پڑھنے کے لیے اوقات کی تحدید تک میں بہت اختلافات ملتے ہیں[ا] لیکن محققین او محتاط علماء و فقہاء کا فیصلہ یہی ہے کہ ایسے زمانہ میں بھی سب نمازیں فرض ہوں گی جن میں اوقاتِ نماز نہیں آتے، کیونکہ نماز فرائض میں سب سے زیادہ مؤکد اور اہم فریضہ ہے اور اسے کفر و ایمان کے درمیان فرق کرنے والا امتیازی نشان قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس صورت میں یہ سوال پیدا ہونا قدرتی ہے کہ جب نماز کا وقت مقرر ہی نہیں آتا تو پھر وہ کس وقت پڑھی جائے گی؟

ایک حدیث سے استدلال اس سوال کا جواب اس حدیث نبویؐ میں ہی مل جاتا ہے کہ جس میں علاماتِ قیامت کے تحت دجال کے نکلنے کی خبر دیتے ہوئے کہا گیا ہے (جس کا مفہوم یہ ہے) کہ "اس میں ایک دن سال بھر کی برابر کا ہوگا .... الخ" صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے سوال کیا کہ اس طویل دن میں ایک دن کی نمازیں (فقط پانچ نمازیں) پڑھی جائیں گی یا سال بھر کی؟ (یہ جواب ملنے پر کہ "سال بھر کی نمازیں پڑھی جائیں گی") انھوں نے دوسرا سوال یہ کیا کہ کس طرح پڑھی جائیں گی؟ انھیں اس کا جواب ملا کہ "اندازہ سے" (یہ حدیث بخاری شریف کے علاوہ حدیث کی تمام معتبر کتابوں میں ملتی ہے، صحیح مسلم میں صفحہ ۴۰۱ ج۲ پر ہے)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے زمانہ اور مقامات میں،

[ا] حوالے پہلے ذکر ہو چکے ہیں

وقت کا تعین، اندازہ سے ہو گا

اندازہ کے چند طریقے اندازہ کی چند شکلیں نکلتی یا نکل سکتی ہیں جن میں تین زیادہ معروف ہیں جو ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں :-

(۱) اقرب الایام المعتدلہ کا اندازہ کر کے اوقات نماز مقرر کیے جائیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً جب یہاں معتدل ایام تھے یعنی ہر نماز کا وقت مقرر متعینہ علامات کے ظاہر ہونے کی بنا پر آ رہا تھا اُس زمانہ میں یہاں جس نماز کا جو صحیح وقت تھا اُسی وقت میں[1] ایسے زمانہ میں بھی نمازیں پڑھی جائیں جبکہ نماز یا نمازوں کے اوقاتِ مقررہ نہیں آ رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ سال کے مختلف دنوں میں جب مختلف اوقات رہتے ہوں تو اس آخری دن کو ہی معیار بنایا جائے گا جس میں نماز کا صحیح وقت رہا تھا اور اس کے بعد پھر وہ علامت نہیں پائی گئی جس سے شرعاً وقت کی تعین ہوتی ہے) "حدیثِ دجال" کا بھی یہی تقاضہ ظاہر اور متبادر ہے کیونکہ بے تکلف یہی سمجھ میں آتا ہے کہ جس آخری دن کے بعد وہ طویل دن شروع ہوا اُس ہی کو معیار بنایا جائے (کم سے کم ابتدائی مدت کے لیے) اگر وہ دن معیار نہ بنایا جائیگا تو پھر کسی دن کو بھی ترجیح (معیار تعین کے لیے) نہیں حاصل ہو سکتی[2] (اس کے بغیر ان مقامات کے وقت کا اندازہ سے تعین غیر معتدل دنوں میں مشکل بلکہ ناممکن ہو گا)

مثلاً خط عرض شمالی ۵۴° پر واقع شہروں میں[3] (انگلینڈ میں) ۱۲ مئی وہ آخری دن ہوتا ہے جس میں عشاء کا وقتِ معین (مقررہ علامت کے ظہور کے ساتھ) آتا ہے یعنی اس دن شب میں ۱۱ بجکر ۴ منٹ پر شفق غائب ہوتی ہے اس کے بعد پھر اس

---

[1] اب اس وقت کا اندازہ کرنے کے لیے گھڑی کی مدد سے تعین کرنا آسان ہو گا۔

[3] یہاں اور آئندہ صفحات میں بھی، انگلینڈ وغیرہ کے مختلف حصوں کے اوقات اور تاریخ کے تعین، نیز خطوط (شمالی) کی تحدید وغیرہ کے لیے مولانا محمد یعقوب صاحب کے سلوٰۃ افزا رسالہ ہی کو بنیاد بنایا گیا ہے جس کا حوالہ اس سے پہلے بھی آ چکا ہے۔

[2] حدیث اور اس حدیث کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ ہر مقام پر اُسی جگہ کے وقت کو معیار بنایا جائے دوسری جگہ کے وقت کو نہیں۔ اس بات کی تائید شامی سے بھی ہوتی ہے۔ ایک خاص سیاق میں ہے «ظاهر حديث الدجال يفيد التقدير في خصوص ذلك اليوم» (صـ ۲۴۳ / ۱)

خط پر کافی مدت تک شفق غائب نہیں ہوتی، بلکہ اس کے غائب ہوئے بغیر ہی (مشرقی سورج نکلنے کی سمت میں) ظاہر ہو جاتی ہے۔ تو جس زمانہ میں شفق غائب نہیں ہوتی اس زمانہ میں بھی اس علاقہ میں عشاء کی نماز کے وقت کی آمد ۱۱ بجکر ۴۴ منٹ پر مان لی جائے اور اس تاریخ (۳۱ مئی) میں اس خط پر صبح صادق ۱۱ بجکر ۵۶ منٹ پر نمودار ہوتی ہے تو اُن دنوں میں بھی جبکہ شفق غائب نہیں ہوتی فجر کے وقت کی آمد ۱۱ بجکر ۵۶ منٹ ہی فرض کی جانی چاہیے۔

(۲) اقرب المقامات۔ یعنی اس علاقہ سے قریب تر معتدل مقام کہ جہاں تمام نمازوں کے اوقات متعینہ علامات کے ساتھ آتے ہوں کو معیار بنا کر اوقاتِ نماز کا تعین کیا جائے۔ مثلاً خطِ مذکور (عرض شمالی ۵۴ء) سے قریب تر کسی جگہ ۲۵ مئی کو اگر عشاء کا وقت ⅓ حصہ رات گذرنے کے بعد مثلاً ۱۱ بجے آتا ہو یعنی ۱۱ بجے شفق غائب ہوتی ہو اور مثلاً ۱۰ بجے صبح صادق ⅓ باقی رہنے پر نمودار ہوتی ہو تو غیر معتدل علاقہ و زمانہ میں بھی اس تاریخ کو ۱۱ بجے عشاء کے وقت کی آمد اور ۳ بجے فجر کے وقت کی آمد مان لی جائے (اگر سورج بالکل نہ ڈوبتا ہو)[1] مگر جیسا کہ اوپر ذرا میں گذرا حدیث دجال کا اصل تقاضہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس علاقہ کے غیر معتدل ایام کے بارے میں اوقات کی تعیین اندازہ سے کرنا مطلوب ہے اس علاقہ کے آخری معتدل دن کو معیار بنایا جائے۔ کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا تھا (اقدُروا لہٗ قدرہٗ) (یعنی اس کا اندازہ کر کے نماز پڑھنا) اس کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں سمجھا گیا ہوگا کہ مثلاً حجاز کے لوگ حجاز کے ہی آخری معتدل دن کے وقت کا اندازہ کریں یہ تو کوئی سمجھا ہی نہیں ہوگا (کیونکہ اس بات کے سمجھنے کا قرینہ بلکہ امکان نہیں تھا) کہ مثلاً حجاز کے لوگ ہندستان یا پاکستان جیسے دور دراز مسافت پر واقع کسی ملک کے اوقات کا اندازہ کریں اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام کے وقت کو معیار بنانے کی بظاہر

---

[1] لیکن اگر سورج ڈوبتا ہے تو جتنی دیر ڈوبا رہے اس کے پہلے ⅓ حصہ کے بعد عشاء اور آخری ⅓ باقی رہنے پر فجر کا وقت مانا جائے گا۔ [2] صحیح مسلم ص ۴۰۱/ج ۲

حدیث کی رو سے گنجائش نہیں معلوم ہوتی، لیکن چونکہ یہ قول ایک مجتہد مطلق اور جلیل القدر امام (شافعیؒ) یا ان کے متبعین اولین میں جو فقہاء ہوئے ہیں ان کا ہے، اس لیے اسے اختیار کرنے میں بھی مضائقہ نہیں (اور پھر "اقرب المقامات" کی طرف حدیثِ دجال سے ذہن کا منتقل ہو جانا اتنا بعید بھی نہیں ہے!)

(۳) اندازہ کی اسی مذکورہ بالا شکل کی ہی ایک دوسری تشریح اسے کہنا مناسب ہوگا یا اس سے ملتی جلتی صورت یہ ہے کہ قریب تر معتدل علاقہ میں سورج کے غروب اور شفق کے غائب ہونے کے درمیان جو فاصلہ ہے، مثلاً دو گھنٹہ کا اسی کو معیار بنا کر غیر معتدل علاقہ و زمانہ میں بھی سورج کے غروب سے دو گھنٹہ بعد عشاء کے وقت کی ابتدا مان لی جائے عہ (اگر اس غیر معتدل علاقہ و زمانہ میں سورج غروب ہوتا ہو چاہے تھوڑی دیر کے لیے ہی لیکن اگر اس جگہ بالکل سورج نہیں ڈوبتا تو پھر قریبی علاقہ میں جس وقت سورج غروب ہو یہاں بھی غروب ہونا سمجھا جائے)

(۴) احقر کی ناقص رائے میں اندازہ کی ایک شکل اور بھی ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ غروب کے بعد جب تک روشنی جانب غروب نظر آئے اس وقت تک مغرب (وعشاء) کا وقت مانا جائے (کیونکہ شفق در اصل جانب غروب میں ہی ہوتی ہے) اور جیسے ہی وہ روشنی سورج نکلنے کی جانب ہو جائے اسے فجر کا وقت سمجھا جائے۔ (کیونکہ صبح صادق کی روشنی اسی جانب ہوتی ہے) اندازہ کی یہ شکل اگرچہ کسی اور فقیہ کے کلام یا نظر سے نہیں گذری لیکن اصلی و معیاری علامات سے اقرب ہونے کی بنا پر راقم سطور کے نزدیک یہ شکل بھی قابلِ توجہ بلکہ قابلِ ترجیح ہے (بالخصوص روزہ کی ابتداء

عہ مشہور حنفی فقیہ علامہ طحطاوی نے یہ اعتراف کیا ہے کہ فقہائے حنفیہ کے کلام میں اندازہ کی یہ تشریح نہیں ملتی اس لیے شافعی فقہاء کے کلام کو سامنے رکھ کر اس کی تشریح کی گئی ہے (دیکھیے حاشیہ طحطاوی علی الدر صفحہ ۱۸۶ ج ۱)

عہ اندازہ کی یہ تشریح بھی کم و بیش انہی متعلقہ اہم کتابوں میں اختصار و تفصیل کے فرق سے ملتی ہیں، مثلاً طحطاوی صفحہ ۱۸۶ ج ۱ اور رد المحتار صفحہ ۲۴۳ تا ۲۴۴ ج ۱ نیز فتاویٰ امدادیہ مبوب مطبوعہ کراچی صفحہ ۱۱۳ ج ۱

اور سحری کے اختتام کے لیے) لیکن یہ شکل وہاں پر ہی متصور ہو گی جہاں سورج ڈوبتا ہو، چاہے تھوڑی دیر کے لیے، اس شکل کے اختیار کر لینے کی صورت میں نماز مغرب کے وقت کی انتہا، اور عشاء کی ابتداء کے تعین کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ مگر احقر کے نزدیک اس کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ اگر جانب مشرق (سورج نکلنے کی سمت) روشنی منتقل ہونے سے پہلے ہی مذکورہ بالا تینوں شکلوں میں سے کسی ایک شکل کے مطابق بھی عشاء کے وقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہو تو اسی اندازہ سے عشاء پڑھی جائے۔ اور اگر ان تینوں میں سے کسی بھی شکل کے مطابق اندازہ سے مقرر کردہ وقت عشا کے پہلے ہی روشنی جانب مشرق منتقل ہو جاتی ہو تو پھر اسی وقت میں عشاء کی نماز پڑھی جائے۔ اس طرح یہ زمانہ عشاء و فجر دونوں کا مشترک وقت ہو جائے گا۔ پہلے عشاء کی نماز پڑھی جائے پھر فجر کی۔ اس صورت میں عشاء کی نماز قضا نہیں ادا ہو گی۔ؑ

فیصلہ کن بات خلاصۂ کلام یہ کہ جن علاقوں میں جس زمانہ میں عشاء (یا کسی بھی) نماز کا وقت مقرر نہیں آتا وہاں کے لوگ مذکورہ بالا شکلوں میں سے کسی بھی شکل کے مطابق وقت کا اندازہ کر کے نماز پڑھ لیں ان میں سے جس شکل کو اپنے لیے آسان اور مناسب سمجھیں اختیار کر لیں۔ (انشاء اللہ فریضہ ادا ہو جائے گا)

اندازہ کے نامناسب طریقے بعض علماء نے ہندوستان کے ممتاز فقہاء مثلاً حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے ہندوستان کے بارے میں بیان کردہ اندازوں سے استدلال کرتے ہوئے غیر معتدل الایام زمانہ و علاقہ کے لیے بھی اسی کو معیار بنانے کو بھی درست قرار دیا ہے، مگر راقم کی نظر میں ایسا کرنا صحیح نہیں کیونکہ یہ قیاس مع الفارق ہو گا اور ایسا ہی ہو گا جیسے کوئی سردی کے دنوں پر گرمی کے دنوں کو قیاس کرنے لگے۔

اس کے درست نہ ہونے کا ایک واضح قرینہ یہ ہے کہ حضرت اقدس تھانویؒ نے ہندوستان بلکہ شمالی ہندوستان کے اندر شفق اور صبح صادق کا اندازہ بتاتے ہوئے

ؑ اس کی تائید درمختار وغیرہ کی عبارت سے ہوتی ہے:۔ (ردالمحتار، امداد الفتاویٰ صـ۲۳۳ درمختار ۱۲)

لکھا ہے:۔ طلوع آفتاب کے وقت سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل تک سحری کھا سکتے ہیں اور فقہائے احتیاط کی ہے کہ غروب سے طلوع تک کل وقت جتنا ہے اس کو سات پر تقسیم کریں چھٹا حصہ سحر کھا سکتے ہیں[1]۔ حضرتؒ کے بیان کردہ اس قاعدہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ رات کا ⅐ حصہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بقدر ہوتا ہے (اور بوادر النوادر میں ہے کہ زیادہ سے زیادہ ۱ گھنٹہ، ۳ منٹ) حالانکہ انگلینڈ میں خط عرضی ۵۲° شمالی پر واقع شہروں میں یکم جنوری کو جتنی طویل رات ہوتی ہے اس کا ⅐ حصہ ۲ گھنٹہ ۴۲ منٹ (تقریباً پونے تین گھنٹے) ہوتا ہے یعنی ہندوستان اور انگلینڈ کے اوقات صبح میں تقریباً دو گھنٹے کا تفاوت ہے، ایسے غیر معمولی فرق کے ہوتے ہوئے بھی یہاں کے 'اندازہ' پر مبنی حساب سے وہاں (انگلینڈ) کے اوقات کا گھڑی سے تعیین کرنا سخت غلطی ہوگی۔ کیونکہ یہاں کا لحاظ کرتے ہوئے نماز و روزہ کے اوقات مقرر کر کے نمازیں وہاں پڑھنا اور سحری کھانا بے وقت نماز پڑھنے اور بعد از وقت سحری کھانے کا موجب ہو سکتا ہے۔

غیر معتدل زمانہ و علاقہ میں کیا روزہ رکھا جائے؟

اوپر کی بحث غیر معتدل علاقہ و زمانہ میں صرف نماز سے متعلق تھی۔ لیکن اگر اس زمانہ غیر معتدل الایام میں رمضان المبارک آجائے جیسا کہ ادھر چند سالوں مثلاً ۱۹۶۸ء سے آ رہا ہے تو کیا اس میں روزہ رکھا جائے گا؟ اگر رکھا جائے گا تو کیونکر؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے پہلے یہ امور پیش نظر رکھنا ضروری ہیں۔

۱۔ کیا ایسے زمانہ و علاقہ میں رات کو صبح صادق سے پہلے اتنا وقت ملجاتا ہے کہ اس میں کچھ کھا پی لیا جا سکے؟

۲۔ رات کو اتنا وقت نہیں ملتا کہ کھا پی لیا جا سکے یعنی یا تو رات ہی نہیں ہوتی یا ہوتی ہے تو اتنی مختصر کہ کچھ کھایا پیا نہیں جا سکتا۔

---

[1] امداد الفتاویٰ مبوب ص، جلد دوم مطبوعہ کراچی۔ نیز حضرت تھانویؒ نے ہی بوادر النوادر ص میں تحریر فرمایا ہے کہ صبح صادق اور طلوع آفتاب کے درمیان کم سے کم فاصلہ ۱ گھنٹہ ۲۰ منٹ اور زیادہ سے زیادہ ۱ گھنٹہ ۳۰ منٹ کا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کا اندازہ بعض اور ہندوستانی علمائے بھی لکھا ہے۔

پہلی صورت (رات میں کھانے پینے کا وقت مل جائے) کے بارے میں علامہ طحطاوی نے علمائے شوافع میں سے ابن حجر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر رات میں صرف اتنا کھالینے کا وقت مل جائے جس سے روزہ دار زندہ رہ سکے (مدۃ لیلھم تسع اکل ما یقیم الصائم) تو کھا کر روزہ رکھ لے۔ بلکہ اگر نماز مغرب پڑھنے اور کھانا کھانے میں سے کوئی ایک کام کیا جاسکتا ہو تو کھانا کھالے اور نماز قضا کرے[۱]۔ علامہ موصوف نے اسی کے ساتھ ایک ایسے شخص سے اپنی ملاقات کا بھی ذکر کیا ہے جو ایسے علاقہ میں رہتا تھا جہاں صرف ایک بار رات کو کھانے کا مختصر وقت ملتا تھا، اور وہاں کے لوگ روزہ رکھتے تھے[۲]

رات مختصر بقدر کھانے پینے کے ہو

اس بنیاد پر بعض علماء کی رائے یہی ہے کہ ایسی صورت میں لوگوں پر رمضان ہی کے اندر روزہ رکھنا ضروری ہوگا۔ مگر اس بارے میں سب سے زیادہ محتاط و متوازن اور فقیہانہ فیصلہ حکیم الامت قدس سرہٗ کا معلوم ہوتا ہے، فرماتے ہیں:- "جہاں لیل شرعی ہوتی ہے وہاں جس جگہ نہار کا طول بقدر تحمل صوم ہو (روزہ رکھنا برداشت ہوسکے) اور فطرۃً ان کا تحمل ہم سے زائد ہوگا...... وہاں روزہ رکھیں اور ادا بھی ہو جائے گا۔ اور جہاں بقدر تحمل نہ ہو وہاں اندازہ کرکے عدد پورا کریں اور بعد ادا، اگر ایسے ایام مل جاویں جن کا تحمل ہوسکے تو احتیاطاً قضا بھی کرلیں اور اگر ایسے ایام نہ ملیں تو وہی اندازہ کے روزے کافی ہو جاویں گے[۳]"

رات ہی نہ آئے یا کھایا نہ جاسکے

دوسری صورت (کہ کھانے پینے کے بقدر رات نہ آئے یا بالکل ہی رات نہ آئے) وہاں پر بھی علامہ زرکشیؒ اور ابن العمادؒ جیسے شافعی فقہاء کہتے ہیں کہ "اقرب البلاد" کے اوقات کا اندازہ کرکے روزہ رکھا جائے گا[۴] اور وہ روزہ ادا بھی ہو جائے گا حالانکہ بظاہر دن میں ہی سحری کھائی گئی اور دن میں ہی افطار کیا گیا ہوگا!

---

[۱] طحطاوی ص۲۰۶ ج۱ [۲] ایضاً ص۲۰۶ [۳] بوادر النوادر ص۳۳۹ ج۲ (مکتبہ اشرف العلوم شعبۂ دار الاشاعت دیوبند) [۴] طحطاوی ص۲۰۶ ج۱

"اندازہ" کی تفصیل اوپر (نماز کے ضمن میں) گذر چکی ہے ظاہر ہے کہ یہاں اندازہ کی ان چار شکلوں میں سے صرف پہلی تین پر عمل کیا جا سکے گا۔ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس صورت حال کے بارے میں یہ تحریر فرمایا ہے:-

"جہاں ...... لیل شرعی (رات) نہیں ہوتی رمضان میں روزہ رکھیں کہ شہود شہر پایا گیا (یعنی رمضان شریف موجود ہے جس کی وجہ سے روزہ رکھنا فرض ہوتا ہے) اور چونکہ افطار و سحر نہار شرعی (دن) میں ہوا ہے اس لیے شبہ کی وجہ سے دوسرے زمانہ (معتدل) میں قضا بھی کر لیں۔[۱]"

بتانے کی ضرورت نہیں کہ حضرت رح کا فتویٰ احتیاط پر مبنی ہے اور پہلا مسلک سہولت پر ہم ضعفاء کے مناسب حال پہلا ہی قول ہے (اور اصحاب عزیمت یا جو بھی دوسرے پر عمل کرے گا ازدیاد اجر کا مستحق یقیناً ہوگا۔)

ضروری بات

یہاں یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا بلکہ ایک درجہ میں ضروری معلوم ہو رہا ہے کہ غیر معتدل ایام (علاقہ و زمانہ) کے اندر نماز کے فرض ہونے نہ ہونے کے بارے میں تو فقہاء بالخصوص فقہائے احناف کا اختلاف رہا ہے۔ لیکن رمضان کی آمد کے بعد روزہ کی فرضیت میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ سب کا یہی قول ہے کہ روزہ ایسے علاقہ کے رہنے والوں پر بھی فرض ہو گا (یہ الگ بات ہے کہ کس طرح رکھیں) علامہ شامی فرماتے ہیں: لا یمکن القول ھنا بعدم الوجوب اصلا کالعشاء روزۂ رمضان کے بارے میں تو واجب نہ ہونے کا قول قطعاً ممکن ہی نہیں البتہ علامہ موصوف نے مذکورہ بالا دونوں قول (اندازہ۔ قضا) کے علاوہ ایک قول یہ بھی بطور احتمال ذکر کیا ہے کہ ۲۴ گھنٹے میں صرف اتنا کھانے پینے کی اجازت ہو کہ جس سے زندگی بچ جائے۔ (باقی وقت پورا کا پورا روزہ میں گذارنا ہو گا) لیکن ان میں سے کسی کو انھوں نے ترجیح نہیں دی ہے۔[۲]

---

[۱] بوادر النوادر صفحہ ۲۲۹ بوادر حضرت کی آخری دور کی تحقیقات کے خلاصہ پر مشتمل ہے۔ اس لیے حضرت کے نزدیک اسی قول کو راجح سمجھنا چاہیے۔ ورنہ فتاویٰ امدادیہ ص ۱۲۳ ج ۱ (مبوبہ) میں اس صورت کے بارے میں یہ فتویٰ بھی ملتا ہے: "روزہ ایسے طویل دن میں ادا کرنا فرض نہیں بلکہ معمولی دنوں میں قضا رکھا جائے گا۔"

[۲] رد المحتار صفحہ ۲۴۴ ج ۱

تاریخِ ہند کا تقابلی مُطالعہ

جنابِ عبدالرؤف خاں ایم، اے

اورنگ زیب عالمگیر پر علی الخصوص اور دیگر مسلم فرماں رواؤں پر علی العموم یہ الزامات عائد کئے جاتے ہیں کہ انہیں حصول تخت و تاج کے لئے اپنے آباء کو مقید کرنے سے گریز نہ تھا۔ برادر کُشی سے وہ محترز نہ تھے، غیر مسلم رعایا کے استیصال و استحصال اور اس کے معابد و منادر کے انہدام سے انہیں لذت حاصل ہوتی تھی نیز یہ کہ ان کے یہاں باضابطہ طور پر قانون جانشینی کا فقدان تھا، یہی وجہ تھی کہ ہر شہنشاہ کے فوت ہوتے ہی اس کے اخلاف و احفاد میں سربر آرائے سلطنت ہونے کے لئے باہم خانہ جنگی برپا ہو جایا کرتی تھی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ معترضین مسلم حکمرانوں کے بعض ناروا اقدامات کو جنہیں وہ اپنی اغراض پرستی کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے اٹھایا کرتے تھے اسلام کے سر تھوپتے ہیں، جبکہ حقیقت شناس جانتے ہیں کہ بہت سے فرماں رواؤں کا شمار مذہب کی عملی دنیا میں عوام سے بھی کمتر درجہ میں رہا ہے، دوسرے یہ کہ کوئی بھی مذہب کسی شخص کے ذاتی افعال و اقوال کا خواہ وہ حاکم ہو یا محکوم، جوابدہ نہیں ہو سکتا، البتہ اس کا وہ فعل مذہب کی کسی ہدایت کے مطابق ہو تو ضرور لائق سند ہے، ورنہ اس کے لئے وہ خود ذمہ دار ہے۔

دراصل اس قسم کے بے سروپا الزامات عائد کرنے کے یہ اسباب ہو سکتے ہیں کہ یا تو معترضین کے آباء و اجداد کا اثاثہ تاریخ ابردۂ عدم میں ہے یا پھر وہ اتنے سادہ دل ہیں کہ اپنے ماضی سے واقف نہیں یا اِن بے چاروں کا ماضی تابناک و روشن ہی نہیں کہ اس سے آگاہی حاصل کرنے کی زحمت گوارا کی جائے یا اپنے ہم مذہب آباء کے سیاہ اور داغدار کارناموں سے عمداً اغماض کیا جاتا ہے کیونکہ یہ فطرت ہے کہ انسان کو اپنی آنکھ کا شہتیر دکھائی نہیں دیتا، مگر

وہ دوسرے کی آنکھ کے حقیر تنکے کی نشاندہی کرنے میں پیش پیش ہوتا ہے یا پھر مسلمانوں کی دلآزاری کے لئے منصوبہ بند طریقہ سے ہر سنجیدہ و غیر سنجیدہ اور علمی و غیر علمی اسٹیج سے رکیک و ناروا باتوں) کا اعادہ کرتے رہنا، انھوں نے اپنی عادتِ ثانیہ بنالیا ہے، بہرحال مطعون کرنے کے اسباب جو کچھ بھی ہوں لیکن اگر قدیم تاریخ ہند کا سرسری مطالعہ بھی کریں تو ظاہر ہوگا کہ مذکورۃ الصدر الزامات کا اطلاق عہد قدیم کے سمراٹوں پر بدرجۂ اولیٰ ہوتا ہے۔ آیئے اس عہد کے سمراٹوں کے واقعات کی روشنی میں ایک حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کی کوشش کریں تاکہ ناظرین کو معلوم ہوسکے کہ ہمارے ملک کا وہ عہد ان تمام تر تہمتوں سے کہاں تک مبرّا ہے جس کے افسانوی و اسطوری واقعات پر برادرانِ وطن کے ایک مخصوص ذہنیت کے طبقہ کو بڑا ناز ہے۔

مہاتما بدھ کے معاصر مگدھ نریش سمراٹ اجات شترو (تقریباً ۴۹۱ تا ۴۵۹ ق.م) کی تاریخ کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ اپنے باپ بمبسار (۵۴۴ تا ۴۹۱ ق.م) کو حوالۂ زنداں کیا بلکہ دوران اسیری اسے بھوکا پیاسا رکھ کر شدید اذیتیں دی گئیں تاکہ وہ ایذارسانیوں کی تاب نہ لاکر مرگِ طبعی سے ہم آغوش ہوجائے مگر وہ ایسا سخت جان تھا کہ مر نہ سکا، لہٰذا اُسے قتل کردیا گیا، اس کی بیوہ رانی بھی چند روز بعد اسی سوگ میں انتقال کرگئی، اجات شترو اپنے اس فعل شنیع کے ارتکاب کے بعد مہاتما بدھ کی خدمت میں حاضر ہوا، مہاتما بدھ نے اُسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا "جاؤ، اب پاپ نہ کرنا۔" [1]

اجات شترو کا اپنے قیدی باپ کا بھوکا پیاسا رکھنا اخلاقی لحاظ سے بدترین ملامت کا سزاوار ہے، یہ سچ ہے کہ قیدی بادشاہ زبردست خطرات کا سرچشمہ ہوتا ہے لیکن دوسرانِ اسار اپنے باپ کو اشیائے خورد و نوش تک سے محروم رکھنا ایسا قبیح فعل ہے جس کا کوئی جواز نہیں تاریخ ہند کے بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے باوجود قیدی باپ یا بھائی کو گرسنہ یا تشنہ رکھنے کی شاید ہی کوئی دوسری نظیر فراہم ہوسکے معلوم ہوتا ہے کہ تخت پر قبضہ کرلینے کے بعد اجات شترو نے فرائض پسری یکسر فراموش کردیئے تھے، تاہم اگر معاملہ اسارت تک ہی محدود ہوتا تو بھی کوئی مناسب تاویل کی جاسکتی تھی مگر پدر کشی کے باب میں تاریخ کے محکمۂ عدالت کا

یہ فیصلہ ہوگا کہ وہ اپنے باپ کے حق میں ناقابلِ عفو ظالم تھا۔ اجات شترو کے بعد اس کے وارثوں میں متواتر تین دیگر راجاؤں نے اپنے اپنے باپوں کے خونِ ناحق سے ہاتھ رنگین کئے جن کے نام قدیم تاریخ ہند کے مایہ ناز مورخ مسٹر ونسنٹ اے اسمتھ نے اورودز (ORODES) فراتزِ چہارم (PHRAATES IV) اور فراتزِ پنجم بتلائے ہیں[2]۔ گویا ع

این سلسلہ تمام ناب است

ریاست جودھپور کے مہاراجہ اجیت سنگھ (۱۶۷۸ء تا ۱۷۲۴ء) کو محلسرا میں سوتے ہوئے اس کے بڑے راجکمار امر سنگھ (ابھے سنگھ) نے اپنے چھوٹے بھائی بخت سنگھ کے ذریعہ ۲۳ جون ۱۷۲۴ء کو قتل کروادیا، کہا جاتا ہے کہ مقتول راجہ کے اپنی بہو (بخت سنگھ کی بیوی) سے ناجائز تعلقات تھے، اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے ہی اس نے اپنے باپ کو قتل کیا، نیز یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ امر سنگھ کے دل میں راجہ بننے کی خواہش مچلنے لگی تھی، کیونکہ وہ اجیت سنگھ کے پچاس سالہ لمبے عہدِ حکومت سے اکتا گیا تھا۔ لہٰذا اس نے بخت سنگھ کو ناگور کی جاگیر کا لالچ دیکر باپ کو مروادیا۔ بہر کیف اسباب سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اتنا مسلّم ہے کہ ایک بھائی نے قولاً اور دوسرے نے فعلاً پدر کشی کے مذموم فعل کا ارتکاب کیا جس سے کسی مورخ کو انکار نہیں، واضح ہو کہ مسلم عہدِ حکومت میں کسی شہزادہ کی تاریخ کے اوراق میں تلاش و جستجو کے باوجود انتہائی مطالعہ میں آنکھوں کو اس قسم کی کوئی مثال نظر نہ آئے گی۔

تکشلا کے مشہور و معروف دار العلوم کا سند یافتہ اجات شترو کا ہمعصر کوشل نریش راجہ پسیندی (प्रसेनजित) صاحبِ دبدبہ و لشکر ہونے کے علاوہ علم و فضل میں بھی منفرد حیثیت کا مالک تھا، اسے اواخر عمر میں اپنے لڑکے وِرودک (اس کے دوسرے نام کشدرک اور وڈوڈابھ بھی تھے) کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ نتیجتاً پسیندی کو راہِ فرار اختیار کرنا پڑی۔ دورانِ فرار اس نے بغرض استمداد و استعانت مگدھ نریش اجات شترو کے پایۂ تخت کا رُخ کیا، مگر راج گرہ میں داخل ہونے سے پیشتر ہی اس نے ایک غریب الوطن کی حیثیت سے تھک کر دم توڑ دیا، جس کی تجہیز و تکفین کے فرائض اجات شترو

نے ادا کئے، اس طرح وِرودَک غاصبانہ طریق سے تختِ سلطنت پر متمکن ہوا، وِرودَک کا عہدِ حکومت شاکاؤں پر کئے گئے لرزہ خیز مظالم سے پُر ہے، جس کے اطناب کی یہاں نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔

مجہول النسب مہاپدم نند نے اپنے آقا راجہ کالا شوک (کاک ورن) کو موقعہ پاکر اس کی راجدھانی کے قریب خنجر گھونپ کر قتل کر دیا اور اس طرح اپنا نام محسن کش افراد کی فہرست میں سرِ عنوان درج کرا لیا۔ کہا جاتا ہے کہ مہاپدم نند کا جو نسلاً حجام تھا مقتول راجہ کی رانی سے معاشقہ تھا، اسی لئے راجہ کو قتل کرنے کے بعد، بیوہ رانی نے اس پر الطاف و عنایات کی بارش کر دی، یہاں تک کہ اسے اپنے دس نابالغ بچّوں کا اتالیق مقرر کر دیا مگر اس سفاک نے کچھ عرصہ بعد اُن تمام بے گناہ بچوں کے خون سے آستین و دامن تر کرتے ہوئے تختِ حکومت غصب کر لیا اور نند خاندان کا مورثِ اعلےٰ کہلایا۔[۵]

راجہ دیوانپیا، پیادسی اشوک اعظم (۲۶۸-۹ تا ۲۳۲ ق۔م) بدھ مت اختیار کرنے سے قبل اتنا خوں خوار تھا کہ اپنی قلمرو میں 'چنڈ اشوک' (ASHOKA THE FIERCE) کے حقارت آمیز نام سے عوام میں مشہور تھا، حکومتِ کلنگا کو اُس نے جس بہیمانہ طور پر شکست و ریخت سے ہمکنار کیا، اس کی نظیر تاریخ کے صفحات میں تلاشِ بسیار کے باوجود ملنا مشکل ہے یہی نہیں اس نے باپ بندوسار (۲۷۲ق۔م) کے انتقال کے بعد جنگ برادران میں اپنے برادرِ اعیانی تشیہ (तिष्य) کو چھوڑ کر دیگر ننانوے علاتی بھائیوں کو تلوار کے ذریعہ فنا کے قعرِ عمیق میں پہنچا کر دم لیا اور اس طرح خون کے دریا کو عبور کرتے ہوئے مگدھ کے تخت پر جلوہ افروز ہوا، ممکن ہے اس سلسلہ میں سنہالی بیانات مبالغہ آمیز ہوں تاہم اتنا تو ہر مورخ کو تسلیم ہے کہ تختِ سلطنت کا اصل حقدار بندوسار کا بڑا لڑکا سوشیم (سُمن) تھا جو اپنے ایامِ شہزادگی میں ٹیکسلا کے اہم صوبہ کا گورنر رہ چکا تھا، مگر اشوک کو سُمن کا دعویٰ منظور نہ تھا اس صورتِ حال میں وراثت کے لئے باہم نبرد آزما ہونا لابدی امر تھا بالآخر اپنے بھائیوں سے تین چار سال بر سرِ پیکار رہنے کے بعد اشوک جو امورِ سیاست کے سرد و گرم سے نسبتاً زیادہ آشنا تھا، کامیاب ہوا، اس جنگ نے اتنا طول کھینچا کہ تختِ سلطنت

تین چار سال تک خالی (INTERREGNUM) رہا۔

گپت خاندان کا عظیم سمراٹ چندر گپت بکرماجیت ثانی (سنہ ۳۸۰ء تا سنہ ۴۱۲ء) اپنے بڑے بھائی رام گپت کو قتل کر کے صاحبِ حکومت ہوا۔ اور اس کے مرنے کے بعد اس کے دونوں بیٹے، کمار گپت اور گووند گپت ڈھائی تین سال تک حصول سلطنت کے لئے باہم جنگ و جدل کرتے رہے۔ آخر میں کمار گپت (سنہ ۴۱۵ء تا سنہ ۴۵۵ء) فتحیاب ہو کر گپت سلطنت کا مالک بنا، کمار گپت کے دارِ فانی سے کوچ کر جانے کے بعد بقول ڈاکٹر مجمدار اور شری گانگولی اس کے دونوں بیٹوں پُرو گپت اور اسکند گپت میں تخت و تاج حاصل کرنے کیلئے نبرد آزمائی ہوئی، جس میں پُرو گپت کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور اسکند گپت (سنہ ۴۵۵ء تا سنہ ۴۶۷ء) ملک کا وارث ہوا۔

اجات شترو، دِرودَک، اشوک اعظم اور مہان گپت سمراٹوں کے سلطنت پر قبضہ کرنے کے طریقِ کار سے مترشح ہوتا ہے کہ صرف مسلم حکمرانوں کے عہد ہی میں نہیں ہندو سمراٹوں کے زمانہ میں بھی وراثت حاصل کرنے کے لئے کسی با ضابطہ اصول کی کارفرمائی نہ تھی درحقیقت اہم شخصیات کے انتقال کے بعد ہر زمانہ اور ہر مقام پر سیاسی افراتفری برپا ہوتی رہی ہے، تاریخ کا کوئی عہد خواہ وہ ہندو سمراٹوں کا زمانہ ہو یا مسلم شہنشاہوں کا حکمرانوں کے مرنے پر خانہ جنگی سے تقریباً مستثنیٰ نہیں رہا۔ اگر متذکرہ بالا واقعات کی روشنی میں مسلم عہدِ حکومت بالخصوص اورنگ زیب وغیرہ کی جنگِ وراثت کا غیر جانبدارانہ طریق سے محاکمہ کیا جائے تو زبانِ حال بے اختیار پکار اٹھے گی ؎

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

لیکن اس عصبیت کا کیا کیجئے کہ اورنگ زیب برادر کش، ظالم اور ستمگر کہلائے اور اشوک دیوانپیا (دیوتاؤں کا عزیز) پیادسی (محبوب نظر) اور بہی خواہِ رعایا (BENEVOLENT) حکمراں کی حیثیت سے خواص و عوام میں مشہور ہو۔

یہی پیادسی اشوک جس کی مذہبی رواداری کے چرچے عام ہیں، بہت سے معاملات میں برہمن مخالف تھا، اگر موریہ سامراج کے کھنڈرات پر کھڑے ہو کر غور کیا جائے تو سوال پیدا ہوتا

ہے کہ اگر اشوک فی نفسہٖ رعیت نواز، فراخدل اور غیر متعصب تھا تو اس کے انتقال کے صرف اڑتالیس سال بعد ہی موریہ سامراج کار جہاں بانی سے کیوں کر بے دخل کر دیا گیا؟ اس سلسلہ میں مہامہوپادھیائے ہر پرشاد شاستری کی تحقیق ہے کہ اس سرعت رفتار زوال کا سبب اشوک (۲۳۲ ق م) کا بدھ مذہب کی بے جا طرفداری اور برہمنوں سے معاندانہ روش اختیار کرنا تھا۔ ڈاکٹر رما شنکر ترپاٹھی بھی شاستری جی کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ اشوک نے امتناع یگیہ، دھم مہاماتروں (محکمہ احتساب کے افسران) کا تقرر، سزاؤں کے نفاذ میں غیر مساویانہ سلوک اور بدھ مذہب کے اتباع میں دیگر ایسے قوانین نافذ کئے جن کے سبب برہمن مشتعل ہو گئے۔ اشوک کے اعلانات نمبر ۷، ۸، ۹ سے اس امر کی توثیق ہوتی ہے کہ اس نے یگیہ جیسے اہم مذہبی فریضہ میں جانوروں کو بھینٹ نہ چڑھائے جانے کا حکم امتناعی سختی کے ساتھ جاری کیا۔ ان مذکورہ اعلانات میں مندرج ہے کہ "......نیز یہ کہ مذہب (بدھ مذہب) مظالم سے محفوظ رہے اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس امر کا حکم امتناعی کلی طور پر جاری کر دیا جائے کہ کسی جاندار کو قتل نہ کیا جائے گا۔ اور نہ کسی ذی روح کو بھینٹ چڑھانے کے کام میں لایا جائے گا۔.....[۱]" پس اشوک کی اسی متعصبانہ پالیسی کا نتیجہ تھا کہ آخری موریہ تاجدار برہدرتھ کو اس کے برہمن سینا پتی پشیہ متر شنگ نے (۱۸۵ ق م) فوجی پریڈ کا معائنہ کراتے ہوئے علی الاعلان قتل کر دیا اور تخت حکومت پر قبضہ کر کے شنگ ونش نامی نئے خاندان کی بنیاد رکھی[۱]۔

اشوک اور اورنگزیب کی وفات کے بعد اگر موریہ سامراج اور مغل سلطنت کے خاتمہ کی مدت پر غور کیا جائے تو علی الترتیب ایک اور تین سال کا تناسب نظر آئے گا یعنی موریہ سامراج بعد از انتقال اشوک تقریباً پچاس سال قائم رہا، جب کہ مغل حکومت اورنگ زیب (م ۱۷۰۷ء) کے بعد ۱۸۵۷ء تک صحیح ڈیڑھ سو سال ہندوستان کی بساط سیاست پر موثر طور پر اپنا رول (ROLE) ادا کرتی رہی۔ انصاف پسند مورخوں کے نزدیک منجملہ اور ... اورنگ زیب یہ مغلوں کی رعایا پروری، رواداری، حکمت عملی اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کا نتیجہ تھا کہ بدنام زمانہ، اورنگ زیب کے بعد کسی قدر کمزور بادشاہوں

کو بھی عوام الناس نے برضا و رغبت قبول کیا جیسا کہ مغل طرزِ حکومت پر عمومی تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب رقمطراز ہیں " سترہویں صدی عیسوی کی مغل حکومت کی بنیاد میں ہمیں نہ مذہب کا سہارا نظر آئے گا نہ زورِ قوت اور نہ ذات برادری کی عصبیت کا بلکہ ہمیں یہ سہارا عام طور پر لوگوں کی سرگرم یا جامد رضامندی ہی میں نظر آئے گا۔ پھر چند سطور کے بعد فرماتے ہیں " مغل سلطنت کو منتخب قانون ساز مجالس کا کوئی علم نہ تھا اور نہ آئینی حقوق کا، بایں ہمہ اس میں اس قدر جمہوری عنصر کارفرما تھا کہ اس کی عام پالیسی عوام کی خواہشات اور جذبات سے ہم آہنگ تھی "[12] اس کے برعکس اشوک کی غیر روادارانہ پالیسی سے دل برداشتہ ہو کر عوام نے اس کے جانشینوں کو اس کے مرنے کے فوراً بعد ہی مسترد کر دیا۔

اجین نریش راجہ بکرماجیت اتنا سنگدل تھا کہ اس نے پچپن کروڑ شاکاؤں کا قتل عام کرتے ہوئے لذت محسوس کی تھی، یہی وجہ ہے کہ اپنی اس فتح کے دن سے ہی اس نے مروجہ بکرمی سمت کا اجرا کیا تاکہ سمت کے ساتھ اس کی سفاکی کی یاد بھی تازہ بنی رہے، اس ضمن میں فاضل اجل پروفیسر محمود خاں شیروانی مرحوم رقمطراز ہیں " اس بات میں عام عقیدہ جس کی تردید کی ہمارے پاس کوئی شہادت نہیں، یہ ہے کہ جب اس (بکرماجیت) نے پچپن کروڑ شاکاؤں کی خوں ریزی کی تھی تب سے یہ سمت جاری ہوا[13]

مہاداتی ہرش وردھن (سنہ ۶۱۲ء تا سنہ ۶۴۷ء) جس کی سخاوت کے افسانے مراہقت کے دور سے گزرنے والے بچوں کی زبانوں پر بھی جاری رہتے ہیں، بدھ مذہب کے علاوہ معاصر بھارت میں مروجہ دیگر مذاہب کے سلسلہ میں انتہائی متعصب واقع ہوا تھا، جیسا کہ قنوج کے مذہبی اجتماع کی کارروائی سے ثابت ہوتا ہے، اس اجتماع کو ڈاکٹر مکرجی نے FARLIAMENT OF RELIGIONS کے نام سے موسوم کیا ہے، اس میں اٹھارہ راجہ تین ہزار مہایانی و ہنیانی بدھ، تین ہزار برہمن نیز ایک ہزار نالندہ دار العلوم کے بھکشوؤں نے شرکت کی تھی، صدرِ جلسہ چینی سیاح ہیون شوہنگ کو بنایا گیا تھا جو مذہباً مہایانی بدھ تھا، اپنی صدارتی تقریر میں اس نے مہایانی فرقہ کے اصول و مبادیات کو سامعین کے سامنے

پیش کرتے ہوئے مناظرہ کے عنوان کا بھی اعلان کیا اور ایک تختی مناظرہ گاہ کے دروازہ پر اس مضمون کی آویزاں کرادی کہ "اگر کوئی شخص میرے پیش کردہ مزعومات و دعاوی میں ایک لفظ بھی غلط ثابت کردے یا میرے دلائل (DISCUSION) میں شک و شبہ کا اظہار کرے تو میں اپنا سر اسے پیش کردوں گا" مگر ہرش وردھن نے جو خود مہایانی بدھ تھا اور ہر جائز و ناجائز طریقہ سے چینی سیاح کو فتحیاب دیکھنا چاہتا تھا، سرکاری طور پر یہ اعلان کرادیا کہ جو کوئی مہایانی امام فقہ یوان شوانگ کو ایذا پہنچائے گا یا اس کے دلائل کو مسترد کرے گا اس کی زبان کاٹ لی جائے گی[۱۰]" ہرش کے اس اعلان سے پیدا شدہ خطرناک صورت حال کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دیگر مذاہب کے فضلاء نے یوان شوانگ سے مناظرہ کرنا تحصیل حاصل سمجھا[۱۱] من کل وجوہ اٹھارہ روز بعد اجتماع ختم ہوگیا، اور یوان شوانگ کی فتح کی خوشی میں ایک جلوس نکالا گیا، جس میں ہرش نے یہ اعلان کیا کہ یوان شوانگ نے غیر مذاہب کے تمام علماء و فضلاء کو شکستِ فاش دے کر مہایان فرقہ کی صداقت ثابت کردی ہے"

("THE MASTER OF THE LAW FROM THE KINGDOM OF CHINA HAS ESTABLISHED THE PRINCIPLES OF THE GREAT VEHICLE AND OVER THROWN ALL OPPOSING DOCTRINES FOR 18 DAYS NO ONE HAS DARED TO ENTER ON DISCUSSION" - Life)

اس موقعہ پر ہرش کا سلوک انتہائی جانبدارانہ رہا، دور دراز سے سفر کی صعوبتیں اٹھا کر آئے ہوئے دیگر مذاہب کے علماء سے ہرش نے بات تک نہ کی جب کہ بدھ مذہب کے پیروؤں (SRAMANAS) کو تحفے تحائف دینے میں اپنا تمام بیت المال خالی کردیا[۱۲] مورخ تاراناتھ کا بیان ہے کہ غیر مذاہب کے متعلق ہرش کا دل و دماغ صاف نہ تھا اس نے مولستان (ملتان ؟) میں ایک خانقاہ تعمیر کروائی، جس میں کئی ماہ تک مختلف الخیال حامل علماء کی میزبانی کی گئی، بعد ازاں ہرش کے ایماء سے اس میں اچانک آگ لگوا دی گئی، جس میں بارہ ہزار لوگ جو مذہبًا بدھ نہ تھے، جل کر خاکستر ہوگئے[۱۳]

قنوج کے مذکورہ اجتماع میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کو مناظرہ کی اجازت نہ دینا

اور اپنی پوری توجہ صرف چینی سیاح پر ہی مرتکز کر دینا قطعاً ناجائز تھا اور مولستان میں بارہ ہزار لوگوں کو بھسم کرا دینا ایسا فعل ہے جسے ظلم و تعدی کے سوا کسی اور اصطلاح سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ مسلم عہدِ حکومت کی تاریخ کے اوراق میں مولستان کے پُر فریب اور وحشیانہ واقعہ جیسی نظیر ہمارے کرم فرماؤں کو چراغِ رُخِ زیبا کی روشنی میں بھی نظر نہ آئے گی۔

ہرش کے معاصر اور حریف ششانک (تقریباً ۶۰۰ء تا ۶۳۷ء) نے جو مشرقی ہندوستان (بنگال) کا راجہ تھا، اپنی حدود سلطنت میں بدھ مذہب کے لوگوں پر سخت تشدد روا رکھا تھا، یہی سبب ہے کہ ہوان سانگ اُسے اپنے سفر نامہ میں "شریر النفس"[۱۸] راجہ کہتا ہے ششانک نے بودھ گیا کے مندر میں مہاتما بدھ کے مجسمہ کی بجائے شیو کی مورت نصب کرنے کی کوشش کی اور مبارک بدھ درخت کو کٹوا کر نذرِ آتش کرا دیا، کُشی نگر کے نزدیک ایک شہر کی بدھ خانقاہ کو مسمار کیا نیز پاٹلی پتر (پٹنہ) میں جس پتھر پر مہاتما بدھ کے قدموں کے نشانات بتلائے جاتے ہیں، اُسے دریائے گنگا میں پھنکوا دیا[۱۹]۔ ہرش اس سے اتنا متنفر تھا کہ اس کا اس خوف سے نام تک نہ لیتا تھا کہ مبادا زبان آلودۂ عصیاں ہو جائے[۲۰]۔

"नामापि चग्रहणा लोडस्य पाप कारिणः पापस लेन लिप्यत इव मे जिहा"

پُشیہ متر شنگ جس نے موریہ سامراج کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا، بودھوں کا شدید ترین مخالف تھا۔ سنسکرت تصنیف دیویا ودان (दिव्यावदान) میں مرقوم ہے کہ اس نے سرکاری طور پر یہ منادی کرا دی کہ "جو کوئی کسی بُدھ بھکشو کا سر کاٹ کر لائے گا اُسے سو دینار (طلائی سکہ) عطا کئے جائیں گے[۲۱]"

("यो मे श्रमण शिरो दास्यति तस्याहं दीनार शतं दास्यामि")

وہ بُدھ مخالف لوگوں کا گہرا دوست تھا، اس نے اپنی قلمرو میں کثیر بودھ خانقاہوں کو جلایا اور بھکشوؤں کا قتلِ عام کیا[۲۲]

ہندو شاستروں کے فاضل کُمارِل بھٹ نے صرف بودھ مذہب کے خلاف تقریر و تحریر ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دکن کے اپنے ایک معتقد راجہ کو بدھوں کی ایذا رسانی پر آمادہ کیا۔ لہٰذا

اس نے راس کماری سے لے کر پہاڑوں تک (ہند ہماچل) ان کے قتل کا حکم دیا، نیز یہ کہ جو انہیں قتل کرنے میں دریغ کرے گا اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا ۲۳۔ چینی سیاح یوان شوانگ نے اپنی سیاحت کے دوران ہندوستان میں ہندوؤں کے مندروں کے ساتھ ساتھ بکثرت بودھ معابد و خانقاہوں کا تذکرہ بھی اپنے سفرنامہ میں کیا ہے مگر مسلم عہد حکومت کے آغاز سے پیشتر ہی اُن کا نام و نشان سرزمین ہند سے مٹ چکا تھا۔ اسی زمانہ میں شنکر آچاریہ کی تحریک پر اکثر و بیشتر بدھ مورتیاں کھنڈرات کی گئیں۔ نالندہ کے شہرۂ آفاق دارالعلوم اور خانقاہ کو بدھ مذہب کے دشمنوں (برہمنوں) نے تین بار برباد کیا۔ جس میں ہزارہا طلباء اور اساتذہ متداول علوم و فنون کے درس و تدریس میں شب و روز منہمک رہتے تھے۔ ۲۴ پے درپے ڈھائے گئے ان مظالم نے ہندوستان میں بودھوں کی کمر ہمت توڑ کر رکھ دی اور انہیں گوشۂ عافیت کی تلاش میں بیرونِ ہند دوسرے ممالک میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا اور بقول ڈاکٹر عماد الحسن آزاد فاروقی "تاریخ کی ستم ظریفیوں کی بعض دوسری مثالوں میں یہ حقیقت بھی شامل کی جاسکتی ہے کہ بدھ مت جو ہندوستان میں پیدا ہوا اور اپنی ابتدائی نشو و نما کے بعد ہندوستان سے نکل کر ایشیا کے دوسرے ممالک میں پھیلا، اس وقت خود اپنے مادر وطن میں ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے تقریباً ناپید ہے"۲۵ کیا برادرِ وطن نے کبھی اس بات پر غور و خوض کیا کہ بدھ مذہب کو ہندوستان میں اس ناگفتہ بہ حالت اور کسمپرسی سے کس نے دوچار کیا؟ کیا اس کے ذمہ دار بھی مسلم حکمراں ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ نویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے ورود سے پیشتر جب یہاں برہمنوں کو عروج حاصل تھا تو انھوں نے بدھ مت کے لوگوں کو ہندوستان کی سنگرتی کا سفیر اور نمائندہ بنا کر ہمیشہ کے لئے ملک بدر کر دیا۔

مندرجہ بالا شواہد کی روشنی میں اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو معترضین کے مسلمانوں پر عائد کردہ اتہامات مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں کیونکہ جن امور کے ضمن میں وہ دوسروں پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔ فی الحقیقت خود ان پر ہی عائد ہوتے ہیں ؎

عیب خود بر دیگراں لے وائے انصاف چنیں — خود سراپا عیب شد سوئے دیگراں لائے چنیں

رہا معابد غیر کے انہدام و توہین کا مسئلہ تو اس سلسلہ میں مسلم فرماں رواؤں کو متہم کرنا

اسلامی تعلیمات اور تاریخ دانی سے اپنی عدم واقفیت کا ثبوت دینا ہے کیونکہ اسلام دیگر مذاہب کے صوامع، منادر، خانقاہوں اور گردواروں کو مسمار کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ دریں صورت مذہب کی تعلیمات کو احترام کی نظروں سے دیکھنے والا کوئی بھی مسلم حکمراں اس قسم کے فعل کے ارتکاب کی جرأت نہیں کر سکتا، تاہم اگر بعض حکمرانوں نے ایسا کیا بھی تو اُس کا سبب مذہبی جنون، یا تعصّب نہیں بلکہ یا تو اس کی دولت پر قبضہ کرنے یا ان کی سیاسی مرکزیت کو برباد کرنے یا ان کی بداخلاقی کو دُور کرنے کے لئے کیا گیا[۲۶] مگر قدیم تاریخ ہند کا از فاتحہ تا تمت مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم حکمرانوں نے صرف مذہبی عناد اور جوش جنون سے مغلوب ہو کر ہی غیروں کے عبادت خانوں پر دستِ تطاول دراز کیا، جیسا کہ گزشتہ سطور میں بودھ خانقاہوں کے ضمن میں ہم دیکھ چکے ہیں، موقعہ ہاتھ آنے پر مساجد کے انہدام کے سلسلہ میں بھی ان کا وہی معاندانہ رویّہ برقرار رہا۔ چنانچہ ہنٹر صاحب تاریخ ہند میں رقمطراز ہیں کہ راجپوتوں نے مسجدوں کو مسمار اور ملّاؤں (علماءِ کرام) کو بے عزّت کیا، حتیٰ کہ قرآن کو جلایا مہاراجہ اجیت سنگھ نے جودھپور میں مساجد کو شہید کر کے ان کی جگہ مندر بنوا دئے، انگریزی عہدِ حکومت میں راجگان بھرت پور و کشمیر اور بانسواڑہ نے مساجد کو مسمار کیا جب کہ کسی مسلمان والیٔ ریاست کے متعلق مندر شکنی کی شکایت نہیں ملتی، کئی ہندو ریاستوں میں مسجدوں پر قبضہ کر کے انہیں دفتروں، گوداموں، بارکوں اور پولیس تھانوں کے مصرف میں استعمال کیا جاتا رہا، مسلم دورِ حکومت کے زمانۂ شباب میں حوالیٔ گجرات میں کئی مساجد پر تصرّف کر کے مکانات بنا لئے گئے اور مسلمانوں کے مکانات پر قبضہ کر کے مندر تعمیر کر لئے گئے[۲۷] جہانگیر کے عہدِ حکومت میں کورکھشیتر کے تالاب کی ایک مسجد اور مقبرہ کو منہدم کر کے اس کی جگہ ایک بلند گردوارہ بنا لیا گیا۔ متھرا میں جودھا بائی کے پروہت نے اپنی بہنہ روزی اور ڈھٹائی سے ایک مسجد کے سامان سے مندر تعمیر کر لیا[۲۸] سنہ ۱۷۶۰ء میں سداشیو راؤ بھاؤ نے دہلی میں حدود رجہ زیادتیاں کیں، مساجد و مقابر کو لوٹا اور توڑا پھوڑا، دیوان خاص کی خوب صورت نقرئی چھت اکھاڑلی جس سے اسے سترہ لاکھ روپئے حاصل ہوئے[۲۹] اس سلسلہ میں مسٹر سڈنی جے اوون رقمطراز ہیں:

THUS HE STRIPPED THE MAGNIFICENT HALL

OF AUDIENCE OF ITS FINE SILVER CEILING WHICH HE COINED IN TO SEVENTEEN LACS OF RUPEES.[29]

ہیبت رائے پھالکہ نے قصبہ سیوہارہ کی جامع مسجد کو نذرِ آتش کیا اور بعد ازاں منہدم و مسمار نیز منہدمہ حصہ میں میدان بنا کر اسے مُرغ بازی کے لئے مخصوص کیا، اس دل خراش سانحہ سے متاثر ہو کر کسی شاعر نے مسجد کا مرثیہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

رہا کردہ برائے مرغ بازی   عبادت گاہِ مردانِ نمازی[30]

بہر کیف ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی بُت شکنی کو توسب جانتے ہیں، مگر میسور کے حیرت انگیز مندر ابھی تک ان بت شکنوں کے ہاتھوں محفوظ رہے، اجنتا اور ایلورا کے برہمن اور بودھی آثار کے تحفظ میں مسلمانوں کا بھی ہاتھ ہے۔ پچیس سال تک دکن میں معرکہ آرا رہنے کے باوجود بُت شکن، اورنگزیب نے اجنتا اور ایلیفنٹا کی غاروں میں بنے مورتیوں کے عجائب خانوں کو ہلکی سی خراش بھی نہ پہنچائی[31]

پیشواؤں کے عہد میں مرہٹوں کا بے گناہ رعایا پر ظلم و زیادتی کرنا عام بات تھی، وہ جس علاقہ سے بھی گزرتے، تاخت و تاراج کا عریاں رقص کرتے کرتے اور بروایت استاذ محترم ڈاکٹر متھرالال شرما "مرہٹہ فوجی دستوں کے وحشی سپاہی چولھوں سے پکتے کھانے تک لوٹ لیا کرتے تھے اور معصوم بچے بھوک سے بلبلاتے ہوئے رہ جاتے تھے"۔ ۵۱-۱۷۵۰ء میں ملہار راؤ ہلکر ایک طاقتور فوج کے ساتھ مضافات جے پور میں داخل ہوا، جہاں اس نے راجدھانی کے اردگرد تمام علاقوں کو جلایا اور برباد کیا[32] ("WITH A STRONG ARMY HE ENTERVED THE TERRETORY OF JAIPUR BURNT AND RAVAGED THE COUNTRY UP TO THE VICINITY OF THE CAPITAL") یہی نہیں اس نے والیٔ جے پور راجہ ایشوری سنگھ (۱۷۴۳ء تا ۱۷۵۰ء) کے سامنے ایسی ناقابلِ عمل شرائط پیش کیں جن کا ایشوری سنگھ جیسے محدود ذرائع راجہ کے لئے پورا کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا، لہٰذا اس نے مرہٹوں کے مظالم سے آزردہ اور دل برداشتہ ہو کر زندگی پر موت کو ترجیح دی، لہٰذا اوائل جنوری ۱۷۵۱ء کو ایک زہریلے ناگ سے

اپنے آپ کو ڈسوا کر ہلاک کرلیا، اس کی تین رانیوں نے بھی زہر کھا کر خودکشی کرلی، نیز راجہ کی بیس باندیاں اس کی چتا میں جل کر بھسم ہوگئیں، اس سانحہ سے جے پور میں صف ماتم بچھ گئی اور سات سال تک حصول اقتدار کی خاطر اپنے بڑے بھائی سے برسر پیکار رہنے والا مادھو سنگھ اول (۱۷۵۰ء تا ۱۷۶۷ء) جو کل تک مرہٹوں کا دوست تھا (اس واقعہ کی بنا پر) آج ان کا دشمن بن گیا، لہٰذا اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لئے اس نے مرہٹہ سردار ہلکر اور سندھیا کو ایک ضیافت میں مسموم کھانا کھلانا چاہا مگر قبل از وقت راز فاش ہونے کے سبب وہ بچ گئے اور بعد ازاں مرہٹہ سردار جے آپا اور اس کے ہمراہیوں کو جے پور کی رونق کا نظارہ کرنے کے بہانہ سے شہر میں بلایا گیا وہ لوگ جیسے ہی داخل ہوئے شہر پناہ کے تمام دروازے بند کردیئے گئے اور ۲۰ جنوری ۱۷۵۱ء کی دوپہر سے لے کر آدھی رات تک مرہٹوں کا قتل عام ہوتا رہا جس میں تقریباً تین ہزار مرہٹہ مقتول ہوئے اور ایک ہزار سے زائد زخمی۔[۳۱]

حرف مدعا یہ کہ سنگلاخ وادی سیاست کے راہ گیر بسا اوقات اپنی اغراض پرستی اور جوش جنون کی تسکین کے لئے راہ زن بھی ہوجایا کرتے ہیں اور متاع امن وانصاف کی غارت گری بھی روا رکھتے ہیں مگر یہ خصوصیت کچھ مسلم عہد حکومت ہی کی نہ تھی، ہندو سمراٹوں کا دور بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، پھر مخصوصات کی تعمیم جمہور پر نہیں کی جاسکتی اور نہ سمراٹوں بادشاہوں راجاؤں، سیاست گرانِ روئے زمین کی آرائے عام رائے اور مذہب پر محمول ہوسکتی ہیں۔

اجات شترو کے اپنے قیدی باپ کے ساتھ کئے گئے ناروا سلوک کو دوبارہ مستحضر کرتے ہوئے اگر اورنگ زیب کے اس برتاؤ پر بھی ایک نظر ڈالیں جو اس نے قیدی شاہجہاں کے ساتھ کیا تھا تو ہمیں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوگا۔ اس سلسلہ میں مورخ شہیر علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی معرکۃ الآراء تصنیف "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" صفحہ ۸۸ پر رقمطراز ہیں کہ عالمگیر نے "اپنے بیٹے شہزادہ اعظم کو شاہجہاں کی خدمت میں عفو تقصیرات کے لئے بھیجا اور پانچ سو اشرفیاں اور چار ہزار روپئے نذر بھیجے اور چند روز کے بعد جب تعبے کی طرف سے پورا اطمینان ہوگیا تو شاہجہاں کے ہر قسم کے آرام وراحت کا سامان مہیا کردیا۔" اور سید

نجیب اشرف ندوی ایم اے اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ :

اورنگزیب نے شاہجہاں کی کامل آزادی میں صرف اس حد تک تحدید کردی تھی کہ وہ اس کو کسی صورت نقصان نہ پہنچا سکے اور بس، ورنہ نہ اُس کے روزانہ مشاغل میں کوئی مداخلت کی گئی اور نہ اس کے ذاتی توشہ خانوں کو ہاتھ لگایا گیا، اس کے ساتھ ہی اورنگزیب نے اس بات کا بھی حکم دے دیا تھا کہ شاہجہاں جو چیز جس وقت طلب کرے، اس کے سامنے حاضر کی جائے، لوگوں کا جو ہزاروں روپیہ اس کے ذمہ ہے وہ ادا کر دیا جائے اور جن لوگوں کے وظائف مقرر ہیں وہ علیٰ حالہٖ باقی رہیں، چنانچہ جہاں آراء (جس کی تمام ترہمدردیاں شہزادہ داراشکوہ کے ساتھ تھیں) کا بھی آخر وقت تک وہی اثر واقتدار اور عزت واحترام باقی رکھا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اورنگزیب نے شاہجہاں کے ساتھ یہی مراعات نہیں کیں بلکہ اُس نے اُن تمام رسوم کو بھی جاری رکھنے کا حکم دیا جو شاہجہاں نے جاری کی تھیں، ان میں ممتاز محل کی برسی بھی تھی[۳۲]۔"

مگر تاریخ کی عدالت میں یہ اپنوں کی شہادتیں ہیں جو نسبتاً کم معتبر خیال کی جاتی ہیں، اس لئے اس بارہ میں غیروں کی شہادت پیش کرنا بھی ضروری ہے، اس سلسلہ میں اورنگزیب کا بدترین دشمن، داراشکوہ کا قریب ترین دوست اور قوتِ مشاہدہ کا دھنی فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر جو واقعہ کا عینی شاہد ہے، اپنے سفرنامہ میں رقمطراز ہے :

"غرضیکہ اورنگزیب کا برتاؤ شاہجہاں کے ساتھ مہربانی اور ادب سے خالی نہ تھا اور حتی الامکان وہ اپنے بوڑھے باپ کی ہر طرح سے خاطرداری کرتا اور نہایت کثرت سے تحفے تحائف بھیجتا رہتا اور سلطنت کے بڑے بڑے معاملات میں اس کی رائے اور مشورے کو مثل ایک پیر و مرشد کی ہدایت کے طلب کرتا تھا اور اس کے عریضوں سے جو اکثر لکھا کرتا تھا، ادب اور فرماں برداری ظاہر ہوتی تھی، بس اس طرح اس کا غصہ آخر کار یہاں تک ٹھنڈا پڑ گیا کہ معاملات سلطنت

میں بیٹے کو لکھنے پڑھنے لگ گیا بلکہ اپنے باغی فرزند کی سب گستاخانہ حرکتیں معاف کر کے اس کے حق میں دعائے خیر بھی کر دی ۳۵ "

اسٹینلے لین پول اورنگ زیب کے سلوک پر فرماتے ہیں کہ :

" شاہجہاں اپنی اسارت سے رفتہ رفتہ مطمئن ہو گیا' اور اورنگ زیب نے اس کی تکالیف رفع کرنے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتا تھا' اس نے اسے ہر قسم کی مطلوبہ تفریحات کی اجازت دے دی، تحائف کے انبار لگا دیئے اور ایسا سامان راحت مہیا کیا گیا جو اسے انتہائی طور پر محظوظ کر سکے۔ بیگم صاحب (شاہزادی جہاں آراء) اور دیگر مستورات اس کی رفاقت میں رکھی گئیں' انواع و اقسام کے پُر تکلف کھانوں کا انتظام کیا گیا، حتیٰ کہ رقص و سرود کے طائفہ (جس سے متدین اورنگ زیب سخت متنفر تھا) سے بھی شاہ جہاں کو دل بہلانے کی اجازت دے دی گئی ۳۶ "

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اورنگ زیب ایسا ہی بھلا مانس تھا تو اتنے خون خرابہ اور باپ کو مقید کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دارا شکوہ کی طرف داری میں خود شاہجہاں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ اگر اورنگ زیب حفاظت خود اختیاری کے پیش نظر اس طرح کا قدم نہ اٹھاتا تو وہ بجائے تخت کے تختۂ دار پر جھولتا نظر آتا۔ اورنگ زیب کو راستہ سے ہٹانے میں جب شاہجہاں کا کسی طرح بس نہ چل سکا تو اس نے عفو تقصیرات اور مزاج پرسی کے لئے آئے ہوئے شاہزادہ محمد اعظم (ابن اورنگ زیب) کو اس بات کے لئے آمادہ کرنا چاہا کہ وہ اپنے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دے مگر شاہزادہ جانتا تھا کہ اس کا باپ فولاد کا بنا ہوا ہے لہٰذا شاہجہاں کا یہ آخری حربہ بھی ناکام رہا اور اس طرح بقول لین پول " شاہ جہاں نے جو جال اپنے بیٹے کی تباہی کے لئے بچھایا تھا اس میں وہ خود پھنس گیا۔"

("THE TRAP WHICH SHAH-JAHAN LAID TO ENSNARE HIS SON TO HIS RUIN, CAUGHT THE OLD KING HIM SELF" - AURANGZIB P.52)

غایت تسوید یہ کہ مسلم حکمرانوں سے دانستہ یا نادانستہ طور پر جو کچھ غلطیاں کار جہانبانی کے

سلسلہ میں، سرزد ہوئیں انہیں ہم "آخر بہ اوّل نسبتے دارد" کے زمرہ میں ہی شمار کر سکتے ہیں کیونکہ جب ڈاکٹر آشیر وادی لال سری واستو جیسے جانبدار مورخ علامہ علاؤالدین خلجی شیر شاہ سوری اور اکبر اعظم کو ایڈمنسٹریشن کے شعبوں میں امام کا درجہ نہ دے کر چندر گپت موریہ اور چندر گپت بکرما جیت ثانی کا خوشہ چیں ہی بتلاتے ہیں تو زیادتیوں کے سلسلہ میں بھی کسی مسلم فرماں رواکی حیثیت مقلد محض ہی کی ہونی چاہیئے نہ کہ ستم ایجاد کی۔ بہرصورت اگر سلاطین و شہنشاہان ہند کا دامن آلودہ معصیاں ہے تو تاریخ سمراٹوں اور راجوں مہاراجوں کی عصمت پر بھی شہادت دینے کو آمادہ نہیں۔

فہرست اسنادِ محولہ

لہ پراچین بھارت کا اتہاس: از ڈاکٹر رما شنکر ترپاٹھی ص ۲۷۴ تا ۲۷۶ مطبوعہ ۱۹۶۳ء
لہ ایضاً ص ۴۸ فوٹ نوٹ نمبر ۳
لہ لیٹر مغلز، جلد دوم صفحات ۱۷ - ۱۱۶ - مصنفہ اروِن، جودھپور راج کا اتہاس صفحہ ۳۰۰ از پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا، راجستھان از ٹاڈ جلد دوم ص ۸ - ۷۵۵، نیز راجستھان کا اتہاس از پروفیسر گوپی ناتھ شرما صفحہ ۴۶۱
لہ رما شنکر ترپاٹھی ص ۳ - ۴۲۷
ھ ہرش چرت مترجمہ کاویل اور طامس بحوالہ ایضاً ص ۴۸ فوٹ نوٹ نمبر ۳
لہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں سمتھ، مکرجی اور بھنڈارکر کی تصانیف موسوم بہ "اشوک"
لہ پراچین بھارت کا اتہاس از ڈاکٹر رما شنکر ترپاٹھی ... اَلمَل چند پانڈے ایم اے ڈی فل ص ۶۴، ۱۹۹ اور ۱۰۷ مطبوعہ ۱۹۶۳ء
شہ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ص ۲۵۹ اور اس سے آگے۔
لہ رما شنکر ترپاٹھی ص ۱۲۷

۱۰ تاریخ ہند کے ماخذ مولفہ مسٹر عطا حسین صاحب بی اے، ایل، ٹی ڈی لٹ ص ۹۶

۱۱ رماشنکر ترپاٹھی ص ۱۴۰

۱۲ ہسٹری آف جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد صفحات ۵-۴، مطبوعہ ۱۹۴۰ء

۱۳ پرتھی راج راسا۔ مطالب وتنقید وتبصرہ ص ۱۳۴ شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی پہلا ایڈیشن ۱۹۴۳ء

۱۴ پراچین بھارت کا اتہاس کھنڈ دو ص ۶۴ از ڈاکٹر ومل چند پانڈے۔

۱۵ "THE FOLLOWERS OF ERROR WITH DREW AND DISAPPEARED SO THAT THERE HAD BEEN NO ONE TO ENTER ON THE DISCUSSION." LIFE IBID P. 68 F.N. 1

۱۶ "WHILE THE 'KING' EXHAUSTED HIS TREASURY IN OFFERINGS OF SARAMANAS, THEY COMING FROM A DISTANCE HAD SCARCELY BEEN SPOKEN TO BEAL.

۱۷ ومل چندر پانڈے کھنڈ دو صفحات ۶۹، ۷۰، ۸۰ و ۸۱

۱۸ تاریخ ہند کے ماخذ ص ۱۰۵

۱۹ ومل چندر پانڈے کھنڈ دو ص ۳-۶۲

۲۰ بحوالہ ایضاً ص ۶۰ فوٹ نوٹ نمبر ۱

۲۱ دیویاؤ دان مرتب کاویل اور نیل ص ۴-۴۳۳ بحوالہ رماشنکر ترپاٹھی ص ۱۴۳ تشریحی نوٹ نمبر ۲۔

۲۲ ایضاً ص ۱۴۳۔

۲۳ تاریخ ہند ہنٹر ص ۱۴۲۔

۲۴ ایضاً ص ۱۱۹

۲۵ اسلام اور عصر جدید (سہ ماہی) جلد ۱۵ شمارہ (۲) بابت ماہ اپریل ۱۹۸۳ء مقالہ بعنوان "بدھ مت، گوتم بدھ کی زندگی اور تعلیمات ص ۴۶۔

۲۶ مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری جلد اول صفحہ ۹۹ مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے مطبوعہ ۱۹۷۵ء

۲۷ مساجد کے انہدام کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو "شذرات"۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ بابت ماہ ستمبر ۱۹۸۳ء ص ۱۶۲ تا ۱۶۴ جو خاصہ کی چیز ہے۔

ﻛ۲۸ برائے تفصیل ملاحظہ ہو "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" تالیف پروفیسر محمد اسلم لاہوری ص ۱۳۷ مطبوعہ ۱۹۶۹ء باہتمام ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

ﻛ۲۹ دی فال آف دی مغل ایمپائر از سڈنی جے اوون ص ۱۸۳ مطبوعہ ۱۹۶۰ء

ﻛ۳۰ رسالہ جہادِ اسلام، مصنفہ قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی ص ۱۴۱

ﻛ۳۱ مقالہ "ہندوستانی تہذیب اور اسلام" از این۔ سی مہتہ آئی سی ایس بحوالہ مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری جلد اول ص ۱۴۶۔

ﻛ۳۲ رائز آف دی پیشواز، مصنفہ ڈاکٹر ایچ این سنہا ایم۔ اے۔ پی، ایچ ڈی لندن ص ۲۴۶ مطبوعہ ۱۹۵۴ء

ﻛ۳۳ برائے تفصیلات ملاحظہ ہوں (۱) مین کرنٹس آف مرہٹہ ہسٹری (ہندی ایڈیشن) از گوبند سکھارام سردیسائی ص ۱۲۷ (۲) رائز آف دی پیشواز ص ۲۴۶ (۳) مغل کالین بھارت از ڈاکٹر آشیر وادی لال ص ۵۲۳ طبع پنجم ۱۹۶۵ء

ﻛ۲۹؁ "بھاؤ نے ۲۳ لاکھ روپئے دہلی میں دوسرے ناجائز ذرائع سے حاصل کئے تھے" برائے تفصیل دیکھئے جی ایس سر ڈیسائی کی تصنیف "نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز" ہندی ایڈیشن ص ۵۵۱ جلد دوم مطبوعہ ۱۹۶۱ء۔

ﻛ۳۴ ملاحظہ ہو "مقدمہ رقعات عالمگیر" ص ۲۔۴۵۱ شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڑھ

ﻛ۳۵ ترجمہ سفرنامہ ڈاکٹر برنیر جلد اوّل ص ۲۸۹ بحوالہ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۸۰

ﻛ۳۶ اورنگ زیب اینڈ دی ڈکے آف مغل ایمپائر از اسٹینلے لین پول ص ۵۳ شائع کردہ ایس چاند اینڈ کمپنی۔

درج ذیل شاہکار کتابوں سے اپنی ذاتی لائبریری کو مکمل کیجیے

تفسیر بیان القرآن ۲۴۰/-
تفسیر ابن کثیر مکمل چار جلد ۲۰۰/-
تفسیر ماجدی ا تا پارہ ۱۱ ۵۵/-
تدوین حدیث (مولانا مناظر احسن گیلانی) ۴۴/-
ترمذی شریف مکمل مترجم عکسی ۱۵/-
الفیۃ الحدیث (مولانا محمد منظور نعمانی) ۱۲/-
حصن حصین ۱۲/۵۰
رسول رحمت (مولانا ابو الکلام آزاد) ۸۰/-
سیرت النبی عکسی اردو
از علامہ ابن ہشام ۱۲۵/-
رحمۃ للعالمین مکمل عکسی
(قاضی سلیمان منصور پوری) ۷۵/-
رسالۃ المآب (مفتی عزیز الرحمٰن) ۶۰/-
مختصر سیرت نبویہ
(مولانا عبد الشکور فاروقیؒ) ۱۰/-
غنیۃ الطالبین
(حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ) ۵۰/-
شریعت یا جہالت عکسی
(محمد یاسین حقانی صاحب) ۴۵/-
فتاویٰ رحیمیہ مکمل چار جلد
(مفتی سید عبد الرحیم لاجپوری) ۱۶۵/-
علم الفقہ (مولانا عبد الشکور فاروقیؒ) ۵۵/-
فتاویٰ دار العلوم دیوبند ۳۲۵/-
جدید مسائل کے شرعی احکام (مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) ۱۳/۲۵
ارواح ثلاثہ ۲۲/-
تلبیس ابلیس اردو ۳۵/-

تبلیغی نصاب اول پلاسٹک ۳۰، حصہ دوم ۲۴/-
(شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ) ۳۰/-
الانور ۴۰/-
آئینہ ملفوظات ۲۰/-
اصحاب النبی ۱۸/-
مکتوبات حضرت علی ۱۸/-
تذکرہ مشائخ دیوبند (مفتی عزیز الرحمٰن صاحب) ۱۸/-
طب روحانی ۱۲/-
تقویۃ الایمان مکمل (شاہ اسمٰعیل شہیدؒ) ۲۸/-
〃 〃 مختصر ۴/۵۰
کلیات امدادیہ ۲۰/-
(حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی) ۲۰/-
خطبات الاحکام ۱۲/۵۰
ایمان کیا ہے ۱۱/۵۰
مکاتیب رشیدیہ ۱۳/۵۰
جواہر خمسہ ۲۵/-
تذکرۂ ائمہ اربعہ ۱۸/۵۰
تبلیغ دین مختصر (امام غزالی) ۱۲/-
تقدیر کیا ہے ۱۲/۵۰
مکتوبات و بیاض یعقوبی ۱۱/-
سیرت عائشہؓ ۱۶/-
اسوۂ صحابیات ۶/-
ارض القرآن ۲۶/-
آداب زندگی ۵/۵۰
طب نبوی ۱۸/-
مقالات صوفیہ ۴/-

القاموس الجدید (اردو عربی) ۲۷/-
〃 〃 (عربی اردو) ۲۰/-
عرفان محبت ۱۴/-
جب ایمان کی بہار آئی ۱۲/-
بشریت انبیاء ۱۰/-
زاد سفر مکمل ۲ حصے ۴۲/-
حیات خلیل ۲۵/-
بہشتی زیور ۳۰/-
تعبیر نامہ خواب ۱۵/-
تعمیر بغداد ۱۵/-
تعارف مذہب شیعہ ۱۵/-
معاشرتی مسائل ۱۵/-
اسلام اور غیر اسلامی تہذیب ۱۰/-
سیرت خلفائے راشدین ۱۰/-
نماز کی عظمت (یا کتاب الصلوٰۃ) ۴/-
شریعت اور طریقت ۲۰/-

کچھ ہندی کتب

مرنے کے بعد کیا ہوگا ۱۴/-
اسلام کیا ہے؟ ۱۰/-
ارکان اسلام ۴/-
میاں بیوی کے حقوق ۱۰/-
مسلمان بیوی ۵/-
آئینۂ نماز ۶/-
اعمال قرآنی ۸/-
علامات قیامت ۶/-
ترکیب نماز ۲/۵۰

چندہ سالانہ
ہندوستان میں -/۲۵
پاکستان سے پاکستانی سکہ میں -/۶۰
بنگلا دیش سے ہندوستانی سکہ میں
-/۳۰

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

فی شمارہ ۲/۵۰

ممالک غیر سے
بحری ڈاک سے -/۶۰ روپے
(۴ پونڈ یا ۲۵ ریال)
ہوائی ڈاک سے -/۱۳۵ روپے
(۹ پونڈ ۵۸ ریال ۵۰ ڈالر)

جلد (۵۲) | بابت اگست ۱۹۸۴ء مطابق ذی قعدہ ۱۴۰۴ھ | شمارہ (۸)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آ جانا چاہیے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی روانہ کیا جائے گا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں اگر دوبارہ بھیجنے کے لیے دفتر میں پرچہ ہوگا تو ضرور بھیجا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار حضرات مبلغ ۵۰ روپے ہندوستانی سکہ میں کسی بھی ذریعہ سے دفتر الفرقان لکھنؤ کو روانہ فرمائیں یا پاکستانی سکہ میں ۶۰ روپے ناظم ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجدیں۔

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

آج ایک بار پھر ہماری معروضات کا موضوع ایرانی انقلاب ہے ــــ مارچ واپریل ۸۳ء کے مشترک شمارے میں حضرت والد ماجد دام اللہ ظلہ کا جو مضمون شائع ہوا تھا، اس کے بارے میں دنیا کے کونے کونے سے خطوط کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے ــــ اس سلسلہ کے صرف دو خط ہم اپنے محترم قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں لیکن اس سے پہلے ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

یہ سوال بہت سے ذہنوں میں آسکتا ہے کہ ایرانی انقلاب کو مستقل طور پر ہدف تنقید اور موضوعِ سخن کیوں بنایا جائے؟ اور کیوں مسلسل اس کے بارے میں لکھا جائے؟

ہمارے خیال میں اس طرح کے سوالات کی بنیاد صرف ایران کے انقلاب اس کی نظریاتی بنیادوں، اور ان کے دور رس اور تباہ کن نتائج سے ناواقفیت ہے، جس کی وجہ سے سچی بات یہ ہے کہ مسئلہ کی سنگینی کا صحیح طور پر اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس لیے اس طرح کے سوالات کا ذہنوں میں آنا نہ باعثِ حیرت ہے نہ لائقِ ملامت! اس مسئلہ کی سنگینی کے کئی پہلو ہیں، ہم یہاں صرف ایک پہلو کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

انیسویں صدی میں تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن ودماغ سترھویں صدی میں سامنے آنے والے سائنسی نظریات سے مرعوب ومتاثر ہوئے تھے، اور علوم فلکیات، طبعیات

کیمیا اور حیاتیات کی غیر معمولی ترقی کی وجہ سے مادیت اور دہریت کو زبردست تقویت پہنچی تھی اور وہ لوگ جو صحیح ایمان اور صحیح علم وفہم سے عاری تھے یہ سمجھنے لگے تھے کہ سائنس نے مذہب کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں، کیونکہ کائنات میں علت ومعلول کا ایک سلسلہ کارفرما ہے جس کی بنا پر اس کی تخلیق بھی ہوئی، اور تشکیل وتعمیر بھی ہو رہی ہے، نہ کسی خالق کی ضرورت ہے اور نہ قیوم کی، اس زمانہ میں عقلوں پر سائنسی تجربات ومشاہدات، اور ان کی بنیاد پر قبول کیے جانے والے نظریات ہی کا غلبہ تھا ۔۔۔۔۔ اس کا ایک اثر یہ بھی پڑا تھا کہ اسلام اور قرآن کی سائنسی تفسیر وتشریح کا رجحان بڑھنا شروع ہوا، اور بات یہاں تک بڑھی کہ قرآن اور بعثت نبوی کا اولین مقصد انسانوں کو کائنات کے سربستہ رازوں سے واقف کرانا، اور زمین وآسمان کے مخفی خزانوں سے استفادہ کی راہیں بتانا" قرار دیا جانے لگا تھا، اور مغربی اقوام کو، جن کے ہاتھوں میں سائنسی تحقیقات کی کنجیاں تھیں، ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (زمین کے وارث بنیں گے میرے صالح بندے) کا مصداق، اور قرآن کے پیش کردہ انسان کامل کا ایک نمونہ کہا جانے لگا۔

انیسویں صدی ہی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جب کہ نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبیعیات اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی، چند ایسے تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ اس علم کی بنیادیں ہل گئیں، اور علم طبعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا، اور مادیت اور دہریت کے پرستاروں کا وہ طلسم جو سائنس کی بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا ٹوٹ گیا، اور "کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو" کے مصداق خدا کی ہستی پر ایمان لانے کے لیے نئی راہیں کھل گئیں۔

بیسویں صدی میں دنیا کے نقشہ میں رونما ہونے والی بڑی اہم تبدیلیوں کے نتیجہ میں دنیا کے عام انسانوں کے، خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن ودماغ پر انسانی زندگی کے دو شعبے سیاسیات واقتصادیات چھا گئے۔ کسی بھی مذہب، مجموعۂ افکار ونظریات، اور نظام حیات کو جانچنے کا صرف ایک ہی پیمانہ رہ گیا، وہ یہ کہ ان دونوں شعبوں کے بارے میں اس کے پاس کیا ہے؟ اس کے پیچھے طاقت کتنی ہے؟ اس کا نظام حکومت کیا ہے؟

ـــــــ ہمیں یہاں ان دونوں شعبوں کی اہمیت اور انسانی زندگی میں ان کے درجہ اور مقام کے بارے میں کچھ نہیں عرض کرنا ہے ـــ ہم یہاں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس طرز فکر کے بہت سے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ آخرت جزا و سزا، جنت، دوزخ، اللہ کی رضا و رحمت اور اس کے غیظ و غضب سے بالکل ہٹ کر ساری توجہ دنیاوی زندگی کے چند مسائل ہی پر مرکوز ہو کر رہ گئی، مذاہب و افکار کو صرف ان مسائل کے پیمانے سے تولا جانے لگا، حالانکہ انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے دین، اور ان کے قائم کردہ منہاج میں یہ مسائل بڑی آسانی سے بالکل ضمنی طور پر، اور کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ چٹکیوں میں حل ہو جاتے تھے ـــــ جب انسان کے اندر ایمان و احتساب آ جاتا ہے، جب اس کے اخلاق، اس کے جذبات، اس کی تمام حرکات و سکنات، اور اس کی ہر فکر و سوچ آخرت اور اللہ کی مشاء کے رنگ میں رنگ جاتی ہے تو زندگی کا ہر شعبہ سدھر جاتا ہے ـــــ اور ہر شعبہ کے بارے میں اللہ کی ہدایات پر عمل کر کے بڑے سیدھے اور فطری طریقے پر پوری زندگی، اور کامل معاشرہ نمونے کی چیز بن جاتا ہے۔ دنیا بھی سنور جاتی ہے، اور آخرت بھی۔

لیکن ہر زمانہ میں اسلام کے مخلصوں اور خادموں میں ایک طبقہ ایسا رہا ہے جس نے اسی کو بہتر سمجھا کہ زمانہ جس چیز کو زیادہ مانگ رہا ہے، جس پہلو کو زیادہ اہمیت دے رہا ہے اسلام کے اسی پہلو کو زیادہ روشن اور نمایاں کیا جائے، تاکہ لوگوں کے ذہن اسلام سے قریب تر ہوں۔ اور لوگ اسلام کو زمانۂ ماضی کی ایک چیز سمجھ کر اس سے مایوس اور برگشتہ نہ ہو جائیں ـــــ ہو سکتا ہے کہ اس طرز سے بہت سے لوگ اسلام سے دوری سے بچ گئے ہوں، اور ذہنی طور پر اس کی صداقت و عقلیت کے بارے میں مطمئن ہو گئے ہوں، لیکن اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ ایک طرف تو اس طرز سے جو لوگ اسلام سے قریب ہوئے، وہ حقیقی اور مکمل اسلام سے نہیں، اس کی اصل روح ایمان و ایقان اور تصدیق و استسلام سے نہیں، اس کے اس تربیتی پہلو سے نہیں جو اس کا مغز و جوہر ہے، بلکہ اس کے چند ظاہری پہلوؤں سے ہی قریب ہوئے، جس کی وجہ سے وہ چند پہلو ہی ان کے ذہن و دماغ پر

چھائے رہے، اور دوسری طرف یہی طرز فکر امت میں عام طور سے پھیلنے لگا، اور عام لوگوں کے ذہن و شعور پر چند مخصوص پہلوؤں اور گوشوں ہی کی چھاپ گہری ہوتی چلی گئی۔ اور تعمیر سیرت اور اصلاح معاشرہ کا وہ کام جو کہ اسلام کا اصل منشا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت و معرفت، اور اس کی رضا کا حصول جو اس کا مقصود ہے یا تو بالکل ہی ساقط ہو گیا، یا فکر و عمل کی فہرست کے بالکل آخر میں محض تبرک کا یا اتمام حجت اور دوسروں کی زبان بندی کی خاطر اسے جگہ دے دی گئی۔

راقم الحروف کا طالب علمانہ خیال ہے کہ مذکورہ بالا امر کی وجہ ہی سے ہماری اس صدی میں اسلام کی تشریح کے لیے کی جانے والی کوششوں میں انہی دونوں شعبوں کے بارے میں اسلام کی تعلیمات کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی گئی ہے۔

یہ طرز کہاں تک صحیح ہے اور کس حد تک منہاج نبوت کے مطابق ہے؟ اور اس کے نتائج عصر حاضر میں فکر اسلامی پر کیا مرتب ہو رہے ہیں؟ یہ موضوع بہت مفصل گفتگو کا متقاضی ہے۔ یہاں فی الحال تو اس کا موقع نہیں ہے۔ یہاں تو ہمیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یہ جو ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ امت کا ایک بہت بڑا طبقہ، جو اپنے جذبات اور صلاحیتوں کے لحاظ سے ہمارے لیے بہت قدر و احترام کے لائق ہے۔ دعوتوں، تحریکوں اور انقلابوں کو بھی اہم تر اسی پہلو سے جانچنے لگا ہے۔ جو دعوت اور جو تحریک سیاسی پرچم بردار ہو، اور کچھ مار کاٹ مچا دے یا مار کاٹ کی باتیں ہی کر کے ظالم و جابر طاقتوں کے مظالم سے دل ہی دل میں کڑھ کر رہ جانے والے اور احساس مظلومیت کی آگ میں سلگنے والے مسلمانوں کے ذہنی سکون یا بہلاوے کا سامان کر دے، بس وہ دعوت اور وہ تحریک اس لائق ہو جاتی ہے کہ نبوت کی طرح اس پر ایمان لایا جائے اور اس پر ایمان کی دعوت دی جائے اور جو اس کے کچھ دوسرے پہلوؤں کے بارے میں، اس کے عقائد، اس کے مقاصد اور اس کے اصلاحات کے نامہ سیاہ کے بارے میں کچھ سوچنے یا غور کرنے کی بات کرے تو طرح طرح کی تہمتیں لگا کر اس کی بات کو بے وزن کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ در اصل ایک نمونہ ہے۔ اسلام کی تفہیم و تشریح کے اسی طرز سے تشکیل پانے والے ذوق و مزاج کا اور عام مسلمانوں کی فکر و سوچ پر پڑنے والے اس کے اثر کا جس کی طرف ہم نے اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا ہے۔

اب تک تو حالت یہ تھی کہ لوگ صرف خیالات اور نظریات کو جانچتے پرکھتے تھے، ان کے داعی و علمبردار کی عملی زندگی پر نظر کرنے کو غیر ضروری بلکہ نامناسب خیال کرتے تھے —— اب بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ لوگ عقائد، خیالات، اصول، اور جد و جہد کے حقیقی محرکات کو بھی جاننے سے گریز کرتے ہیں بلکہ اس کی کوشش کو خاصا غیر مہذب اور نامناسب کل خیال کرتے ہیں، ان کے نزدیک یہ کافی ہے کہ ایک شخص اسلام کا نام لے رہا ہے۔ اسلام کا نعرہ اپوانہائے حکومت سے بلند کر رہا ہے۔ باہیں جبہ و دستار دنیا کی طاقتوں کو للکار رہا ہے۔ اب کوئی ضرورت نہیں کہ اس کے عقائد اور خیالات کی جانچ پڑتال کی جائے!

—— حیرت ہوتی ہے جب ایسی باتیں ہمارے کانوں میں پڑتی ہیں، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اسلام اور قرآن، کسی مخصوص نظام عقائد و اعمال کا نام نہیں جو چاہو عقیدے رکھو جو چاہو عمل کرو، تم مسلمان ہی رہو گے، اگر تم اسلام اسلام کا نام لیتے رہو!!

ہمارے نزدیک اس طرز فکر کے رواج پانے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام کے صحیح اور کمل فہم اور دین کی سمجھ امت میں بہت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اقتدار و سیاست کا سکہ رائج الوقت، ابناء اسلام کے ذہنوں کو اس طرح مغلوب کر چکا ہے کہ اس لیبل کے ساتھ غلاظت کا ہر ڈھیر بھی مشام جاں کو معطر کرتا رہتا ہے —— اور ہر وہ شخص جو انقلاب کا نعرہ لگائے، وہ امیدوں اور عقیدتوں کا مرکز ہو جاتا ہے، اس کے عقیدہ کا ہر بگاڑ، اور افکار و نظریات کی ہر کجی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے —— جو لوگ اللہ کے دین کے فشار و مزاج سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ دین میں کتنی خطرناک تحریف ہے، اور اس کے نتیجہ میں ہر زیغ و ضلال، اور ہر کفر و باطل کو کتنی آسانی سے ابناء اسلام کے ذہنوں میں راہ مل سکتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے حقیقی اسلام کا چہرہ کیسا مسخ ہو سکتا ہے۔

کہ مکہ میں اسلام اور داعی اسلام کی مخالفت اور ان کو نہ بڑھنے دینے کی اہل مکہ کی ہر منفی کوشش جب ناکام ہوتی دکھائی دینے لگی تو ایک مرحلہ پر انھوں نے "کچھ لو اور کچھ دو" کی بنیاد پر مصالحت و مفاہمت کی بات سوچی، یہ تجویز رکھی گئی کہ آپ ہمارے معبودوں کا احترام کریں،

اور ان کی کچھ تعظیم و عبادت کر لیا کریں، کم از کم ان کو ہاتھ ہی لگا دیا کریں، اور آپ جس معبود کی عبادت کرتے اور دعوت دیتے ہیں ہم اس کا احترام کریں اور اس کی کبھی عبادت کر لیا کریں۔ اس طرح ہمارا آپ کا یہ اختلاف ختم ہو سکتا ہے۔ اسی موقع پر سورۂ کافرون (قل یا ایہا الکافرون .....) نازل ہوئی۔

اس سورت کا تیور اور لب و لہجہ غیر معمولی ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ دعوت حق کے منکروں سے واشگاف اور دو ٹوک انداز میں کہہ دیں کہ (یہ معاملہ لین دین کا نہیں ہے۔ یہ دین کا سب سے اہم بنیادی مسئلہ ہے) تم اپنے جن خود ساختہ معبودوں کی عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کرتا اور نہیں کروں گا۔ (اس کی امید نہ رکھی جائے) اور میں جس خدائے وحدہٗ لا شریک کی عبادت کرتا ہوں تم اس کی عبادت اور پرستش کرنیوالے نہیں۔

اگر عقیدہ کا مسئلہ ویسا ہی ہوتا جیسا کہ آج کل کے ہمارے بہت سے بھائیوں اور اسلام کی سربلندی کے مبارک جذبہ سے سرشار بہت سے نوجوانوں کے ذہن و دماغ میں ہے تو اس وقت حالات کا تقاضا آج کے حالات کی بہ نسبت ہزار گنا زیادہ یہ تھا کہ عقیدہ کی بنیاد پر دشمنی قائم نہ کی جائے اور اس مسئلہ کو اس وقت تک کے لیے ملتوی رکھا جائے جب اسلام کو طاقت حاصل ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شفیق چچا ابو طالب کا معاملہ بھی عقیدہ کی اہمیت کی بڑی واضح دلیل ہے ـــــ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ابو طالب آپ کی حفاظت اور مدد کیا کرتے تھے، اور آپ کے بارے میں ان کے اندر بڑی حمیت تھی، جس کی بنا پر وہ لوگوں کی رضامندی اور ناراضگی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے۔ تو کیا اس کا فائدہ ان کو پہنچے گا؟ آپ نے فرمایا کہ میں نے ان کو آگ کی لپٹوں میں پایا اور کچھ ہلکی آگ تک نکال لایا۔"

اسی طرح صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ابن جدعان جاہلیت کے زمانے میں بڑی صلہ رحمی کرتے تھے، مسکینوں اور غریبوں کو کھانا کھلاتے تھے، تو کیا یہ اُن کے لیے سودمند ہو گا، آپ نے فرمایا، نہیں، ان کو اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو گا، کیونکہ انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ "رب اغفر لی خطیئتی

یوم الدین" (اے میرے رب روز جزا کو میرے گناہ بخش دیجیے گا۔) یعنی اللہ پر اور آخرت پر یقین کے علاوہ حسن اخلاق کے محرکات اگر کچھ اور ہیں تو اس سے انسان کی سیرت و کردار کو سچا سدھار نہیں ملے گا۔ اور آخرت میں اس کا کوئی نفع نہیں پہنچے گا۔

بہرحال یہ ہے اہمیت اسلام میں عقائد اور ان پر ایمان و استقامت کی! اور ہمارا احساس ہے کہ ایرانی انقلاب نے اس اہمیت کو چیلنج کیا ہے ـــــ اور اس کی اندھی تائید نے انبیاء علیہم السلام کے منہاج دعوت کی اس اساسی خصوصیت کو بالکل پس پشت ڈال دینے کا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ اس کا پورا پورا احتساب کیا جائے اور علم و دیانت کے تقاضوں کو سو فیصد ملحوظ رکھتے ہوئے مسئلہ کی سنگینی سے پوری امت کو باخبر کیا جائے۔

یہی احساس ہے جس نے ان حالات میں جبکہ ایران کے انقلاب کے بارے میں مبارکبادوں، تائیدوں، تعریفی تحریروں اور تقریروں اور زبردست عالمگیر پروپیگنڈائی مہم کے نقاروں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے الفرقان اور صاحب الفرقان (مدظلہ) کو اس طرف متوجہ کیا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت کے لیے کی جانے والی ہر کوشش کو صفات قبولیت سے آراستہ فرمائے اور تمام شرور و فتن سے ہماری حفاظت فرمائے۔

لیجیے! اب وہ دو خط ملاحظہ فرمائیے، جن کا انتخاب ہم نے حضرت والد ماجد مدظلہ، کے مضمون (شائع شدہ شمارہ مارچ، اپریل ۱۹۸۴ء) کے بارے میں آنے والے خطوط کے ذخیرہ میں سے کیا ہے۔

پہلا خط حضرت مولانا محمد ناظم ندوی مدظلہ کا ہے۔ مولانا موصوف عربی ادب کے نامور محقق و ماہر، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق استاد و مہتمم، اور عظیم عالم و محقق علامہ سید سلیمان ندوی کے شاگرد اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے سابق استاذ ہیں ـــ والد ماجد مدظلہ سے دیرینہ تعلق ہے۔ الفرقان میں مولانا موصوف کے فکر انگیز مضامین آزادی ہند کے زمانہ میں شائع ہوا کرتے تھے ـــ بلکہ اسی زمانہ میں الفرقان کے کئی اداریے بھی مولانا موصوف کے قلم سے شائع ہوئے تھے۔ مولانا عرصہ دراز سے کراچی میں مقیم ہیں ـــــ اب خط کا اصل متن ملاحظہ فرمائیے۔

مکرم و محترم جناب مولانا محمد منظور نعمانی صاحب دامت فیوضکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ الفرقان کا ایک نمبر بابت مارچ و اپریل موصول ہوا۔ کرم فرمائی کا شکریہ۔ ہم ندویوں کا بھی یہی حال رہا کہ شیعی عقائد کا سرسری علم حاصل کیا، ان کی امہات الکتب سے بھی صرف نام کی حد تک واقفیت رہی مگر ان کا مطالعہ کرنے کا داعیہ و ولولہ پیدا نہیں ہوا۔ لکھنؤ میں عرصہ تک قیام کے باوجود اور شیعی و سنی آویزش اور تصادم کے باوجود ان کے عقائد سے بالکل بے خبری رہی، بلکہ سچی بات عرض کر دوں کہ حضرت مولانا عبدالشکورؒ حامی سنت کی اس تحقیق کو ماننے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ فرقہ شیعہ قرآن کریم کو محرّف اور غیر محفوظ جانتا اور مانتا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ مناظرہ کرنے سے ایک خاص مزاج بن جاتا ہے اور اپنے مخالف کے متعلق مبنی بر غلو و مبالغہ باتیں منسوب کرنے لگتا ہے۔ لیکن ایران کے "اثنا عشری مذہبی انقلاب" کے بعد جب پاکستان میں اس فرقہ نے اپنی قوت کا مظاہرہ شروع کیا اور جماعت اسلامی کے سابق سربراہ مولانا مودودی کے پاس دو قاصد بھیجے، یہ دونوں قاصد ایران میں انقلاب کی کامیابی سے قبل پاکستان آئے تھے۔ اس انقلاب سے قبل کچھ لوگوں کو غلط فہمی پیدا ہوئی تھی کہ یہ دینی اسلامی انقلاب ہے۔ خود مولانا مودودی نے میری معلومات کی حد تک اس انقلاب کے متعلق اپنی کوئی واضح رائے نہیں ظاہر کی تھی، اہلسنت کے علماء جنہوں نے ہمیشہ نامناسب حالات میں دین و عقیدہ کی حفاظت کا عظیم کام انجام دیا ہے انھوں نے میرے پاس بعض تحریریں بھیجیں، جن میں چونکا دینے والی باتیں تھیں، امام منتظر کے متعلق لکھا تھا کہ وہ جب دنیا میں دوبارہ آئیں گے تو ایسا نظام عدل قائم کریں گے کہ ویسا نظام انبیاء علیہم السلام نے بھی نہیں قائم کیا تھا بلکہ خود خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہیں قائم کیا تھا۔

———— اور اسی طرح دوسرے کارہائے نمایاں انجام دینے کی باتیں تھیں۔ ان تحریروں کے بعد مجھے احساس ہوا کہ تحقیق کرنی چاہیے کہ واقعۃً اس قسم کی تحریر ان کی مستند و معتبر کتابوں میں موجود ہے چنانچہ اسی داعیہ کے تحت ان کی معتبر کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اصول کافی کلینی م ۳۲۹ھ، مجلسی م ۱۱۱۱ھ کی متعدد کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، نیز نوری طبرسی کی فصل الخطاب کا ایک نسخہ مجھ کو مل گیا، ان کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات صراحت سے ثابت ہو گئی کہ "اثنا عشری فرقہ قرآن کریم کے محرّف ہونے پر یقین رکھتا ہے اور تقیہ کی بناء پر قرآن کے محفوظ ہونے کا

اعلان کرتا ہے اور حضرت مولانا عبدالشکورؒ نے جو کچھ ان کے عقائد کے متعلق لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے اس میں کسی غلو و مبالغہ پر مبنی بدگمانی کو دخل نہیں ہے، ان کی اکثر معتبر کتب میں قرآن کریم کے محرّف وغیر محفوظ ہونے کا صراحت ذکر موجود ہے۔

طہران سے شیعی عقیدہ پر مبنی کتابیں طبع ہو کر ہند و پاکستان میں آرہی ہیں، ان کتابوں میں فرقہ اثنا عشری کے جارحانہ عزائم اور سنیوں کے عظیم اسلاف کے خلاف دل ہلا دینے والی اشتعال انگیز باتیں موجود ہیں، اگر عالم اسلام کو متحد کرنے کی دعوت دینے والے شیعی زعماء اپنی کتابوں کے مندرجات سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں، ان عقائد اور جارحانہ عزائم کے بعد دعوت اتحاد ایک شاطرانہ فریب کے سوا اور کیا ہے؟ ......

طالب دعا آپ کا قدیم قدر شناس و معترف علم و فضل

محمد ناظم ندوی

مولانا موصوف کے اس مکتوب سے جہاں ایک نمونہ اس کا سامنے آیا ہے کہ عموماً حضرات علمائے کرام شیعیت کے براہ راست مطالعہ سے پہلے اس کے بارے میں کس طرح سوچتے ہیں اور پھر مطالعہ کے بعد ان کے انداز فکر میں کیا تبدیلی آجاتی ہے؟ وہیں اس سے اس کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ایران کی قیادت کی طرف سے باطل کے خلاف دنیائے اسلام کے اتحاد کا جو نعرہ بلند کیا جا رہا ہے وہ "کلمۃ حق ارید بہا الباطل" کا مصداق ہے اور اس کا واحد مقصد افتراق و انتشار سے پریشان اور وحدت امت اور غلبۂ اسلام کی تمنا رکھنے والے بھولے بھالے مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا محمد ناظم صاحب مدظلہ آجکل شیعیت کے بارے میں اردو اور عربی میں ایک کتاب تصنیف فرما رہے ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کی اس سعی کو مبارک فرمائے۔ اور اپنے بندوں کے لیے نافع بنائے۔ ہم سب مولانا کی تصنیف کے مطالعہ اور اس سے استفادہ کے مشتاق ہیں۔

اور لیجیے اب دوسرا خط ملاحظہ کیجیے، اس سے یہ اندازہ کرنا آسان ہو جائے گا کہ اس پروپیگنڈائی مہم کا اثر عالمی طور پر کیا پڑ رہا ہے۔ اور ہمارے سادہ لوح بھائی ایرانی انقلابیوں اور ان کے ایجنٹوں کی لن ترانیوں سے کس قدر گمراہ ہو رہے ہیں؟

مکتوب نگار گجرات کے ایک باتوفیق خاندان کے ایک باتوفیق فرد جناب محمد خالد نیہا رضا صاحب

ہیں، جو ایک جماعت کے ساتھ ویسٹ انڈیز (جزائر غرب الہند) گئے تھے، وہاں سے واپسی میں راستہ ہی سے سفر کی کارگذاری پر مشتمل انھوں نے یہ خط حضرت والد ماجد مدظلہ کے نام لکھا تھا، اس خط کا وہ حصہ جو ہمارے موضوع سے متعلق ہے، پیش خدمت ہے۔

"یہ خط ہوائی جہاز سے لکھ رہا ہوں جبکہ ہم بار باڈوز ویسٹ انڈیز سے لندن کی طرف مائل پرواز ہیں، تبلیغی جماعت کے ساتھ ہی چار مہینے کے لیے ویسٹ انڈیز آیا ہوا تھا، اور اب ہندوستان واپس جانے کے لیے لندن کی طرف پرواز کر رہا ہوں۔ امید ہے وسط رمضان تک انشاء اللہ ہندوستان ہم آئیں گے۔

ہمارا سفر بار باڈوز، ٹرینیڈاد، گیانا، دوسری نام میں ہوا، بار باڈوز ٹرینیڈاد میں کسی درجہ میں دینداری ہے لیکن گیانا اور سری نام میں جہالت اس قدر ہے کہ الامان! الحفیظ!

اس خط لکھنے کا خاص محرک یہ بات ہے کہ میں نے اس سفر کے دوران جو فروری ۱۹۸۴ء سے شروع ہوا تھا یہ دیکھا کہ ایرانی لٹریچر حد سے زیادہ یہاں چاروں جگہوں پر آرہا ہے اور یہاں کے بھولے بھالے لوگ لاعلمی سے اسے سنی مساجد میں قرآن شریف کے ساتھ سجا کر رکھتے ہیں۔ اور آیت اللہ خمینی کی خوب تعریف کرتے ہیں اور ایرانی انقلاب کو فتح اسلام سمجھ رہے ہیں۔ ہم نے اپنی مقدور بھر کوشش کر کے لوگوں کو سمجھایا کہ شیعہ اور شیعیت کیا چیز ہے اور ہم سنیوں کو ان سے کتنا بچ کر رہنا چاہیے۔ یہاں کے لوگ اس قدر متاثر ہیں کہ جو سنی مسلمان دین کی پابندی کرے تو اسے اعزازاً آیت اللہ کہتے ہیں۔

سفر کے آخر میں جب ہم بار باڈوز پہنچے تو اپریل کا الفرقان بار باڈوز میں ایک صاحب کے پاس ملا، اور بالتفصیل کی طرح اس میں آپ کا مضمون خمینی صاحب کے بارے میں اور شیعیت کے بارے میں پڑھنے کو ملا۔ اس قدر نفع والا مضمون محسوس ہوا کہ جی چاہتا ہے آپ کو مبارکباد پیش کروں، اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و قوت عطا فرمائے اور آپ کے سایہ کو ہم سب کے سروں پر تا دیر قائم و دائم رکھے اور امت محمدیہ کو آپ کے قلم سے اور آپ کے علم سے نفع پہونچائے۔ آمین۔ وقت کی ضرورت کے اعتبار سے پورا مضمون (جو ابھی ہم تک ادھورا ہی پہونچا ہے) انشاء اللہ ایسا ہوگا کہ اسے ضرور کتابی شکل میں اردو اور انگریزی میں شائع ہونا چاہیے"

ایک تازہ انکشاف :-

خمینی صاحب اپنی کتاب کشف الاسرار کے آئینہ میں

اب سے تین مہینے پہلے مارچ اپریل کے مشترک شمارہ میں ایرانی انقلاب اور خمینی صاحب کے متعلق راقم سطور کا جو مضمون ناظرین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہوگا (جو دراصل ایک مقالہ کا ابتدائی حصہ تھا) وہ سنہ رواں ۱۹۸۴ء کے اوائل میں لکھا گیا تھا۔ اس میں خمینی صاحب کے معتقدات خاص کر حضرات شیخین اور عام صحابہ کرام سے متعلق اُن کے عقیدہ اور رویہ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ان کی صرف ایک کتاب "الحکومۃ الاسلامیہ" کی بنیاد پر لکھا تھا اُس وقت میرے سامنے ان کی صرف یہی ایسی کتاب تھی جس میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امامت وولایت کے منصب پر حضرت علی مرتضیٰ کی نامزدگی کا جا بجا اس طرح ذکر کیا تھا جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ جیسا کہ ناظرین کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں دو اور دو چار کی طرح یہ نکلتا تھا کہ حضرات خلفائے ثلاثہ اور اُن تمام صحابہ کرام کو جنھوں نے ان حضرات کو خلیفۂ رسول اور امت کا دینی و دنیوی سربراہ تسلیم کرکے ان سے بیعت کی تھی سب کو (معاذ اللہ) اللہ و رسول کا غدار، اور مرتد و منحرف قرار دیا جائے؛ لیکن جیسا کہ راقم سطور نے عرض کیا تھا خمینی صاحب نے ان سب حضرات پر یہ فردِ جرم اس کتاب میں ایسی ہوشیاری اور فنکاری سے لگائی تھی اور ایسی

پردہ داری سے کام لیا تھا کہ پوری کتاب میں ان میں سے کسی ایک کا بھی نام نہیں آیا تھا، اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ ایسا انھوں نے اپنی کس سیاسی مصلحت سے کیا تھا۔

لیکن ماہ رواں رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ (جون ۱۹۸۴ء) میں اللہ تعالیٰ کی تائید غیبی سے مجھے خمینی صاحب کی ایک دوسری کتاب "کشف الاسرار" مل گئی۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔ (جو بظاہر شیعانِ ایران ہی کے لیے لکھی گئی ہے) یہ قریباً ساڑھے تین سو صفحے کی ضخیم کتاب ہے اس میں انھوں نے شیخین (حضرت ابو بکر صدیق و حضرت عمر فاروقؓ) اور حضرت عثمان ذو النورین پر نام لیکر اور عام صحابہ کرام پر ٹھیٹ تبرائی شیعوں کی طرح کیچڑ اچھالی ہے اور اپنے ناظرین کو بتلایا ہے کہ (معاذ اللہ) یہ خلفائے ثلاثہ اور ان کے خاص رفقا (یعنی تمام اکابر صحابہ) صرف دنیا کے طالب اور انتہائی درجہ کے بدکردار تھے، انھوں نے حکومت اور اقتدار کی طمع ہی میں صرف زبان سے اسلام قبول کیا تھا، یہ صرف ظاہر میں مسلمان لیکن باطن میں کافر اور زندیق تھے۔ یہ اپنے اس مقصد و نصب العین کے لیے ہر ناکردنی کر سکتے تھے۔ اس کے لیے اگر ضرورت ہوتی تو قرآن میں تحریف بھی کر سکتے تھے، جھوٹی حدیثیں بھی گڑھ سکتے تھے، ان کے دل خدا کے خوف سے بالکل خالی تھے اور وہ فی الحقیقت ایمان سے محروم تھے وہ اگر یہ دیکھتے کہ یہ مقصد اسلام چھوڑ کے اور ابوجہل و ابولہب کی طرح اس کی دشمنی کا موقف اختیار کر کے ہی حاصل ہو سکتا ہے تو یہ بھی کر گزرتے۔

ہم ذیل میں اس کتاب "کشف الاسرار" کی اصل فارسی عبارتیں درج کریں گے اور فارسی نہ جاننے والے ناظرین کی سہولت فہم کے پیشِ نظر اردو میں ان عبارتوں کا عام فہم حاصل مطلب ہی لکھیں گے۔

یوں تو اس کتاب میں بیسیوں صفحات مختلف مقامات پر ایسے ہیں جن میں حضرات خلفائے ثلاثہ اور صحابہ کرام پر کیچڑ اچھالی گئی ہے اور ان کی شان میں انتہائی درجہ کی دل آزار گستاخیاں کی گئی ہیں۔ لیکن یہاں ہم ان میں سے صرف ایک ہی بحث

کی چند عبارتیں نذرِ ناظرین کرتے ہیں۔ ملحوظ رہے کہ اس مقالہ میں ہمارا مقصد جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے خمینی صاحب کی مذہبی حیثیت اور ان کے معتقدات سے ناظرین کو صرف واقف کرانا ہے اس لیے ہم صرف ان کی باتیں ناظرین کے سامنے پیش کریں گے۔ ان کی غلط سے غلط باتوں کی تردید بھی اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

خمینی صاحب نے اس کتاب کے صفحہ ۱۱۲ پر "گفتارِ شیعہ در بابِ امامت" کا عنوان قائم کر کے پہلے مسئلہ امامت کے بارے میں شیعہ سنی اختلافات کا ذکر اور شیعی نقطہ نظر بیان فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علی اور حسن و حسین اور سلمان فارسی اور ابوذر غفاری اور مقداد اور عمار اور عباس و ابن عباس جیسے حضرات نے امامت و خلافت کے بارے میں چاہا اور لوگوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق عمل کیا جائے (یعنی حضرت علی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصی اور آپ کا جانشین امام اور ولی الامر مان لیا جائے) لیکن وہ پارٹی بندی اور طمع و ہوس جس نے ہمیشہ حقیقتوں کو پامال کیا ہے اور غلط کام کرائے ہیں اس نے اس موقع پر بھی اپنا کام کیا ـــــ مذکورہ بالا حضرات (یعنی حضرت علی وغیرہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین کے کام میں مشغول تھے کہ سقیفہ بنی ساعدہ کے جلسہ میں ابوبکر کا انتخاب کر لیا گیا اور یہ (عمارتِ خلافت کی "خشتِ اول" (پہلی اینٹ) تھی جو ٹیڑھی رکھی گئی۔ وہیں سے اختلاف شروع ہو گیا ـــــ شیعہ کہتے ہیں کہ امام کی تعیین اور نامزدگی خدا کی طرف سے ہونی چاہیے اور اسی کی طرف سے علی اور ان کی اولاد میں سے ائمہ معصومین اولی الامر نامزد ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو ائمہ اولی الامر متعین اور نامزد کیا ہے۔

خمینی صاحب نے امامت و خلافت کے بارے میں اپنا اور اپنے فرقہ شیعہ اثنا عشریہ کا یہ موقف اور دعویٰ بیان کرنے کے بعد مندرجہ ذیل سوالیہ عنوان قائم

کر کے لکھا ہے :-

خدا قرآن صریحاً اسم امام را نبردہ

"پس از آنکہ بحکم خرد و قرآن روشن شد کہ امامت یکے از اصول مہمہ اسلام است و خدا این اصل مسلم را در چند جائے قرآن ذکر کردہ اینک در جواب این گفتار میپردازیم کہ چرا خدا اسم امام را با این ہمہ شناسنامہ ذکر نکردہ تا خلاف برداختہ شود و اینہمہ خونریزی نشود ؟" کشف الاسرار ص۱۱۲

سوال کا حاصل یہ ہے کہ اگر حضرت علی اور ان کی اولاد میں سے ائمہ معصومین کی امامت کا مسئلہ (خمینی صاحب اور عام شیعوں کے دعوے کے مطابق) از روئے عقل اور از روئے قرآن اسلام کے اہم اصولوں میں سے ہے اور قرآن میں چند جگہ اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ تو پھر خدا نے قرآن میں امام کا نام کیوں ذکر نہیں کر دیا؟ اگر صراحت کے ساتھ امام کا نام قرآن میں ذکر کر دیا جاتا تو اس مسئلہ میں امت میں اختلاف پیدا نہ ہوتا اور جو خونریزیاں ہوئیں وہ نہ ہوتیں ؟

خمینی صاحب کے جوابات :-

خمینی صاحب نے اس سوال کے چند جوابات دیے ہیں، ان میں سے پہلے دو جوابوں کا چونکہ ہمارے موضوع سے خاص تعلق نہیں ہے اس لیے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں، تاہم اُن کے بارے میں بھی اتنا عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کتاب "الحکومۃ الاسلامیہ" اور "تحریر الوسیلہ" کے مطالعہ سے (عقیدہ سے قطع نظر) اُن کے علم و دانش کے بارہ میں جو اندازہ ہوا تھا یہ دو جواب اس سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے، بلکہ اس بات کی دلیل اور مثال ہیں کہ جب کوئی صاحب علم و دانش آدمی بھی ایک غلط عقیدہ قائم کر لیتا ہے اور اس کی حمایت کے لیے کمربستہ ہو جاتا ہے تو انتہائی درجہ کی بے تکی جاہلانہ اور سفیہانہ باتیں بھی اُس سے سرزد ہوتی ہیں، اگر ہم کو خمینی صاحب پر تنقید اور ان کی تنقیص

دلچسپی ہوتی تو ہم ان دو جوابوں کو بھی نقل کرتے اور ان پر بحث کر کے ناظرین کو دکھاتے کہ خالص علم و دانش کے لحاظ سے یہ دونوں جواب کس قدر لچر اور بے تکے ہیں۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا چونکہ ان کا ہمارے موضوع سے تعلق نہیں اس لیے ہم نے ان کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

خمینی صاحب نے اس سوال کا تیسرا جواب یہ دیا ہے جس کا ہمارے موضوع سے تعلق ہے۔

"۳۔ آنکہ فرضاً در قرآن اسم امام را ہم تعیین میکرد از کجا کہ خلاف بین مسلمانہا واقع نمیشد آنہائیکہ سالہا در طمع ریاست خود ابدین پیغمبر چسپاندہ بودند و دستہ بندیہا میکردند ممکن نبود بگفتہ قرآن از کار خود دست بردارند، با ہر حیلہ بود کار خود را انجام میدادند بلکہ شاید در اینصورت خلاف بین مسلمانہا طورے میشد کہ بانہدام اصل اسلام منتہی میشد، زیرا کہ ممکن بود آنہا کہ در صدد ریاست بودند چون دیدند کہ باسم اسلام نمیشود بمقصود خود برسند یکدستہ حزبے بر ضد اسلام تشکیل میدادند" ...... الخ

کشف الاسرار صفحہ ۱۱۳-۱۱۴

اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ اگر بالفرض قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے لیے امام کا (یعنی حضرت علیؓ کا) نام بھی ذکر کر دیا جاتا تو یہ کہاں سے سمجھ لیا گیا کہ اس کے بعد امامت و خلافت کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف نہ ہوتا۔ جن لوگوں نے حکومت و ریاست کی طمع ہی میں برسہا برس سے اپنے کو دین پیغمبر یعنی اسلام سے وابستہ کر رکھا اور چپکا رکھا تھا اور جو اسی مقصد کے لیے سازش اور پارٹی بندی کرتے رہے تھے، اُن سے ممکن نہیں تھا کہ قرآن کے فرمان کو تسلیم کر کے اپنے مقصد اور اپنے منصوبے سے دستبردار ہو جاتے، جن حیلے اور جس ہتھکنڈے سے بھی ان کا مقصد (یعنی حکومت) حاصل ہوتا وہ اس کو استعمال کرتے

اور ہر قیمت اپنا منصوبہ پورا کرتے۔ بلکہ شاید اس صورت میں مسلمانوں کے درمیان ایسا اختلاف پیدا ہوتا جس کے نتیجہ میں اسلام کی بنیاد ہی منہدم ہو جاتی، کیونکہ ممکن تھا کہ اسلام قبول کرنے سے جن لوگوں کا مقصد و نصب العین صرف حکومت و اقتدار حاصل کرنا تھا، جب وہ دیکھتے کہ اسلام کے نام سے اور اس سے وابستہ رہ کر ہم یہ مقصد حاصل نہیں کر سکتے تو اپنا یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے اسلام ہی کے خلاف ایک پارٹی بنا لیتے اور اسلام کے کھلے دشمن بن کر میدان میں آجاتے...

یہ کن بدبختوں کا ذکر ہے؟

ہمارے بعض بھائی جو شیعہ مذہب سے واقف نہیں ہیں وہ شاید نہ سمجھ سکے ہوں کہ خمینی صاحب کن بدبخت لوگوں کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ وہ حکومت و ریاست ہی کی طمع و طلب میں اسلام میں داخل ہوئے تھے اور اسی کی امید میں اس سے چپکے رہے اور اگر قرآن میں امت کے امام اور صاحب حکومت کی حیثیت سے حضرت علی کے نام کی صراحت بھی کر دی جاتی تب بھی وہ لوگ اس کو نہ مانتے، یہاں تک کہ اگر وہ دیکھتے کہ اسلام چھوڑ کے اور اس کی دشمنی کا موقف اختیار کر کے وہ حکومت و اقتدار حاصل کر سکتے ہیں تو وہ ایسا ہی کرتے اور اسلام کے کھلے دشمن بن کر میدان میں آجاتے۔

تو ان ناواقف بھائیوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مذہب شیعہ کے معروف مسلمات میں سے یہ بھی ہے کہ خلفائے ثلاثہ کا یہی حال تھا۔ حضرت ابوبکر کو ان کے ایک کاہن دوست نے (اور ایک دوسری شیعی روایت کے مطابق کسی یہودی عالم نے) بتلایا تھا کہ محمد بن عبداللہ نبی ہوں گے اور ان کی حکومت قائم ہو جائے گی، تم ان کے ساتھ لگ جاؤ گے تو ان کے بعد تم ان کی جگہ حکمراں ہو جاؤ گے تو (معاذ اللہ) ابوبکر نے اس کاہن (یا یہودی) کے کہنے کی بنیاد پر حکومت ہی کی طمع میں بظاہر اسلام قبول کیا تھا ——— "حملۂ حیدری" کا مصنف باذل ایرانی، کاہن والی کہانی بیان

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کرتے ہوئے لکھتا ہے

باد کاہنے دادہ بود یک خبر — کہ مبعوث گردد یکے نامور
زبطحا زمیں در ہمیں چند گاہ — بود خاتم انبیاے الہ
تو با خاتم انبیا بگروی — چو او بگذرد جانشینش شوی
زکاہن چو بودش بیاد ایں نوید — بیاورد ایماں نشاں چوں بدید

(حملہ حیدری ص۱۲۱۔ بحوالہ آیات بینات ص۴۶)

اور اسی حملہ حیدری میں ہے۔

خبر دادہ بودند چوں کاہناں — کہ دین محمد بگیرد جہاں
ہمہ پیرو انش بعزلت رسند — تمام اہل انکار ذلت کشند

(حملہ حیدری صفحہ ۱۵ بحوالہ آیات بینات ص۴۰)

اور شیعوں کے معروف مصنف علامہ باقر مجلسی نے رسالہ رجعیہ میں بارھویں امام معصوم (امام مہدی) کی طرف نسبت کرکے ان کا ارشاد نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ

ایشاں از روئے گفتۂ یہود بظاہر کلمتین گفتند از برائے طمع اینکہ شاید ولایتے و حکومتے حضرت بایشان بدہد و در باطن کافر بودند

بحوالہ آیات بینات ص۴۳-۴۴

انھوں نے یہود کے بتلانے کے مطابق کلمۂ توحید اور کلمۂ رسالت زبان سے پڑھ لیا تھا اس لالچ اور اس امید میں کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکومت اور اقتدار ان کو دیدیں اور اپنے باطن میں اور دل میں یہ کافر ہی تھے

بہرحال خمینی صاحب نے اپنی مندرجہ بالا عبارت میں حضرات خلفائے ثلاثہ

ل دگذشتہ صفحہ کا حاشیہ) حملۂ حیدری شیعہ حضرات کی مقبول ترین کتابوں میں سے ہے یہ شیعی نقطۂ نظر کے مطابق تاریخ اسلام کا منظوم دفتر ہے۔ اس کا مصنف باذل ایرانی بڑا قادر الکلام شاعر ہے۔ یہ کتاب ہندوستان میں پہلی بار تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے [illegible]ھ میں مطبع سلطانی لکھنؤ میں اس دور کے مجتہد اعظم سید محمد صاحب کی اصلاح اور تحشیہ کے ساتھ طبع ہوئی تھی۔

اور ان کے رفقاء کار تمام اکابر صحابہ ہی کے بارے میں فرمایا ہے کہ اسلام میں داخل ہونے سے ان کا مقصد صرف حکومت و اقتدار حاصل کرنا تھا اور اس کے لیے یہ قرآن کے صریح فرمان کی مخالفت کر سکتے تھے اور اگر یہ دیکھتے کہ یہ مقصد اسلام چھوڑ کے اور (ابوجہل و ابولہب کی طرح) اس کی دشمنی کا موقف اختیار کر کے حاصل ہو سکتا ہے تو یہ لوگ بے دریغ یہ بھی کر گزرتے[1] (آگے اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے خمینی صاحب نے حضرات شیخین کا نام لیکر بھی مشق تبرا فرمائی ہے جیسا کہ ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے۔)

یہاں تک خمینی صاحب کے جواب ۳ پر گفتگو ہوئی۔ اب ناظرین کرام ان کا جواب ۴ ملاحظہ فرمائیں۔

> ۴۔ آنکہ ممکن بود درصورتیکہ امام را در قرآن ثبت میکردند آنہانیکہ جز برائے دنیا و ریاست با اسلام و قرآن سروکار نداشتند و قرآن را وسیلۂ اجرائے نیات فاسدہ خود کردہ بودند آں آیات را از قرآن بردارند و کتاب آسمانی را تحریف کنند و برائے ہمیشہ قرآن را از نظر جہانیاں بیندازند و تا روز قیامت ایں ننگ برائے مسلمانہا و قرآن آنہا بماند و ہماعیبے راکہ مسلمانان بکتاب یہود و نصاریٰ میگرفتند عیناً برائے خود اینہا ثابت شود۔　　(کشف الاسرار ص۱۱۴)

خمینی صاحب کے اس جواب ۴ کا حاصل یہ ہے کہ ــــ اگر اللہ تعالیٰ قرآن میں امام کا نام بھی صراحۃً ذکر فرما دیتا تو جن لوگوں نے اسلام اور قرآن سے صرف دنیا

---

[1] چونکہ اس وقت ہمارا اصل خطاب اہلسنت سے ہے اس لیے ہم ان خرافات کی تردید میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے، ہمیں یقین ہے کہ ہر مسلمان بلکہ وہ غیر مسلم بھی جو اسلام اور اس کی تاریخ کے بارے میں کچھ جانتے ہیں ان خرافات کو خرافات ہی سمجھیں گے اور دیوانے کی بڑ سے زیادہ وقعت نہ دینگے۔
قاتلهم الله انّی یؤفکون ۝

اور حکومت ہی کے لیے تعلق قائم کیا تھا اور قرآن کو انھوں نے اپنی اغراض فاسدہ کا ذریعہ اور وسیلہ بنا لیا تھا اور اس کے سوا اسلام اور قرآن سے ان کو کوئی سروکار نہیں تھا، ان کے لیے بالکل ممکن تھا کہ ان آیتوں کو (جن میں امام کا نام ذکر کیا گیا ہوتا) وہ قرآن سے نکال دیتے اور اس مقدس آسمانی کتاب میں تحریف کر دیتے اور قرآن کے اس حصہ کو ہمیشہ کے لیے دنیا والوں کی نظر سے غائب کر دیتے۔ اور روز قیامت تک مسلمانوں اور ان کے قرآن کے لیے یہ بات باعث شرم و عار ہوتی۔ اور مسلمانوں کی طرف سے یہود و نصاریٰ کی کتابوں کے بارے تحریف کا جو اعتراض کیا جاتا ہے وہی اعتراض ان پر اور ان کے قرآن پر عائد اور وارد ہوتا۔

خمینی صاحب کے جواب ۳ کی وضاحت کرتے ہوئے اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے بعد اس جواب ۴ پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں، اس میں خمینی صاحب نے اپنے اس عقیدہ کا عام تبرائی شیعوں کی طرح صفائی سے اظہار فرمایا ہے کہ حضرات خلفائے ثلاثہ اور ان سے بیعت کر کے مخلصانہ تعاون کرنے والے تمام ہی صحابہ کرام نے (معاذ اللہ) صرف دنیا اور حکومت و ریاست کی طمع میں اسلام سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق جوڑا تھا اور وہ اپنے اس مقصد کے لیے ہر نا کردنی کر سکتے تھے یہاں تک کہ قرآن میں تحریف بھی کر سکتے تھے ـــــ اس کے بعد خمینی صاحب کا جواب ۵ ملاحظہ فرمایا جائے۔

۵۔ فرضا کہ ہیچ یک از یں امور نمیشد باز خلاف از بین مسلمانہا برنمیخواست زیرا ممکن بود آں حزب ریاست خواہ کہ از کار خود ممکن نبود دست بردارند فوراً یک حدیث بپیغمبر اسلام نسبت دہند کہ نزدیک رحلت گفت دمرشما با شوریٰ باشد، علی بن ابی طالب را خدا از یں منصب خلع کرد۔ کشف الاسرار ص۱۱۴

خمینی صاحب کے اس جواب ۵ کا حاصل یہ ہے کہ فرض کر لیا جائے کہ اگر قرآن میں صراحت کے ساتھ امام اور ولی الامر کی حیثیت سے حضرت علی کا نام صراحت کے

ساتھ ذکر کردیا جاتا اور جواب ۳ و ۴ میں ہم نے جن باتوں کا ذکر کیا اُن میں سے کبھی کوئی بات ظہور میں نہ آتی اور قرآن میں تحریف کبھی نہ کی جاتی اور وہ آیت جوں کی توں قرآن میں موجود ہوتی جس میں علی بن ابی طالب کی امامت کی صراحت کی گئی ہوتی تب بھی یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ امامت و خلافت کے مسئلہ میں مسلمانوں میں وہ اختلاف نہ ہوتا جو ہوا۔ کیونکہ جو پارٹی (یعنی (معاذ اللہ) ابوبکر و عمر کی پارٹی) صرف حکومت و اقتدار کی طالب تھی اور اسی کی طمع اور امید میں اُس نے اپنے کو اسلام کے ساتھ چپکا یا تھا، ممکن نہ تھا کہ وہ قرآن کی اس آیت کی وجہ سے اپنے مقصد سے دست بردار ہو جاتی، وہ لوگ فوراً ایک حدیث اس مضمون کی وضع کر کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کر کے پیش کر دیتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری وقت میں فرمایا تھا کہ تمھاری امارت و حکومت کا معاملہ باہمی مشورہ سے طے ہو گا۔ علی بن ابی طالب کو خدا نے امامت کے منصب سے معزول کر دیا ہے۔ ——— خمینی صاحب کا یہ جواب بھی ان کے باطن کا پورا آئینہ دار ہے اور کسی وضاحت اور تبصرہ سے بے نیاز ہے۔

اس جواب ۵ کے بعد خمینی صاحب نے حضراتِ شیخین کا نام لیکر مشق تبرّا فرمائی ہے۔ پہلے عنوان قائم فرمایا ہے "مخالفتہائے ابوبکر با نص قرآن" اس کے بعد دوسرا عنوان قائم کیا ہے "مخالفت عمر با قرآن خدا" پہلے عنوان کے تحت فرمایا ہے:-

"شاید بگوئید اگر در قرآن امامت تصریح میشد شیخین مخالفت نمیکردند، و فرضاً آنہا مخالفت میخواستند بکنند مسلمانہا از آنہا نمی پذیرفتند۔

ناچار درین مختصر چند مادہ از مخالفتہائے آنہا تصریح قرآن ذکر میکنیم تا روشن شود کہ آنہا مخالفت میکردند و مردم ہم میپذیرفتند"۔

کشف الاسرار ص ۱۱۵

مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کہیں کہ قرآن میں اگر صراحت کے ساتھ حضرت علی کی امامت و ولایت کا ذکر کر دیا جاتا تو شیخین (ابو بکر و عمر) اُس کے خلاف نہیں کر سکتے تھے،

اور اگر بالفرض وہ اس کے خلاف کرنا چاہتے تو عام مسلمان قرآن کے خلاف ان کی اس بات کو قبول نہ کرتے اور ان کی بات نہ چل سکتی۔ (خمینی صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ خیال اور یہ خوش گمانی غلط ہے) ہم اس کی چند مثالیں یہاں پیش کرتے ہیں کہ ابو بکر نے اور اسی طرح عمر نے قرآن کے صریح احکام کے خلاف کام اور فیصلے کیے اور عام مسلمانوں نے ان کو قبول بھی کر لیا، کسی نے مخالفت نہیں کی۔

اس کے بعد خمینی صاحب نے (اپنے خیال کے مطابق) اس کی تین مثالیں حضرت ابو بکر صدیق سے متعلق پیش کی ہیں ان میں پہلی مثال غالباً سب سے زیادہ وزنی سمجھ کر خمینی صاحب نے یہ پیش فرمائی ہے کہ قرآنی آیات اور اس کے بیان فرمائے ہوئے قانون وراثت کی رو سے آپ کی صاحبزادی فاطمہ زہرا آپ کے ترکہ کی وارث تھیں لیکن ابو بکر نے خلیفہ ہونے کے بعد صریح قرآنی حکم کے خلاف ان کو ترکہ سے محروم کر دیا اور رسول خدا کی طرف سے یہ حدیث گھڑ کے لوگوں کے سامنے پیش کر دی "انا معشر الانبیاء لا نورث ما ترکناہ صدقۃ" (کشف الاسرار ص ۱۱۵) (ہم پیغمبروں کا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو کچھ چھوڑیں صدقہ ہے)

خمینی صاحب نے ابو بکر صدیق کی مخالفت قرآن کی یہ پہلی مثال پیش فرمائی ہے ـــــ جیسا کہ پہلے بھی ہم عرض کر چکے ہیں خمینی صاحب کی باتوں کا جواب دینا اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے تاہم یہاں اتنا اشارہ کر دینا ہم نامناسب نہیں سمجھتے کہ حضرت ابو بکر صدیق نے یہ حدیث بیان فرما کر خود اپنی صاحبزادی حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت عمر کی صاحبزادی حضرت حفصہ کو بھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ ہونے کی حیثیت سے آپ کی وارث تھیں آپ کے ترکہ سے ان کا حصہ نہیں دیا۔

صدیق اکبر کی مخالفت قرآن کی خمینی صاحب کی طرف سے پیش کی ہوئی یہ پہلی مثال تھی۔ باقی دو مثالیں بھی اسی طرح کی ہیں ـــــ اس کے آگے خمینی صاحب

نے "مخالفت عمر با قرآن خدا" کا عنوان قائم کر کے چار مثالیں حضرت عمرؓ سے متعلق ذکر کی ہیں۔ جن میں سب سے پہلی مثال (غالباً اپنے دعوے کی سب سے زیادہ روشن اور وزنی دلیل سمجھتے ہوئے) خمینی صاحب نے یہ پیش فرمائی ہے کہ متعہ کو قرآن میں جائز قرار دیا گیا تھا[1]، عمرؓ نے قرآنی حکم کے خلاف اس کو حرام قرار دیدیا۔ باقی تین مثالیں بھی اسی طرح کی اور اسی وزن کی ہیں۔ ع

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

حقیقت یہ ہے کہ یہ مثالیں ان حضرات شیخین اور عام صحابہ کرام کے خلاف خمینی صاحب کے قلبی عناد اور سیاہ باطنی کی دلیلیں ہیں۔ اور چونکہ یہ سب وہی گھسے پٹے سدا عن اور مباحث ہیں جن پر گزشتہ سات آٹھ صدیوں میں، عربی، فارسی اور اردو میں بھی بلا مبالغہ سیکڑوں نہیں، ہزاروں چھوٹی بڑی کتابیں اور مضامین و مقالات لکھے جا چکے ہیں، اس لیے ہم نے ان مثالوں کا ذکر کرنا اور ان پر تبصرہ کرنا غیر ضروری سمجھا۔ نیز یہ کہ ساتویں اور آٹھویں صدی کے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سے لیکر ہماری چودھویں صدی کے حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی تک اہل سنت کے متکلمین و مصنفین نے ان موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے (جو بجائے خود ایک وسیع کتب خانہ ہے) راقم سطور کے نزدیک اس پر کسی اضافہ کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔

علاوہ ازیں جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے ہمارے اس مقالہ کا موضوع شیعہ سنی اختلافی مسائل پر بحث مباحثہ نہیں ہے۔ اس میں ہمارا خطاب اہل سنت ہی سے، خاص کر ان پڑھے لکھے اور دانشور کہلائے جانے والے حضرات سے ہے جو اس پروپیگنڈے سے متاثر ہیں جو ایرانی سفارت خانوں اور ان کے ایجنٹوں کے ذریعہ خمینی صاحب کی شخصیت کے بارے میں کیا جا رہا ہے کہ وہ شیعہ سنی اختلاف سے

---

[1] ہمارے اکثر ناظرین واقف نہوں گے کہ متعہ شیعہ مذہب میں صرف جائز اور حلال ہی نہیں ہے بلکہ اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔ انشاء اللہ اس بارہ میں اپنے موقع پر تفصیل سے ذکر کیا جائے گا۔

بالاتر بلکہ بیزار ہیں، وحدت اسلامی کے داعی ہیں، حضرات خلفائے راشدین کا احترام کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو وہ شیطان قرار دیتے ہیں جو شیعہ سنی اختلاف کی بات کریں ۔ ـــــــ یہ پروپیگنڈا (جو سو فی صد تقیہ اور جھوٹ پر مبنی ہے) اس طرح کیا جارہا ہے کہ زمین و آسمان کے درمیان کی پوری فضا اس سے بھر دی گئی ہے[1]۔

الغرض اس مقالہ میں ہمارا خاص خطاب اہل سنت میں سے انہی حضرات سے ہے جو حقیقت سے ناواقفی اور سادہ لوحی کی وجہ سے اس پروپیگنڈے پر یقین کرتے ہیں ۔ ـــــــ ہمارا مقصد انہی حضرات کو خمینی صاحب کی حقیقت اور حضرات خلفائے راشدین اور عام صحابہ کرام اور اہل سنت کے بارے میں ان کے خیالات اور موقف سے واقف کرانا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر عقلیں مسخ نہیں کر دی گئی ہیں اور ہدایت سے محرومی کا فیصلہ نہیں کر دیا گیا ہے تو خمینی صاحب کی جو عبارتیں ان صفحات میں ان کی کتاب "کشف الاسرار" سے نقل کی گئی ہیں وہی اس مقصد کے لیے کافی ہیں ۔

ہاں اس سلسلہ میں حضرت فاروق اعظم کی شان میں خمینی صاحب کا ایک انتہائی دل آزار اور دلخراش جملہ ہم دل پر جبر کر کے ان فریب خوردہ حضرات کی عبرت و بصیرت

---

[1] ہندوپاکستان کے ایرانی سفارتخانوں اور ان کی ایجنسیوں اور ایجنٹوں کے ذریعہ اخبارات و رسائل اور پمفلٹوں کی شکل میں اردو زبان میں جو پروپیگنڈہ اس سلسلہ میں کیا جارہا ہے اس کا حال تو کسی قدر تفصیل سے معلوم ہے ۔ لیکن یورپ، امریکہ، افریقہ جیسے ممالک کے بارے میں خطوط اور دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وہاں کی زبانوں میں یہ پروپیگنڈہ اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانے پر اور زور وشور سے کیا جارہا ہے اور عام طور سے پڑھے لکھے مسلمان جو حقیقت سے بالکل واقف نہیں اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر خمینی صاحب کے بارے میں ایسا ہی یقین رکھتے ہیں ـــ ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ تقیہ (یعنی جھوٹ بول کر دوسروں کو دھوکا دینا) شیعہ مذہب میں صرف جائز نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کی عبادت اور ائمہ معصومین کی سنت ہے ۔ مذہب شیعہ کی معتبر کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے کہ سنیوں کے ساتھ جماعت میں ان کے امام کے پیچھے ازراہ تقیہ جو نماز پڑھی جائے اس کا ثواب پچیس درجہ زیادہ ہو گا ـــ (انشاء اللہ آگے اپنے موقع پر اس موضوع پر تفصیل سے عرض کیا جائے گا ۔

کے لیے اور نقل کرتے ہیں۔

خمینی صاحب نے "مخالفتِ عمر با قرآن خدا" کے عنوان کے تحت، سب سے آخر میں حدیث قرطاس" کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلۂ کلام میں فاروق اعظم کی شان میں اُن کے آخری الفاظ یہ ہیں:۔

"ایں کلام یاوہ کہ از اصل کفر و زندقہ ظاہر شدہ مخالف است با آیاتے از قرآن کریم" (کشف الاسرار ص۱۱۹)

اس جملہ میں حضرت فاروق اعظم کو صراحۃً کافر و زندیق قرار دیا گیا ہے۔ خمینی صاحب کی اس بدزبانی پر کہنے کو تو بہت کچھ دل چاہتا ہے لیکن اس سے اپنے غیظ و غضب کے اظہار کے سوا کوئی فائدہ نہ ہوگا اس لیے اس کا انتقام عزیز ذو انتقام ہی کے سپرد کرتے ہیں۔

خمینی صاحب نے اس بحث کے آخر میں ایک عنوان قائم فرمایا ہے:

نتیجہ سخن ما در ایں بارہ (یعنی شیخین کی طرف سے قرآن کی مخالفت کے بارے میں ہماری مندرجہ بالا گفتگو کا نتیجہ) اس عنوان کے تحت خمینی صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

از مجموعہ ایں ہا معلوم شد مخالفت کردن شیخین از قرآن در حضور مسلمانان یک امر خیلے مہمے نبود و مسلمانان نیز یا داخل در حزب خود آنہا بودہ و در مقصود با آنہا بودند، و یا اگر ہمراہ نبودند جرأت حرف زدن در مقابل آنہا کہ با پیغمبر خدا و دختر او ایں طور سلوک میکردند نداشتند، و یا اگر گاہے یکے از آنہا یک حرفے میزد سخن او را بجے نمیگذاشتند و جملہ کلام آنکہ اگر در قرآن ہم ایں امر با صراحت لہجہ ذکر میشد باز آنہا دست از مقصود خود برنمیداشتند و ترک ریاست برائے گفتہ خدا نمیکردند۔ منتہا چوں ابو بکر ظاہر سازیش بیشتر بود با یک حدیث ساختگی کار را اتمام میکرد چنانچہ

راجع بآیات ارث دیدید و از عمر ہم استبعادے ندا شت کہ آخر امر بگوید خدا یا جبرئیل یا پیغمبر در فرستادن یا آوردن این آیت اشتباہ کردند و مہجور شدند، آنگاہ سنیان نیز از جائے برخیز استند و متابعت او را میکردند چنانچہ در اینہمہ تغییرات کہ در دین اسلام داد متابعت از او کردند و قول او را بآیات قرآنی و گفتہائے پیغمبر اسلام مقدم داشتند"

کشف الاسرار ص ۱۱۹--۱۲۰

خمینی صاحب نے اس طول طویل عبارت میں اپنے ناظرین کے سامنے اس بحث کا نتیجہ اور خلاصہ پیش کیا ہے جو انھوں نے شیخین (حضرت ابوبکر و حضرت عمر) کی مخالفت قرآن کے بارہ میں کی ہے، (جو ہمارے ناظرین کرام نے گزشتہ صفحات میں ملاحظہ فرمائی) خمینی صاحب کی اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے ابوبکر و عمر کی مخالفت قرآن کی جو مثالیں پیش کی ہیں اُن سے معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی موجودگی میں اور علانیہ اُن کے سامنے صریح قرآنی احکام کے خلاف رویہ اختیار کرنا ان دونوں کے لیے کوئی اہم اور غیر معمولی بات نہیں تھی، اُس وقت کے مسلمانوں (یعنی صحابہ) کا حال یہ تھا کہ یا تو وہ اُن کی پارٹی میں شامل اور حکومت و اقتدار طلبی کے اُن کے مقصد و نصب العین میں اُن کے ساتھ شریک، اُن کے رفیق کار اور پورے ہمنوا تھے، یا اگر اُن کی پارٹی میں شامل اور اُن کے پورے ہمنوا نہیں تھے تو بھی ان کا حال یہ تھا کہ وہ ان جفا پیشہ طاقتور منافقین کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکالنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے جو خود رسول خدا اور آپ کی لخت جگر فاطمہ زہرا کے ساتھ ظالمانہ سلوک کر چکے تھے[۱] وہ اُن سے ڈرتے تھے اس وجہ سے اُن کے خلاف زبان کھولنے کی ان میں جرأت

---

[۱] اس ظالمانہ سلوک سے خمینی صاحب کا اشارہ اُن شیعی روایات کی طرف ہے جن میں بیان کیا گیا ہے کہ (معاذ اللہ) شیخین اور ان کی پارٹی کے خاص ساتھیوں نے رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیسی ایذائیں پہنچائیں اور کیسے کیسے ستایا اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی، لخت جگر فاطمہ زہرا کے ساتھ کیا ظالمانہ سلوک کیا؟

(باقی صفحہ آئندہ پر)

وہمت ہی نہیں تھی، اور اگر اُن میں سے کوئی بات کرنے کی ہمت بھی کرتا اور کچھ بولتا تو وہ اُس کی کوئی پروا نہ کرتے اور جو کرنا ہوتا وہی کرتے ـــــ حاصل یہ کہ اگر قرآن میں امامت کے منصب کے لیے حضرت علی کے نام کی صراحت بھی کر دی گئی ہوتی تب بھی یہ لوگ (شیخین اور ان کی پارٹی) اللہ کے فرمان کی وجہ سے حکومت پر قبضہ کرنے کے اپنے مقصد اور منصوبہ سے ہرگز دستبردار نہ ہوتے، ابو بکر جنھوں نے پہلے سے پورا منصوبہ تیار کر رکھا تھا، قرآن کی اُس آیت کے خلاف ایک حدیث گھڑ کے پیش کر دیتے اور معاملہ ختم کر دیتے جیسا کہ انھوں نے حضرت فاطمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث سے محروم کرنے کے لیے کیا ـــــ اور عمر سے بالکل بعید نہیں تھا کہ وہ (اس آیت کے بارے میں جس میں صراحت کے ساتھ امامت کے منصب پر حضرت علی کی نامزدگی کا ذکر کیا گیا ہوتا) یہ کہکر معاملہ ختم کر دیتے کہ یا تو خود خدا سے اس آیت کے نازل کرنے میں یا جبرئیل یا رسول خدا سے اس کے پہچاننے میں بھول چوک ہوگئی، اس وقت سنی لوگ بھی ان کی تائید کے لیے کھڑے ہو جاتے اور خدا کے فرمان کے مقابلہ میں اُن ہی کی بات مانتے ـــــ جیسا کہ اُن ساری تبدیلیوں کے بارے میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ابو بکر نے ان کو باپ کے ترکہ سے محروم کیا اور (معاذ اللہ) عمر نے ان کے بازو پر ایسا تازیانہ مارا جس سے ان کا بازو سوج گیا، اور گھر کا دروازہ اُن پر گرا دیا جس سے ان کی پسلیاں ٹوٹ گئیں اور پیٹ میں جو بچہ تھا جس کا نام پیدائش سے پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محسن رکھ گئے تھے وہ شہید ہو گیا۔" یہ (خرافاتی) روایت ملا باقر مجلسی نے "جلاء العیون" میں ذکر کی ہے (اس کے اردو ترجمہ مطبوعہ [illegible] کے حصہ اول صفحہ ۱۸۶ پر بھی دیکھی جا سکتی ہے)۔ اور واضح رہے کہ خمینی صاحب نے اپنی اسی کتاب کشف الاسرار کے صفحہ ۱۲۱ پر مجلسی کی کتابوں کو معتبر قرار دیکر اُن کے مطالعہ کا مشورہ دیا ہے۔ نیز یہ روایت شیعہ مسلک کی معتبر ترین کتاب احتجاج طبرسی صفحہ ۸۳ میں بھی ہے۔ علاوہ ازیں خود خمینی صاحب نے حضرت عمر کے بارے میں کشف الاسرار ہی میں لکھا ہے کہ انھوں نے رسول خدا کے آخری وقت میں آپ کی شان میں ایسی گستاخی کی کہ روح پاک کو انتہائی صدمہ ہوا اور آپ اسی صدمہ کو لیکر دنیا سے رخصت ہوئے۔ (صفحہ ۱۱۹) اور اسی کشف الاسرار میں حضرت عمر کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے رسول خدا کے گھر میں آگ لگائی (در خانہ پیغمبر آتش زد۔ صفحہ ۱۱۱) معاذ اللہ

ان کا رویہ ہے جو عمر نے دین اسلام اور اُس کے احکام میں کی ہیں، ان سب میں سنیوں نے قرآنی آیات اور رسول خدا کے ارشادات کے مقابلہ میں عمر کی بات ہی کو مقدم رکھا ہے اور اسی کی پیروی کر رہے ہیں۔

حضرت عثمان ذوالنورین کے بارے میں :۔

شاید ناظرین نے یہ بھی محسوس کیا ہو کہ حضرات شیخین، عام صحابہ کرام اور اس کے آگے اُن کے متبعین اولین و آخرین اہل سنت کے بارے میں تو خمینی صاحب نے اس موقع پر اپنے خیالات و "تحقیقات" کا اظہار فرمایا لیکن خلیفہ ثالث حضرت عثمان کا کوئی ذکر ہی نہیں آیا ــــ تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ خمینی صاحب کے نزدیک وہ (معاذ اللہ) اس درجہ کے مجرم ہیں کہ ان کو اور ان کے ساتھ حضرت معاویہ کو انھوں نے یزید کے ساتھ مجرمین کے کٹہرے میں کھڑا کیا ہے۔ اسی کتاب "کشف الاسرار" میں مندرجہ بالا بحث سے چند صفحے پہلے یہ مضمون لکھنے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بھیجکر دین اسلام کی، اور خداوندی قانون کے مطابق ایک حکومت عادلہ کی تعمیر و تکمیل کرائی اور یہ عمارت مکمل ہو گئی، تو عقل کا تقاضا ہے کہ وہ خدا اُس کی بقا اور حفاظت کا بھی انتظام کرے، اور اپنے پیغمبر ہی کے ذریعہ اس کے بارے میں ہدایت دے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا، تو وہ اس کا مستحق نہیں کہ اس کو خدا مان کر ہم اس کی پرستش کریں ــــ آگے اسی سلسلہ میں خمینی صاحب نے لکھا ہے :۔

> ما خدائے را پرستش میکنیم و میشناسیم کہ کارہایش بر اساس عقل پائیدار و بخلاف گفتۂ عقل ہیچ کارے نہ کند نہ آں خدائے کہ بنائے مرتفع از خداپرستی و عدالت و دینداری بنا کند و خود بخرابی آں بکوشد و یزید و معاویہ و عثمان و ازیں قبیل چپاولچی ہائے دیگر را بمردم امارت دہد۔
>
> (کشف الاسرار ص۱۰۷)

مطلب یہ ہے کہ ہم ایسے خدا کی پرستش کرتے اور اسی کو مانتے ہیں جس کے سارے

کام عقل و حکمت کے مطابق ہوں۔ ایسے خدا کو نہیں جو خدا پرستی اور عدالت و دینداری کی ایک عالیشان عمارت تیار کرائے اور خود ہی اس کی بربادی کی کوشش کرے کہ یزید و معاویہ اور عثمان جیسے ظالموں بدقماشوں کو امارت اور حکومت سپرد کر دے۔

اس وقت ہم کو اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا ہے ناظرین کو صرف یہ بتلانا ہے کہ حضرت عثمان بھی (جن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یکے بعد دیگرے دو صاحبزادیوں کا نکاح کیا اور یہ شرف اُن کے سوا کسی کو حاصل نہیں) خمینی صاحب کے نزدیک اس درجہ کے مجرم ہیں۔ (کبرت کلمةً تخرج من أفواههم)

اب رہ گئے بس حضرت علی

اور ان کے تین یا چار ساتھی (سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد بن الاسود اور ایک روایت کے مطابق چوتھے عمار بن یاسر بھی) اس وقت کے ایک لاکھ سے اوپر مسلمانوں میں شیعی روایات کے مطابق بس یہی پانچ حضرات تھے، جو منافق نہیں تھے مومن صادق تھے، اور وفات نبوی کے بعد بھی یہ ثابت قدم رہے ــــ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس پانچ نفری جماعت میں قائد اور امیر کی حیثیت حضرت علی ہی کی تھی باقی چار اُن کے متبع اور پیروکار تھے ــــ لیکن شیعی روایات اور خمینی صاحب کے بیان کے مطابق) اُن کا بھی حال یہ تھا کہ یہ جاننے کے باوجود کہ ابوبکر (معاذ اللہ) مومن نہیں منافق ہیں اور انھوں نے صرف حکومت اور اقتدار کی طمع اور ہوس میں اپنے کو مسلمان ظاہر کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چپکا رکھا تھا، اور (معاذ اللہ) یہ ایسے بدکردار ہیں کہ حکومت طلبی کے مقصد کے تقاضے سے قرآن میں تحریف بھی کر سکتے ہیں، اور اس کے بعد بھی آگے یہ کہ اگر کسی وقت یہ محسوس کریں کہ اسلام چھوڑ کے (ابوجہل و ابولہب کی طرح) اسلام دشمنی کا موقف اختیار کر کے ہی یہ حکومت و اقتدار حاصل کر سکتے ہیں تو یہ بھی کر گزریں گے۔

(بہرحال ابوبکر کے بارے میں یہ سب کچھ جاننے کے باوجود) حضرت علی نے تقیہ کا راستہ اختیار کر کے ان کو خلیفۂ رسول مان کر ان کی بیعت کی اور ان کے ساتھ اُن کے چاروں

ساتھیوں نے بھی اسی طرح تقیہ کا راستہ اختیار کر کے ضمیر کے خلاف ان کی بیعت کی۔
شیعہ حضرات کی معتبر کتاب "احتجاج طبرسی" میں ہے

ما من الامة احدٌ بایع مکرھاً غیر علی و اربعتنا

سوائے علی کے اور ہمارے ان چاروں کے امت میں سے کسی نے ابو بکر کی بیعت زور اور زبردستی سے مجبور ہو کر نہیں کی (یعنی ان کے سوا سب مسلمانوں نے ان کی بیعت برضا و رغبت کی)

پھر شیعہ مذہب کے مسلمات میں سے ہے کہ حضرت علی، ابو بکر کی پوری مدت خلافت میں اس تقیہ ہی کی روش پر قائم رہے کبھی ایک دن بھی انھوں نے کسی مجمع میں اپنے اختلاف کا اظہار نہیں کیا، دن میں پانچ وقت ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے، اور امور خلافت میں برابر تعاون کرتے رہے۔ پھر یہی رویہ ان کا حضرت عمر کے قریباً دس سالہ دور خلافت میں اور اس کے بعد حضرت عثمان کے قریباً بارہ سالہ دور خلافت میں بھی رہا ـــــ الغرض خلفائے ثلثہ کے پورے ۲۴ سالہ دور خلافت میں مذہب شیعہ کے مسلمات اور شیعی روایات کے مطابق خلافت و امامت کے مسئلہ میں کبھی اپنے اختلاف کا اظہار نہیں کیا۔

پھر شیعی روایات میں اس جبر اور زبردستی کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے جس سے مجبور ہو کر حضرت علی نے بیعت کی تھی، وہ بڑی ہی شرمناک اور خود علی مرتضیٰ کے حق میں انتہائی توہین آمیز ہے ـــــ احتجاج طبرسی کی جس روایت میں اس جبری بیعت کا ذکر کیا گیا ہے اسی میں ہے کہ "حضرت علی کے گلے میں رسی ڈال کر گھر سے گھسیٹتے ہوئے ابو بکر کے پاس لایا گیا اور وہاں عمر اور خالد بن ولید وغیرہ تلواریں لیے کھڑے تھے اور (معاذ اللہ) عمر نے دھمکی دی کہ بیعت کرو ورنہ سر قلم کر دیا جائے گا، اس طرح ان کو مجبور کیا گیا تب آخر الامر انھوں نے بیعت کی" ـــــ (ملخصاً، احتجاج طبرسی صفحہ ۴۸۔۴۹)

حیرت ہے کہ ان شیعہ مصنفین نے یہ خرافاتی روایت جس میں حضرت علی کی سخت ترین توہین و تذلیل کی گئی ہے اور ان کو انتہائی بزدل اور پست کردار دکھایا گیا ہے، اپنی تصنیفات

میں شامل کرنا کس طرح مناسب سمجھا۔ ہمارے نزدیک تو اس کی کوئی معقول توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ حضرات شیخین کی عداوت اور ان کو ظالم و جابر ثابت کرنے کا جذبہ ان پر ایسا غالب آیا کہ وہ اس کو سوچ ہی نہ سکے کہ اس روایت سے خود حضرت علی کی تصویر کتنی خراب بنتی ہے؟

حضرت علی مرتضیٰ تو امت کے سابقین اولین میں ہیں، ان میں خداداد طاقت و شجاعت فطری غیرت و حمیت اور محیر العقول جانبازی کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تربیت کے فیض سے عزیمت و قربانی اور حق گوئی و بیباکی کے اوصاف مثالی حد تک راسخ ہو گئے تھے، ان کے بارے میں ایسی بزدلی اور پست کرداری کا تصور کبھی نہیں کیا جا سکتا ——— بعد کے دور میں بھی اس امت میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے "کلمۃ حق عند سلطان جائر" کے جہاد کی تابناک مثالیں قائم کی ہیں۔
——— امام ابو حنیفہ نے اپنے دور کی حکومت کی خواہش و فرمائش کو پورا کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ ان کے نزدیک غلط اور خلاف دیانت تھی، اور اس کی پاداش میں جیل جانے کو پسند کیا، اور جیل کی سختیاں جھیلیں ——— امام مالک کو اس وقت کے عباسی حکمراں نے "طلاق مکرہ" کا مسئلہ بیان کرنے سے منع کیا، انھوں نے اس پابندی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، حکومت کی طرف سے ان کو سخت ترین سزا دی گئی۔ اور اونٹ پر سوار کرا کے مجرموں کی طرح ان کو گشت کرایا گیا تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا اور کیسا ہی مقتدا ہو اگر وہ حکمراں کی بات نہیں مانے گا تو اس کا یہ حشر ہوگا! لیکن امام مالک اس گشت ہی کے دوران پکار پکار کر کہتے تھے:-

"من عرفني فقد عرفني، ومن لم يعرفني فأنا مالك بن أنس أقول، طلاق المكره ليس بشئ (جو مجھے پہچانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں پہچانتا اس کو میں بتلاتا ہوں کہ میں مالک بن انس ہوں، سن لو میں کہتا ہوں کہ مکرہ کی طلاق کچھ نہیں ہے۔)

پھر اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ کو خلیفۂ وقت نے مجبور کیا کہ وہ "خلق قرآن" کے مسئلہ میں اس کے مسلک سے اتفاق اور اس کی ہمنوائی کریں، لیکن جب امام ممدوح نے اس سے انکار کر دیا تو ان پر جلاد مسلط کر دیے گئے جو کوڑے برساتے تھے اور امام کے جسم سے خون کے فوارے چھوٹتے تھے، اس وقت بھی وہ پکار کر یہی کہتے تھے "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" (قرآن اللہ کا کلام ہے، مخلوق نہیں ہے)

یہ تو ابتدائی صدیوں کی مثالیں ہیں، ہر دور میں امت میں ایسے اصحاب عزیمت واستقامت پیدا ہوتے رہے ہیں، جن کے تذکرے تاریخ کی کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں اور خود ہمارا دور بھی اس طرح کی مثالوں سے خالی نہیں رہا، پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) میں فتح حاصل کرنے کے بعد برطانوی حکومت اس کا ثبوت پیش کر چکی تھی کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے، ٹھیک اسی زمانے میں اسی حکومت کے خلاف ہمارے اسی ملک ہندوستان میں تحریک خلافت اٹھی، اللہ تعالیٰ کے ہزاروں باتوفیق بندے انگریزوں کی حکومت میں رہ کر انگریزی حکومت کے خلاف یہ جاننے کے باوجود باغیانہ تقریریں کرتے تھے کہ ہم اس کے نتیجہ میں جیل میں ڈال دیے جائیں گے۔ اور پھر ایسا ہی ہوتا تھا، اس وقت کی جیل گویا اس دنیا کا جہنم تھی، اس سلسلہ میں خاص طور سے حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ انھوں نے ایک تقریر میں اعلان کیا کہ انگریزی حکومت کی فوج کی ملازمت حرام ہے۔ ان کی اس تقریر پر مقدمہ چلا جو "کراچی کے مقدمہ" کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔ عدالت کی طرف سے ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ نے یہ تقریر کی تھی؟ آپ نے فرمایا کہ

"ہاں! میں نے ایسا ہی کہا تھا، اور اب پھر کہتا ہوں کہ انگریزی حکومت کی فوج کی ملازمت حرام ہے۔"

جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، عدالت کی طرف سے انھیں قید کا حکم سنایا گیا، اور وہ قید میں رہے۔

بہرحال یہ شیعی روایات اور شیعہ حضرات کا یہ مسلمہ ومتفقہ عقیدہ کہ حضرت علیؓ نے دباؤ اور دھمکی سے مجبور ہو کر ایسے شخص کی بیعت کی جس کے بارے میں وہ جانتے تھے کہ وہ مومن نہیں منافق ہے، اور اس کے بعد ان کا رویہ بھی بظاہر وفاداری اور تعاون کا رہا اور پھر خلفائے ثلاثہ کے

پورے ۲۴ سالہ دور میں تقیہ کے نام سے یہی (منافقانہ) روش اُن کی رہی ـــــ ہمارے نزدیک عقل ونقل کے لحاظ سے قطعاً غلط اور حضرت علی پر عظیم بہتان ہے اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو حضرت علی اس قابل بھی نہیں رہتے کہ کسی عدالت میں ان کی شہادت قبول کی جاسکے اور یہ کہنا کہ حضرت علی کو یہی اللہ اور اس کے رسول کا حکم تھا (جیسا کہ شیعی روایات میں کہا گیا ہے) "عذر گناہ بدتر از گناہ" اور اللہ ورسول کو اس گناہ عظیم کا ذمہ دار قرار دینا ہے۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک علواً کبیراہ

ہم نے حضرت علی مرتضیٰ کی پوزیشن صاف کرنے کے لیے یہاں اتنی تفصیلی گفتگو ضروری سمجھی، ورنہ ہم اپنے ناظرین کو صرف یہ بتلانا چاہتے تھے کہ شیخین، ذوالنورین اور عام صحابہ کرام کے بارے میں خمینی صاحب کے خیالات تو ان کو معلوم ہو چکے' حضرت علی مرتضیٰ کے بارے میں بھی ان کا وہ نقطہ نظر اور عقیدہ اُن کے سامنے رہے جس سے واقف ہونا شیعہ مذہب کو اور خمینی صاحب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ (جاری)

ایک ضروری وضاحت

رمضان وشوال (جون وجولائی) کا مشترک شمارہ ماہ مبارک کے بالکل آخر میں، یا شوال کے شروع میں آپ تک پہنچا ہوگا، اور اس میں ماہ مبارک کے متعلق حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی دامت برکاتہم کے نہایت مفید ارشادات و افادات پڑھ کر آپ کو یقیناً یہ احساس ہوا ہوگا کہ اس شمارے کو رمضان مبارک کے شروع ہی میں آنا چاہیے تھا۔ ـــــ آپ کا یہ احساس بالکل بجا ہے ـــــ اور ہم نے بھی اس شمارہ کی ترتیب اور کتابت ہنگامی طور پر مکمل کرکے شعبان کے آخری ہفتے میں اسے پریس کے حوالے کر دیا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ رمضان مبارک کے پہلے ہفتہ میں یہ آپ تک پہنچ جائے ـــــ لیکن وائے مجبوری کہ پریس والوں نے ۱۶ر رمضان کو چھاپ کر رسالہ ہمارے حوالہ کیا اور ۱۷ر کو ہم نے اسے روانہ کیا، خدا کرے کہ ماہ مبارک ختم ہونے سے پہلے ہی وہ آپ سب کو مل گیا ہو ـــــ امید ہے کہ اس وضاحت کے بعد ناظرین کرام ہمیں معذور قرار دے سکیں گے۔ (ادارہ)

مولانا محمد حسن سنبھلیؒ

از مولانا محمد زکریا سنبھلی استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء

شمالی ہند کا وہ حصہ جو اب مغربی اتر پردیش کا علاقہ ہے اسلامی ثقافت کا گہوارہ اور علم و اہل علم کا مرکز رہا ہے اسی خطہ میں ایک قصبہ سنبھل (ضلع مراد آباد) ہے۔ سنبھل کی آبادی تو غالباً قبل از تاریخ کی ہے لیکن تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں اسلام اس بستی میں داخل ہوا اور مسلمانوں کی آبادی یہاں شروع ہوئی" اب یہ قصبہ ہندوستان کے ان مقامات میں شمار کیا جاتا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

ہر دور میں یہاں علماء اور صلحاء کی بڑی تعداد رہی اور تعلیم و ارشاد کا کام انجام دیتی رہی۔ بہت سے حضرات کے مزارات شہر اور نواح شہر میں موجود و معروف ہیں اور ان کے تذکرے کتب تاریخ میں محفوظ ہیں[1]

سنبھل میں علماء کا یہ تسلسل الحمد للہ ابھی تک باقی ہے ماضی قریب میں بھی سنبھل میں ایسے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے تدریسی اور تصنیفی میدان میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے اور دین و علم دین کی بڑی خدمت کی ہے ان ہی علماء میں

---

[1] ان میں چند کے اسماء گرامی یہ ہیں، مولانا ابو طالب سنبھلی، مولانا تاج الدین سنبھلی، شیخ سعد اللہ سنبھلی شیخ عبد الاول سنبھلی، مفتی عبد الحی سنبھلی، شیخ عبد الرحمان سنبھلی، شیخ عبد العظیم سنبھلی، شیخ عبد اللہ سنبھلی، شیخ فاضل ابن امجد سنبھلی، شیخ کمال محمد سنبھلی، شیخ منور ابن منصور سنبھلی، مولانا حاتم سنبھلی اور ان کے صاحبزادے مولانا عبد الحلیم سنبھلی مفسر قرآن مولانا حمید الدین سنبھلی، شیخ عبد اللہ بن عثمان سنبھلی، مولانا رستم علی سنبھلی، مولانا علی محمد سنبھلی، مولانا قطب الدین سنبھلی مولانا قدرت اللہ سنبھلی، مولانا محبوب علی سنبھلی وغیرہم اور آخری عہد میں مولانا سراج احمد اسرائیلی، مولانا کریم بخش سنبھلی، مولانا عبد الوحید سنبھلی، مولانا عبد المجید سنبھلی، مولانا سید احمد اسرائیلی مولانا احمد حسن سنبھلی، مولانا شکیل احمد اسرائیلی کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

ایک جید عالم اور صاحب تدریس و تصنیف بزرگ مولانا محمد حسن سنبھلی گذرے ہیں۔

تاریخ پیدائش و سلسلۂ نسب

مولانا محمد حسن سنبھلی سنبھل کے مشہور محلہ کوٹ میں متوطن علمی خانوادے میں ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح وقایہ کی شرح "سعایہ" کے مقدمہ میں مولانا کی تاریخ پیدائش ۲۰ شعبان ۱۲۶۴ھ بروز چہارشنبہ تحریر فرمائی ہے اور سلسلۂ نسب اس طرح لکھا ہے۔ مولوی محمد حسن ابن محمد ظہور حسن ابن محمد شمس علی۔ مولانا عبد الحیٔ حسنی نے بھی اپنی شہرۂ آفاق کتاب نزہۃ الخواطر میں سلسلۂ نسب اسی طرح لکھا ہے۔ البتہ ایک لفظ الاسرائیلی کا اضافہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا تعلق سنبھل کے اس ممتاز خاندان سے ہے جس میں ہمیشہ علماء ربانین پیدا ہوتے رہے ہیں۔ مشہور عالم دین مولانا حاتم سنبھلی اسی خاندان سے تھے[1] یہ خاندان حضرت عبد اللہ ابن سلام رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہے اور چوں کہ حضرت عبد اللہ ابن سلام اسلام لانے سے پہلے یہودی عالم تھے اور نسبًا بنی اسرائیل میں سے تھے اس لیے ان کو اور ان کی اولاد کو اسرائیلی کہا جاتا ہے۔ مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی نے بھی اس خاندان کے حضرت عبد اللہ ابن سلامؓ سے نسبی تعلق کا ذکر فرمایا ہے۔ سنبھل کے علاوہ اس خاندان

---

[1] مولانا محمد حاتم سنبھلی کا شمار ہندوستان کے ممتاز اور مشہور علماء کرام میں ہوتا ہے، اپنے استاذ مولانا عزیز اللہ تلمبنی سے جملہ علوم و فنون اور سلوک تصوف کی تحصیل کی، بعد تکمیل تصوف کے لیے شیخ علاء الدین دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے کمالات ظاہری اور باطنی سے آراستہ ہو کر سنبھل ہی میں رونق آرائے مسند درس ہوئے اور چالیس ۴۰ سال تک درس و تدریس اور وعظ نصیحت اور تعلیم سلوک و تصوف میں مشغول رہے بڑے صاحب علم و فضل اور کثیر العبادۃ بزرگ تھے مولانا سید محمد امروہی، شیخ عبد القادر بدایونی، شیخ ابو الفتح خیرآبادی اور شیخ عثمان بنگالی اور صاحبزادہ محترم مولانا عبد الحلیم آپ کے مشہور تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں ۹۶۰ھ یا ۹۶۹ھ میں وفات پائی اور سنبھل ہی میں مدفون ہوئے، محلہ حاتم سرائے جہاں آپ مدفون ہیں مولانا ہی کی طرف منسوب ہے (نزہۃ الخواطر ج ۴)۔

کے لوگ علی گڑھ، مراد آباد وغیرہ میں بھی ہیں۔

ابتدائی تعلیم اور تدریسی مشغولیت

ابتدائی تعلیم اپنے وطن سنبھل ہی میں اپنے ماموں مفتی عبد السلام سنبھلی اور مفتی شرف الدین کے تلمیذ رشید مولانا قطب الدین سے حاصل کی اس کے بعد رامپور تشریف لے گئے[1] اور وہاں مولانا عبد الکریم خاں[1] اور مولانا سدید الدین خاں سے تحصیل علم کی[1] اور پھر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی کچھ کتابیں پڑھیں[2]۔ مولانا کی طالب علمانہ زندگی کے بارے میں اتنی ہی معلومات مجھے حاصل ہو سکیں۔ جہاں تک مولانا کی تدریسی خدمات کا تعلق ہے تو یہ تذکرہ تو متعدد جگہ ملتا ہے کہ مولانا نے مدت تک تدریسی خدمت انجام دی ہے لیکن اس سلسلہ میں مقامات وغیرہ کی تفصیل نہیں ملتی۔ مولانا عبد الحی الحسنی نے بھی اسی پر اکتفا کیا ہے کہ تحصیل علم کے بعد مولانا نے بعض مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں (شمر ولی التدریس فی بعض المدارس العربیۃ)۔

تصانیف

مولانا کثیر التصانیف تھے ان کی تصنیفات کی تعداد ایک سو سے کچھ زیادہ بتائی گئی ہے صاحب نزہۃ الخواطر نے مولانا کی کتابوں کی تعداد ایک سو ایک بتائی ہے۔ مولانا عبد العلی مدراسی نے بھی مولانا کی تصانیف کی تعداد ایک سو دو لکھی ہے مشہور شامی

---

[1] ملاحظہ ہو مقدمہ "سعایہ" "شرح" "شرح وقایہ" مصنفہ مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی۔

[2] مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی نے مقدمہ سعایہ میں مولانا محمد حسن سنبھلی کا مختصر تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا تفصیلی تذکرہ میری کتاب "اخبار الخلان بأبناء علماء ہندوستان" میں دیکھا جائے لیکن افسوس یہ ہے کہ مولانا اسے مکمل نہیں کر سکے جہاں تک میرے علم میں ہے اس کتاب کا نامکمل مسودہ مولانا فرنگی محلی کے دیگر مسودات کے ساتھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کتاب کے مکمل نہ ہونے کا ذکر خود مولانا فرنگی محلی نے عمدۃ الرعایہ کے مقدمہ میں فرمایا ہے۔

محدث و محقق شیخ عبدالفتاح ابو غدہ لکھتے ہیں۔ ولہ نحو مائۃ مؤلف أو یزید[1]

مولانا کی تصانیف علوم اسلامیہ، قرآن، حدیث، فقہ اور فرائض کے علاوہ علوم عقلیہ فلسفہ، منطق، صرف، نحو، کلام، ریاضی اور علم معانی وغیرہ مختلف علوم میں ہیں مولانا عبدالحی حسنی فرماتے ہیں "میں نے مولانا کی تصانیف میں سے منطق کی معروف شرح ایساغوجی پڑھی ہے جو مولانا نے ایک دن میں لکھی تھی اس کے علاوہ میں نے ان کی جو مطبوعہ کتابیں دیکھی ہیں یا جن مطبوعہ کتابوں کا مطالعہ کیا ہے ان کے نام یہ ہیں المنطق الجدید، القول الوسیط فی الجعل المؤلف البسیط، سوانح الزمن علی شرح السلم لملا حسن، نظم الفرائد علی شرح العقائد، شرح اصول الشاشی، حاشیہ بر ہدایۃ الفقہ اور تنسیق النظام، جو مسند امام ابو حنیفہ پر ایک بہترین حاشیہ ہے۔ مولانا محمد حسن کی غیر مطبوعہ کتابوں میں شرح وقایہ کا حاشیہ صرح الحمایۃ اور اس کا مقدمہ بھی میں نے پڑھا ہے میں نے اس کتاب کو مولانا عبدالعلی مدراسی کے پاس دیکھا یہ کتاب ان کی بہترین تصنیف ہے۔"

اس کتاب یعنی صرح الحمایۃ کے بارے میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھتے ہیں۔
والف حاشیۃ شرح الوقایۃ وکتب منہ إلی الآن نحو سبعین جزءاً من البدء إلی آخر بحث الغسل۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کتاب کتنی مبسوط ہے کہ صرف غسل تک کے مسائل ستر جز میں آئے ہیں مولانا فرنگی محلی کی اس تحریر سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک یہ کتاب مکمل نہیں ہوئی تھی بظاہر بعد میں مولانا محمد حسن سنبھلی نے اسے مکمل کرلیا اور مولانا عبدالعلی مدراسی کے سپرد کردیا[2] جو لکھنؤ میں دینی کتابوں

---

[1] ملاحظہ ہو مقدمہ قواعد فی علوم الحدیث [2] مولانا عبدالعلی مدراسی لکھنؤ کے مشہور ناشر کتب اور علم دوست بزرگ گزرے ہیں دوسرے اصحاب تصانیف اہل علم کی طرح مولانا محمد حسن سنبھلی سے قریبی تعلق تھا ان کی تصنیف تنسیق النظام بھی جس کا تذکرہ سطور بالا میں گزر چکا ہے انھیں کے اہتمام سے شائع ہوئی تھی اور انھوں نے مولانا محمد حسن سنبھلی کی وفات پر ایک مرثیہ بھی کہا جس کا تذکرہ اس مضمون کے آخر میں آئے گا یہ بات قرین قیاس ہے کہ صرح الحمایۃ کی اشاعت کا کام بھی مولانا سنبھلی نے مولانا عبدالعلی مدراسی ہی کے سپرد کیا تھا لیکن مشیت الٰہی کہ اس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی اور اس کا مسودہ ان کے پورے کتب خانہ کے ساتھ ضائع ہوگیا (فالی اللہ المشتکی) ان کے صاحبزادہ محترم والی آسی صاحب سے راقم الحروف نے دریافت کیا تو انھوں نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

کے مشہور ناشر تھے مولانا عبدالحی الحسنی نے یہ کتاب انھیں کے پاس دیکھی تھی لیکن افسوس کہ یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی۔

مولانا کی کتابوں میں تنسیق النظام فی شرح مسند الامام جس کا ذکر ابھی سطور بالا میں گزر چکا ہے بہت بلند پایہ کتاب ہے اور اس کا مقدمہ تو فن حدیث اور اصول حدیث میں عجیب اور نادر تحقیقات کا خزانہ ہے صرف یہ مقدمہ ہی بڑے سائز کے ایک سو تیئس صفحات پر مشتمل ہے۔ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے لکھا ہے تنسیق النظام فی مسند الامام ھو کتاب عظیم جداً و مقدمتہ بلغت ۱۲۳ صفحۃً فی القطع الکبیر الھندی۔ یہ کتاب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں نمبر ۱۶۱ حدیث پر موجود ہے۔

مقدمہ میں اولاً یہ ذکر فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے پندرہ[۱۵] مسانید ہیں جن میں ایک مسند یہ بھی ہے یہ مسند صدرالدین موسیٰ بن زکریا الحصکفی کی سند سے مروی ہے۔ اولاً یہ شیوخ کی ترتیب پر تھا علامہ عابد سندھی نے اسے ابواب فقہیہ کی ترتیب پر مرتب فرمایا ہے۔

مسند کے اس تعارف کے بعد امام ابوحنیفہؒ کا تذکرہ اور آپ کے تابعی ہونے کا ذکر ہے اور اس سلسلہ میں حافظ ابن حجرؒ وغیرہ کے اقوال بھی نقل کیے ہیں اور بعض صحابہ کرام جن کو امام صاحب نے دیکھا ہے کے نام بھی ذکر کیے ہیں۔

مقدمہ میں ہی مسند امام ابی حنیفہؒ کی احادیث کی سندوں پر بعض معترضین کے اعتراضات کے جواب تحریر فرمائے ہیں اور اس سلسلہ میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس کے عام راوی صحیحین کے راویوں میں سے ہیں۔ اسی سلسلہ میں فن اسماء الرجال اور فن اصول حدیث سے متعلق نہایت دقیق علمی بحثیں کی ہیں۔

آخر میں مقدمہ کے بڑے حصہ میں اس کتاب کے راویوں کے تراجم اس ترتیب سے ذکر کیے ہیں کہ اولاً صحابہ کرام کے تراجم اور پھر امام ابوحنیفہؒ کے بلاواسطہ اساتذہ کے تذکرے اور آخر میں دیگر راویوں کا ذکر ہے۔

مقدمہ ۱۲۳ صفحہ پر ختم ہوتا ہے اور اس کے بعد اصل کتاب اور اس کی شرح ہے شرح میں مولانا نے اولاً احادیث کے معانی کی وضاحت ان سے مستنبط ہونے والے مسائل فقہیہ کا ذکر احناف کے دلائل اور ان پر کیے جانے والے اعتراضات کے وافی وشافی جواب، پھر حدیث کی فنی حیثیت کہ وہ صحیح ہے یا حسن وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا نے یہ بھی التزام کیا ہے کہ اس کتاب کی احادیث کی دیگر کتب حدیث میں بھی تخریج کرتے ہیں کہ یہ حدیث احادیث کی فلاں فلاں کتاب میں مروی ہے۔

مولانا کی یہ کتاب بھی مولانا کی وفات کے بعد ہی شائع ہو سکی ہے۔ مولانا کی وفات ۱۳۰۵ھ میں ہوئی ہے اور کتاب ۱۳۰۹ھ میں شائع ہوئی ہے۔

حدیث وفقہ کے طلباء اور اساتذہ کے لیے اس کتاب کا مطالعہ انشاء اللہ بہت مفید ہوگا مولانا محمد حسن سنبھلی کے علمی، ذہنی اور تصنیفی کمالات کا اندازہ مولانا عبدالحیٔ حسنی کے اس جملہ سے کیا جا سکتا ہے۔ لقیتہ بلکناؤ فوجدتہ ذکیاً فطناً حاد الذھن سریع الملاحظۃ ذا حافظۃ عجیبۃ وفکرۃ غریبۃ تفرد فی قوۃ التحریر وغزارۃ الاملاء وجزالۃ التعبیر وکلامہ عفو الساعۃ وفیض القریحۃ ومسارعۃ القلم ومسابقۃ الید۔ (میری ان سے ملاقات لکھنؤ میں ہوئی میں نے انھیں بہت ذہین وفہیم اور بیدار مغز پایا ان کا حافظہ غیر معمولی اور قوت فہم بے نظیر تھی۔ طاقت ور طرز نگارش، اور موثر اور عمیق اسلوب تحریر میں منفرد تھے برجستہ اظہار خیال اور بے تکلف اور فی البدیہہ تقریر وتحریر پر بڑی قدرت حاصل تھی۔

وفات

مولانا محمد حسن سنبھلی نے اپنے ہم عصر وہم مسلک وہم مشرب عالم ومصنف مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح بہت کم عمر پائی صرف اکتالیس ۴۱ سال کی عمر میں گرانقدر علمی سرمایہ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے ۱۲ صفر ۱۳۰۵ھ بروز دوشنبہ سنبھل ہی میں انتقال فرمایا شیخ عبدالفتاح ابوغدہ ان کا تعارف

کراتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ العلامۃ المحقق الشیخ محمد حسن السنبھلی ویقال له السنبلی الهندی عصری الشیخ عبد الحیٔ اللکهنوی وصدیقه ومشابهه فی کثرة التالیف العدیدة وتنوعها مع قصر العمر ایضاً

مولانا عبد العلی مدراسی نے دو سو چار اشعار کا ایک مرثیہ بصورت مسدس مولانا کی وفات پر کہا تھا جو تنسیق النظام کے آخر میں ملحق ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہوا صفر میں سفر ان کا		تیرھویں تھی دن پیر کا تھا
شباب آخر کو آپہنچا		قدم کہولت میں رکھا

تاج فضیلت کے در تھے		درۂ بحر تبحر تھے
عمدۂ فن کے بہادر تھے		مرد مصاف تحاور تھے

اسی مرثیہ میں تاریخہائے وفات بھی لکھی ہیں مثلاً ولهم اجرٌ عظیم ۱۳۰۵ھ
اور قد رضی اللہ عنھم ۱۳۰۵ھ - دخل مقامات الجنة ۱۳۰۵ھ - أدخله الخلد ۱۳۰۵ھ - خیر الخاتمة ۱۸۸۷ء

ایک ضروری اطلاع

اس معمول کے پیش نظر کہ رمضان مبارک کے متصلاً بعد شائع ہونے والے شمارہ میں عید الفطر کے موقع پر والد ماجد مدظلہ کا خطاب شائع ہوتا ہے، ہمارا خیال ہے کہ ہمارے ناظرین کرام کو اس شمارہ میں اس کا انتظار ہوگا، اس بناء پر یہ اطلاع دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انشاء اللہ خطاب عید الفطر آئندہ شمارے بابت ماہ ستمبر میں شائع ہوگا۔

——— مدیر

چندہ سالانہ

ہندوستان میں ۲۵/-

پاکستان سے پاکستانی سکہ میں ۶۰/-

بنگلادیش سے ہندستانی سکہ میں ۳۰/-

الفرقان لکھنؤ

فی شمارہ ۲/۵۰

ممالک غیر سے

بحری ڈاک سے ۱۰۰/- روپے

(۴ پونڈ یا ۲۵ ریال)

ہوائی ڈاک سے ۲۳۵/- روپے

(۹ پونڈ یا ۴۰ ریال یا ۱۵ ڈالر)

جلد (۵۲) | بابت ستمبر ۱۹۸۴ء مطابق ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ | شمارہ (۹)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہئے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی روانہ کیا جائیگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں اگر دوبارہ بھیجنے کے لیے دفتر میں پرچہ ہوگا تو ضرور بھیجا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار حضرات: مبلغ ۳۰ روپے ہندستانی سکہ میں کسی بھی ذریعہ سے دفتر الفرقان لکھنؤ کو روانہ فرمائیں یا پاکستانی سکہ میں ۶۰ روپے ناظم ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجدیں۔

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

مولانا سید نور الحسن صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ

۲۰ ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ (یکم اگست ۱۹۸۷ء) کی صبح یہ راقم الحروف حسب معمول دارالعلوم ندوۃ العلماء پہنچا تو یہ خبرِ وحشت اثر ملی کہ میرے، اور ندوے میں گذشتہ قریباً نصف صدی میں تعلیم پانے والے بے شمار طالبان علوم نبوت کے شفیق ترین استاذ مولانا سید نور الحسن صاحب آج شب اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ خبر سنتے ہی دل پر جو اثر ہونا تھا وہ تو ہوا ہی، بیس سال پہلے کے وہ نقوش آنکھوں کے سامنے تازہ ہو گئے جب کہ راقم سطور دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ایک کمسن طالب علم تھا، ان دنوں میں جن اساتذہ کی شفقت و محبت کا اثر میرے دل پر زیادہ گہرا تھا، شاید ان میں سرفہرست مولانا نور الحسن صاحب ہی تھے۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۰ء تک، پھر ۱۹۶۰ء سے سال رواں ۱۹۸۷ء تک ندوے کے طلبہ و متعلقین ایک ایسا نورانی چہرہ دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے جس کو دیکھ کر بے ساختہ محبت و احترام کے جذبات دل میں امنڈنے لگتے تھے اور بے اختیار اس کی طرف طبیعت کھنچتی تھی، یہ چہرہ مولانا نور الحسن صاحب کا تھا، میانہ قد متناسب الاعضاء جسم، چہرہ انار کی طرح سرخ اور گلاب کی طرح شاداب، اللہ نے نورانی صورت، اور خندہ پیشانی کی صفت کے ساتھ ان کی شخصیت کو ایسی دل آویزی اور سبک روحی نصیب فرمائی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے حلقۂ احباب میں بڑے محبوب اور اپنے حلقۂ تلامذہ و مستفیدین میں بڑے مقبول تھے اور جو ان کی صحبت میں ایک مرتبہ بیٹھ جاتا وہ یہ کہتا ہوا اٹھتا۔ ع

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی

۱۹۳۴ء میں ۹ سال کی عمر میں دارالعلوم میں درجہ اول عربی میں داخل ہوا، غالباً اسی سال

مولانا سے تلمذ کا آغاز ہو گیا۔ مولانا یوں تو صرف و نحو کے مدرس تھے، اور اس انداز سے صرف و نحو کے قواعد سمجھاتے کہ ہم مبتدی و کمسن طلبہ کو ان میں مزا آنے لگتا، اور ان کی مشق و تطبیق کے لیے نئی نئی مثالیں سوچنے اور ان سے ان کی تصویب کرانے کا شوق پیدا ہو جاتا، اور اس کوشش میں ہم سے غلطی بھی ہوتی تب بھی وہ ایسی شاباشی دیتے جیسے کہ کوئی غلطی ہم سے نہ ہوئی ہو، تاہم اپنے مضمون کی ایسی کامیاب تدریس کے ساتھ ساتھ وہ طلبہ کی دینی و ذہنی تربیت کا فرض بھی ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیتے کہ دل پر ان کی باتیں نقش بھی ہو جاتیں اور یہ محسوس بھی نہ ہونے پاتا کہ کوئی شخص وعظ و اصلاح کے فلک چہارم سے اہلِ زمین کو خطاب کر رہا ہے ——— ان سے مل کر مجھ جیسے جھینپو، ڈرپوک اور کمسن طالب علم کو بھی وہ دوری اور پستی نہ محسوس ہوتی جو اس دور میں مبتدی طلبہ کو بڑے اساتذہ سے مل کر محسوس ہوا کرتی تھی ——— دیکھنے میں یہ بات معمولی ہے مگر در اصل بڑی غیر معمولی ہے۔

اس دور کا ایک واقعہ آج تک دل پر نقش ہے، اور اس کے اثرات اب تک محسوس ہوتے ہیں۔

اگست ۱۹۶۶ء کی آخری تاریخیں تھیں، ایک دن درجہ میں مولانا تشریف لائے تو خلافِ معمول چہرہ اترا ہوا گھرے رنج و غم کے آثار صاف ہویدا، آنکھیں آنسوؤں سے تر، کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر بورڈ پر پہلے خود اپنے ہاتھ سے یہ شعر لکھا

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اور بڑے تاثر کے ساتھ یہ خبر سنائی کہ مصر کے عظیم داعی سید قطب اور ان کے کچھ رفقاء کو پھانسی دے دی گئی ——— اس کے بعد سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اہل خاندان اور ساتھیوں کا تذکرہ بڑی محبت سے کرتے رہے، اور اسلام کی راہ میں جان دینے کے فضائل اس انداز سے سنائے کہ آج تک یاد ہے کہ اسی وقت دل میں معصوم سا شوق پیدا ہو گیا تھا، اور میری والدہ مرحومہ (جو اس وقت حیات تھیں) بڑی خاموشی کے ساتھ قصے سنا کر میرے دل میں شوق شہادت کا جو بیج ڈالتی رہی تھیں اس کا اثر مولانا کی اس گفتگو سے تازہ ہو گیا تھا۔ پھر عمر کے ساتھ ساتھ ہماری معلومات اور شعور میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا، مولانا کی یہ مزاجی خصوصیت اور زیادہ کھل کر سامنے آتی گئی کہ اللہ نے انھیں ان ذاتی اوصاف و اخلاق کے ساتھ نصرت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ اور خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات کے ساتھ وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کا ذوق بھی نصیب فرمایا ہے

اسی کا نتیجہ تھا کہ انھیں حضرت شیخ الہندؒ اور علامہ اقبالؒ سے گہری مناسبت وعقیدت تھی ــــ ایک مرتبہ اسی قسم کا تذکرہ ہو رہا تھا کہ مولانا محمد الیاسؒ کا ذکر آ گیا، کسی نے کہا کہ اس ایک مرد خود آگاہ نے پورے جہان کو دگرگوں کر دیا جبکہ اس کے پاس نہ تقریر تھی نہ تحریر، مولانا نے اس پر فوراً یہ شعر سنایا ؎

ہو حسنِ طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا
ہو صدقِ طلب پھر اثرِ آہِ رسا دیکھ

مولانا انوار الحسن صاحب کی پیدائش، سادات کے ایک خانوادہ میں ۱۵؍ ربیع الثانی ۱۳۲۴ھ (۸؍ جون ۱۹۰۶ء) بروز جمعہ حیدر آباد کے ضلع ورنگل میں ہوئی تھی۔ (مولانا کا آبائی وطن لکھنؤ کے مشرق میں واقع ضلع بارہ بنکی کا ایک گاؤں بھیولی تھا، مولانا کے جد بزرگوار سید محمد حسن صاحب بسلسلۂ ملازمت حیدر آباد میں مقیم ہو گئے تھے) ۶ سال کی عمر میں مولانا کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا، جو بالآخر ۱۳۵۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

جس یکسوئی، ذوق وشوق اور انہماک سے مولانا نے علم دین کی تحصیل کی اس کا اندازہ صرف اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس بیس سالہ طالب علمانہ زندگی میں صرف ایک بار اپنے گھر (حیدر آباد) گئے ــــ مولانا ذکر فرماتے تھے کہ بچپن میں انھوں نے ایک عالم کا یہ واقعہ پڑھ یا سن لیا تھا کہ وہ اپنی طالب علمی کے دور میں گھر سے آنے والے خطوط کو بغیر پڑھے گھڑے میں ڈال دیتے تھے تاکہ کسی خبر سے دل کی ذہنی یکسوئی میں خلل نہ پڑ جائے ــــ اس واقعہ کا اثر مولانا کے دل پر بہت گہرا پڑا تھا۔

دارالعلوم دیوبند میں سب سے زیادہ تعلق حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا اعزاز علیؒ سے تھا، تھانہ بھون حضرت تھانویؒ کی زیارت وملاقات کے لیے جاتے رہنے کا بھی معمول تھا۔

مولانا کے بڑے صاحبزادے برادر گرامی قدر سید ضیاء الحسن صاحب (استاذ اسلامیہ کالج لکھنؤ) کی عنایت سے راقم الحروف کو مولانا کے کاغذات، ڈائری اور ذخیرہ خطوط دیکھنے کا موقع مل گیا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے نام ان کے خاص استاد ومربی حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کے خط کا اقتباس یہاں نقل کر دیا جائے کہ اس سے دونوں کے تعلق کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اور درس وتدریس کے سلسلہ کی کچھ کام کی باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔

دیوبند، یوپی
۱۹ شوال ۱۳۵۹ھ ۲۰ نومبر عزیز مکرم زیدت معالیکم، السلام علیکم
عرصہ دراز کے بعد یاد فرمایا، جو حضرات گاہے گاہے یاد فرمانے کے عادی ہیں اگر وہ یک قلم فراموش کر دیتے ہیں تو خواہ مخواہ خیال ہوتا ہے کہ کیا بات ہے آپ اپنی کثرت مشغولیت اور مصروفیت کو وجہ شکایت نہ بنادیں، بلکہ یہ تو خداوند عالم کی ایک بڑی نعمت ہے جو وہ اپنے خاص خاص بندوں کو دیتا ہے ورنہ بڑے بڑے عالم مارے مارے پھرتے ہیں مگر کوئی دینی خدمت خدا کی طرف سے ان کو نہیں ملی آپ کو خداوند عالم نے اپنے کام میں لگا لیا ہے یہ نعمت قابل غبطہ ہے اس پر شکر کیجیے من کثرت نعم اللہ علیہ کثرت حوائج الناس الیہ۔

پھر مراسلت ہو یا ملاقات، ظاہری چیزیں ہیں جو بہت زیادہ لائق اعتماد نہیں۔ میرے لیے تو بہت زیادہ دلخوش کرم بات یہ ہے کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ تیری یاد دل میں رہا کرتی ہے صلحاء امت کے قلوب میں خیال رہنا ایک مستقل نعمت ہے اور امید ہے کہ شاید اس کے طفیل میں حسن خاتمہ کی سعادت نصیب ہو جائے۔

آپ نے اپنے اسباق کی تفصیل درج فرمائی ہے، اطمینان ہوا، اگر موقع ملے تو کنز اور کافیہ ہی کسی کو شروع کرا دیجیے۔ پڑھانے میں زیادہ مطالب بتانے کا خیال نہ فرمائیں اس قدر بتادیں کہ بچے کتاب کا مطلب سمجھ کر اٹھیں"

مولانا مرحوم دیوبند سے فراغت کے بعد شروع میں دو ایک سال کرنل گنج (گونڈہ) اور پھر دار المبلغین لکھنؤ میں مدرس رہے، ۱۹۳۳ء میں ندوے آ گئے اور پھر ۱۹۵۸ء تک مسلسل یہیں رہے۔ اس کے بعد ندوے کے حالات میں کچھ انتشار ہوا جس کا سلسلہ طلبہ کی اسٹرائیک تک پہنچا، تو ندوے سے چلے گئے، پھر ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء میں دوبارہ آ گئے اور پھر یہ تعلق دم واپسیں تک باقی رہا ۔ ظاہر ہے کہ اس طویل عرصہ میں انھیں نہ جانے کیسے کیسے تجربوں سے گذرنا ہوا ہوگا، لیکن مولانا کا حال یہ تھا ع

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

مولانا کی ایک مزاجی خصوصیت یہ تھی کہ جو ان سے قریب ہوتا مولانا اس پر اتنی محبت و شفقت نچھاور کرتے کہ وہ سمجھتا کہ سب سے زیادہ مجھے ہی مولانا کی محبت حاصل ہے ۔ راقم الحروف

(باقی صفحہ ۳۹ - پر)

مولانا محمد منظور نعمانی

خمینی صاحب اپنی کتاب کشف الاسرار کے آئینہ میں

(۲)

حضرات شیخین، ذوالنورین، عام صحابہ کرام اور اہلسنت کے بارے میں خمینی صاحب کے فرمودات ایک نظر میں

خمینی صاحب کی کتاب "کشف الاسرار" کی جو عبارتیں اس سلسلہ کی پہلی قسط میں ناظرین کرام نے ملاحظہ فرمائیں، جن میں انھوں نے حضرات شیخین و ذوالنورین، عام صحابہ کرام اور اولین و آخرین اہل سنت کے بارے میں تقیہ کی لاگ لپیٹ کے بغیر اپنے عقیدہ و مسلک کا صراحت و صفائی اور پورے ادعا کے ساتھ اظہار فرمایا ہے اُن کے بارے میں جو کچھ ہم کو اپنے خاص مخاطبین سے عرض کرنا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے مختصر الفاظ میں خمینی صاحب کے ان فرمودات کا حاصل چند نمبروں میں یکجا ناظرین کے سامنے "نقل کفر کفر نباشد" کی معذرت کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔

(۱) شیخین ابو بکر و عمر دل سے ایمان ہی نہیں لائے تھے، صرف حکومت اور اقتدار کی طمع و ہوس میں انھوں نے بظاہر اسلام قبول کر لیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اپنے کو چپکا رکھا تھا۔ (جیساکہ ناظرین کو معلوم ہو چکا ہے یہ چپکا رکھنا خود خمینی صاحب کی تعبیر ہے)

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حکومت و اقتدار حاصل کرنے کا ان کا جو منصوبہ تھا اس کے لیے وہ ابتدا ہی سے سازش کرتے رہے، اور انھوں نے اپنے ہم خیالوں کی ایک طاقتور پارٹی بنالی تھی، ان سب کا اصل مقصد اور مطمح نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حکومت پر قبضہ کرلینا ہی تھا۔ اس کے سوا اسلام سے اور قرآن سے اُن کو کوئی سروکار نہیں تھا۔

(۳) اگر بالفرض قرآن میں صراحت کے ساتھ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امامت و خلافت کے لیے حضرت علی کی نامزدگی کا ذکر بھی کردیا جاتا تب بھی یہ لوگ اِن قرآنی آیات اور خداوندی فرمان کی وجہ سے اپنے اُس مقصد اور منصوبہ سے دستبردار ہونے والے نہیں تھے جس کے لیے انھوں نے اپنے کو اسلام سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چپکا رکھا تھا، اس مقصد کے لیے جو کھیلے اور جو داؤ پیچ ان کو کرنے پڑتے وہ سب کرتے، اور فرمان خداوندی کی پروانہ کرتے۔

(۴) قرآنی احکام اور خداوندی فرمان کے خلاف کرنا اُن کے لیے معمولی بات تھی، انھوں نے بہت سے قرآنی احکام کی مخالفت کی اور خداوندی فرمان کی کوئی پروا نہیں کی۔

(۵) اگر وہ اپنا مقصد (حکومت و اقتدار) حاصل کرنے کے لیے قرآن سے ان آیات کا نکال دینا ضروری سمجھتے (جن میں امامت کے منصب پر حضرت علی کی نامزگی کا ذکر کیا گیا ہوتا) تو وہ ان آیتوں ہی کو قرآن سے نکال دیتے۔ یہ اُن کے لیے معمولی بات تھی۔

(۶) اگر وہ ان آیات کو قرآن سے نکالتے تب وہ یہ کرسکتے تھے اور یہی کرتے کہ ایک حدیث اس مضمون کی گھڑ کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرکے لوگوں کو سنادیتے کہ آخری وقت میں آپ نے فرمایا تھا کہ امام و خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ شوریٰ سے طے ہوگا اور علی جنکو امامت کے منصب کے لیے نامزد کیا گیا تھا اور قرآن میں بھی اس کا ذکر کردیا گیا تھا اُن کو اس منصب سے معزول کردیا گیا ——————

(۷) اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ قرآن آیات کے بارے میں کہہ دیتے کہ یا تو خود خدا سے ان آیتوں کے نازل کرنے میں، یا جبرئیل یا رسول خدا سے ان کے پہنچانے میں اشتباہ ہو گیا" یعنی غلطی اور چوک ہو گئی۔

(۸) خمینی صاحب نے حدیث قرطاس ہی کا ذکر کرتے ہوئے بڑے دردناک نوحہ کے انداز میں (حضرت عمر کے بارے میں) لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے آخری وقت میں اُس نے آپ کی شان میں ایسی گستاخی کی جس سے روح پاک کو انتہائی صدمہ پہنچا اور آپ دل پر اس صدمہ کا داغ لیکر دنیا سے رخصت ہوئے ۔۔۔ اس موقعہ پر خمینی صاحب نے صراحت کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ عمر کا یہ گستاخانہ کلمہ دراصل اُس کے باطن اور اندر کے کفر و زندقہ کا ظہور تھا، یعنی اس سے ظاہر ہو گیا کہ (معاذ اللہ) وہ باطن میں کافر و زندیق تھا۔

(۹) اگر یہ شیخین (اور ان کی پارٹی والے) دیکھتے کہ قرآن کی ان آیات کی وجہ سے (جن میں امامت کے لیے حضرت علی کی نامزدگی کی گئی ہوتی) اسلام سے وابستہ رہتے ہوئے ہم حصول حکومت کے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسلام کو ترک کر کے اور اس سے کٹ کر ہی یہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں، تو یہ ایسا ہی کرتے اور (ابو جہل و ابو لہب کا موقف اختیار کر کے) اپنی پارٹی کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو جاتے۔

(۱۰) عثمان و معاویہ اور یزید ایک ہی درجہ کے "چٹے وٹے" (ظالم و مجرم) تھے

(۱۱) عام صحابہ کا حال یہ تھا کہ یا تو وہ ان کی (شیخین کی) خاص پارٹی میں شریک و شامل، ان کے رفیق کار اور حکومت طلبی کے مقصد میں ان کے پورے ہمنوا تھے۔ یا پھر وہ تھے جو ان لوگوں سے ڈرتے تھے اور ان کے خلاف ایک حرف زبان سے نکالنے کی ان میں جرأت و ہمت نہیں تھی۔

(۱۲) دنیا بھر کے اولین و آخرین اہل سنت کے بارے میں خمینی صاحب کا ارشاد ہے سنیوں کا معاملہ یہ ہے کہ ابو بکر و عمر قرآن کے صریح احکام کے خلاف جو کچھ کہیں، یہ لوگ قرآن کے مقابلہ میں اسی کو قبول کرتے اور اسی کی پیروی کرتے ہیں ۔۔۔ عمر نے اسلام میں

جو تبدیلیاں کیں اور قرآنی احکام کے خلاف جو احکام جاری کیے سنیوں نے قرآن کے اصل حکم کے مقابلہ میں عمر کی تبدیلیوں اور اُس کے جاری کیے ہوئے احکام کو قبول کر لیا اور وہ انہی کی پیروی کر رہے ہیں۔ (یہ ہے خمینی صاحب کے فرمودات کا حاصل اور خلاصہ)

خمینی صاحب کے ان فرمودات کے لوازم و نتائج

قرآنی آیات اور احادیث متواترہ کی تکذیب

خمینی صاحب نے "کشف الاسرار" کی اُن عبارتوں میں جو ناظرین کرام نے پہلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں (اور جن کا حاصل سطور بالا میں عرض کیا گیا) حضرات خلفائے ثلاثہ اور ان کے خاص رفقاء یعنی ـــــ حضرت علی مرتضیٰ اور ان کے ۳-۴ ساتھیوں کے علاوہ ـــــ تمام ہی سابقین اولین، مثلاً حضرت ابو عبیدہ بن الجراح، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت طلحہ، حضرت زبیر وغیرہ صف اول کے سارے ہی صحابہ کرام کے بارے میں جو کچھ فرمایا ـــــ یعنی یہ کہ یہ سب (معاذ اللہ) منافقین تھے، صرف حکومت اور اقتدار کی طمع اور ہوس میں اس پوری پارٹی نے بظاہر اسلام قبول کرکے اپنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چپکا رکھا تھا، اور یہ ایسے شقی اور ناخدا ترس تھے کہ اپنے اس مقصد کے لیے بے تکلف قرآن میں تحریف اور قطع برید کر سکتے تھے اور حد یہ کہ اگر یہ لوگ اپنے اس مقصد کے لیے اسلام کو چھوڑ کے (ابو جہل اور ابو لہب کی طرح) اسلام دشمنی کا موقف اختیار کرکے مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو جانا ضروری سمجھتے تو یہ ایسا بھی کر سکتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

الغرض خمینی صاحب نے یہ جو کچھ فرمایا ظاہر ہے کہ یہ قرآن مجید کی اُن تمام آیات کی تکذیب ہے جن سے قطعیت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ حضرات خلفائے راشدین (بشمول حضرت علی مرتضیٰ) اور تمام ہی سابقین اولین اور وہ تمام صحابہ کرام جو دین کی دعوت و نصرت اور جہاد فی سبیل اللہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے،

وہ سب مومنین صادقین ہیں، مقبولین بارگاہ خداوندی ہیں، جنتی ہیں، اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہیں ــــــــ ان آیات کو پوری وضاحت و تشریح کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی "ازالۃ الخفا" میں، اور نواب محسن الملکؒ کی آیات بینات حصہ اول میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان دونوں بزرگوں کے بعد حضرت مولانا عبد الشکور فاروقی لکھنویؒ نے علاحدہ علاحدہ ان آیات کی تفسیر میں مستقل رسائل لکھے ہیں[1]، ان چیزوں کا مطالعہ کرکے ہر وہ شخص جو عقل سلیم اور نور ایمان سے محروم نہیں کیا گیا ہے پورے یقین کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں خاص معجزانہ انداز میں ان صحابہ کرام کے مومنین صادقین ہونے کی شہادت محفوظ کر دی ہے۔ اور یہ اس لیے بھی کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید اور آپ کی ساری دینی تعلیمات انھیں کے ذریعہ بعد والوں کو پہنچنے والی تھیں، اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت، آپ کے واقعات حیات، آپ کی ہدایات، سیرت و تعلیمات اور آپ کے معجزات کے عینی شاہد تھے اور انہی کی دعوت و شہادت بعد والوں کے لیے ایمان لانے کا ذریعہ بننے والی تھی۔ ــــــــ اور

---

[1] حضرت مولانا عبد الشکور صاحبؒ کے اس سلسلہ کے چند رسائل کے نام یہ ہیں۔ مقدمہ تفسیر آیات خلافت۔ تفسیر آیت استخلاف۔ تفسیر آیت تمکین فی الارض۔ تفسیر آیت فیٔ۔ تفسیر آیت قتال مرتدین۔ تفسیر آیت اظہار دین۔ تفسیر آیت رضوان۔ تفسیر آیت میراث الارض۔ تفسیر آیت معیت۔ تفسیر آیت دعوت اعراب۔ (ان کے علاوہ بھی اس سلسلہ کے متعدد تفسیری رسائل حضرت مولانا لکھنوی علیہ الرحمہ کے ہیں) ان میں سے اکثر رسائل قریباً ساڑھے سات سو صفحات کے ضخیم مجلد مجموعہ کی شکل میں حال ہی میں پاکستان میں طبع ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ کا نام "تحفۂ خلافت" ہے۔ یہ مجموعہ "جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام" مدنی محلہ شہر جہلم (پاکستان) سے طلب کیا جا سکتا ہے۔ (راقم سطور کو حضرت مولانا لکھنویؒ کے حفید مولانا عبد العلیم صاحب فاروقی نے بتلایا ہے کہ ان تمام رسائل کو تصحیح وغیرہ کے خاص اہتمام کے ساتھ عنقریب ہی شائع کرنے کا ان کا ارادہ ہے)

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان اصحاب کی امانت وصداقت اور عند اللہ مقبولیت کی شہادت کے علاوہ ان کے وہ فضائل ومناقب بھی بیان فرمائے جو حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور اہل علم جانتے ہیں کہ "قدر مشترک" کے اصول پر یہ احادیث متواتر ہیں۔

بہرحال خمینی صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ ان آیات کی اور ان احادیث متواترہ کی اسی طرح تکذیب ہے جس طرح کہ یہ عقیدہ کہ نبوت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی آسکتا ہے ـــــ اُن آیات قرآنی اور احادیث متواترہ کی تکذیب ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین اور آخری نبی ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ (اور بالکل ضروری نہیں کہ یہ تکذیب دانستہ، شعوری اور بالارادہ ہو)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک پر معاذ اللہ ......

پھر بات اِن آیات و احادیث کی تکذیب ہی پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اس سے بدرجہا زیادہ سنگین یہ مسئلہ بھی سامنے آتا ہے کہ اگر خواص وعوام صحابہ کرام کے بارے میں خمینی صاحب کے اِن فرمودات کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا لازمی اور بدیہی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تسلیم کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت واصلاح، تزکیۂ نفس اور تعمیر سیرت کے جس مقصد عظیم کے لیے آپ کو خاتم الانبیاء بنا کر مبعوث فرمایا تھا، اس میں آپ صرف ناکام ہی نہیں رہے بلکہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ خاکم بدہن) انتہائی درجہ کے نااہل اور ناقابل ثابت ہوئے ـــــ آپ کی زندگی میں ایک لاکھ سے اوپر آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد ابتدائے دورِ نبوت سے آپ کی حیات طیبہ کے آخری دن تک آپ کے قریب، اور سفر وحضر میں آپ کی رفاقت وصحبت میں رہی، آپ کے مواعظ وخطبات اور مجلسی ارشادات خود آپ کی زبان مبارک سے دن رات سنتی رہی، آپ کے معاملات اور شب وروز کے معمولات دیکھتی رہی، لیکن ان میں سے دس کو بھی ایمان نصیب نہیں ہوا وہ (معاذ اللہ) منافق یعنی بظاہر مسلمان اور بباطن کافر ہی رہے۔ کیا کسی مرشد ومصلح کی ناقابلیت اور نااہلیت کا

اس سے بڑا بھی کوئی ثبوت ہو سکتا ہے؟ —— پھر حضرت علی مرتضیٰ اور ان کے جن تین چار ساتھیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مومن صادق تھے، ان کا بھی حال یہ بتلایا جاتا ہے کہ انھوں نے دھمکی دباؤ سے مجبور ہو کر ایسے لوگوں کو خلیفۂ رسول مان لیا اور اُن کی بیعت کر لی جن کے بارے میں وہ جانتے تھے کہ وہ مومن ہی نہیں منافق ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت کے دشمن ہیں۔ اور پھر تقیہ کے نام سے اُن کے ۲۴ سالہ دورِ خلافت میں ان کی اطاعت اور وفاداری کا رویہ اپنائے رہے ——

الغرض خمینی صاحب کے ان فرمودات کا لازمی اور بدیہی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین و دعوت، تربیت اور بیس سالہ جد و جہد بالکل ہی بے اثر رہی اس سے ایک بھی مرد مومن پیدا نہ ہو سکا یا تو منافقین تھے یا وہ جو تقیہ کے نام سے منافقانہ رویہ ہی اختیار کیے رہے —— معاذ اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ

قرآن مجید قطعاً ناقابل اعتبار اور روئے عقل اس پر ایمان ناممکن

اسی طرح خمینی صاحب کے ان فرمودات کا یہ بھی لازمی اور بدیہی نتیجہ ہے کہ قرآن مجید قطعاً ناقابل اعتبار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت مسلّم ہے کہ قرآن پاک موجودہ کتابی شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے دور میں سرکاری اہتمام سے مدوّن ہوا۔ اور پھر حضرت عثمان نے اپنے دورِ خلافت میں اسی نسخہ کی نقلیں سرکاری طور پر اس وقت کے عالم اسلامی کے مرکزی شہروں میں بھیجیں —— اور خمینی صاحب کے مندرجہ بالا فرمودات کے مطابق یہ خلفائے ثلٰثہ (معاذ اللہ) ایسے منافق اور ناخدا ترس تھے کہ اپنی دنیوی اور سیاسی مصلحتوں کے تقاضے سے قرآن پاک میں بے تکلف ہر طرح کی تحریف اور قطع و برید کر سکتے تھے، اور اگر وہ ایسا کرتے تو عام صحابہ میں سے کوئی اُن کی اس حرکت کے خلاف آواز تک اٹھانے والا نہیں تھا، سب اُن سے خوف زدہ اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے تھے —— ظاہر ہے

کہ خمینی صاحب کی اس بات کو تسلیم کر لینے کے بعد عقلی طور پر بھی اس کا امکان نہیں رہتا کہ موجودہ قرآن کے بارہ میں یقین کیا جائے کہ یہ فی الحقیقت وہی کتاب اللہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اور اس میں کوئی تحریف اور قطع و برید کی کارروائی نہیں ہوئی ہے ـــــ خمینی صاحب کے فرمودات کا یہ ایسا روشن اور بدیہی نتیجہ ہے کہ اس کے سمجھنے کے لیے کسی خاص درجہ کی ذہانت اور باریک بینی کی ضرورت نہیں۔ ہر موٹی عقل والا بھی اس کو دو اور دو چار کی طرح سمجھ سکتا ہے ـــــ واضح رہے کہ ایمان اُس قلبی یقین و تصدیق کا نام ہے جس میں کسی شک شبہ کا امکان اور گنجائش ہی نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ حضرات خلفائے ثلثہ اور عام صحابہ کرام کے بارے میں خمینی صاحب کی بات تسلیم کر لینے کے بعد قرآن پاک کے بارے میں ایسے یقین کا ازروئے عقل امکان ہی نہیں رہتا۔

ملحوظ رہے کہ ایمان بالقرآن کے بارے میں یہاں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ صرف خمینی صاحب کے فرمودات کی بنیاد پر عرض کیا گیا ہے، اس مسئلہ پر تفصیل کیساتھ ان شاء اللہ آگے اسی مقالہ میں اپنے مقام پر لکھا جائے گا، وہیں عرض کیا جائے گا کہ اس بارے میں کتب شیعہ میں "ائمہ معصومین" سے کیا ارشادات روایت کیے گئے ہیں اور اکابر و اعاظم علمائے شیعہ کا موقف کیا رہا ہے۔

خمینی صاحب کے فرمودات کے لوازم و نتائج کے سلسلہ میں آخری سنگین ترین بات

اس سلسلہ میں راقم سطور ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہے جو اس عاجز کے نزدیک سب سے زیادہ سنگین ہے، کاش شیعہ حضرات بھی اس پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔

حضرات شیخین، ذوالنورین اور اُن کے خاص رفقاء، صف اول کے قریباً تمام ہی صحابہ کرام کے بارے میں خمینی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھ کے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف معاندانہ جذبہ رکھنے والے غیر مسلم، آج کل کی سیاسی مکروفریب کی عام فضا میں، یہ نتیجہ بھی نکال سکتے ہیں کہ (معاذ اللہ) خود ان کے پیغمبر کا دعوائے نبوت اور ایک نئے مذہب اسلام کی دعوت اپنی حکومت قائم کرنے ہی کی

ایک ترکیب تھی، اصل مقصد بس حکومت حاصل کرنا تھا ـــــ اور ابو بکر و عمر و عثمان جیسے مکہ کے کچھ سر برآوردہ اور ہوشیار و چالاک لوگ بھی اسی مقصد کو دل میں لیے ہوئے آپ کے ساتھ ہو گئے۔ اور اس طرح اسلام کے نام پر ایک پارٹی بن گئی ـــــ اس پارٹی میں شروع ہی سے دو گروپ تھے، ایک طرف خود پیغمبر صاحب تھے جن کا مقصد اور منصوبہ یہ تھا کہ حکومت قائم ہو جائے تو وہ ہمیشہ کے لیے اس کو اپنے گھر والوں کے لیے محفوظ کر دیں، نسلاً بعد نسلٍ حکومت ہمیشہ انہی کے ہاتھ میں رہے ـــــ چنانچہ جب مدینہ میں حکومت قائم ہو گئی تو (شیعی روایات کے مطابق) مختلف موقعوں پر اللہ کے حکم کے حوالہ سے آپ نے اس کا اظہار بھی فرمایا اور آخری کام اس سلسلہ میں آپ نے یہ کیا کہ جب قریباً پورا ملک عرب آپ کے زیر اقتدار آ گیا تو آپ نے غدیر خم کے مقام پر بہت بڑے مجمع میں خدا کے حکم کا حوالہ دے کر اس کا اعلان فرمایا کہ میرے بعد ولی الامر (یعنی حکمراں اور فرمانروا) کی حیثیت سے میرے جانشین میرے داماد علی بن ابی طالب ہوں گے۔ اور ان کے بعد ہمیشہ حکومت اُن کی نسل میں رہے گی ـــــ پھر اس کے بعد آپ نے اپنی آخری بیماری میں آخری دنوں میں (شیعی روایات کے مطابق حضرت علی کی اس جانشینی ہی کے لیے) ایک دستاویز لکھا دینے کا بھی ارادہ کیا، لیکن دوسرے گروپ کے سب سے طاقتور آدمی عمر کی مداخلت سے وہ لکھی نہیں جا سکی۔

اور پارٹی میں دوسرا گروپ ابو بکر و عمر وغیرہ کا تھا، اُن کا منصوبہ یہ تھا کہ پیغمبر صاحب کے بعد حکومت پر ہم قبضہ کر لیں گے۔ وہ اس کے لیے شروع ہی سے سازش کرتے رہے تھے۔ اور بالآخر وقت آنے پر یہی گروپ اپنی چالاکی اور چابک دستی سے حکومت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ خمینی صاحب نے "کشف الاسرار" میں حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اور تمام صحابہ کرام کی جو تصویر کھینچی ہے اور ان کے بارے میں جو لکھا ہے اس نے اسلام اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاہ باطن دشمنوں کے لیے اس طرح سوچنے اور کہنے کا پورا مواد فراہم کر دیا ہے۔ شیعہ حضرات میں

جو سلیم الفطرت اور نیک دل ہیں کاش وہ بھی خمینی صاحب کے فرمودات کے ان لوازم و نتائج پر غور فرمائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام میں ہرگز اس طرح کا کوئی اختلاف اور کوئی گروپ بندی نہیں تھی، قرآن مجید میں اُن کا یہ حال بیان فرمایا گیا ہے "اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَاءُ بَیْنَهُمْ" (سورۃ الفتح) (یعنی ان اصحاب محمد کا حال یہ ہے کہ یہ دین کے منکروں دشمنوں کے مقابلہ میں سخت مزاج ہیں اور آپس میں ایک دوسرے پر مہربان ہیں) —— دوسری جگہ ان ہی کے بارے میں فرمایا گیا ہے "وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ" (سورۃ الانفال) یعنی اللہ نے رسول خدا پر ایمان لانے والے آپ کے اصحاب کے دل جوڑ دیے ہیں اور اُن میں باہم الفت و محبت پیدا کر دی ہے —— اور تاریخ کی، یہانتک کہ غیر مسلم مورخین کی شہادت بھی یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے آپ کے صحابہ کرام میں اس طرح کا کوئی اختلاف اور کوئی گروپ بندی نہیں تھی جس کا نقشہ خمینی صاحب نے "کشف الاسرار" میں کھینچا ہے۔ سُبْحَانَکَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ ۝

اب ہم خمینی صاحب کے فرمودات سے متعلق اس سلسلۂ کلام کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان گزارشات کو اپنے بندوں کے لیے موجب بصیرت بنائے۔

ایک نیازمندانہ اور مخلصانہ عرضداشت

اہلسنت میں سے خمینی صاحب کے مداحوں اور داعیوں کی خدمت میں

جیسا کہ اس مقالہ میں پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اکثر ناظرین کو بطور خود بھی معلوم ہوگا کہ اہل سنت میں سے بھی بعض اچھے خاصے پڑھے لکھے اور موقر

حضرات کی طرف سے اور ان کی بعض معروف جماعتوں اور تنظیموں کے ذمہ داروں کی طرف سے بھی خمینی صاحب کے بارے میں انتہائی درجہ کے خوش کن خیالات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے اور اُن کو اس دور کا امیر المومنین اور امام المسلمین بتلایا جاتا رہا ہے اور امت مسلمہ کے سامنے پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ تحریروں، تقریروں اور اخباری بیانات کے ذریعہ گویا شہادت دی جاتی رہی ہے کہ خمینی صاحب دل و جان سے وحدت اسلامی کے داعی ہیں، وہ شیعہ سنی اختلاف سے بالاتر بلکہ بیزار ہیں خلفائے راشدین کا احترام کرتے ہیں، وہ ایسے آدمی کو شیطان کہتے ہیں جو شیعہ سنی اختلاف کی بات کرے۔ اور یہ کہ ایران کا انقلاب خالص اسلامی انقلاب ہے۔

ہم اُن جماعتوں، تنظیموں اور اُن کے اخبارات و رسائل، اور ان اشخاص و افراد کا نام لیے بغیر ان کی خدمت میں محض لوجہ اللہ نیازمندانہ۔ اور مخلصانہ طور پر عرض کرتے ہیں کہ خمینی صاحب کی کتاب "کشف الاسرار" (جو فی الحقیقت اسم با مسمّٰے کشف الاسرار ہی ہے) کی منقولہ بالا عبارتوں میں آپ نے خمینی صاحب کو پڑھ لیا اور گویا انہی کی زبان سے سن لیا کہ حضرات شیخین و ذوالنورین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام اصحاب کرام کے بارے میں وہ کیا فرما رہے ہیں۔ اور "ما انا علیہ و اصحابی" کی تعلیم و تلقین کے مطابق ان کا اتباع کرنے والے اور قرآن پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق ان کو مومنین صادقین یقین کرتے ہوئے ان سے عقیدت و محبت رکھنے والے اولین و آخرین اہلسنت اُن کے نزدیک کس درجہ کے مجرم ہیں ـــــ الغرض ان سب باتوں کے اس طرح واضح طور پر سامنے آجانے کے بعد کہ ان کی کوئی تاویل بھی نہیں کی جاسکتی ـــــ ہم اس حُسن ظن کی بنا پر کہ آپ حضرات نے خمینی صاحب اور اُن کے برپا کیے ہوئے انقلاب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا۔ اس کی وجہ حقائق سے اور شیعہ حضرات کے عام معمول "تقیہ" کے طول و عرض سے ناواقفی اور غلط معلومات تھے، لیکن اب جبکہ اپنی کتاب "کشف الاسرار" کے صفحات اور اس کی عبارتوں میں خمینی صاحب پوری

طرح آپ کے سامنے آگئے اور آپ کے لیے اُن کے بارے میں غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہی تو آپ سے نیازمندانہ اور مخلصانہ گزارش ہے کہ آخرت کی مسئولیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، آپ اس غلطی کی اصلاح، اس کی تلافی اور امت مسلمہ کے عام افراد پر پڑنے والے اُس کے اثرات کے ازالہ کی کوشش سے دریغ نہ کریں۔ یہ آپ کا دینی فریضہ اور خود آپ کی ذات کا آپ پر حق ہے۔

قرآن مجید کے بالکل آغاز میں، اور اس کے بعد بھی جا بجا غلطی اور غلط کام کرنے والے دو کرداروں کا ذکر ہماری رہنمائی اور سبق آموزی کے لیے کیا گیا ہے ——— ایک ابلیس کا کہ اُس نے بھی ایک غلط کام کیا حکم الٰہی کی نافرمانی کی، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ اور باز پرس کے بعد بھی اُس نے غلطی سے رجوع اور توبہ و استغفار کے ذریعہ تلافی کی کوشش نہیں کی بلکہ غلطی کی تاویل و توجیہ کر کے اس کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ——— اور اس کے مقابلہ میں دوسرا کردار ہمارے ابو الآبا، حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے کہ اُن سے بھی ایک غلطی اور بظاہر اللہ کے ایک حکم کی نافرمانی ہوئی لیکن جب ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے غلطی پر متنبہ کیا گیا تو انھوں نے اپنی غلطی کی کوئی تاویل نہیں کی بلکہ اپنے قصور کا اعتراف کر کے عرض کیا۔ ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخٰسرین ٥ ——— پھر قرآن پاک میں دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے معاملہ اور انجام کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔

بہرحال ہمارے جن بھائیوں سے خمینی صاحب کے بارے میں غلطی ہوئی (جو یقیناً سنگین غلطی تھی) اللہ تعالیٰ ان کو توفیق دے کہ وہ سیدنا آدم علیہ السلام کی سنت کو اپنائیں اور رب کریم کی مغفرت و رحمت اور جنت کے مستحق ہوں ——— اللہ تعالیٰ اس عاجز راقم سطور کو بھی ہمیشہ اپنے قصوروں کے احساس و اعتراف اور توبہ و استغفار کی توفیق عطا فرمائے۔ ویتوب اللہ علی من تاب۔

مولانا سید محمد علی رامپوری رحمۃ اللہ علیہ

تاثیر و ہدایت کے چند واقعات

مولانا عتیق احمد بستوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

[مخدوم گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہ کے ایماء پر زیر نظر مضمون قلمبند کیا گیا، موصوف ہی نے "القول الجلی فی کرامات السید محمد علی" مصنفہ نواب افسر الدولہ جان جہاں خاں کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی مہیا فرمائی جس کی بنیاد پر یہ مضمون مرتب ہو سکا۔ مضمون کے سوانحی حصہ کے لیے حسب ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا (۱) کاروانِ ایمان و عزیمت حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی (۲) جماعت مجاہدین، غلام رسول مہر مرحوم (۳) نزہۃ الخواطر جلد ہفتم، حضرت مولانا سید عبدالحی حسنیؒ (۴) مکاتیب سید احمد شہید ـــــــ عتیق]

مولانا سید محمد علیؒ رامپوری کا شمار سید احمد شہید کے ممتاز خلفاء میں ہے، سید احمد شہیدؒ نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنے داعی و مبلغ بھیجے تھے جنکی جد و جہد اور اخلاص و للہیت کے نتیجے میں پورے پورے علاقے کی کایا پلٹ گئی ہندوستان کے اطراف و اکناف میں ایمان و عزیمت کی باد بہاری چلی، جن قدسی صفات بزرگوں کو سید صاحب نے تبلیغ و دعوت کے اہم اور نازک فریضہ کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ انھیں میں ایک بلند قامت شخصیت مولانا محمد علی رامپوری کی تھی۔

حالات اور کارنامے

مولانا محمد علی رامپوری کا شجرۂ نسب یہ ہے محمد علی بن عنایت علی بن فضل علی حسینی نقوی۔ اوپر جا کر آپ کا شجرۂ نسب مشہور ولی اور شیخ طریقت شیخ جلال الدین بن حسین بن محمد حسینی بخاری سے مل جاتا ہے آبائی وطن دہلی تھا وہیں پیدائش اور نشو ونما ہوئی۔ لیکن بچپن ہی میں اپنے برادر اکبر علامہ حیدر علی رامپوری ثم ٹونکی کی طرح رام پور منتقل ہو گئے۔ جو اس وقت علم و فن کا بڑا گہوارہ اور فضلائے روزگار کی اقامت گاہ تھا رامپور کے نامی گرامی اساتذہ کی خدمت میں رہ کر علم و فن میں کمال پیدا کیا۔ اپنے بڑے بھائی علامہ حیدر علی ٹونکی سے بھی اکتساب فیض کیا۔

علوم اسلامیہ میں علامہ حیدر علی کی طرح ان کا مرتبہ بھی بہت بلند تھا سید احمد شہید نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں انھیں ان القاب سے یاد کیا ہے "فضیلت مآب، مناقب انتساب، مقبول بارگاہ قدسی مولوی محمد علی صاحب" مولانا سید عبدالحی حسنیؒ نے نزہۃ الخواطر میں ان کا ذکر خیر ان الفاظ میں کیا ہے "الشیخ العالم الکبیر المحدث"

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ مولانا محمد علی رامپوری سید صاحب سے بیعت کب ہوئے لیکن سید صاحب کے اس مکتوب گرامی سے جو علامہ حیدر علی رامپوری کے نام ہے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ میں موصوف مجاہدین کا ایک قافلہ لیکر سرحد کے علاقہ میں پہونچ چکے تھے سید صاحب نے ان کی آمد پر غیر معمولی مسرت کا اظہار فرمایا ہے۔

کچھ دنوں موصوف مجاہدین کے ساتھ کارزار جہاد میں شریک رہے اس کے بعد جب مولانا سید محبوب علی کی میدان جہاد سے واپسی کی وجہ سے ہندوستان سے قافلوں کی آمد رک گئی اس وقت سید احمد شہیدؒ نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں اپنے مبلغین بھیجے۔ مولانا محمد علی رامپوری کو حیدر آباد جانے کا حکم ملا۔ تو انھوں نے عذر کیا کہ مجھ کو نہ اس قدر علم ہے کہ کسی عالم سے

مباحثہ یا مناظرہ کروں اور نہ یہ سلیقہ ہے کہ لوگوں کے انبوہ میں وعظ و درس کہوں سید صاحب نے فرمایا: کہ جس بات کا عذر کرتے ہو اللہ سے امید ہے کہ وہ عذر دور کر دے گا۔ پھر آپ نے اپنا کرتہ، پاجامہ اور ٹوپی انھیں پہنائی۔ چار پانچ آدمی ان کے ہمراہ کر دیئے۔ راستہ میں وعظ و تبلیغ فرماتے ہوئے آپ حیدر آباد (دکن) پہونچے، حاسدوں اور بدخواہوں نے ناکام و بدنام کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن آپ کے پہونچنے پر نائب السلطنت نے آپ کا عظیم الشان استقبال کیا جو صرف نواب اسکندر جاہ کا ہوا تھا اور ڈھائی سو روپیہ ماہانہ مقرر کر دیا۔ مہمانداری کے لیے دو ہزار رقم یک مشت ملی، ہزارہا آدمی ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ ان کی تبلیغ و دعوت سے حیدر آباد میں سنت کا احیاء ہوا۔ مبارز الدولہ اور دوسرے بڑے بڑے امراء ان کے فیض صحبت سے صراطِ مستقیم پر گامزن ہوئے۔

مولانا سید محمد علی رامپوری حیدر آباد میں تبلیغ و دعوت اور افادۂ خلق میں مصروف تھے اور ہزاروں طالبانِ حق ان کے چشمۂ علم و عرفان سے سیراب ہو رہے تھے اسی دوران انھیں سید صاحب کی طرف سے مدراس جانے کا حکم ملا اور ان کی جگہ حیدر آباد میں مولانا ولایت علی نامزد کیے گئے پیر و مرشد کا حکم پاتے ہی ادنیٰ تامل کے بغیر انھوں نے مدراس کے لیے رخت سفر باندھا اور اوائل محرم ۱۲۴۵ھ جولائی ۱۸۲۹ء میں مدراس پہونچے ان کی دعوتی اور اصلاحی سرگرمیوں کے نتیجہ میں بہت بڑا عظیم انقلاب برپا ہو گیا، چند دنوں میں پورے شہر میں ان کے وعظ کی دھوم مچ گئی، ہزاروں آدمی تائب ہو کر آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے نواب محمد خاں، عالم خاں بہادر تہور جنگ اور ان کے [illegible] امراء نے بیعت کر کے راہِ سنت اپنائی اور بڑی بڑی آزمائشیں ان کے پائے ثبات میں جنبش نہیں پیدا کر سکیں، ہزاروں جواری شرابی اور بدکار تائب ہو کر پارسا اور مومن کامل بن گئے، مدراس کے کلالوں نے حکومت میں عرضی پیش کی کہ سیندھی اور شراب کا مقررہ ٹیکس ہم نہیں ادا کر سکتے اس شہر میں ہندوستان سے ایک عالم آیا ہے اس نے تمام مسلمان خریداروں کو سیندھی

اور شراب نوشی سے منع کر دیا ہے۔ اس لیے شراب اور سیندھی کا بکنا بند ہوگیا ہے کلکٹر کے حکم سے پولیس نے اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ کلالوں کا استغاثہ صحیح ہے اسی طرح کسبیوں اور طوائفوں نے نواب صاحب کرناٹک کی سرکار میں عرضی گذاری کہ ہمارے روزگار میں اس نو وارد سید کے وعظ و نصیحت سے بڑا خلل پڑ گیا ہے۔ سرکار میں ہماری جس قدر باقیات ہیں وہ مرحمت ہو جائیں تاکہ روزمرہ کا خرچ چلے۔ مولانا محمد علی رامپوری بڑی کامیابی سے اصلاح و دعوت کا فریضہ انجام دے رہے تھے کہ حادثہ بالاکوٹ کی اطلاع ملی تو مدراس میں اپنے متعدد جانشین چھوڑ کر رامپور تشریف لائے۔

انھیں اپنے پیر و مرشد سے غایت درجہ کی محبت اور عشق تھا سید احمد شہیدؒ کی شہادت کی خبر سنکر مضطرب ہو گئے۔ ایک آدمی اس خبر کی تحقیق کے لیے بھیجا۔ پھر خود بے کل ہو کر تحقیق حال کے لیے نکل پڑے جب مولانا سید جعفر علی صاحب "منظورۃ السعداء" کے بیان سے انھیں شہادت کا یقین ہوا تو بڑے افسردہ ہوئے۔ مصنف "القول الجلی" لکھتے ہیں: "حضرت مولانا محمد علی رامپوری اپنے بارے میں بد زبانیوں ایذاؤں اور سازشوں کے سلسلے میں بڑی بردباری اور صبر سے کام لیتے تھے مگر جب حضرت سید احمد قدس سرہ کے حق میں کسی کی بدگوئی کی خبر پہونچتی تو بہت گرم اور بے قرار ہو کر فرماتے: مجھے یہ کہہ لیں مگر میاں صاحب کی نسبت بدگوئی نہ کریں۔"

۱۲۵۰ھ میں حج کے ارادہ سے کلکتہ پہونچے تو مدراس والوں نے بہم اصرار کیا کہ یہاں قیام فرماتے ہوئے حجاز تشریف لے جائیں۔ آپ کے دوبارہ قیام مدراس سے اہل مدراس کو بڑا دینی فائدہ پہونچا۔ لیکن اہل بدعت و نفاق نے اس بار قیامت بپا کردی۔ حکام کو آپ کے خلاف کر دیا۔ تکفیر کے فتوے دینے بڑی شورش ہوئی "تقویۃ الایمان" جلائی گئی۔ آخر کار فتنہ سے بچنے کے لیے موصوف کو مدراس چھوڑنا پڑا اس کے بعد مولانا محمد علی نے حج کیا پھر احیائے دین کے کام میں لگے رہے۔ ۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء میں وفات پائی۔

"القول الجلی" کی اہمیت

نواب محمد خاں عالم خاں بہادر تہور جنگ خلیفہ اجل مولانا سید محمد علی رامپوری کے صاحبزادہ نواب افسر الدولہ جان جہاں خاں نے مولانا سید محمد علی رامپوری کی کرامات اور مؤثر واقعات کے بیان میں دکنی اردو میں ایک کتاب "القول الجلی فی کرامات السید محمد علی" کے نام سے مرتب کی، اس میں صرف اپنے چشم دید اور معتبر مشاہدین کے بیان کردہ واقعات وکرامات شامل کیے، اس کتاب سے جستہ جستہ واقعات واقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ جن سے مولانا محمد علی رامپوری کی شخصیت اور کارناموں کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑے گی اور ناظرین کو تخصیص ہوگا کہ اخلاص وللہیت اور تندہی سے دعوتی اور اصلاحی کام کرنے والوں میں اللہ جل شانہ کیسی تاثیر اور قوت تسخیر پیدا فرما دیتے ہیں یہ واقعات اسلام کی اثر آفرینی، صداقت اور اسلامی اخلاق وکردار کی انقلاب آفریں طاقت کے آئینہ دار ہیں۔

ایک نواب کی بیعت واستقامت

مولانا سید محمد علی رامپوری کی تاثیر وہدایت کے بیسیوں ایمان افروز واقعات اس کتاب کی زینت ہیں بہ طور نمونہ چند واقعات درج ہیں۔

مصنف اپنے والد نواب محمد خاں عالم خاں بہادر تہور جنگ کی بیعت کا واقعہ اس طرح تحریر کرتے ہیں "حضرت واعظ (مولانا محمد علی رامپوری) رحمۃ اللہ تعالیٰ مرحوم ۱۲۴۸ھ کے آغاز میں مدراس تشریف لائے ان کی وعظ ونصیحت سے بہتوں کو ہدایت ملی۔ آپ کے احوال کی متواتر خبر والد صاحب کو ہو چکی تھی والد صاحب آپ کا تذکرہ سن کر فرماتے تھے: ہاں ہندوستانی ہیں، خوش زبان ہیں، ان کی تقریریں دلچسپ ہوں گی۔ لیکن اس شہر مدراس میں ایسے بہت سے لوگ آتے ہیں بڑا کرو فر ہو جاتا ہے۔ مگر آخر قیام نہیں ہوتا" بالآخر دوستوں کی ترغیب سے

والد صاحب ان دونوں کے ہمراہ حضرت واعظ کی قیام گاہ پر پیدل تشریف لے گئے کیونکہ ان کی قیام گاہ ہمارے مکان سے بہت نزدیک تھی حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ جب میری ان سے ملاقات اور گفتگو ہوئی تو یہ تاثر قائم ہوا کہ وہ ایک دیندار، خوش اخلاق، خوش تقریر، لائق دوستی انسان ہیں، دیر تک نشست اور گفتگو کے بعد میں نے اپنے ایک رفیق کو اٹھنے کا اشارہ کیا، انھوں نے سمجھا کہ میں حضرت واعظ سے خلوت میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں اس لیے وہ دوسرے رفیق کا ہاتھ پکڑ کر باہر چلے گئے، ان دونوں کے چلے جانے کے بعد میرے دل میں چند سوالات کرنے کا داعیہ پیدا ہوا، جو پہلے سے دل میں کھٹک رہے تھے۔ سوالات پیش کرنے کے بعد حضرت واعظ نے فرمایا: یہی سوالات میں نے حضرت سید صاحب (سید احمد شہیدؒ) سے کیے تھے۔ انھوں نے جو جوابات دیے ہیں وہی میں آپ کے سامنے دہراتا ہوں، چونکہ سارے جوابات کافی وشافی تھے اس لیے بے اختیار میرے دل میں بیعت ہونے کا شوق پیدا ہوا۔ بیعت کرانے کے بعد حضرت مرشد نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ دعا کے الفاظ سنکر میرے دونوں رفیق جو باہر کھڑے تھے تعجب کرنے لگے ایسا بڑا اور مستقل مزاج شخص کتنی جلدی اور آسانی سے شکار ہوا۔

رفیقوں نے جرأت کرکے پوچھا کہ آپ اتنی جلدی کیسے بیعت ہو گئے؟ فرمایا مت پوچھو دل خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ میرے لیے بیعت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔"

والد صاحب کو دوسرے خداداد کمالات کے علاوہ موسیقی میں بڑا مقام حاصل تھا، نئی نئی دھنیں اور سُر ایجاد کرتے تھے، آلات موسیقی کے لیے ایک مکان مخصوص تھا جس میں بیش قیمت نادر ونایاب آلات موسیقی والد صاحب نے جمع فرمائے تھے۔ مگر بیعت کی رات نے ان آلات پر قیامت کی صبح کردی، سارے آلات موسیقی اور ساز و رباب توڑے جانے لگے سید بڈھن علی صاحب جو

والد صاحب کے ندیم خاص اور آلات موسیقی کے محافظ تھے، انھوں نے آلات موسیقی وسرود توڑنے پر بہت ماتم کیا، لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ آخر میں انھوں نے بھی بیعت کرلی۔ مدراس میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ نواب محمد خاں عالم خاں بہادر تائب ہوکر اپنے بیش قیمت اور نادر آلات موسیقی توڑ پھوڑ رہے ہیں تو بعض شوقین رؤسا نے بڑی بڑی قیمتیں دے کر خریدنا چاہا۔ والد صاحب نے جواب دیا "جب میں ان منہیات کو اپنے سے دور کررہا ہوں تو دوسروں کو ہرگز ان میں مبتلا نہ ہونے دوں گا"۔ اس کے بعد والد صاحب نے میرے بڑے بھائی کو اور مجھے حضرت واعظ سے بیعت کرایا۔ والد صاحب نے حضرت مرشد کی دعوت کی تاکہ خواتین سے لیکر خدام تک سب بیعت سے مشرف ہو جائیں۔

بیعت ہونے کے بعد نواب محمد خاں عالم خاں بہادر نے بڑی عزیمت اور استقامت کے ساتھ پوری زندگی گذاری۔ مولانا محمد علی رامپوری نے انھیں خلافت سے سرفراز فرمایا۔ مولانا محمد علی رامپوری کی دوبارہ مدراس تشریف آوری پر جب اہل بدعت وضلالت نے شورش برپا کی، اور حکام وقت نیز نواب صاحب کرناٹک کو بھی مولانا رامپوری کے خلاف کردیا وہ دور نواب محمد خاں عالم خاں اور مولانا رامپوری کے تمام مریدین و متوسلین کے لیے بڑا آزمائشی تھا، اس وقت بھی نواب صاحب نے پوری استقامت کا ثبوت دیا۔ نواب صاحب کرناٹک نے ان کی تنخواہ جس کی تعداد گیارہ سو روپے ماہانہ تھی بند کرادی، ان کی صاحبزادی جو بیگم نواب صاحب مدراس نواب عظیم جاہ بہادر کے نکاح میں تھیں اور والد کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں ان کو بھی تنگ کیا گیا کہ کسی طرح وہ غیر شرعی مراسم اختیار کرلیں جو عموماً اس زمانے میں رائج تھے اور حق پرست خاتون کا نواب صاحب کو ایک ہی جواب تھا "میں آپ کی بیوی ہوں اور آپ کے ہر فرمان کو ماننے کے لیے تیار ہوں لیکن قبر اور آخرت کے معاملات سب کے الگ الگ ہیں میں آپ کے فرمان سے کسی غیر شرعی امر کی مرتکب نہیں ہوسکتی"۔ نواب صاحب نے انھیں طلاق دینے کی دھمکی دی تو نواب خاں عالم خاں نے فرمایا کہ آپ طلاق

دیدیں گے تو میں آپ ہی کے اصطبل کے مسلمان سائیس سے اس کا نکاح کر دوں گا۔

ایک سیدزادی کی بیعت

مصنف اپنی سوتیلی دادی کی بیعت کا واقعہ لکھتے ہیں جو سیدزادی تھیں اور حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی نسل سے تھیں "میری سوتیلی دادی جنکی عمر اس وقت ساٹھ سے زیادہ تھی بیعت میں پہلی بار شریک نہ ہوئیں کیونکہ وہ کسی کو مانتی نہ تھیں اور راگ موقوف ہونے، آلات موسیقی کے ٹوٹنے سے سخت آزردہ تھیں۔ کہتی تھیں زندہ گھر مردہ ہو گیا۔ دادی صاحبہ پیر پرستی کی بدعت میں بہت سرگرم تھیں ہمیشہ کاٹ باوا کے مرغ ان کے پاس تیار رہا کرتے تھے، ہر مہینہ کم از کم دو تین مرغ کاٹ باوا کے نام پر کٹوا کر کاٹ بلوا کے مجاور کے پاس بھیجتیں خود اس کے مشائخ کو انھیں بیعت کرنے کی بڑی طمع تھی مگر دادی فرماتی تھیں میں اس کے سوا کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں ہوں گی جس کی شکل میرے جد امجد پیران پیر نے مجھے خواب میں دکھلا کر ارشاد کیا ہے کہ" ان کی مرید ہو، ان کا مرید ہونا میرا مرید ہونا ہے" حضرت مرشد کی جب ہمارے یہاں ضیافت تھی، تو پردہ کے پیچھے سے انھوں نے حضرت مرشد کو دیکھا تو پکار اٹھیں کہ یہ وہی شکل ہے۔ جو پیران پیر نے مجھے دکھلائی تھی۔ یہی میرا پیر ہے" اور بیعت کے لیے بیچین ہو گئیں، حضرت مرشد سے بیعت ہونے کے بعد دادی صاحبہ نے سب بدعات ترک کر دیں توحید و سنت پر قائم ہو گئیں۔ کاٹ باوا کا مرغا گھر سے مفقود ہو گیا، تمام گھر نمازی بن گیا۔ دائیاں، گھر کی خادمان جنھوں نے کبھی سجدہ بھی نہ کیا تھا تہجد گذار ہو گئیں قرآن کی سورتیں سیکھ لیں، اگرچہ زبان پر الفاظ چڑھتے نہ تھے مگر بڑی محنت سے آیتیں یاد کرنے اور پڑھنے لگیں۔

صاحبزادے کا ایمان افروز واقعہ

مولانا محمد علی رامپوری اور ان کا پورا گھرانہ توحید اور اتباع سنت کے

رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اس گھرانے کے چھوٹے بچے بھی اس بارے میں بڑے بیدار اور حساس تھے، مصنف ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک بار مولانا محمد علی رامپوری کا قافلہ ایک گاؤں میں قیام پذیر ہوا۔ ایک کشادہ اور شاندار مکان میں انھیں اتارا گیا، وہاں ایک عجیب اتفاق ہوا، بڑے صاحبزادے جنکی عمر صرف چار سال تھی، مکان کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ایک راہ گیر نے انھیں دیکھ کر کہا: بندگی صاحبزادے۔ صاحبزادے نے کہا: صاحب بندگی تو صرف خدا کا حق ہے، السلام علیکم کہیے" صاحبزادے کی اس بات کا بڑا چرچا ہوا کہ جب اتنا کمسن لڑکا توحید پر اس درجہ قائم ہو تو باپ کا کیا حال ہوگا، وہاں کے لوگوں کا اعتقاد اور بڑھ گیا، جوق در جوق آتے اور بیعت سے مشرف ہوتے، تھوڑے ہی دنوں میں وہ بستی موحد اور متقی بن گئی۔

ایک شیعہ کی توبہ

ایک بڑے متعصب اور گستاخ شیعہ معین الدین صاحب تھے وہ حضرت مرشد کے پاس آئے، ان کو اپنی قوت و تنومندی پر بھی بڑا غرور تھا شیعوں نے انھیں ابھارا کہ سید واعظ کے ساتھ گستاخی کریں، اور یہ کہکر بھڑکایا کہ سید واعظ حضرت علی کو مشکل کشا نہیں مانتے، چنانچہ یہ صاحب ہاتھ پاؤں میں چاندی کے زیور کڑے، چھلے اور تعویذ وغیرہ پہنے ہوئے آئے۔ حضرت مرشد کو سلام کرکے سامنے بیٹھ گئے اور زور سے کہنے لگے: مولوی صاحب کیا آپ جناب امیر المومنین کو مولیٰ مشکل کشا نہیں کہتے؟ حضرت نے انتہائی نرمی اور آہستگی سے کہا: یہ لقب حضرت علی کو کس نے دیا؟ انھوں نے جواب دیا حضرت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے۔ حضرت مرشد نے پوچھا مشکل کیا لفظ ہے اور کشا کیا؟ اور یہ کس زبان کے الفاظ ہیں، اس کی ترکیب کس زبان کے قاعدے پر ہوئی ہے؟ یہ سن کر صاحب موصوف گھبرائے اور حواس باختہ ہوکے کہا: کشا فارسی لفظ ہے اور مشکل عربی، حضرت نے فرمایا: بھلا فارسی لفظ و ترکیب کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح حضرت علی

کو لقب دیتے، "آپ کی زبان تو عربی تھی" یہ سنکر معین الدین صاحب لاجواب ہوکر
اِدھر اُدھر دیکھنے لگے، ان کی پریشانی دیکھ کر حضرت نے فرمایا ـــــ یوں کہیے کہ
اللہ تعالیٰ نے بہت سی دین کی مشکلیں حضرت علیؓ کے ہاتھ حل کروائی ہیں۔ بہرحال
موصوف لاجواب ہوکر چلے گئے۔ کئی دن کے بعد پھر آئے تو ان کے پہونچتے ہی حضرت
نے پوچھا، آپ کو جو اندرونی درد کی شکایت تھی اس کا کیا حال ہے؟ انھیں حیرت
ہوئی کہ میں نے اپنے کسی قریبی دوست یا عزیز کو بھی درد کی خبر نہیں دی تھی تو
پھر حضرت مرشد کو کیسے معلوم ہوگیا۔ یہ کرامت دیکھ کے حضرت کے بڑے معتقد
ہوگئے۔ اس کے تھوڑی دیر کے بعد دستر خوان بچھا، حضرت نے ان کو اپنے بازو
میں بٹھایا اور اپنی رکابی میں سے مٹھی بھر خشکہ ان کی رکابی میں رکھا معین الدین
صاحب بڑے قوی ہیکل تنومند خوراکی آدمی تھے لیکن اتنے ہی خشکے میں خوب
سیر ہوگئے۔ الغرض یہ کرامت دیکھ کر کھانے سے فارغ ہوتے ہی شیعیت سے توبہ
کی اور بہت اصرار کرکے بیعت ہوگئے، حالانکہ ان کی شیعیت کی وجہ سے حضرت
چاہتے تھے کہ وہ پہلے اہل سنت کے مذہب کو خوب سمجھ لیں مگر انھوں نے فوراً توبہ
اور بیعت کی، اسی جگہ ہاتھ پیر کے زیور نکال دیے اور تاحیات توحید پر قائم رہے۔

شراب نوشی سے توبہ

مدراس کے محلہ جنتا دھاری کا ایک نعل بند جس کا نام شیخ علی تھا۔ حضرت مرشد
کے پاس حاضر ہوا اور مرید ہونے کی خواہش ظاہر کی حضرت نے فرمایا: ہاں آؤ۔
اس نے عرض کیا کہ اس شرط کے ساتھ بیعت ہوں گا کہ مجھے شراب پینے کی اجازت
ہو۔ حضرت نے فرمایا: پہلے بیعت تو کر لو یہ کہکر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا،
توبہ پر مشتمل بیعت کے الفاظ کہلا کر دعا فرمائی، اس کے بعد دریافت کیا کہ کس وقت
شراب نوشی کا شغل کرتے ہو؟ اس نے عرض کیا رات میں سوتے وقت، فرمایا:
میاں تم اس وقت نیبو کا شربت پیا کرو۔ یہ تم کو وہی مزہ دے گا۔ چنانچہ اس

نعل بند نے شراب چھوڑ دی اور نیبو کا شربت پینے لگا، یہ شخص حضرت کی روانگی کے بعد بلکہ حضرت کی وفات کے بعد بھی زندہ رہا، بہتوں کے سامنے اس نے اس کرامت کا ذکر کیا اور کہا کہ ہمارے مرشد نے مجھے نجاست سے چھڑا کر ستھری چیز کے پینے کا حکم فرمایا اور مزہ مجھے وہی ملتا ہے۔

سنت کا احترام

مصنف "القول الجلی" نے چشم دید راویوں کے حوالہ سے ایک حیرت انگیز واقعہ لکھا ہے جس سے مولانا محمد علی رامپوری کی غیر معمولی قوت تاثیر، ان کے مواعظ کے انقلابی اثرات کے علاوہ یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ان کے یہاں سنت کا کس درجہ احترام تھا، اپنے کو بڑے سے بڑے خطرے میں ڈالنا منظور تھا، لیکن سنت کا ذکر آنے کے بعد اس سے بے اعتنائی ناممکن تھی۔ مصنف لکھتے ہیں "حضرت مرشد کلکتہ سے کشتی پر سوار ہو کر دہلی ہوتے ہوئے رامپور کے لیے روانہ ہوئے، آپ کے ساتھ پورا قافلہ تھا، جب نواب اودھ کے علاقے میں داخل ہوئے تو چوروں کا ایک جوق کشتی کے ساتھ ساتھ کنارے کنارے چلنے لگا، اور قافلہ کو لوٹنے کے لیے منتظر تھا، لیکن حضرت مرشد کے رفقاء راتوں کو کشتی دریا کے انگریزی کنارے کی طرف بندھوائے تھے اور بندوقوں سے مسلح ہو کر پہرہ دیا کرتے تھے، ایک رات کا ذکر ہے کہ جہاں کشتی باندھی گئی تھی وہاں پانی قابل عبور تھا، اس لیے ڈاکو بندوق سے مسلح ہو کر دریا عبور کر کے کشتی تک پہونچ گئے، دونوں طرف سے بندوقیں چلیں۔ آخر کار ڈاکو مایوس ہو کر واپس چلے گئے مگر ساتھ ساتھ کنارے سے چلنا نہ چھوڑا۔ آخر جب لوٹنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو ایک داؤں چلے۔ ان کے سردار نے بڑے اخلاق سے کنارے پر کشتی کے مقابل کھڑے ہو کر عرض کیا، ہمارے یہاں آپ کی دعوت ہے اور دعوت قبول کرنا سنت ہے، آپ تو سنت پر قائم ہیں۔ دعوت قبول کیجیے اور وعظ بھی کیجیے کیونکہ ہمیں وعظ سننے کی نہایت آرزو ہے۔ حضرت نے رفقاء سے

مشورہ کیا۔ رفقا میں متعدد علماء بھی تھے جو کلکتہ سے شریک سفر ہوئے تھے کسی نے دعوت قبول کرنے کی رائے نہیں دی مگر حضرت نے فرمایا: وہ لوگ سنت کا نام لیتے ہیں، اسی نام کے احترام میں جانا چاہتا ہوں، ہمارا حامی فقط خدا ہے، شاید ہمارے جانے کو ان کی ہدایت کا سبب کردے تمام رفقا تیار ہو گئے، چند آدمیوں کو کشتی کی نگہداشت کے لیے چھوڑ دیا اور چوروں کے سردار سے کہا کہ ہم لوگ ہتھیار سمیت آئیں گے انھوں نے منظور کرلیا، تو حضرت مرشد رفقا کی معیت میں ان کے ساتھ چلے۔ ہولناک جنگل ان کے ساتھ طے کیا اور ویران کھنڈرے میں جو ڈاکوؤں کا بسیرا تھا پہونچے۔ ڈاکوؤں کا سردار آپ کو اپنے گھر لے گیا ضیافت کی تیاری شروع کی، اسی دوران رات ہو گئی، حضرت مرشد اور آپ کے ہمراہیوں کو معلوم ہو گیا کہ ان لوگوں کا پروگرام ہے کہ جب سب لوگ دستر خوان پر کھانے کے لیے بیٹھیں گے، تو اچانک حملہ کر کے سب کو قتل کر ڈالیں گے، دستر خوان بچھنے پر حضرت نے ڈاکوؤں سے فرمایا کہ: ہماری یہ عادت نہیں سب ایک ساتھ کھانے پر بیٹھیں، اس لیے ہمارے آدھے رفقا دستر خوان پر بیٹھیں گے اور آدھے سلح کھڑے رہیں گے، پہلی جماعت کے فارغ ہونے کے بعد دوسری جماعت کھانے پر بیٹھے گی، اگر تم اس بات کو منظور نہ کرو گے تو ہم لوگ فوراً واپس چلے جائیں گے مجبوراً ڈاکوؤں نے اسے منظور کیا، کھانے سے فراغت کے بعد چوروں نے وعظ کی درخواست کی، تاکہ جب سب لوگ وعظ میں مشغول ہوں اس وقت اچانک حملہ کردیں۔ حضرت مرشد نے وعظ شروع فرمایا۔ یہ وعظ ایسا گرم و تیز ہوا کہ چور تہ دل سے گریہ وزاری کرنے لگے۔ آخر کار سبھوں نے توبہ اور بیعت کی اور ہدایت پانے کے بعد اپنی بدنیتی کا اعتراف کیا اور کہا کہ ہماری تقدیر میں آپ کی طفیل ہدایت لکھی تھی، حضرت مرشد نے ان سے سخت عہد لیا کہ کبھی چوری نہ کریں گے اور کسی کو راہ میں اذیت نہ دیں گے۔ اس کے بعد حضرت مرشد وطن تشریف لے گئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد جب شیخ محی الدین نے اپنے وطن مدراس جانے کی اجازت چاہی تو حضرت نے انھیں رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ ان تائبوں کے یہاں جاؤ۔ اور ہمارا سلام پہونچا کر

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

گاہے گاہے باز خواں....

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

عمومی اصلاح و دعوت کا کام
طریق کار کے بارے میں ایک مشورہ

۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ سخت جدوجہد کے بعد آزادی کا پروانہ ہندوستان کو ملا تھا — تقسیم کا مطالبہ بھی منظور ہو گیا تھا۔ اور بے شمار لوگ جو عرصہ دراز سے اس کے لیے کوشاں تھے، توقع رکھتے تھے کہ اب ملت اسلامیہ ہندیہ کے برے دن ختم ہونے کو ہیں۔ لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ابھی توقعات کی کلیں کا زمانہ بھی ٹھیک سے شروع نہیں ہوا تھا کہ افق پر سرخ بادل منڈلانے لگے، اور دیکھنے والوں نے ان بادلوں سے برسنے والی آگ اور خون کو صاف دیکھ لیا، اور اندازہ ہو گیا کہ مسائل جوں کے توں ہیں اور رہیں گے اور بگاڑ ترقی پذیر ہے اور رہے گا۔ — اس تجربہ کے نتیجہ میں وہ حقیقت، قرآن کا ایک ایک لفظ جس کا داعی و شاہد ہے اس طرح بے غبار ہو کر آنکھوں کے سامنے آگئی تھی کہ تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ امت مسلمہ کی قوت کا واحد سرچشمہ دین ہے اور ان ساری "ولایتی اور دیسی" پریشانیوں اور ذلتوں کا واحد سبب بددینی انحطاط اور عمومی بے دینی یا بددینی ہے — نیز ان کے دور کرنے کی کوئی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان کے اصل سبب بے دینی یا بددینی کو دور نہ کیا جائے۔ بہت سے لوگ جو اس سنت خداوندی کو صرف سن کر پورے طور سے نہیں مان پا رہے تھے، اب اسے کارفرما دیکھ کر اور اس کے نتائج و مظاہر کو برت کر، پہلے سے زیادہ صداقت و واقعیت کے ساتھ اسے تسلیم کرنے لگے تھے اور اس کا ایک اثر یہ ہوا تھا کہ ملت اسلامیہ کے مسائل و مشکلات کے لیے فکرمند حضرات اپنے دوسرے کاموں کے ساتھ عمومی اصلاح و تربیت کے کام کو بھی ضروری محسوس کر کے اس کی تشکیل اور خاکے تجویز کرنے لگے تھے۔

اُدھر چودھویں صدی ہجری میں جو حساس اور دردمند دل صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری امت، اور پوری انسانیت کے حالات سے بے چین و مضطرب تھے ان میں سے ایک حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے سینے میں دھڑک رہا تھا ——

راقم سطور تو ان دنوں میں اس عالم آب و گل میں آیا بھی نہیں تھا۔ البتہ ان صفحات کے پڑھنے والوں میں ایسے کئی حضرات ہوں گے جنھوں نے وہ دور بھی پایا ہوگا، اور حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا بھی ہوگا۔ بہرحال اپنے جیسے حضرات کی خدمت میں براہِ راست دیکھنے والے اور مستند و ثقہ حضرات کی روایت سے جو کچھ سنا ہے، اس کی روشنی میں یہ عرض کرنا نامناسب نہیں معلوم ہوتا کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو شروع ہی سے اللہ تعالیٰ نے قلب دردمند عطا فرمایا تھا، اور روز بروز ان کے قلبی اضطراب اور درد و الم میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جو کچھ میں آتا تھا جس کام سے کچھ خیر کی امید ہوتی تھی، امت کے حالات میں اصلاح کے لیے وہ آپ شروع کرتے لیکن تجربہ یہ محسوس کرا دیتے کہ اس پوری امت کے درپیش اس عمومی اور ہمہ گیر انقلاب کا مقصد حاصل نہیں ہو پا رہا ہے جس سے کم پر قناعت ان کی نگہ بلند کو منظور نہ تھی بہتر طریقے کی تلاش شروع کر دیتے۔ لیکن کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ عجیب حیرت اور پریشانی کا سامنا تھا —— بالآخر "ووجدک ضالاً فهدیٰ" کے خداوندی معاملہ اور دعوت و عزیمت کی تاریخ میں مسلسل پیش آنے والے تجربہ کا ظہور چودھویں صدی کے اس "امی" پر ہوا۔ جو نہ صاحبِ قلم تھا، نہ صاحبِ بیان، نہ تقریر اس کے پاس تھی نہ تحریر، نہ شہرت و مقبولیت کے دوسرے اسباب اس کے پاس تھے۔ بس درد تھا، غم تھا، فکر تھی کڑھن تھی اضطراب تھا، جان توڑ محنت تھی، اور جان سوز دعائیں تھیں۔ ہمت تھی حوصلہ تھا، اللہ کے وعدوں، اس کی قدرت و سنت کا محض قانونی اعتراف نہیں حقیقی یقین تھا، اور بس یہی صفات ان کا اصل سرمایہ، اور جلوۂ زندگانی میں ان کی تشریح تھیں، وہ اس شعر کے صحیح مصداق تھے ؎

تپیدم، نالہ کردم، آب گشتم، خاک گردیدم
تکلف بیش ازیں نتواں بعرض مدعا کردن

اور شاید انہی صفات کا ثمرہ تھا کہ اللہ نے ان کو وہ مخصوص بصیرت اور قرآن مجید، اسوۂ نبوی اور اسوۂ صحابہ میں تدبر اور ان سے دعوت کی راہ میں پیش آنے والے ہر چھوٹے بڑے مسئلہ میں رہنمائی اخذ کرنے کی وہ استعداد دی تھی جس کے بغیر یہ عظیم اور نازک کام صحیح نہج پر نہیں کیا جا سکتا۔

ناظرین کرام معاف فرمائیں، ارادہ اور شاید ضرورت کے بھی برخلاف یہ تمہیدی نوٹ طویل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ مجھے عرض یہ کرنا تھا کہ ۱۳۶۲ھ میں جبکہ عام طور سے عمومی اصلاح و تربیت کی ضرورت کو محسوس کیا جانے لگا تھا، اور لوگ رواجی سیاسی تدبیروں سے مایوس ہو کر دین اور دعوت کو ہی اپنے مسائل کا حل تسلیم کرنے لگے تھے اس وقت رجب ۱۳۶۲ھ میں یہ مضمون اس غرض سے لکھا گیا تھا کہ اس مقصد کے لیے اس طریقہ کو اختیار

کرنے کا مشورہ دیا جائے جو نبوی مزاج و منہاج سے قریب تر ہے اور جس کو چودھویں صدی میں زندہ کرنے کے لیے حکمت الٰہی نے بظاہر مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا انتخاب فرمایا تھا۔

اب جبکہ ہندوستان کی آزادی کو چالیس سال گذرنے کو ہیں اور مختلف تجربے حالات کو درست کرنے کے لیے کیے جاچکے ہیں، اور ان تمام تجربوں کے سوفیصد مایوس کن نتائج ہمارے سامنے ہیں اور ایک طبقہ ان تجربوں سے بیزار و مایوس ہو کر دین اور دینی جد و جہد ہی کو مسائل کا واحد حل سمجھنے پر مجبور ہونے لگا ہے۔ اور اسکے لیے بھی نئی نئی تجویزیں مرتب ہو رہی ہیں، نئے نئے خاکے بن رہے ہیں، ان سب اہل درد و فکر کی خدمت میں ان کے مخلصانہ جذبات کے پورے قدر و احترام کے ساتھ اسی مضمون کو دوبارہ پیش کیا جا رہا ہے ——— اللہ تعالیٰ اسے اسکے نفع کو عام فرمائے ——— مدیر]

ہندوستان کے جدید سیاسی فیصلہ کے بعد سے دیندار اور دین کا فکر رکھنے والے مسلمانوں کے عام حلقوں میں بڑی شدت اور قوت کے ساتھ یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ دین سے ناواقف اور مذہباً سے غافل قسم کے مسلمانوں کی دینی اصلاح کے کام کی طرف خاص توجہ دی جائے اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ جد و جہد کی جائے ——— پاکستانی علاقوں میں تو اس کام کی ضرورت خاص طور سے اس لیے محسوس کی جا رہی ہے کہ اگر وہاں کے عام مسلمانوں میں دینی بیداری اور اسلامی تقاضوں سے صحیح واقفیت وسیع پیمانے پر نہ پیدا کی گئی اور اسلامی اصولوں کے مطابق وہاں کی رائے عامہ کی اصلاح و تربیت نہ کی جاسکی تو خطرہ ہے کہ وہاں کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونے کے باوجود اپنے نظام و قانون کے لحاظ سے "غیر اسلامی" بلکہ لادینی رہے، اور خدانخواستہ اسلام اپنی اس حکومت میں بھی ویسا ہی مظلوم و محکوم اور اسی کس مپرسی کی حالت میں رہے، جیسا کہ وہ نامسلمانوں کی حکومت میں رہا یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اسلامی حکومت تب ہی قائم ہوسکتی ہے جبکہ رائے عامہ پوری مسلمان ہو۔

اور باقی ہندوستانی علاقوں کے مسلمانوں میں اس کام کی ضرورت خاص کر اس وقت اس لیے محسوس کی جا رہی ہے کہ اگر ان میں دین سے صحیح تعلق، واقفیت اور مضبوط اسلامی سیرت عام طور سے پیدا نہ کی گئی اور حقیقی اسلام سے ان کی بیشتر آبادی کی جہالت، غفلت اور دین سے ان کی بے تعلقی ویسی ہی رہی جیسی کہ اب ہے تو اس کا قوی خطرہ ہے کہ مستقبل کے بدلے ہوئے حالات میں دنیوی مفاد اور حقیر مادی مقاصد کی خاطر یا کسی وقت خطرناک حالات سے دوچار ہو کر خدانخواستہ کہیں وہ اپنی اس برائے نام اسلامیت کو بھی ختم نہ کردیں جس کو وہ اب تک محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔

بہرحال یہی وہ حالات و خطرات ہیں جن کے پیش نظر عام دینی حلقوں میں اس وقت مسلمانوں میں اصلاح و تبلیغ کے کام کی ضرورت کا احساس شدت سے پیدا ہو رہا ہے اور بہت سے وہ ادارے اور وہ حلقے بھی جو ابھی تک اس کام کی طرف زیادہ متوجہ نہ تھے اب متوجہ ہو رہے ہیں، تجاویز سوچی جا رہی ہیں اور خاکے بن رہے ہیں۔

اس ضرورت کا احساس کرنے والے اور اس مقصد کے لیے تجاویز اور طریقہ کار سوچنے والے ان حضرات میں بعض تو وہ ہیں جن کے سامنے تبلیغ کے وہی معروف عام طور طریقے ہیں جو مدت دراز سے رائج ہیں کہ مبلغین مقرر کیے جائیں جو شہروں، دیہاتوں دیہاتوں دورے کریں، وعظ کہیں، تبلیغ کریں اور ناواقف مسلمانوں کو دین کے احکام و مسائل بتلائیں۔ اس کے علاوہ اسلامی مکاتب اور دینی تعلیم کے مدرسے کثرت سے کھولے جائیں اور ہو سکے تو کاروباری اور مزدور پیشہ لوگوں کی تعلیم کے لیے شبینہ مکاتیب بھی قائم کیے جائیں نیز مذہبی رسالے اور کتابیں شائع کی جائیں۔

دوسرے بعض حضرات وہ ہیں جو نئی دنیا اور اس کی نئی ترقیوں اور جدتوں سے واقف ہیں اور ان کے سامنے کسی ازم اور کسی مسلک کو پھیلانے اور کسی قوم اور کسی گروہ میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے کے وہ نئے ڈھنگ اور تحریکوں کے پروپیگنڈے کے وہ جدید طریقے بھی ہیں جو زمانہ حال کی مادی اور لادینی تحریکات کو پھیلانے میں بہت کارگر ثابت ہوئے ہیں یہ حضرات مسلمانوں میں دینی اصلاح و تبلیغ کے اس کام کے لیے انہی جدید طریقوں کو زیادہ مفید اور کارگر سمجھتے ہیں۔

اسلام کا درد اور دین کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے یہ دونوں طبقے بھی انشاء اللہ اپنے اپنے عمل اور اخلاص کے مطابق عند اللہ اجر کے مستحق ہوں گے —— لیکن جی چاہتا ہے کہ خلوص کے ساتھ ان حضرات کی خدمت میں ایک مشورہ عرض کیا جائے۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی اصلاحی دعوت

ان سطور کے پڑھنے والے حضرات میں غالباً کوئی ایک صاحب بھی ایسے نہ ہوں گے جو حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی شخصیت سے ناواقف ہوں مولانا مرحوم نے اپنی عمر کا وہ سارا حصہ جس میں انسان کی خداداد صلاحیتیں اور قوتیں پختہ ہوکر کسی کام کے قابل ہوتی ہیں (۳۵۔۴۰ سال کے سن سے لیکر ۶۰ سال تک) صرف اس کام پر صرف کیا، پھر اس کام سے ان کو صرف اس طرح کی دلچسپی ہی نہ تھی جو کسی صاحب تحریک کو قدرتی طور پر اپنی تحریک سے ہوتی ہے بلکہ جن لوگوں کو ان سے قریب رہنے کا اور ان کی جلوت و خلوت سے واقف ہونے کا موقعہ ملا وہ جانتے ہیں کہ وہ اس راہ میں جد و جہد کو یقین کے ساتھ رضائے الٰہی کا خاص وسیلہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک کے سکون کا ذریعہ سمجھتے تھے اس لیے اُن کو اس کام سے حقیقی عشق تھا، یہی ان کے دل کا درد اور یہی ان کے سر کا سودا تھا، اپنی قوت واستطاعت کی آخری حد تک اس کام میں کوشش کرنا وہ اپنے لیے فرض عین جانتے تھے، اپنی ذات کے بارے میں ان کا فیصلہ تھا کہ صحت اور زندگی کے خیال سے بھی اس دعوت اور اس کی جد و جہد میں کچھ کمی کر دینا یا سستی کرنا میرے لیے جائز نہیں ہے وہ تنہائیوں میں بیٹھ بیٹھ کر کتاب و سنت کی تعلیم و ہدایت اور اسوۂ نبوی کی روشنی میں اس کام کی راہیں اور نشیب و فراز سوچتے تھے، اسلام کی پچھلی تاریخ اور اپنے تجربوں سے نتائج اخذ کر کے طریقہ کار میں تبدیلی و ترمیم بھی کرتے تھے اور جب کام میں کوئی نقص اور رخنہ محسوس ہوتا یا راستہ نہ کھلتا تو بڑے ابتہال اور اضطرار کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے رہنمائی اور اصلاح حال کے لیے دعائیں بھی فرمایا کرتے تھے بلکہ ایسے مرحلے بھی آئے کہ آپ کی فکر و تدبیر عاجز ہوگئی اور تجربات نے مایوس کیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف تبتل اور انقطاع کی راہ اختیار کرلی اور طویل طویل اعتکاف کیے اور رات دن حق تعالیٰ سے رہنمائی اور دستگیری کی فریادیں کیں، استخارے کیے اور پھر غور و فکر کے بعد جو طریق کار سمجھ میں آیا اس کو اختیار کیا۔

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ یہ کام جس قدر غیر معمولی استقلال و انہماک سے اور جتنی یکسوئی کے ساتھ مولانا مرحوم نے کیا اور ۲۰ - ۲۵ سال کی طویل مدت میں تجربوں کی جتنی منزلوں سے وہ گزرے جہاں تک ہمیں علم ہے یہ اس دور میں ان کا خاص حصہ تھا۔ ہمارا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ مولانا مرحوم اس زمانہ کے سب سے بڑے عالم و عارف اور سب سے بڑے شیخ و مصلح تھے یا دین کے فہم و فکر میں وہ تمام اہل زمانہ پر فائق تھے۔ لیکن اُن سے اور اُن کے اس کام سے واقفیت کے بعد ہمیں اس میں ذرا شبہ نہیں کہ دین کے اس خاص شعبہ (یعنی اصلاح مسلمین اور تجدید و احیاء دین) کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو کام ان سے لیا اور ان کی بصیرت پر اس کام کے جو دقیق اصول منکشف فرمائے ان میں وہ بالکل منفرد تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر مولانا مرحوم کی اس دعوت کو اجتماعی دینی کاموں کا اچھا سلیقہ رکھنے والے اہل علم و بصیرت حضرات کی ایک معتدبہ تعداد اپنا لیتی اور اپنی خداداد صلاحیتیں اس پر لگا دیتی تو زمانہ کے بڑے بڑے مفکر حیران رہ جاتے کہ ایک حجرہ نشین مولوی بھی ایک پوری امت کی اصلاح اور اس میں مکمل تبدیلی پیدا کرنے کی ایک ایسی ممکن العمل اسکیم سوچ سکتا اور ایسا لائحہ عمل پیش کر سکتا ہے جو تحریکات کے آج کل کے مروجہ طور طریقوں سے بالکل الگ ہو۔

لیکن ہمیں بڑے رنج و قلق کے ساتھ اپنی اس ناکامی کا اعتراف ہے کہ اب تک بھی اس دعوت اور اس تحریک کو ایسے حضرات کی کسی قابل ذکر تعداد کا تعاون حاصل نہ ہو سکا بلکہ ایسے حضرات نے ابھی تک اس کو سمجھنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ جس طرح کے عام افراد اب تک اس کام میں لگے ہیں عمومی سطح پر بس انہی کے درجہ کا کام ہو رہا ہے[1] اور اس لیے عام نظروں کو اس میں کوئی غیر معمولی پن محسوس

---

[1] بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ اہل علم حضرات کی کمی کی وجہ سے بسا اوقات بے اصولیوں اور بے عنوانیوں کا بھی تجربہ ہوتا ہے اور بہت سے اور مخلص حضرات کے لیے وہ کبھی اعتراض اور وحشت کا باعث بنتا ہے۔

نہیں ہوتا، بلکہ بہت سے حضرات تو اپنی سرسری اور اوپری معلومات کی بناء پر اس کو صرف کلمہ اور نماز کی ایک تحریک سمجھتے ہیں کیونکہ انھیں اتنا ہی معلوم ہے اور انھوں نے صرف اتنا ہی دیکھا ہے کہ اس سلسلہ کی تبلیغی جماعتیں اپنے تبلیغی گشت میں غافل اور ناواقف عوام کو کلمہ طیبہ اور نماز ہی کی تبلیغ و تلقین کرتی ہیں، حالانکہ اس دعوت و تحریک کے متعلق یہ اندازہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی بڑے دارالعلوم کے صرف ابتدائی مکتبی درجہ کو دیکھ کر (جس میں کوئی میاں جی یا حافظ جی بچوں کو قرآن شریف اور قاعدہ بغدادی پڑھا رہے ہوں) یہ رائے قائم کرے کہ اس دارالعلوم میں تو بچوں کو صرف قاعدہ بغدادی اور قرآن شریف ہی پڑھایا جاتا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی حالت دینی لحاظ سے اس وقت جس قدر بگڑی ہوئی ہے اور ان کے مختلف طبقات کی اصلاح کے لیے جس قدر جامع اور ہمہ گیر طریقہ کار کی ضرورت ہے اور جس ترتیب اور جس حکمت سے کام ہونا چاہیے مولانا مرحوم کے طریقہ کار میں ان سبھی چیزوں کی رعایت ہے۔

مگر افسوس! معاصرت بڑا حجاب ہے اور مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی حلقہ بندیوں نے ان کو بڑے بڑے فیوض سے محروم رکھا ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ مولانا محمد الیاس مرحوم کی دینی دعوت اور اس کے طریق کار کے خاص نکات کو سمجھنے میں یہ دو چیزیں بھی بہت سے اہل علم حضرات کے لیے رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ بعض اچھے صاحب علم و صلاحیت والے حضرات صرف اس لیے مولانا مرحوم کی دعوت کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ وہ مولانا کے ہم عصر ہیں۔ اور خود عالم دین ہیں یا اس لیے کہ وہ کسی خاص جماعت یا خاص حلقہ یا خاص سلسلہ سے تعلق و وابستگی رکھتے ہیں۔ اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے دلوں میں یہ خیال راسخ ہو گیا ہے کہ ہر طرح کی خیر اور ہر قسم کی اچھائی صرف ہماری ہی جماعت اور ہمارے ہی حلقہ اور ہمارے ہی سلسلہ میں منحصر ہے اور اس لیے اپنے خاص دائرے سے باہر کی کسی شخصیت سے کبھی ہمیں کوئی اچھی بات نہیں مل سکتی

حالانکہ یہ ذہنیت نہایت ہی غلط ہے اور یہ غلط فہمی بہت ہی بڑا حجاب ہے مولانا محمد الیاسؒ تو ایک صاحب علم و معرفت اور صاحب دل بزرگ تھے میں تو عرض کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اس مرتبہ اور اس مقام کا نہ بھی ہو وہ بھی اگر کسی نیک مقصد کے پیچھے اس طرح پڑ جائے اور اپنی ہستی کو اس میں اس طرح فنا کر دے جیسا کہ اصلاح و تبلیغ کے اس کام میں مولانا مرحوم کا حال تھا تو ہمارے لیے ضروری ہو گا کہ جب ہم اس مقصد کے لیے قدم اٹھائیں تو اس بندہ کے افکار و تجربات سے فائدہ اٹھائیں اور اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو اپنا ہی نقصان کریں گے۔

بہرحال جو مخلصین اس وقت اس مقصد کے لیے نئے جوش سے اٹھ رہے ہیں اور مسلمانوں میں اصلاح و تبلیغ کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ ان کے عزم اور ان کے عمل میں برکت دے اور مدد فرمائے) ان کی خدمت میں خلوص اور دلسوزی سے صرف اتنا عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ

جب اللہ کے ایک بندہ نے (جس کو اس نے دین کا علم و فہم بھی دیا تھا اور اس کے ساتھ دل روشن اور ذہن ثاقب بھی عطا فرمایا تھا) ایک مقصد کے پیچھے اپنی ہستی کو فنا کر دیا اور مختلف تجربوں کے بعد وہ ایک طریق کار پر مطمئن ہوا تو ہمارے اور آپ کے لیے ضروری ہے کہ اگر ہم اس مقصد کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اس راہ میں مر مٹنے والے اس بندۂ خدا کے افکار و تجربات سے فائدہ اٹھانے کی ضرور کوشش کریں ورنہ یقیناً ہم اپنا بہت سا وقت ضائع کریں گے۔

مولانا مرحوم نے اس کام کے لیے کوئی خاص جماعت، یا جمعیت یا انجمن نہیں بنائی بلکہ آپ نے مسلمانوں کے تمام طبقات کو ایک عمومی دعوت دی کہ جس طرح ہر دین دار اپنا فرض سمجھ کر نماز روزہ ادا کرتا ہے اسی طرح اپنا اپنا فرض سمجھ کر سب مسلمان اس کام کو بھی کریں، خواہ ان کا تعلق کسی جماعت اور کسی انجمن سے بھی ہو اور خواہ وہ کسی بھی حلقہ یا سلسلہ سے وابستہ ہوں۔ چنانچہ یہ کام اب بھی جہاں کہیں ہو رہا ہے اسی عمومی دعوتی طرز پر ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس عاجز کی خواہش

اور گذارش بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ آپ حضرات اس دعوت کی حقیقت، اس کے اصول اور طریق کار کے خاص نکات کو سمجھنے کی کوشش فرمائیں، اور حسب توفیق اپنی ذمہ داری پر اور اپنے طور پر کام کریں۔ ع

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

البتہ مولانا مرحوم کا یہ طریقہ کار چونکہ زیادہ تر عمل سے تعلق رکھتا ہے اور صرف مضامین یا رسائل پڑھ لینے سے اس کے تمام پہلو اور اس کی دقیق رعایتیں پوری طرح سمجھ میں نہیں آتیں بلکہ اس کے لیے کم از کم چند روز عمل میں شرکت و رفاقت اور عمل کا مطالعہ و مشاہدہ اور اس کے تجربہ کاروں اور واقف کاروں سے بار بار کا مذاکرہ ضروری ہے، لہذا اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ اس کام کو سمجھنے کا ارادہ کرنے والے حضرات چند روز کے لیے بستی نظام الدین (دہلی) تشریف لے جائیں جہاں اس دینی دعوت کا مرکز ہے امید ہے کہ وہاں کے چند روز قیام میں انشاء اللہ اس کام کے خاص خاص اصول اور اہم اہم پہلو نگاہ میں آجائیں گے پھر اگر اس سلسلہ کی جزئیات و کلیات سے آپ متفق الرائے نہ بھی ہو سکیں گے تب بھی انشاء اللہ اس کام کے سلسلہ میں بہت کچھ بصیرت آپ حاصل کر سکیں گے۔ اور اس مقصد کے متعلق انشاء اللہ آپ کو بہت کچھ روشنی حاصل ہو سکے گی۔ واللہ الموفق

(صفحہ ۲۹ کا بقیہ)

ان کا حال دریافت کرو۔ شیخ محی الدین نے وہاں جاکر دیکھا کہ وہ لوگ بڑے باسلیقہ اور دیندار ہو گئے ہیں اور حضرت مرشد کی بڑی شکر گذاری کرتے ہیں کہ ہم کو طرح طرح کی گمراہی اور فسق سے چھڑا کر نہایت نیک راہ بتائی اب ہمارا روزگار اچھا ہے کہ محنت مزدوری یا تجارت کر لیتے ہیں حتیٰ کہ عورتیں بھی محنت مزدوری میں لگی ہیں۔ (باقی)

(نگاہِ اولیں کا بقیہ)

بھی ان خوش نصیبوں میں سے ہے جن کے ساتھ مولانا خصوصی معاملہ فرماتے۔ دار العلوم کی طالب علمی کے زمانہ میں بھی یہی معاملہ رہا، پھر جب میں مدینہ منورہ چلا گیا، اور سالانہ تعطیلات میں آتا اور مولانا سے ملاقات ہوتی تو اسی محبت کا معاملہ فرماتے، اور اب دو سال سے جب سے کہ دار العلوم میں تدریسی خدمت میرے سپرد ہوئی، مولانا کی بے لوث محبت و شفقت بڑھتی ہی رہی۔

مولانا کی خندہ پیشانی، متبسم چہرے اور ہشاش بشاش بشرے سے ان کی قلبی کیفیات اور سوزِ دروں کا اندازہ ہر شخص کو نہیں ہو سکتا تھا، مولانا ملت اسلامیہ کے حالات، رفتار زمانہ، اور خصوصاً اللہ والوں کی متاع دین و دانش لٹ جانے سے بے حد مضطرب اور رنجیدہ دل اور مدرسہ و خانقاہ کے اندرونی احوال و کوائف سے بہت غمگین رہتے تھے۔ مولانا اپنے حسب حال یہ شعر کبھی کبھی سنایا کرتے تھے ؎

دنیا سمجھ رہی ہے ہوں پیکر مسرت درد نہاں کو لیکن اللہ جانتا ہے

ایک طرف مولانا کا حساس مزاج، اور یہ دردمند دل تھا، اور دوسری طرف ان کی فطری کم گوئی کی عادت اور محبت و مروت بھرا مزاج، مولانا کے دل میں جو جذبات امنڈتے تھے، ان کے اظہار میں ان کا اعلیٰ ذوق شعری اور حیرت انگیز شعری حافظہ بڑی مدد کرتا تھا۔ ایک دفعہ کتب خانہ دار العلوم میں ایک مجلس میں ملت اسلامیہ کی زبوں حالی اور مردہ شعوری کا ذکر ہو رہا تھا، کافی دیر خاموش رہنے کے بعد مولانا نے ایک شعر پڑھا، اور وہ ہی سب کو حاصل مجلس لگا، شعر یہ تھا:

بعد مُردن کچھ نہیں یہ فلسفہ مردود ہے قوم ہی کو دیکھیے مردہ ہے اور موجود ہے

ایک مدرسہ میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ ضرورت کے بقدر اساتذہ کے مشاہروں میں اضافہ کیا جائے، لیکن یہ تجویز اعلیٰ ذمہ داران نے منظور نہ کی، ایک مجلس میں اس واقعہ کا تذکرہ ہوا، مولانا نے صرف دو شعر سنائے

امیر شہر کے ارماں ابھی کہاں نکلے فقیر شہر کے تن پر لباس باقی ہے
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی

مولانا ہم لوگوں کی تربیت کے لیے جو اشعار موقع و محل کی مناسبت سے بکثرت پڑھا کرتے تھے، ان میں یہ دو شعر خاص طور سے قابل ذکر ہیں ؎

ترک دنیا کے علائق تو کیے سب زاہد گر مناسب ہو تو اک ترک ریا اور سہی
ہم نے دیکھا ہے وہ بت توڑ دیے جاتے ہیں جن میں ہو جاتے ہیں انداز خدائی پیدا

مولانا کے مزاج میں خودداری و غیرت مندی، اور "منت غیر" سے ممکن حد تک احتیاط۔ اتنی تھی کہ جو لوگ اس مزاج سے آشنا اور اسکو برتنے کے عادی نہ ہوتے وہ انھیں کسی اور نگاہ سے دیکھتے۔ مولانا کی زبان سے یہ شعر ان کے اہل تعلق نے بارہا سنا ہوگا اور ان کے زندگی بھر کے رویہ کو اس کے مطابق پایا ہوگا ؎

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری — کہ آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

اور اسی خودداری اور بے نیازی نے مولانا کو خود اعتمادی کی دولت بے بہا دی تھی، ایک موقع پر مولانا نے بڑے جوش سے یہ دو شعر سنائے تھے ؎

مجھے اسیر کرو یا میری زباں کاٹو — میرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے
کسی مغرور کے آگے ہمارا سر نہیں جھکتا — فقیری میں بھی اختر غیرت شاہانہ رکھتے ہیں

مولانا انتقال سے کچھ پہلے یہ رباعی بار بار پڑھتے تھے۔

طفلی و پیری، جوانی دیکھ لی — تین دن کی زندگانی دیکھ لی
اب زمیں کا پیار باقی ہے نجیب — آسماں کی مہربانی دیکھ لی

مولانا کے دیرینہ رفیق مولانا محبوب الرحمن ازہری صاحب (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء) انتقال سے چند دن پہلے مولانا کی عیادت کے لیے دو تین بار ان کے گھر گئے، لیکن اتفاقاً ہر بار ملاقات نہ ہو سکی، اس کے بعد جب مولانا سے ملاقات ہوئی تو برجستہ یہ شعر پڑھا ؎

دیکھیے گردش تقدیر اسے کہتے ہیں — فاتحہ پڑھنے وہ آئیں میری تربت نہ ملے

مولانا کی ڈائری میں سب سے آخر میں درج یہ دعائیہ رباعی پڑھ کر

الٰهی لست للفردوس أهلا — ولا أقوى على نار الجحيم
فهب لی توبةً واغفر ذنوبي — فانك غافر الذنب العظيم

نیک شگونی کے طور پر بے ساختہ یہ مصرعہ میری زبان پر آگیا ؏

خدا کے فضل سے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

حضرت والد ماجد مدظلہ سے مولانا کا تعلق بہت قدیم تھا، راقم کے عم بزرگوار مولانا حکیم محمد احسن صاحب دار العلوم دیوبند میں مولانا کے ہم زمانہ رہے تھے، مولانا کے چھوٹے صاحبزادے برادر مکرم سید قمر الحسن صاحب ندوے میں میرے رفیق درس تھے، ان سب رشتوں سے مولانا کی جتنی عنایتیں اور شفقتیں اپنے اس حقیر ناکارہ پر رہیں اتنے ہی حقوق بھی ان کے اس پر ہیں۔ ناظرین کرام سے مولانا کے لیے ایصال ثواب اور دعاؤں کے زیادہ سے زیادہ اہتمام کی گذارش ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے مراتب بلند فرمائے، ان کے اہل خانہ کو بھرپور صبر و اجر دے، اور ہم سب کو

ان کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے مسلک اور منہاج پر عمل کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین

ممالک غیر سے
بحری ڈاک سے ۶۰/ روپے
یا ۵ پونڈ یا ۲۰ ریال
ہوائی ڈاک سے ۱۳۵/ روپے
(۹ پونڈ ۵۰ ریال ۱۵ ڈالر)

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

فی شمارہ ۲/۵۰

چندہ سالانہ
ہندوستان میں ۲۵/-
پاکستان سے پاکستانی سکہ میں ۶۰/-
بنگلہ دیش سے ہندوستانی سکہ میں ۳۰/-

جلد ۵۲ | بابت اکتوبر ۱۹۸۴ء مطابق محرم الحرام ۱۴۰۵ھ | شمارہ (۱۰)

اگر اس دائرہ میں ○ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آ جانا چاہیے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی روانہ کیا جائے گا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں۔ دوبارہ بھیجنے کے لیے دفتر میں پرچہ ہوگا تو ضرور بھیجا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار حضرات: مبلغ ۵۰ روپے ہندوستانی سکہ میں کسی بھی ذریعہ سے دفتر الفرقان لکھنؤ کو روانہ فرمائیں یا پاکستانی سکہ میں ۶۰ روپے ناظم ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیج دیں۔

محمد حسان نعمانی پرنٹر پبلشر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بے شمار مقامات پر اپنی اس سنت کا ذکر فرمایا ہے کہ جب حق کی دعوت اس عالم میں شروع ہوتی ہے، تو پہلے اس کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ باطل سر اٹھاتا ہے، زور پکڑتا ہے اور خاصی مخلوق اس سے مرعوب و متاثر نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن باطل کا یہ زور عارضی ہوتا ہے، اس کا طلسم جس تیزی سے چھاتا ہے اس سے زیادہ تیزی سے ٹوٹتا ہے۔ اور حق آہستہ آہستہ، فطری رفتار سے آتا ہے، اور پھر وہی باقی رہتا ہے، وہی قائم رہتا ہے، —— اسی سے اہل خیر کو خیر ملتا ہے۔ اور شر والوں کا شر اسی سے دفع ہوتا ہے۔

سورۂ رعد کی آیت ۱۷ میں اس سنت کو دو مثالوں سے واضح فرمایا گیا ہے۔ پہلی مثال کا حاصل یہ ہے کہ "تم دیکھتے ہو کہ آسمان سے بارش ہوتی ہے تو وادیاں اور نالے اپنے حجم کے مطابق لبریز ہو کر بہہ نکلتے ہیں، پھر دیکھتے ہو کہ سیلاب آجاتا ہے۔ اور سیلاب جھاگ کو ابھار کر اوپر کر دیتا ہے —— کبھی جھاگ اتنا ہوتا ہے کہ اس کے نیچے بہنے والا پانی آنکھوں سے اوجھل ہونے لگتا ہے۔ جھاگ ہی جھاگ نظر آتا ہے، لیکن یہ جھاگ بالآخر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ اور وہ پانی جو زمین اور اہل زمین کے لیے نافع ہے وہی بالآخر باقی رہتا ہے۔

دوسری مثال کا حاصل یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ زیورات ڈھالنے کے لیے جب سونے یا چاندی وغیرہ کو پگھلایا جاتا ہے تو اس کا میل کچیل اوپر آجاتا ہے جو کبھی اتنا ہوتا ہے

کہ اصل دھات دکھائی نہیں پڑتی، میل ہی میل نظر آتا ہے ــــــ لیکن بالآخر یہ میل غائب ہو جاتا ہے، اور وہ قیمتی شے باقی رہتی ہے۔

ان دو مثالوں کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل کے سلسلہ میں اپنی سنت بیان فرمائی ہے کہ دعوت حق کی بارش سے جب بندگان خدا اپنے اپنے ظرف کے بقدر آب حیات سے بہرہ ور ہوتے ہیں، اور ہدایت کا سیلاب بہنے لگتا ہے تو باطل کا جھاگ اور باطل کا میل ابھرتا ہے، لیکن پھر ہوتا کیا ہے "فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ" تو جھاگ اور میل تو بے مصرف ہو کر اڑ جاتا ہے لیکن جو چیز لوگوں کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے وہی زمین میں قائم اور باقی رہتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک عام آدمی باطل سے بچنے، اور حق کی صحیح پہچان کے لیے کیا تدبیر اختیار کرے؟ قرآن مجید ہی میں متعدد مقامات پر اس کا بھی جواب دیا گیا ہے سورۂ بقرہ[1] میں یہ بیان کرنے کے بعد کہ لوگوں کو حق تک لانے کے لیے، اہل حق کو جبر و اکراہ کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ حق تک پہنچنے سے جو شے بھی رکاوٹ بنتی ہو (خواہ وہ اپنا نفس ہو، حب مال یا حب جاہ کی کمزوریاں ہوں، عہدہ و منصب ہو، ذاتی مصالح ہوں، حلقۂ احباب کی ناراضگی کا اندیشہ ہو یا کسی بھی قسم کی ذہنی یا قرابتی وابستگی کے تقاضے ہوں) طالب حق اس سے اپنا دامن چھڑائے، اس سے بالکل بے نیاز ہو کر محض اللہ پر اعتماد، اس کے بھروسے اور اس کے ساتھ ایمانی تعلق کے ذریعہ حق تک پہنچنے کی کوشش کرے تو اللہ کا قانون ہے کہ اس کی دستگیری ہوتی ہے، اور اسے صحیح راہ نہ صرف یہ کہ دکھا دی جاتی ہے بلکہ اس پر چلنا آسان کر دیا جاتا ہے بلکہ منزل تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور جو یہ تدبیر اختیار نہیں کرتا بلکہ یہ رکاوٹیں اسے الجھا لیتی ہیں، اس کی انگلی شیطان کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے جو، ظاہر ہے کہ اسے باطل ہی یں دھکیل دیتا ہے۔ یہی خلاصہ ہے سورۂ بقرہ کی ان آیات کا۔

---

[1] (آیت ۲۵۶ ــ ۲۵۷)

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ، فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ، لَا انْفِصَامَ لَهَا ، وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ؛ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ ، وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ ـ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِنَ النُّوْرِ إِلَى الظُّلُمَاتِ أُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ۝

چھ سال پہلے جب ایران میں "اسلامی انقلاب" کا غلغلہ بلند ہوا تھا، راقم الحروف مدینہ منورہ میں بسلسلۂ تعلیم مقیم تھا، جو لوگ حرمین شریفین میں قیام کر چکے ہیں انھیں اس کا تجربہ ہوگا کہ وہاں سے بیٹھ کر پورے عالم، اور خصوصاً پوری ملت اسلامیہ کا نظارہ کرنا اور اس کے فکری و عملی رجحانات کی تشخیص کرنا بہت آسان ہوتا ہے

—— اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید دنیا میں ایسے لوگ معدودے چند ہی ہوں گے جو ایران کے انقلاب کو سو فیصد غیر اسلامی سمجھ رہے ہوں گے —— حال یہ تھا کہ لوگ خصوصاً پرجوش نوجوان اس بارے میں کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جس شخص کے بارے میں یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ اسے اس انقلاب کے بارے میں کچھ شبہات ہیں یا اس کی رائے میں اس کی تائید میں کچھ احتیاط سے کام لینا چاہیئے اسے بزدل، تنگ نظر، دین و سیاست کی تفریق کا علمبردار، اور نرا ملّا قرار دے کر اس کی بات کو ہوا میں اڑا دیا جاتا تھا —— پھر پروپیگنڈے کی زبردست طاقت کے ذریعہ پورے عالم میں ایران کے انقلاب کی خالص یا کم از کم غالب اسلامیت کا تصور بلکہ عقیدہ سیلاب بلاخیز کی طرح پھیل کر پوری دنیا کے بےچین و بےقرار مسلمانوں اور خصوصاً نوجوانوں کے ذہن و دماغ میں اس طرح رچ بس گیا کہ کچھ لوگوں کے خیال میں اس کے بدلنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا، اور اس لیے اس کی کوشش حکمت اور حقیقت پسندی کے سراسر منافی سمجھی گئی۔

لیکن اب؟

اب صورت حال بدل چکی ہے ــــ اب دھواں چھٹ رہا ہے میل اور جھاگ اڑ رہا ہے۔ اور حق سامنے آ رہا ہے ــــ ایران سے ابھرنے والے حق نما باطل کی حقیقت سے لوگ واقف ہوتے جا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ہم سب کو دکھا دے، اور باطل سے بچنے اور حق کے اتباع کی توفیق ہم سب کو نصیب فرمائے، اور اپنے ان بندوں کو اپنی شان عالی کے مطابق جزائے خیر دے جن کو اسی نے حق پر ثابت قدم رکھا، اور دوسروں کے حق کی طرف آنے کا ذریعہ بنایا۔

اس تمہید کے بعد ہم مختلف مقامات سے آنے والے چند خطوط شائع کر رہے ہیں جن سے اس رخ کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہلا خط ہمارے مخدوم و محترم جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب کا ہے جو علمی و دینی حلقوں میں پورے عالم میں معروف ہیں ــــ مولانا موصوف نے الفرقان میں شائع ہونے والے والد ماجد مدظلہ، کے مضامین پڑھ کر ان کے نام اپنے تازہ مکتوب مورخہ ۱۰/۹/۸۴ء میں تحریر فرمایا ہے:

"الفرقان کی گذشتہ دو اشاعتوں میں "خمینی" پر آپ نے جو کچھ لکھا ہے میں نے اس کو حرفاً حرفاً توجہ سے پڑھا ہے۔ اور اب میں یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے آپ نے حق بالکل واضح کر دیا ہے، ایران کے انقلاب کے سلسلہ میں میرے جو خیالات تھے اور جن کا اظہار وقتاً فوقتاً میں نے "برہان" میں کیا ہے میں ان سب سے رجوع کرتا ہوں آپ اگر چاہیں تو اس خط کو الفرقان میں شائع کر سکتے ہیں، میں خود بھی برہان میں لکھوں گا۔"

یہ مکتوب تو مولانا اکبر آبادی کے اس موقف کے بارے میں صرف یہی عرض کر سکتا ہے کہ ہماری نسل کے لیے مولانا موصوف نے اپنے اس اقدام سے حق پرستی اور بے نفسی کی جو اعلیٰ مثال قائم کی ہے، مولانا دعا فرمائیں کہ ہمیں بھی اس سے سبق حاصل کرنے اور زندگی بھر اس پر قائم رہنے کی توفیق ملے ــــ ہمیں امید ہے کہ بہت سے

اللہ کے بندوں کو مولانا کے اس فیصلہ سے تقویت ملے گی، اور وہ اس کے سہارے تذبذب سے نجات پاسکیں گے۔

(۲)

ڈربن جنوبی افریقہ سے فاضل گرامی ڈاکٹر سید سلمان ندوی خلف الرشید حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ) صدر شعبۂ اسلامیات، ڈربن یونیورسٹی نے حضرت والد ماجد مدظلہ کے نام تازہ خط میں لکھا ہے:

"ایران کے انقلاب کے بارے میں شروع سے میں متذبذب تھا کہ اس بارے میں ہمارا کیا موقف ہو۔ ایک طرف عقائد ضالہ اور دوسری طرف اسلامی حکومت یا شعار اسلامی کے قیام کا کارنامہ تھا۔ مگر جیسے جیسے وقت گذرتا گیا طبیعت اسی طرف مائل ہوتی گئی کہ شیعی گمراہ عقائد کی بنیاد پر جو حکومت یا شعار حکومت قائم ہوگا وہ خود شیعی ہوگا اور اسلامی نہ ہوگا۔

(۳)

لندن سے نکلنے والے مشہور اسلامی انگریزی رسالہ "امپیکٹ انٹرنیشنل" کے شمارے بابت ۲۴ اگست تا ۱۳ ستمبر میں ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس کا رخ بھی یہی ہے، اس مضمون کا ترجمہ دہلی سے برادر زادہ عزیز و محترم عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب نے بھیجا ہے، ہم وہ پورا ترجمہ بعینہٖ اپنے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں، مضمون کے تعارف کے لیے بھی حضرت والد ماجد کے نام فاضل مترجم کے خط سے ہی چند سطریں مستعار لی جارہی ہیں — اپنے خط میں انھوں نے لکھا ہے:

"تازہ الفرقان میں شیعیت اور امام خمینی سے متعلق آپ کے سلسلہ مضامین کی آخری قسط پڑھ لی۔ ہمارے خیال میں بس یہی تینوں مضامین ان لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں، جو بے سوچے سمجھے محض جذباتی تقاضہ سے انقلاب ایران کی حمایت کرتے رہے ہیں یا اس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ لندن سے شائع ہونے والے

"اسلام پسند" حلقہ کے ترجمان انگریزی رسالہ "امپیکٹ انٹرنیشنل" کے حالیہ شمارہ میں امام خمینی کی ایک تقریر کا بڑے سخت انداز میں تعاقب کیا گیا ہے۔ اس رسالہ کی پالیسی "جماعت" کی طرح اول اول واضح طور پر جگہ پر جوش حمایت کی تھی جو بعد میں رفتہ رفتہ صرف ہمدردی تک محدود رہ گئی اور اب باقاعدہ پریشانی کے اظہار میں بدل گئی ہے، جیسا کہ اس مضمون سے اندازہ ہوتا ہے۔۔"

اب ناظرین کرام وہ مضمون ملاحظہ فرمائیں:۔

انقلاب دوستوں کی آزمائش

اسلام اور اسلامی تاریخ پر خط تنسیخ پھیرنے کی کوشش

۹ر اگست ۱۹۸۴ء کو شیعہ فرقے کے آٹھویں امام —— امام رضا —— کے یوم ولادت کی بارہ سو انیسویں (۱۲۱۹) سالگرہ تھی۔ اس موقع پر ایران کے شہر مشہد میں، جو امام رضا کا مدفن بھی ہے "حیات و تعلیمات امام رضا" کے عنوان سے ایک بین الاقوامی اجتماع منعقد ہوا۔ اجتماع کا افتتاح ایرانی صدر مملکت علی خامنئی کے ایک پیغام سے کیا گیا۔ صدر موصوف نے اپنے پیغام میں کہا کہ:

"اگرچہ ائمہ معصومین سے متعلق اب تک ہزاروں مضامین اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ حضرات ائمہ کی حیاۃ مبارکہ کو ابھی تک پورے طور پر سمجھا نہیں جا سکا ہے اور ان کے پُر مشقت جہاد کی قدر و قیمت خود اہل تشیع کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ اور مخفی رہی ہے۔"

لیکن اس سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل اور اسلام اور اسلامی تاریخ کے متعلق موجودہ ایرانی قیادت کے نقطۂ نگاہ کی ترجمان وہ تقریر ہے جو ایران کے انقلابی رہنما آیت اللہ روح اللہ خمینی نے اسی موقعے کی مناسبت سے اپنی قیام گاہ پر منعقد ہونے والی ایک خصوصی مجلس میں فرمائی۔

اس مجلس میں حکومت کے اعلیٰ عہدیداران اور سینیر فوجی حکام امام خمینی کے مخاطب تھے چنانچہ انھوں نے اپنی تقریر میں مختلف سیاسی، انتظامی اور انقلابی امور کا جائزہ لیا اور حکومتی مشینری کے بعض شعبوں میں پائی جانے والی خامیوں اور نقائص کی نشاندہی بھی کی ——— انھوں نے خاص طور پر انتقام لینے کے پھیلے ہوئے جذبہ کا ذکر کیا، اور پھر ریڈیو ایران کے بحر احمر میں سرنگیں بچھانے کی خبر کو مثبت انداز میں نشر کرنے کے اقدام کی مذمت کی جس کی وجہ سے ایران کے سر الزام آیا، انھوں نے گذشتہ پارلیمانی انتخابات میں انقلابی گارڈوں کی طرف سے مختلف امیدواروں کی تائید کے اقدام کی بھی سخت مذمت کی اور انقلابی دستوں اور فوج کو سیاسی امور سے مکمل طور پر الگ رہنے کی تاکید کی ......

لیکن جس چیز نے ان کی اس تقریر کو بہت زیادہ اہم اور ہمارے لیے قابل توجہ بنا دیا وہ یہ ہے کہ ایرانی رہنما نے بظاہر اس مبارک موقع کو بعض ایسے عجیب و غریب نظریات کے اظہار کے لیے بھی منتخب فرمایا جو کم از کم اتنی صراحت اور صفائی کے ساتھ اس سے پہلے ظاہر نہیں کیے گئے تھے۔ امام خمینی کے یہ نظریات مبینہ طور پر خود ان کے برپا کیے ہوئے انقلاب کی برق رفتاری کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں بعض شیعہ قائدین کے انتہائی مخصوص عقائد کی ہر ممکنہ رعایت کے باوجود امام صاحب کے ان افکار و نظریات کو اسلام اور اسلامی تاریخ پر خط تنسیخ پھیر دینے کے مترادف تصور کیا جاسکتا ہے اور ان کی صرف یہی ایک توجیہ ممکن ہے کہ ان کے ان خیالات کو کلیتًا خود ساختہ اور من گھڑت قرار دیدیا جائے۔

آیت اللہ خمینی نے جلسہ میں موجود سرکاری عہدیداروں سے جن میں صدر مملکت علی خامنئی، وزیر اعظم موسوی اور چیف جسٹس اردابیلی بھی شامل تھے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"دو باتیں ان کے لیے کثرت رنج و قلق کا باعث بنی رہتی ہیں اور دونوں ہی ایک دوسرے سے زیادہ افسوسناک ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہ مستقل

ناکامی ہے جو صدر اسلام سے لیکر آج تک اُس معیاری اسلامی حکومت کے قیام میں پیش آتی رہی ہے جو اسلام کا مطلوب ہے"۔

اپنے اس خیال کی مزید تشریح کرتے ہوئے امام صاحب نے فرمایا کہ:

"خود پیغمبر اقدس صلعم کے زمانہ میں بھی مختلف دشواریوں، اختلافات اور حربی مصروفیتوں کی وجہ سے حکومت کا نظام اس نہج پر قائم نہیں کیا جاسکا تھا جیسا کہ آپؐ چاہتے تھے"۔

امام موصوف کی یہ رائے بظاہر اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، اور آپؐ کے مشن کا واحد اور اولین مقصد ایک معیاری اسلامی حکومت قائم کرنا تھا اور یہ کہ خود پیغمبر اسلام بھی اسے قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ یہ دونوں ہی مفروضے سراسر غلط اور مغالطہ آمیز ہیں۔

یہ امر مسلّم ہے کہ خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہر لحاظ سے پیغمبر اسلامؐ کے کامل اور مکمل جانشین تھے اور امت مسلمہ کی عظیم اکثریت ——— شیعہ فرقہ کے استثناء کے ساتھ ——— خلافت راشدہ کو شالی حکمرانی کا دور تسلیم کرتی ہے لیکن خمینی صاحب نے خلفاء ثلاثہ (حضرت ابو بکر عمر و عثمان رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کے تذکرہ کو درمیان سے اس طرح حذف[1] کرتے ہوئے کہ جیسے تاریخ میں ان کا وجود سرے سے موجود ہی نہو، ارشاد فرمایا کہ:

"...... اور بعینہٖ یہی بات (یعنی اسلامی حکومت کے قیام میں ناکامی) تمام ائمہ کے زمانوں پر صادق آتی ہے ——— امیر المومنین سیدنا علیؓ کو اپنے زمانۂ خلافت میں جنگوں، باہمی تنازعوں اور ان منافقین (کمزور دیدہ دانیوں) کا سامنا رہا جو کفار سے بھی زیادہ بدتر تھے۔ ——— یہ اسباب و عوامل اس نظام

---

[1] یہ حذف بھی مصلحۃً ہی کیا گیا ہے۔ ورنہ خلفاء ثلاثہ کے بارے میں ان کے جو واقعی خیالات ہیں، ناظرین الفرقان گذشتہ شمارے میں ان کی کتاب کشف الاسرار کی عبارتوں کے براہ راست مطالعہ سے ان سے واقف ہو چکے ہیں ——— الفرقان

حکومت کے حصول میں مانع رہے جو امیر المومنین قائم کرنا چاہتے تھے۔"

امام صاحب نے مزید فرمایا کہ:

"دوسری اور نسبتاً زیادہ افسوسناک بات امیر المومنین (سیدنا علیؓ) کو اس حقیقت (یا سچائی؟) کے اظہار سے باز رکھنے کی ہے جو پیغمبرؐ نے اپنے انتقال سے قبل سیدنا علیؓ کے کان میں رازداری کے ساتھ منکشف فرمادی تھی اور جس کے بارے میں امیر المومنین نے فرمایا تھا کہ اس کے ذریعہ انھیں ہزاروں ابواب پر مشتمل علم کا ایک دفتر حاصل ہو گیا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ دشمنوں نے ائمہ معصومین (حضرت علیؓ اور ان کے خلفاء) کو یہ موقع فراہم نہیں ہونے دیا کہ وہ اس "علم" کو دوسروں تک پہونچاتے اور نہ ہی ان ائمہ کرام کو ایسا کوئی شخص مل سکا جو اس کا اہل ہوتا کہ اسے مذکورہ علم تفویض کیا جاسکتا۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ائمہ معصومین اس علم کو اپنے سینوں میں چھپائے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔"

دوسرے لفظوں میں سارے ائمہ کرام کو وہ علم (علم خلافت) جو پیغمبر حضرت محمد صلعم نے حضرت علیؓ کے کان میں سرگوشی کے ذریعہ منتقل فرمادیا تھا اپنے متبعین تک پہنچانے سے باز رکھا گیا اور وہ خود اپنے طور پر بھی اس فرض کی ادائیگی میں ناکام رہے حیرت ہوتی ہے کہ امام خمینی کے ان فرمودات نے خود شیعوں کے منصب امامت کو کس درجہ بے وقعت اور محض اک مد فضول بنا کر رکھ دیا ہے۔

بہر حال یہ سوال ابھی اپنی جگہ قائم ہے کہ آخر وہ "علم" کیا تھا جسے ائمہ معصومین دوسروں تک نہیں پہونچا سکے۔ خمینی صاحب کے خیال میں ائمہ کا علم اس علم سے مختلف ہے جس تک دوسرے لوگوں کی رسائی ہے یعنی وہ علم دیگر علماء اور طالبان علم حاصل نہیں کرسکتے۔ رہی یہ بات کہ کیا قرآن اس علم کا ماخذ اور ذریعہ نہیں ہے؟ تو اس سلسلہ میں امام خمینی کا نظریہ خود انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

"قرآن پاک (کا حقیقی علم) آج تک ہم سے اوجھل اور مستور ہے۔ اگرچہ علماء، فلسفیوں یا (اسی قبیل کے) دوسرے لوگوں نے قرآن کے بارے میں بہت کچھ کہا

اور لکھا ہے لیکن اصلاً جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہ نہ ہو سکا ہے اور نہ ہو سکے گا۔ علم قرآن سے مراد قرآنی آیات کے مروجہ مطالب و معانی نہیں ہیں کہ یہ معانی تو سبھی جانتے ہیں۔ ..... موجودہ قرآن کی آغاز اسلام سے آج تک کی جانے والی تفسیریں واقعتہً اس کی تفسیر نہیں بلکہ محض ترجمے ہیں جو قرآن سے بس (کسی حد تک) مناسبت رکھتے ہیں لیکن انھیں قرآن کی مکمل تفسیر نہیں کہا جا سکتا۔"

ایرانی رہنما نے بڑے متاسفانہ لہجے میں کہا کہ:

"جو چیز ہم کھوئے بیٹھے ہیں وہ عادلانہ نظام پر مبنی ایک ایسی الٰہی حکومت ہے جو ابتک قائم نہیں کی جا سکی ہے۔ اور آج جبکہ قادر مطلق نے اپنے فضل و کرم سے ایران کے عوام کو یہ کامیابی عطا فرمادی ہے تو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ وہ (دشمنان اسلام) ایران میں حکومت الٰہیہ کے خلاف کیا کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ دشمنوں نے ایرانی حکام کو اسلام کا تعارف کرانے اور اسے دنیا کے سامنے پیش کرنے کا موقع نہیں دیا ہے۔"

امام خمینی کے مندرجہ بالا ارشادات کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ

۱۔ پیغمبر اسلامؐ اور تمام ائمہ اکرام اس نظام حکومت کے قیام میں ناکام و نامراد رہے جس کا اسلام درا صل مطالبہ کرتا ہے۔

۲۔ اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ سارے حضرات قرآن کا حقیقی علم اپنے پیرودں تک نہیں پہونچا سکے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن نگاہوں سے اوجھل اور مستور رہے۔

۳۔ آج جبکہ اللہ تعالیٰ نے ایران کے عوام کو یہ کامیابی عطا فرمادی ہے تو اس کے دشمن روئے زمین پر قائم ہونے والی اس پہلی اور وحید و فرید حکومت الٰہیہ کو یہ موقع نہیں دے رہے ہیں کہ وہ دنیا کو اسلام سے متعارف کرا سکے۔

دشمن تو بہرحال دشمن ہیں لیکن اس طرح کے مفروضوں اور بے بنیاد دعووں نے انقلاب دوستوں کے لیے بھی بڑی سنگین مشکل کھڑی کر دی ہے۔"

(اسلام اور ایران)

ملاحظہ فرمایا آپ نے! چودہ سو سال کی تاریخ خمینی صاحب کے نزدیک کیسی تاریک تاریخ ہے؟ اس پوری مدت میں نہ اسلام کا علم ہی عام ہو سکا ہے نہ ان پر عمل ہی ہو سکا ہے ...... اور اللہ نظر بد سے بچائے کیا حوصلہ خمینی صاحب کے زور بازو میں ہے اور کیسا تقدس ان کو اور ان کے انقلابی ساتھیوں کو حاصل ہے کہ جو کام نہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کر سکے نہ ان کے ساتھی کر سکے نہ "ائمہ" کر سکے وہ قبلہ خمینی صاحب کرنے چلے ہیں!

جس ماضی کو اب تک ہم آپ تابناک اور قابل فخر سمجھتے تھے، اور ساری کوششیں اسی ایک محور کے گرد گھومتی تھیں کہ وہ "ماضی" ایک بار پھر ہمارا "حال" بن جائے، معلوم ہوا کہ وہ تو اس لائق ہی نہیں، وہ تو سراسر ناکامی کا دور ہے، نفاق اور باطل کے غلبہ کا دور ہے۔ جو ہونا ہے وہ اب ہونا ہے اور اس کا سہرا خمینی صاحب کی ذات والا برکات کے سر بندھنا ہے۔ الامان! الحفیظ

اس کے جواب میں جب دنیا کے تمام کافر، دنیا کے تمام ظالم، دنیا کے تمام فاسق و فاجر لوگ اگر یہ کہیں کہ چودہ سو سال کی طویل مدت میں جس مذہب کا نہ علم اس کے اپنے ماننے والوں میں آسکا نہ عمل، اس مذہب کے احیاء کی، اس کی طرف دعوت کی، اسی میں خیر و سعادت تصور سمجھنے کی اور اس سے ہٹ کر زندگی گذارنے والوں کے محاسبہ یا ان کی اصلاح کی کوشش کی آخر کیا گنجائش باقی ہے، اور ایسے مذہب کو ان سب کاموں کا کیا حق حاصل ہے؟ تو ہمیں نہیں معلوم کہ اس کے جواب میں کیا کہا جائے گا؟؟؟؟

بہر حال اسپیکٹ کے فاضل مضمون نگار کو ان کا یہ مضمون مبارک ہو ——— ہم امید کرتے ہیں کہ مستقبل قریب میں وہ زیادہ وضاحت کے ساتھ اظہار خیال کر سکیں گے۔

جہاں تک سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی و امی و روحی و نفسی) ان کے عظیم اور جاں نثار صحابۂ کرام اور ان کے پاکباز اہل بیت کے بارے میں خمینی صاحب کے ان ناپاک خیالات کی تردید کا مسئلہ ہے سو ہم نہیں سمجھتے کہ اس سے زیادہ غیر ضروری

کوئی اور کام بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا کا ہر باہوش آدمی یہ ماننے پر مجبور رہے کہ دنیا میں آج جو بھی خیر ہے وہ سب انہی نفوس قدسیہ کے طفیل ہے۔

اس موقع پر ہم متحدہ ہندستان ہی کے ایک نومسلم جناب پروفیسر غازی احمد صاحب کے تازہ خط کی چند سطریں برائے عبرت پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں ـــــ ہمارے ناظرین بھولے نہ ہوں گے، ان کے قبول اسلام کی سبق آموز داستان خود انہی کی زبانی حال ہی میں الفرقان میں کئی قسطوں میں شائع ہوئی تھی، چودہ سال کی عمر میں انھیں صرف ایک مرتبہ خواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا، اور اس خواب ہی میں انھوں نے آپ ہی کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا تھا ـــــ خمینی صاحب کے متعلق حضرت والد ماجد مدظلہ کے مضامین ان کی نظر سے گذرے تو انھوں نے ان کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۱۷؍۹؍۸۴ء میں لکھا:

"الفرقان میں خمینی کے بارے میں آپ کی تحریر فرمودہ دو قسطیں ازدیاد ایمان اور مسرت کا باعث ہوئیں۔ اللہ تعالےٰ آپ کو مزید سعادتوں اور برکتوں سے نوازیں ـــــ آمین

میرے نزدیک تشیع کا اسلامی فرقے سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ یہ فرقہ تو اسلام سے انتقام لینے کے لیے بنایا گیا تھا ـــــ

ایک روز شیعوں کے ایک گلڈ میں مقام صحابہ پر تقریر تھی۔ میں نے تقریر کا آغاز اپنی ذات کے تعارف سے کیا کہ اگر آقائے نامدار چودہ سو سال بعد عالم رویا میں ایک ہندو بچہ کو دولت اسلام سے مشرف فرماتے ہیں اور وہ بچہ ہر قسم کی تکالیف برداشت کر کے استقامت اختیار کرتا ہے۔ الحمدللہ حلت وحرمت کا امتیاز عملی زندگی میں رکھتا ہے۔ اس کے ذمے کوئی نماز نہیں، کالج میں کبھی پیریڈ ضائع نہیں کرتا ـــــ الغرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف خواب میں زیارت کا فیض اتنا بڑا انقلاب لے آتا ہے تو ان حضرات کا کیا مقام ہوگا جو ۲۳ سال شب و روز آپ کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔

الحمد للہ دو گھنٹے کی گذارشات کے بعد شیعہ حضرات میں سے دس بارہ سامعین تائب ہو گئے۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک "

ہمارے خیال میں جناب غازی صاحب کی یہ چند سطریں فیض نبوی اور تاریخ اسلام پر خط تنسیخ پھیر دینے کی خمینی صاحب کی اس کوشش کا بھرپور اور عام فہم جواب رکھتی ہیں جس کا ذکر امپیکٹ کے منقولہ بالا مضمون میں کیا گیا ہے، ساتھ ہی اس میں اس پہلو سے عبرت کا بھی بڑا سامان ہے کہ یہ خیالات ایک نومسلم کے ہیں۔

پوری دنیا میں احیائے اسلام کے علمبردار، نائب امام غائب جناب خمینی صاحب اور ایک نومسلم کے افکار و خیالات کے درمیان فرق پر غور کیجیے اور مشاہدہ کیجیے اس سنت الٰہی کا جس کا اعلان قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ (یضل بہ کثیراً ویھدی بہ کثیراً، وما یضل بہ الا الفاسقین)

ہم آخر میں مختصراً یہ اشارہ کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ خمینی صاحب کے یہ خیالات صرف ان لوگوں کے لیے نئے، اجنبی اور تعجب خیز ہیں جو شیعہ مذہب اور اس کے مرکزی اور بنیادی اصولوں سے واقف نہیں ہیں ـــــــ جو لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ شیعیت کا اصل مقصد ہی امت مسلمہ کو ان کے مرکز اتباع "نبوت" اور "خلافت" سے ہٹا کر اس کے متوازی ایک دوسرے مرکز سے جوڑنا ہے، اور اس طرح امت کے اندر ایک نئی امت کی تشکیل کر کے اسلام کو مسخ کر دینا ہے انھیں ان خیالات میں ذرہ برابر نیا پن محسوس نہیں ہوتا ـــــــ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو انشاء اللہ اس اجمال کی تفصیل آئندہ کی جائے گی۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

خطاب عید الفطر

بنی اسرائیل اور امت مسلمہ

[ہر سال کی طرح اس سال بھی عید الفطر کے موقع پر دار العلوم ندوۃ العلماء کی وسیع مسجد میں ہزاروں اہلیان لکھنؤ کے سامنے حضرت والد ماجد مدظلہٗ نے خطاب فرمایا تھا، اعلان اور کوشش کے باوجود کچھ ناگزیر وجوہ سے یہ خطاب گذشتہ شمارے میں بھی پیش نہیں کیا جا سکا تھا، اس تاخیر کی معذرت کے ساتھ اب پیش خدمت ہے۔

——— مدیر]

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ۔ لقد جاءت رسل ربنا بالحق۔ صلوات اللہ تعالیٰ علیھم وعلی من تبعھم باحسان، اما بعد۔

میرے عزیز بھائیو اور دوستو اور محترم بزرگو! اس وقت بہت ضروری سمجھ کر ایک بہت اہم بات کہنا چاہتا ہوں۔ میرے محترم بزرگ اور میرے عزیز بھائی و دوست دلوں کو خوب متوجہ کر کے سنیں۔

آپ میں سے جو حضرات قرآن کی تلاوت کے ساتھ ترجمہ قرآن یا درس قرآن کے حلقوں میں شرکت کے ذریعہ اس کے مضامین سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتے

ہوں گے انھیں یہ بات معلوم ہو گی کہ قرآن مجید میں جا بجا بڑی کثرت سے بنی اسرائیل کا تذکرہ ہے۔ قرآن مجید تاریخ کی کتاب نہیں ہے، قصہ کہانی کی کتاب نہیں ہے، وہ کتاب ہدایت ہے۔ اس میں جو کچھ ہے ہدایت کے لیے ہے، بنی اسرائیل کا کثرت سے قرآن نے جو ذکر کیا ہے وہ بھی ہماری ہدایت اور تربیت کے مقصد سے کیا ہے۔

بنی اسرائیل کون تھے؟ یوں سمجھیے کہ وہ اپنے وقت کے مسلمان تھے انبیاء علیہم السلام کے ماننے والے تھے۔ بلکہ ان کی اولاد تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک صاحب زادے حضرت اسحاق تھے ان کے ایک صاحب زادے حضرت یعقوب تھے جن کا لقب اسرائیل تھا انھیں کی اولاد ہے جو بنی اسرائیل کہلائی۔ یہ سب وہ تھے جو اپنے سلسلہ کے پیغمبروں کو مانتے تھے یہ سب ابراہیم علیہ السلام اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے ـــــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو بنو اسرائیل تھے وہ دو حصوں میں تقسیم تھے ایک وہ جو عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانتے تھے ان کو جھٹلاتے تھے اور ان کے بارے میں بہت بری باتیں کہتے تھے۔ لیکن ان سے پہلے کے پیغمبروں کو وہ بھی مانتے تھے۔ اور دوسرا طبقہ وہ تھا جو عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مانتا تھا۔ قرآن مجید ان سب کو بنی اسرائیل کہتا ہے۔ یہ دراصل ایک ہی نسل تھی، ایک ہی سلسلہ تھا۔ ان کا حال سمجھ لیجیے جیسے کہ ہم اور آپ مسلمان ہیں قرآن کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی اور رسول مانتے ہیں اسی طرح یہ بنو اسرائیل اپنے سلسلہ کے پیغمبروں کو مانتے تھے اور ان کے ذریعہ آئی ہوئی اللہ کی کتابوں کو بھی مانتے تھے لیکن تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ان کا حال، ایسا ہی بگڑا ہوا تھا جیسا کہ ہم مسلمانوں کا بگڑا ہوا ہے ـــــ یہ ان کا عمومی حال تھا۔ پوری امت پر نظر ڈالی جاتی تو عام حال یہی نظر آتا ایسا نہیں تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان میں کوئی ایک اللہ کا بندہ ایسا نہ ہو جو صحیح راستے پر ہو قرآن مجید میں کئی جگہ پر صاف صاف کہا گیا ہے کہ اہل کتاب بنی اسرائیل میں بہت نیک اور پارسا افراد بھی موجود تھے ـــــ

ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔ ذٰلک بأن منھم قسیسین و رھبانا و أنھم لا یستکبرون ، واذا سمعوا ما أنزل الی الرسول تری أعینھم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق، یقولون ربنا آمنا فاکتبنا مع الشاھدین ہ اس آیت میں حبشہ کے نصاریٰ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان میں ایسے اچھے علماء اور درویش تھے جن میں استکبار نہیں تھا، آگے ان کا یہ حال بیان فرمایا گیا جب وہ قرآن پاک کی آیتیں سنتے ہیں تو فوراً حق کو پہچان لیتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اللہ کے حضور میں عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ ہم ایمان لاتے ہیں، تو ہم کو حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ لے۔

الغرض ان اہل کتاب میں ایسے ایسے نیک صفت اور مخلص اور حق پرست افراد موجود تھے، لیکن جہاں تک پوری امت کا سوال ہے تو اس کا وہی حال تھا جو میں نے ابھی ذکر کیا۔

ایک حدیث میں یہی مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے إن اللہ نظر إلی اھل الارض فمقتھم عربھم وعجمھم الا بقایا من اھل الکتاب وفی روایۃ الا بقایا من بنی اسرائیل اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانہ کی بات ہے کہ اللہ کی نظر میں ساری دنیا تھی مشرق و مغرب شمال و جنوب، عرب و عجم سب پر اس کی نگاہ تھی اور سب کی زندگی اللہ کے نزدیک سخت ناپسندیدہ تھی اور اللہ کے غضب کا مستحق بنانے والی تھی یہ عام حال تھا اہل کتاب (بنی اسرائیل) میں سے کچھ ایسے بچے کھچے افراد رہ گئے تھے جن کی زندگی ایسی نہیں تھی اور جو صحیح راستے پر تھے ان سے اللہ ناراض نہیں تھا۔

قرآن مجید میں پہلے ہی پارہ کا نواں رکوع یہاں سے شروع ہوتا ہے" و إذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون الا اللہ و بالوالدین احسانا و ذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وقولوا للناس حسنا و أقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ ثم تولیتم الا قلیلا منکم و أنتم معرضون ہ اس آیت میں اُن موٹی موٹی باتوں کا

ذکر کیا گیا ہے جن کا حکم بنو اسرائیل کو دیا گیا تھا یہ موٹی موٹی باتیں یہ تھیں توحید والدین کے ساتھ حسن سلوک، اہل قرابت، یتیم بچوں اور عام اہل حاجت کے حقوق کی پوری پوری ادائیگی اور بلا کسی تفریق کے تمام انسانوں کے ساتھ نرم گفتگو اور اچھا معاملہ نیز نماز و زکوٰۃ کا پورا اہتمام۔

جیسا کہ آپ سب نے محسوس کیا ہو گا یہ وہ اصولی ہدایات اور تعلیمات ہیں جن پر ہر نبی اور ہر خدائی کتاب کی تعلیمات میں زور دیا گیا ہے۔ قرآن کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی بنیادی تعلیمات بھی یہی ہیں۔ بنی اسرائیل کو بھی یہی ہدایات دی گئی تھیں لیکن پھر ہوا کیا؟ قرآن کہتا ہے "ثم تولیتم الا قلیلا منکم وانتم معرضون" پھر تم نے (کچھ دن کے بعد) ان ہدایات سے منھ موڑ لیا اور بے توجہی اختیار کر لی سوائے چند افراد کے۔ قرآن نے یہاں یہ نہیں کہا کہ عام طور پر تم لوگوں نے انکار کر دیا اور مرتد ہو گئے بلکہ قرآن کا کہنا ہے کہ تمھارا عمومی حال یہی ہو گیا کہ عام طور پر تمھیں کوئی تعلق نہیں رہا حالانکہ تم نے زبان سے ان چیزوں کو جھٹلایا نہیں اور یہ حال بھی تمھاری اکثریت کا ہوا البتہ ایسے افراد تم میں موجود رہے جو اس عمومی بگاڑ میں مبتلا نہیں ہوئے۔

ان اصولی ہدایات کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کو خصوصی تاکید آپس میں ایک دوسرے کے ناحق خون نہ بہانے اور گھر سے بے گھر نہ کرنے کی بھی کی گئی تھی چنانچہ قرآن مجید نے ان اصولی ہدایات کے ذکر کے بعد اس خاص ہدایت کا بھی ذکر کیا ہے[۱]۔ اور پھر یہ بتایا ہے کہ بنی اسرائیل نے جو معاملہ اُن اصولی ہدایات کے ساتھ کیا تھا۔ یعنی عملی بے تعلقی اور بے توجہی کا معاملہ وہی معاملہ انھوں نے اس خصوصی ہدایت کے ساتھ بھی کیا، البتہ اس خصوصی ہدایت کے صرف ایک جزء پر انھوں نے عمل کیا گویا یوں سمجھیے کہ انھوں نے اللہ کے اکثر حکموں کو نظر انداز کر دیا اور کچھ ایسی جزوی

---

[۱] یہ سورہ بقرہ کی آیات ۸۴، ۸۵ کا مضمون ہے واذ اخذنا میثاقکم ..... تا ..... وانتم تشھدون۔

ہدایات پر عمل کیا جن میں ان کو اپنا ذاتی یا قومی نفع نظر آیا قرآن نے ان کے اس پورے رویہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے "أفتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض" یعنی کیا تمھارا حال یہ ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے کچھ حکموں کو مانتے ہو اور کچھ کو نہیں مانتے ہو تم نے اللہ کے کچھ حکموں کے ساتھ ایمانی معاملہ کیا اور باقی کے ساتھ کافرانہ رویہ رکھا۔ ہم اور آپ غور کریں کچھ حکموں پر عمل کو ان حکموں پر ایمان کا نام دیا اور کچھ حکموں پر عمل نہ کرنے کو ان حکموں کے کفر کے نام سے یاد کیا اسی سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ جس ایمان پر خدا کے یہاں وعدے ہیں اس ایمان کا کیا مفہوم ہے اور جس کفر پر دنیا اور آخرت کی عبرتناک سزاؤں کا ذکر ہے اس کفر سے کیا مراد ہے۔

اس کے بعد قرآن بنی اسرائیل کو ان کے اس رویہ کی سزا سناتا ہے لرزا دینے والی سزا، فرمایا گیا ہے۔ "فما جزاء من یفعل ذالک منکم الا خزی فی الحیاۃ الدنیا ویوم القیامۃ یردون إلی اشد العذاب وما اللہ بغافل عما تعملون" جس امت کا یہ حال ہو کہ اس کی اکثریت اللہ کے کچھ حکموں پر عمل کرے اور زیادہ تر حکموں پر عمل نہ کرے اس کا انجام اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ دنیا میں رسوائیاں اس پر مسلط ہوں گی ذلتیں اس کا مقدر بنیں گی اور پھر اسی پر حساب بے باق نہیں ہو جائے گا قیامت کے دن سے ان پر سخت ترین عذاب ہو گا۔

میرے دوستو! اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ بنی اسرائیل کا ذکر کر کے اور ان کی تاریخ سنا کر در اصل ہمارے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا گیا ہے اور گویا یہ کہہ دیا گیا کہ اس آئینہ میں ہمیشہ اپنا حال دیکھتے رہو اور خوب سمجھ لو اور ذہن نشین کر لو کہ تم سے پہلے ایک قوم تھی جو تمھاری طرح اپنے وقت کی مسلمان قوم تھی پیغمبر کو ماننے والی قوم تھی لیکن کچھ دن تک تو واقعی وہ صحیح راستے پر چلے اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ان پر چھائی رہیں لیکن رفتہ رفتہ ان کا حال یہ ہو گیا کہ اکثریت عملی طور پر اللہ کے اکثر حکموں سے روگرداں ہو گئی اور اس کے نتیجہ میں اللہ کے قانون کے مطابق ان کا

حال یہ ہوا کہ ساری رحمتیں اور برکتیں چھین لی گئیں اور ان کی جگہ ذلتوں اور رسوائیوں نے لے لی لہٰذا تم خوب سمجھ لو کہ جس دن تمہارا عمومی حال بنی اسرائیل کی طرح ہو جائیگا تو تمہارا انجام بھی وہی ہوگا جو اُن کا ہوا۔ بنی اسرائیل کا انجام کیا ہوا اس کا ذکر قرآن میں دوسرے مقامات پر اس سے زیادہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے

"وإذا جاء وعد أولٰهما بعثنا عليكم عبادًا لنا أولي بأسٍ شديدٍ فجاسوا خلال الديار وكان وعدًا مفعولًا" اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے اللہ کے حکموں کے خلاف وہ راستہ اختیار کیا جس سے زمین میں بگاڑ اور فساد پھیلتا ہے تو ہم نے ان پر اپنے کچھ طاقتور بندے مسلط کر دیئے یہ طاقتور بندے کون تھے یہ کوئی نیک اور مومنین صالحین نہیں تھے یہ بدترین کافر اور سرکش لوگ تھے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کو سزا دینی ہوتی ہے اور اسے رسوا کرنا ہوتا ہے تو بھنگیوں سے اسے جوتے لگوائے جاتے ہیں۔ قرآن ہم سے کہتا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے جو پیغمبروں کی اولاد تھے اللہ کے احکام کو نظر انداز کرنے کا رویہ اپنا لیا اور اپنے جی کی چاہت پر زندگی گذارنے لگے تو اللہ ہی نے ان پر بے رحم اور سنگدل اور ظالم و جابر کافروں کو مسلط کر دیا۔ ان کافروں نے بنی اسرائیل کے ساتھ کیا کیا؟ قرآن ہی کا بیان ہے کہ انھوں نے ان کی بستیوں کی بستیاں الٹ دیں علاقوں کے علاقے ویران کر دیئے آبادیوں کی آبادیاں ہلاک کر ڈالیں گھروں میں گھس گھس کر لوٹ مار مچائی اور آگ اور خون کی ہولی کھیلی اور یہی نہیں تاریخ بنی اسرائیل بتاتی یہ بھی ہے کہ انھوں نے اللہ کی کتاب توراۃ کے نسخے گھروں سے نکال نکال کر ان کے سامنے جلائے اور جانی و مالی اذیتوں کے ساتھ یہ روحانی تکلیف بھی بنی اسرائیل کو اٹھانی پڑی۔

میرے دوستو بزرگو! جیسا کہ میں نے عرض کیا ہم اور آپ اس آئینہ میں اپنی تصویر دیکھیں ہم اور آپ اپنا احتساب کریں آخری کتاب قرآن مجید اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہم کو جو ہدایات دی گئیں وہ سب وہی احکام اور ہدایات

ہیں جو ہر نبی کے ذریعہ پچھلی امتوں کو ملتی رہیں جن میں سب سے پہلے توحید ہے۔ توحید کیا ہے؟ توحید صرف زبان سے کلمہ کے بول کا نام نہیں ہے، توحید ایک حقیقت ہے دل کی ایک کیفیت اور دل کے ایک یقین کا نام ہے یقین اس بات پر کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہی مالک و معبود ہے اسی کی عبادت اسی کی پرستش اسی سے امید اسی سے خوف، یقین اس پر کہ دنیا میں صرف اسی کا حکم چلتا ہے جو کچھ ہوتا ہے اسی کے حکم سے ہوتا ہے، موت اسی کے ہاتھ میں ہے، حیات اسی کے ہاتھ میں ہے۔ بیماری بھی اسی کے ہاتھ میں ہے شفا اسی کے ہاتھ میں ہے، عزت و ذلت بھی اسی کے ہاتھ میں ہے، اس لیے عبادت بھی اسی کی، دعا بھی اسی سے، اطاعت بھی اسی کی، اور محبت بھی اسی سے ——— یہ ہے توحید، اور اس میں ذرا بھی جھول گوارا برداشت نہیں ہے۔ اس سے ہٹ کر کسی اور پر نگاہ جانا اللہ کو ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں چہ جائیکہ یہ سمجھنا کہ دنیا میں رہنے والے بزرگان دین یا قبروں والے اولیاء اور مشائخ اولاد دے سکتے ہیں، مقدمہ جتا سکتے ہیں کاروبار میں برکت دے سکتے ہیں ——— تو خدائے پاک کی قسم یہ اللہ کے ساتھ سیدھا سیدھا شرک ہے۔

توحید کے بعد جو حکم سب سے زیادہ تاکید سے دیا گیا ہے وہ نماز اور زکوٰۃ کا حکم ہے جو لوگ جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں ان دونوں کا حکم کس لب و لہجہ میں دیا گیا ہے اور ان دونوں کا کیا درجہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا اور صحابہ نے سمجھا تھا، وہ لوگ جانتے ہیں کہ ان دونوں کے بغیر آدمی صاحب ایمان ہی نہیں ہوتا اور جتنی عظمت اور جتنے اخلاص سے اور جتنے اہتمام سے مسلمان ان دو حکموں پر عمل کرتا ہے اسی قدر اس کے دل میں ایمان کی روشنی اور اس کے اعمال میں اسلام کا اثر آتا ہے۔

نماز کے بارے میں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ اس کا صرف پڑھ لینا اور فرض ادا کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی کوشش ہو کہ نماز اچھی سے اچھی پڑھی جائے اور ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے ہماری نماز کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے کچھ تو مناسبت اور مشابہت حاصل ہو جائے۔ اپنے اپنے علاقہ کے علماء

کرام سے پوچھیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کیسی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم رکوع کیسے فرماتے تھے سجدہ کیسے فرماتے تھے آپ کس طرح قرأت فرماتے تھے، آپ کے دل کی کیا کیفیت ہوتی تھی، سورۂ فاتحہ پڑھتے وقت یا رکوع و سجدہ میں اللہ کی حمد و تسبیح کرتے وقت کیا دھیان ہونا چاہیے۔ میرے دوستو! اس کی کوشش ہمارا فرض ہے کوشش کرتے کرتے مر جائیں تو نماز میں جتنی کوتاہی رہ جائے گی اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے اور کوشش ہی نہ کی ایسے ہی بے توجہی سے نماز پڑھتے رہے تو بڑا خسارہ اٹھانا پڑے گا۔

زکوٰۃ کے بارے میں اتنا اور عرض کر دوں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا کہ زکوٰۃ سے کسی کے مال میں کمی نہیں ہوگی۔ اب ایک طرف اللہ کے رسول کا یہ ارشاد ہے اور ایک طرف شیطان کا یہ وسوسہ ہے کہ زکوٰۃ دو گے تو اتنی دولت کم ہو جائے گی، اب ہم خود سوچ لیں کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر زیادہ یقین ہے یا اپنے سب سے بڑے دشمن شیطان کے پر فریب وسوسہ پر، اس لیے میرے دوستو میری گذارش ہے کہ اپنے قریب کے علماء کرام سے اپنی مالی حالت بتا کر دریافت کیجیے کہ آپ پر زکوٰۃ واجب تو نہیں ہے؟

توحید اور نماز و زکوٰۃ کے علاوہ بہت سے اعمال ہیں جن کا اللہ نے ہم کو حکم دیا ہے جیسے روزہ حج وغیرہ اور بہت سی صفات ہیں جن کو اپنی زندگی میں اتارنے کا اللہ نے ہم کو مکلف کیا ہے جیسے سچائی، ایثار، ہمدردی اور خیر خواہی وغیرہ اسی طرح بہت سے اعمال سے اور بہت سے صفات سے بچنے اور دور رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے ان سب اعمال اور ان صفات سے اپنے کو بچانے کی فکر اور کوشش بھی ضروری ہے بلکہ بعض پہلوؤں سے یہ مقدم ہے ان اعمال سے اور ان صفات سے انسان کے دل پر ایسا زنگ اور میل آ جاتا ہے کہ جو اچھے اعمال آدمی کرتا ہے ان کا اثر اس کے دل پر اور روح پر نہیں پڑتا جب کسی پرانے برتن پر قلعی کی جاتی ہے تو پہلے اس کے میل کو صاف کیا جاتا ہے ورنہ قلعی چڑھتی نہیں اسی لیے میں نے عرض

کیا کہ جن اعمال سے دلوں میں زنگ آتا ہے ان سے بچنے کی کوشش بعض پہلوؤں سے مقدم ہے۔

میرے سامنے یہ سیکڑوں ہزاروں نوجوان بیٹھے ہیں میں ان سے کہتا ہوں کہ اے نوجوانو! اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے والو اس زمانہ کا ام الخبائث سینما ہے۔ ہر گناہ کی تعلیم اسی سے ہوتی ہے۔ ہر شر اسی سے پھیلتا ہے۔ اللہ کے لیے عہد کرو کہ اس گناہ سے خاص طور سے بچیں گے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میرے عزیز نوجوانو! اب رحم کرو اپنے اوپر، آج کا دن مبارک دن ہے آج ہی بلکہ ابھی اور اسی وقت عہد کرو کہ اس بدترین اور خبیث گناہ کے قریب نہیں جائیں گے جس سے پیسہ بھی برباد ہوتا ہے صحت بھی خراب ہوتی ہے روحانیت بھی برباد ہوتی ہے، دین بھی برباد ہوتا ہے، تم یقین کرو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب تم سینما کی طرف قدم اٹھاتے ہو اللہ تم سے ناراض ہوتا ہے فرشتے تم پر لعنت کرتے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک کو جب اس کی خبر ہوتی ہے تو سخت تکلیف ہوتی ہے کہ میرا یہ امتی یہ میرا نام لیوا کہاں جا رہا ہے۔ اور یہ بھی سنو میرے عزیز نوجوانو! اب تک جو گناہ ہوئے ان کو سوچکر نادم تو خوب ہو، معافی تو خوب مانگو لیکن مایوس نہ ہونا اللہ ارحم الراحمین ہے بہت معاف فرمانے والا ہے اس کی رحمت اس کے غضب سے بڑھ کر ہے، برسہا برس کے گناہ گاروں ہی کو نہیں عمر بھر کے مشرکوں کافروں کو بھی سچی توبہ سے اللہ تعالیٰ پوری طرح معاف فرما دیتا ہے بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بندہ بار بار توبہ کرتا ہے اور بار بار اس سے غلطی ہوتی ہے اور پھر بار بار وہ اللہ سے معافی مانگتا ہے تو اللہ یہ نہیں کہتا کہ اب بہت ہو چکا اب معافی نہیں ملے گی بلکہ اللہ بار بار بندہ کو معاف فرماتا ہے، یہی نہیں کہ معاف فرما دیتا ہے بلکہ اللہ کو اس بندہ پر پیار آتا ہے۔ علامہ ابن قیمؒ نے اس کی ایک بڑی نفیس مثال دی ہے۔ انھوں نے اللہ کی صفتِ رحمت اور بندوں کے ساتھ اس کے کریمانہ و رحیمانہ تعلق کی تفصیل سے وضاحت کرنے کے بعد ایک بندۂ خدا کا واقعہ لکھا ہے جو بڑے غلط راستے پر پڑ گیا تھا، وہ ایک گلی سے گذر رہا تھا، اس نے دیکھا کہ

ایک گھر کا دروازہ کھلا اور ایک بچہ اس میں سے نکلا اس کی ماں نے اسے گھر سے دھکے دے دے کر نکال رہی تھی جب وہ باہر ہو گیا تو ماں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا بچہ اسی طرح روتا چلاتا بلکتا بڑبڑاتا کچھ دور تک چلتا گیا۔ پھر ایک جگہ پہنچ کر رک گیا اور کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ میں کہاں جا سکتا ہوں؟ مجھے کون اپنے پاس رکھے گا، کون ماں کی طرح دیکھ بھال کرے گا؟ یہ سوچ کر وہ ٹوٹے دل سے اپنے گھر ہی کی طرف لوٹ پڑا، دروازہ بند تھا وہیں چوکھٹ پر سر رکھ کے پڑ گیا، اور پڑے پڑے آنکھ لگ گئی، نیند آ گئی، ماں آئی، دروازہ کھولا اور اپنے جگر کے ٹکڑے کو اس طرح چوکھٹ پر سر رکھے پڑا دیکھ کر اس کا دل بھر آیا، ممتا کو جوش آ گیا، آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔ بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا یا بے تحاشا پیار کرنے لگی، اور کہنے لگی، بیٹے تو نے دیکھا، میرے سوا تیرا کون ہے؟ تو نے نالائقی اور نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے میرا دل دکھایا، اور تیرے لیے میری فطرت کے خلاف مجھے غصہ دلایا، سن لے! میں تیری ہوں اور تو میرا ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے تیرے ہی لیے ہے...

میرے دوستو! علامہ ابن قیمؒ نے جس بندۂ خدا کا چشم دید واقعہ ذکر کیا ہے، اسی کے لیے نہیں ہم آپ سب کے لیے اور دنیا بھر کے گنہگاروں اور خطا کاروں کے لیے اس واقعہ میں بڑا سبق ہے۔ ایک ماں کے سینے میں اپنی اولاد کے لیے جتنا پیار ہوتا ہے، جتنی شفقت ہوتی ہے، خدائے پاک کی قسم اللہ کی ذات میں اپنے بندوں کے لیے اس سے بھی زیادہ پیار اور رحم ہے۔ اس لیے کہتا ہوں کہ اب تک کی کوتاہیوں کی وجہ سے، اب تک کے گناہوں اور اب تک کی غافلانہ زندگی کی وجہ سے نادم تو بہت ہو مایوس نہ ہو، واپس آؤ اللہ کی طرف، اسی کی چوکھٹ پر سر رکھ کے روؤ، بلبلاؤ، پھر دیکھو کہ اس کی رحمت کے دروازے کیسے کھلتے ہیں، پھر دیکھو کہ وہ کیسے اپنی آغوش رحمت میں لیتا ہے۔ کس کس طرح دل بڑھاتا ہے، حوصلہ دیتا ہے دستگیری کرتا ہے، اور صحیح راہ دکھا دیتا ہے بلکہ انگلی پکڑ کر کے چلا دیتا ہے۔ غفلت اور بے حسی سے کیسے زندگی بھر کے لیے نجات دے دیتا ہے۔

میرے بھائیو اور دوستو! بنی اسرائیل کی جو داستان ہمیں آپ کو اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں سنائی ہے اس سے ہمیں سبق لینا چاہیے۔ جب تک بنی اسرائیل کی زندگی اللہ کے حکموں کے مطابق رہی، دنیا میں امن و عافیت اور برتری و عزت کے ساتھ اللہ نے اُن کو رکھا، دوسروں کے لیے نمونہ بنا کر رکھا، اور جب اُن کی اکثریت نے اللہ کے اکثر حکموں کو پامال کرنا شروع کر دیا، اللہ نے ان پر بے رحم دشمن مسلط کر دیے جنھوں نے ان کو بری طرح سے ذلیل کیا۔

اب اس آئینہ میں ہم اپنی صورت دیکھیں! کیا یہی حال بعینہ ہمارا نہیں ہے، یہ جو کچھ پوری دنیا میں امت محمدیہ کے ساتھ ہو رہا ہے، فسادات ہو رہے ہیں، جان و مال لوٹا جا رہا ہے، گھروں میں، بازاروں میں اور مسجدوں میں آگ لگائی جا رہی ہے یہ سب اللہ کی طرف سے سزا ہے اس بات کی کہ ہماری اکثریت اور مجموعی طور پر پوری امت اللہ کے اکثر حکموں کو پامال کر رہی ہے۔ نہ اللہ کا ان بنی اسرائیل کے ساتھ رشتہ تھا جو انبیاء علیہم السلام کی اولاد تھے، نہ ہم سے رشتہ ہے جو خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں۔ اللہ کے یہاں جو معاملہ ہوتا ہے وہ تو مخلوق کے اعمال و کردار کی بنا پر ہوتا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ہم میں ہمارے اکثر بھائی اللہ کے اکثر حکموں کو بالکل نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے۔ تو ذرا سوچیے کہ اپنے حالات کو درست کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔

دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے۔ سوچو کہ کیا اللہ کے حکم کے بغیر ہو سکتا ہے؟ اللہ کے سوا کسی اور کا ارادہ، کسی اور کا فیصلہ، کسی اور کی طاقت بھی دنیا میں کار فرما ہے؟ اور پھر اس پر غور کرو کہ اگر اللہ کسی بات کا فیصلہ کرے، تو اس کو کسی مخلوق کے ذریعہ بدلوایا جا سکتا ہے، نہیں اور ہرگز نہیں! لا راد لقضائہ ولا معقب لحکمہ، نہ کوئی اس کے فیصلہ کو بدلنے والا ہے نہ کوئی اُسے چیلنج کرنے والا۔

اللہ ہم کو اس حقیقت پر ایمان نصیب فرمائے کہ دنیا میں افراد کے ساتھ، یا قوموں کے ساتھ جو ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے ---- اور اللہ کا معاملہ نہ افراد سے

ساتھ جو ضابطہ ہوتا ہے نہ قوموں کے ساتھ، جو قوم اللہ کے حکموں کو پورا کرے گی، اور اللہ کے پسند کیے ہوئے طریقۂ زندگی کے مطابق اپنی زندگی گزارے گی۔ وہ دنیا میں بھی اللہ کے اچھے معاملہ کی مستحق ہوگی، اور آخرت میں بھی سرخرو اور کامیاب ہوگی۔

اس لیے میرے دوستو! آج کے اس مبارک دن میں یہ ارادہ کرو، اور عہد کرو کہ انشاء اللہ خدا کے ہر حکم کو اپنی زندگی میں اتاریں گے، اور اللہ کے حکموں کو پوری امت میں زندہ کرنے کے لیے خوب محنت کریں گے۔

میں باریکیوں میں نہیں جاتا، وہی حکم جو بنی اسرائیل کو دیے گئے تھے، وہ ایسے اصولی احکام ہیں جو اللہ کے پسندیدہ طریقۂ زندگی کے بنیادی اجزاء ہیں۔ توحید کا حکم، نماز اور زکوٰۃ کا حکم، والدین، اقربا، یتیموں اور اہل حاجت کے ساتھ نیک سلوک کا حکم اور تمام انسانوں سے حسنِ کلام اور حسنِ معاملہ کا حکم۔

یہی وہ بنیادی احکام ہیں جن پر عمل کرنے سے پورے دین پر عمل کرنے کا مزاج بن جاتا ہے۔ اس لیے ان احکام پر پورا پورا عمل کرنے کی نیت کرو، اور پوری امت میں پورے دین کو زندہ کرنے کے لیے عمومی جد و جہد میں خوب محنت کرو اور قربانیاں دو، الحمدللہ کہ ہم آپ اس زمانہ میں ہیں جب کہ یہ عمومی جد و جہد پوری دنیا میں کی جا رہی ہے۔ اگر یہ صحیح نہج پر کی جائے، اور اس کے اصولوں پر عمل کیا جائے، اور دعاؤں کا پورا اہتمام کیا جائے تو انشاء اللہ اسی جد و جہد سے امت محمدیہ کے اندر اللہ کے حکموں سے فرار کا رجحان ختم ہو جائے گا اور ذہن و مزاج کا رخ درست ہو جائے گا۔ پھر اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے حالات درست کرنے کے فیصلے ہوں گے، اور پھر جو کوشش کی جائیگی اس کے نتائج مثبت اور حوصلہ افزا نکلیں گے۔

میرے بھائیو! جو مجھے کہنا تھا اللہ نے کہلوا دیا، اللہ تعالیٰ مجھے، آپ کو اور تمام مسلمانوں کو عمل کی توفیق عطا فرمائے تاکہ میں قیامت کے دن اس جرم میں نہ پکڑا جاؤں کہ تو لوگوں سے کہتا تھا اور خود عمل نہیں کرتا تھا، اور آپ ان لوگوں میں سے نہ ہوں جو اس پر پکڑے جائیں گے کہ تمھیں دین کی بات پہنچ گئی پھر بھی تم نے اپنی زندگی کو نہ بدلا۔

اب آئیے، ہم آپ دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر دعا کریں۔ بالکل یہ سمجھیں کہ اللہ حاضر ناظر ہے۔ اللہ کے بے شمار فرشتے موجود ہیں۔ مسجد کی فضا ان سے بھری ہوئی ہے۔ اگر ہماری آپ کی آنکھیں ہوتیں تو ہم ان کو دیکھتے ——— اب ہم اللہ کو اور یہاں موجود اس کے فرشتوں کو گواہ بنا کر عہد کریں اور اللہ سے کچھ مانگیں:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ نَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ نَسْتَغْفِرُكَ وَنَتُوْبُ اِلَيْكَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ، رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ، رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَكْرَامُ، يَاحَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ نَسْتَغِيْثُ اَللّٰهُمَّ اِنَّ مَغْفِرَتَكَ اَوْسَعُ مِنْ ذُنُوْبِنَا وَرَحْمَتَكَ اَرْجٰى عِنْدَنَا مِنْ اَعْمَالِنَا، اَللّٰهُمَّ اصْنَعْ بِنَا مَا اَنْتَ اَهْلُهٗ وَلَا تَصْنَعْ بِنَا مَا نَحْنُ اَهْلُهٗ، اَنْتَ اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ وَاَهْلُ الْجُوْدِ وَاَهْلُ الْكَرَمِ وَاَهْلُ الْاِحْسَانِ۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ الْاَحْيَاءِ مِنْهُمْ وَالْاَمْوَاتِ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ الرَّحِيْمُ۔

اے اللہ ہم آپ کے بندے آپ کے حضور میں حاضر ہیں دل سے اور زبان سے گواہی دیتے ہیں کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ ہی کے ہاتھ میں سب کچھ ہے ہم گواہی دیتے ہیں کہ سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے نبی برحق ہیں ہم نے ان کا دین قبول کیا، ہم آپ پر ایمان لائے اور آپ کے رسول پر بھی ایمان لائے اے اللہ ہم کو حقیقت ایمان نصیب فرما، ہمارے قلوب کو نور ایمان نصیب فرما، ہم میں سے کسی کو محروم نہ فرما! اے اللہ جو بندے یہاں جمع ہیں ان سب کو حقیقت ایمان نصیب فرما، ان جوانوں کو بوڑھوں کو، ان عزیزوں کو ان بھائیوں کو ان میں سے ایک ایک کو کمال ایمان کی دولت سے مالا مال فرما! اے اللہ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ابتک کی زندگی اکثر آپ کے حکموں کے خلاف گزری ہے، سر سے پیر تک ہمارا پورا جسم اور

ظاہر سے لیکر باطن تک ہمارا پورا وجود آپ کے حکموں کے خلاف استعمال ہوا ہے ہم معافی کے طالب ہیں ہم کو معاف فرمائیے، ہم توبہ کرتے ہیں ہماری توبہ قبول فرمائیے، اس مبارک دن میں اس مبارک ماحول میں ہم ارادہ کرتے ہیں کہ گناہوں سے بچیں گے اور آپ کے حکموں کے خلاف زندگی نہیں گزاریں گے، اے اللہ ہمارے ارادوں کو قبول فرما اور ان میں عزم و اخلاص کی روح پیدا فرما، شیطان اور نفس ہمیں گناہوں میں مبتلا کرنے والے ہیں ان دونوں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔ تیری مدد کے بغیر ہم ان کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے، اے اللہ دین کو عام فرما، تیرے جو بندے دین کی محنت کر رہے ہیں اور جس شکل میں بھی جو دین کی فکر میں لگے ہیں ان کی فکروں اور محنتوں کو قبول فرما، اے اللہ ان کی مدد فرما، صحیح طریقہ پر کام کرنے کی انھیں توفیق نصیب فرما، ہر قسم کے فتنوں سے ان کی حفاظت فرما، نفس اور شیطان کے شرور سے ان کو محفوظ رکھ، اے اللہ ہمارے ساتھ رحم کا معاملہ فرما، ہمارے لیے رحمت کا فیصلہ فرمادے تیرے فیصلے میں دخل دینے والا کوئی نہیں، دوزخ کے عذاب سے ہمیں بچالے اور محض اپنے کرم سے ہمیں جنت نصیب فرمادے، اے اللہ ہمیں غفلت سے نجات دے، ایسا بنادے کہ تیری طرف سے غفلت نہ ہو آخرت اور جنت و دوزخ کو نہ بھولیں قبر کو نہ بھولیں، حشر کو نہ بھولیں، آخرت کی ہر منزل میں ہمارے ساتھ رحمت کا معاملہ فرما، کرم کا معاملہ فرما، اے اللہ ہمارے ساتھ وہ معاملہ نہ فرما جس کے ہم اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے مستحق ہیں، ہمارے ساتھ وہ معاملہ فرما جو آپ کی شان رحیمی و کریمی کے لائق ہے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک أنت التواب الرحیم، وصل اللهم وسلم علی سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین!

مولانا سیّد محمد علی رامپوری ؒ

تاثیر و ہدایت کے چند واقعات

(دوسری قسط)

مولانا عتیق احمد بستوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

[مولانا سید محمد علی رامپوری سید احمد شہید کے ممتاز خلفاء میں تھے۔ ان کے حالات پر مشتمل ان کے ایک مسترشد نواب افسر الدولہ جان جہاں خاں کی لکھی ہوئی کتاب "القول الجلی فی کرامات السید محمد علی" اور بعض دوسرے تاریخی ماخذ کی روشنی میں لکھے گئے اس مضمون کی پہلی قسط گذشتہ شمارے میں پیش کی گئی تھی۔ ذیل میں اس کی دوسری اور آخری قسط ملاحظہ فرمائی جائے ——— ادارہ]

مواعظ کی تاثیر

مولانا سید محمد علی رامپوری کے مواعظ بڑے مؤثر اور دلگداز ہوا کرتے تھے ان میں بلا کی سادگی اور کشش ہوتی تھی بیان کے سوز دروں اور اخلاص باطن کی آنچ سے پتھر جیسے دل موم ہو جاتے اور پشتینی جرائم پیشہ افراد کو سچی توبہ کی توفیق ملتی اور ان کی زندگیاں یکسر بدل جاتیں۔ مصنف لکھتے ہیں: "نواب کرناٹک کے

دہلی کاروں میں ایک کایستھ تھا جس کا خطاب راجہ ٹیکم چند تھا، اسے حضرت مرشد کا وعظ سننے کا بڑا شوق تھا، لیکن مواعظ چونکہ عموماً مسجد میں ہوا کرتے تھے اس لیے شریک نہیں ہو پاتا تھا، ایک بار نواب والاجاہ مرحوم کے دیوانخانہ ہمایوں محل میں حضرت مرشد کا وعظ طے پایا حضرت مرشد کے ایک مرید محمد شفیع خاں قلم بردار نے راجہ ٹیکم چند سے کہا کہ اب تو دیوان خانہ میں وعظ ہونے جا رہا ہے وہاں ہندو وغیرہ بھی حاضر رہتے ہیں آپ وہاں بلا مزاحمت سن لیں گے۔ محمد شفیع خاں نے انھیں حضرت مرشد کے قریب پہونچا دیا تاکہ درمیان وعظ نہ جا سکیں۔ مولانا کا وعظ شروع ہوا جب وعظ زوروں پر آیا تو راجہ جی نے اپنی شال سے دونوں کان زور سے بند کر لیے، شفیع خاں نے کہا آپ کو تو وعظ کی آرزو تھی، پھر کان کیوں بند کر لیے، اس نے جواب دیا: "جی سننا نہ چاہیے کیونکہ دل ادھر کھنچا چلا جاتا ہے" اسی وعظ میں حضرت مرشد نے نواب صاحب اور ان کی والدہ کے سفر ناگور کا تذکرہ کیا جو نواب اعظم جاہ بہادر مرحوم کے دور میں ہوا تھا۔ فرمایا ہر دو نواب صاحب اور ان کی والدہ بیگم صاحبہ وہاں جانے کو نکلے، وہ مقام مدراس سے دس منزل پر ہے، ہر ہر منزل پر سب طرح کے آرام کی تیاریاں کی گئیں، میر منزل آگے بھجوایا گیا سرکار انگریزی سے تمام کلکٹروں اور عہدہ داروں کو احکام روانہ ہوئے کہ ہر طرح کی راحت کا ساز و سامان ہر منزل پر تیار رہے، اس سفر میں وقت بہلانے کے لیے ندیم و رفیق ہمیشہ سے زیادہ تھے۔ اس مختصر سے سفر کی تو نواب صاحب نے اس قدر تیاریاں کیں، راحت و آرام سے گئے اور واپس آئے مگر افسوس ہے کہ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ نے آخرت کے بڑے سفر کے لیے ویسی توجہ نہ کی جس میں نیک عمل کے سوا کوئی رفیق نہیں ہو سکتا، بھلا قبر میں جو پہلی منزل ہے نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کا کون رفیق ہوگا؟ وہاں ان کے لیے ڈیرے خیمے کس کے سپرد ہوں گے، شمعدانیں، چراغ، قندیلیں کہاں سے آئیں گی؟ کفن کے سوا ان کے بدن پر گرما و سرما کا کون لباس ہوگا؟ ایسے وقت میں سارا

کر دفن چھوڑ کر نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کو اکیلے ہی اندھیرے گڑھے میں رہنا ہوگا، وہاں کوئی رفیق یا روشنی سوائے عمل کے نہ ہوگی منکر نکیر کا جواب سکھانے کے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا۔ یہ کہہ کر حضرت واعظ نے برزخ اور وہاں کی بیکسی اور موقف کی گرمی اور نفسی نفسی پکارنے کی حالت اس گرمی سے بیان کی کہ زنانہ مردانہ میں یکساں آہ وزاری کا شور اٹھا۔

اسی نوع کا دوسرا واقعہ مصنف سید جواہر علی خاں کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں شادی محل میں جواہر حسین خاں کی کوٹھری میں بیٹھا ہوا تھا اسی دوران ایک شخص اس کوٹھری میں آکے کہنے لگا کہ مولوی سید محمد علی صاحب جو نوارد ہیں بڑی مسجد میں شہادت امام حسین کا وعظ کر رہے ہیں سارے حاضرین زار زار ہیں، یہ سنکر جواہر حسین خاں نے مجھ سے کہا: خاں صاحب چلیے تو سنیں کیسا وعظ ہے اور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے چلے مسجد شادی محل سے نزدیک تھی، بہت جلد پہونچ گئے، مسجد کے باہر ہی سے حاضرین کے رونے کی آواز سنائی پڑرہی تھی میں نے دل میں کہا اتنا شور وگریہ محض تکلف ہے مگر جب مسجد کے صحن کی سیڑھیوں پر چڑھا۔ ہنوز وعظ کی آواز پوری سنائی نہ پڑرہی تھی کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے؛ جب اندر پہونچا تو خود بے اختیار ہوگیا۔ اس سے مجھ کو گونہ اعتقاد ہوا یہ واعظ صاحب باطن ہے۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ کے وعظ کی کہانی

ایک بار کسی نے مولانا اسماعیل شہیدؒ کے وعظ وہدایت کی کیفیت پوچھی تو فرمایا میں ایک قصہ ان کے وعظ کے اثر کا بیان کرتا ہوں ایک دن وہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے مدرسے کے دروازے پر اپنے ایک رفیق کے ساتھ کھڑے تھے۔ دیکھا کہ بہت سی جوان اور خوبصورت عورتیں رتھوں اور بہلیوں میں سوار ہوکر کہیں جارہی ہیں، عورتیں پردوں میں سے جھانکتی ہیں۔ ان کی تمام زیب وزینت نظر آتی ہے، مولانا نے اپنے رفیق سے پوچھا یہ کون عورتیں ہیں؟ انھوں نے

کہا کسبیاں ہیں دریافت کیا۔ کیا مسلمان عورتیں ہیں؟ کہا ہاں، مولانا نے کہا ہماری بہنیں ہیں خدا ہم سے پوچھے گا کہ اتنی بہت سی مسلمان عورتوں کے بدکاری میں مبتلا ہوتے ہوئے تم نے انھیں کیوں نصیحت نہیں کی؟ ہم تو ان کے ٹھکانے جائیں گے اور نصیحت کریں گے" ان کے رفیق نے کہا: لوگ آپ کے مخالف ہیں، بدنام کریں گے کہ کنجڑہ واڑی میں آپ بھی جانے لگے، فرمایا کہ اسمٰعیل کو اس کی پرواہ نہیں جب اللہ اور اس کے رسول کی بات بولنے اٹھا تو دل سے پوچھا اے دل اگر تیرے بدن کی بوٹیاں کاٹ کے چیلوں کو کھلائیں کیا تب بھی اللہ کی بات بولتا رہے گا؟ کہا ہاں۔

اس عرصہ میں دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ سب کسبیاں کسی تقریب کے موقع پر بڑی نائکہ (بڑی کسبی) کے گھر جارہی ہیں۔ شام کو مولانا بھیس بدل کر فقیرانہ لباس میں اس بڑی نائکہ کے دروازے پر پہونچے، دیکھا بڑا عالی شان گھر ہے جو سلاطین کے زمانے میں ایسی عورتوں کے لیے بنایا گیا تھا، دروازہ پر دستک دی، اور یہ آواز لگائی: او اللہ والیاں، او اللہ والیاں، چند چھوکریوں نے پوچھا کون ہو؟ جواب دیا۔ فقیر ہے کچھ صدا سنائے گا اور تماشہ دکھائے گا" وہ سمجھیں وہ تماشہ گر فقیر ہے دروازہ کھول کر اندر بلالیا۔ مولانا نے پوچھا بڑی نائکہ کہاں ہیں؟ انھوں نے کہا بالاخانے پر ہے اور سیڑھیاں بتلادیں مولانا اوپر گئے، وہاں دیکھا کہ بڑی نائکہ بڑے شان و تزک سے کرسی پر بیٹھی ہے، شمعیں روشن ہیں، اس نے مولانا کو دیکھ کر پہچان لیا، سخت گھبراہٹ میں مبتلا ہو کر اٹھ گئی۔ کہا: صاحبزادے کدھر کو آئے! آپ نے فرمایا گھبراؤ نہیں کچھ سخن کہتا ہوں۔ تماشہ دکھلاتا ہوں، سب اکٹھی رہو، چونکہ ہدایت کا وقت آگیا تھا سب اکٹھا ہوگئیں۔ مولانا کی گردن میں حمائل آویزاں تھی، اسے کھول کر ایسی خوش الحانی سے قرآن پڑھا کہ اسی کو سن کر سب لوٹ پوٹ ہوگئیں پھر مولانا نے ان آیتوں کا بیان شروع کیا، جس میں دنیا کی ہر چیز کی بے ثباتی کا ذکر تھا کہ حسن و جوانی

کو قیام ہے نہ مال و زندگانی کو، ہر چیز زوال پذیر ہے یہ بیان ایسی فصاحت و بلاغت سے ہوا کہ سب کی سب بے قرار ہو گئیں۔ مولانا نے جب یہ حالت دیکھی تو موت اور سکرات اور اس وقت کی بے کسی، وحشت اور اس عالم سے جدائی کا افسوس اس درد سے بیان کیا کہ اکثر عورتیں حواس باختہ ہو گئیں، پھر اس کے بعد قبر کی تنہائی منکر نکیر کے سوال اور وہاں کے عذاب کا بیان اس زور پر کیا کہ بہتوں پر غشی طاری ہو گئی ہر طرف آہ و زاری ہونے لگی۔ اس کے بعد محشر کی سختیوں اور سزاؤں کا بیان شروع کیا۔ فرمایا: وہاں بدکاروں کے گروہ کے گروہ گرفتار ہو کے آئیں گے، جو کوئی یہاں جس گناہ کا سبب اور وسیلہ ہوا ہے وہ پیش رو ہوگا اور اس کے سبب سے جتنے لوگ معصیت کے مرتکب ہوئے ہیں سب اس کے پیچھے ہوں گے۔ جب تم میں کی ایک ایک آدمی کی سیکڑوں زانی اس کے پیچھے ہوں گے، ایسی حالت میں آنے والے کا حال خدائے ذو الجلال کے آگے کیا ہوگا۔

یہ بیان بھی ایسا گرم ہوا کہ سب روتے روتے بیدم ہو گئیں تب اس حکیم امت نے ان خستہ حالوں کے دلوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے توبہ کی فضیلت بیان کرنی شروع کی کہ توبہ سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس بیان سے ان بیدلوں میں کچھ دم آیا، پھر نکاح کی فضیلت بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ اب یہاں جو جس سے چاہے نکاح کر لے۔ اس وعظ کی اطلاع ہوتے ہی تمام شہر سے بے شمار لوگ وعظ سننے کے لیے اس مکان پر اکٹھا ہو گئے تھے، سامعین کی کثرت کی وجہ سے راستے بند ہو گئے تھے۔ آپ کی نکاح کی ترغیب سے جو نکاح کے قابل تھیں انھوں نے نکاح کر لیا، جو سن رسیدہ تھیں انھوں نے محنت و مزدوری کو ذریعہ معاش بنایا سب نے بدکاری اور فسق و فجور سے سچی توبہ کر لی اور شریعت پر قائم ہو گئیں۔

دشمنوں کے ساتھ رویہ

ہر دور میں اہل اللہ، خاصان خدا، بزرگان دین کے مخالفین اور دشمن جانی بھی اچھے خاصے ہوتے ہیں، مولانا محمد علی رامپوریؒ کے مخالفین بھی کم نہیں تھے۔ جہاں

بھی انھوں نے اصلاح و دعوت اور احیائے سنت کا کام شروع کیا، اہل بدعت وضلالت نے ہزار مخالفتیں شروع کر دیں۔ شورش بپا کی، اور ان کی ایذا رسانی کے لیے ہر اوچھا حربہ استعمال کیا۔ مدراس میں تو اہل ضلالت نے اتنا زور باندھا کہ مولانا موصوف کو مدراس چھوڑنے پر مجبور کر دیا، لیکن اس بندۂ خدا نے تمام مخالفتوں اور مذالتوں کا جواب علم و بردباری، خوش خلقی اور عفو و درگذر سے دیا۔ مصنف نے اس سلسلہ کے چند اخلاق آموز، ایمان افروز واقعات قلمبند کیے ہیں۔

ایک روز عصر بعد حضرت بالاخانہ پر نشست گاہ میں تھے۔ مخصوص معتقدین حاضر تھے۔ یہ عاجز بہت نزدیک تھا۔ حضرت کچھ صبر و تحمل کا بیان کر رہے ہیں یکایک گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے ہاں ہاں کہتے ہوئے بے اختیار زنان خانہ کی طرف دوڑے، حضرت کے اس طرح جانے سے ہم لوگوں کو سخت حیرت ہوئی دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت مرشد کی اہلیہ دونوں صاحبزادیوں کے ساتھ بلوے کے بانی کے حق میں بددعا کرنے کے لیے قرآن کی تلاوت کر رہی تھیں ابھی انھوں نے بددعا نہیں کی تھی کہ حضرت مرشد وہاں پہونچے اور فرمایا یہ آپ کیا کرنے جا رہی ہیں اپنے اجداد کی طرح آپ کا رویہ محض صبر و عفو کا ہونا چاہیے، دشمنوں کے حق میں بددعا کے بجائے دعا کرنی چاہیے۔ خدا نے چاہا تو مخالف موافق ہو جائیں گے یا ان کی اولاد راہ راست پر آجائے گی۔ اس کے بعد حضرت مرشد نے قرآن ان کے ہاتھ سے لے لیا اور ان سے دعا خیر کروائے اور خود بھی دعا کر کے ان کو نیچے لائے۔

حضرت مرشد کی اہلیہ نے بددعا کا قصد اس لیے کیا تھا کہ مخالفوں کی شورش اور فتنہ انگیزی حد سے بڑھ گئی تھی حتی کہ وہ لوگ جان کے درپے ہو گئے تھے چنانچہ ایک اخوند کی عورت نے جو منافقت سے بڑی عقیدت مندی ظاہر کرتی تھی حضرت مرشدہ کی خدمت میں دہی حاضر کیا، ایک صاحبزادی نے اسے تناول فرمایا تو دست شروع ہو گیا دست آتے آتے بری حالت ہو گئی حضرت مرشد کو خبر ہوئی تو اندر تشریف لا کر دعا فرمائی، کافی دیر میں افاقہ ہوا اس عورت کو معتقد۔ بیویوں نے

پکڑا بہت مشکل سے اپنے جرم کی قائل ہوئی اور کہا کہ فلاں صاحب نے میرے پاس وہ دہی بھیجا تھا کہ حضرت مولوی صاحب کے لیے بھیجوں، تحقیق ہو جانے کے بعد بھی حضرت مرشد نے درگذر کیا فرمایا، خدا نے تو ہمیں آخر بچا لیا پھر انتقام کی ضرورت ہے اور انتقام لینا ہمارا کام بھی نہیں۔

مصنف نے ایک دوسرا واقعہ لکھا ہے جس سے صاحب تذکرہ کی بلند اخلاقی اسلامی غیرت وحمیت اور انسانی شرافت پر روشنی پڑتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے "حضرت مرشد کا ایک صادق الاعتقاد مرید مدراس کے انگریز کمانڈر انچیف کا خانساماں تھا، اس نے بلوے کے زمانہ میں حضرت مرشد سے اجازت چاہی کہ کمانڈر انچیف صاحب کی معرفت گورنمنٹ میں عرضی پیش کرے، اس نے یہ بھی عرض کیا کہ حضرت کے خلاف جو کچھ شورش ہوئی ہے اس کی خبر میں نے کمانڈر انچیف صاحب تک پہنچائی تو انھوں نے بلا کر ساری کیفیت دریافت کی اور پوچھا کیا تمھارے مرشد مجھ سے ملنا پسند کریں گے۔ میں نے کہا وہ نہیں ملتے۔ پھر انھوں نے پوچھا: اگر میں ان کے یہاں حاضر ہوں تو کیا ملاقات کریں گے۔ میں نے جواب دیا کہ وہ ایسی ملاقاتوں سے احتراز کرتے ہیں۔ صاحب نے کہا ہم کیا کریں ان کے مخالفوں کی طرف سے فریادیں آتی ہیں، اور ان کی طرف سے کوئی فریاد نہیں آتی، اگر تم ان کی طرف سے درخواست لاؤ تو میں بندوبست کیے دیتا ہوں، میں نے کہا کہ وہ نالش نہیں کریں گے، صاحب نے کہا اگر تم یا ان کا کوئی مرید ان کی اجازت سے گورنمنٹ میں میری معرفت کوئی عرضی دے تو میں کونسل میں وہ عرضی پیش کر کے مخالفوں کا فتنہ وفساد روک سکتا ہوں۔ جب یہ سارا قصہ حضرت مرشد کی خدمت میں بیان کیا گیا تو حضرت نے برہم ہو کر فرمایا: میں مسلمانوں کے خلاف اہل حکومت سے فریاد نہیں کرنا چاہتا، اس وقت خانساماں ہاتھ میں عرضی لیے کھڑا تھا، اس سے فرمایا: اگر ہماری بیعت پر قائم ہو تو وہ کاغذ مجھے دیدو اور اس سے کاغذ لے کر اسے چاک کر دیا۔ وہ بیچارہ آپ کا صبر وحلم دیکھ کر متعجب وحیران ہو کر چلا گیا، حضرت مرشد مخلصوں میں متواتر مخالفین کے حق میں یہ دعا کرتے

تجھے: خدایا! تو نے مجھ کو بہت سی نعمتیں دیں اور سرفراز کیا بعض مسلمان بھائی اس پر حسد کرتے ہیں ان کو بھی سرفراز کیجیے تاکہ ان کا حسد دفع ہو۔

حسن خاتمہ کے چند واقعات

ہر دور میں بکثرت مشاہدہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ساری زندگی یا کم از کم زندگی کے آخری حصہ میں توحید و سنت پر قائم رہتے ہیں انھیں حسن خاتمہ نصیب ہوتا ہے، وہ لوگ بڑے ہشاش و بشاش، ترو تازہ دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ دم واپسیں "چو مرگ آید تبسم برلب اوست" کی سچی تصویر ہوتے ہیں۔ کلمہ پڑھتے ہوئے ذکر و تسبیح کی حالت میں ان کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کرتا ہے۔

مولانا سید محمد علی رامپوری کے مریدین و معتقدین کے حسن خاتمہ کے کثیر واقعات "القول الجلی" کی زینت ہیں بطور نمونہ چند واقعات نقل کیے جاتے ہیں۔ "محمد ادریس نام کا ایک شخص، اور اس کی بیوی دونوں حضرت مرشد کے صادق الاعتقاد مرید تھے، بڑے باغ میں رہتے تھے، حضرت مرشد کی مدراس میں دوبارہ روانگی کے سال دو سال بعد محمد ادریس کی بیوی مرض الموت میں مبتلا ہوئی اس نے آخر وقت میں محلہ کی تمام عورتوں کو بلایا اور کہا: میرا آخری وقت ہے، دیکھو اس سید برحق کی مریدہ کس ثبات، ایمانداری سے مرتی ہے" اس کے بعد اس نے ذکر شروع کیا، ذکر الٰہی کرتے ہوئے اللہ کے نام کے ساتھ اس کی روح قبض ہوئی، پھر ایک مدت بعد خود محمد ادریس بیمار ہوا، اس نے بھی دم اخیر لوگوں کو جمع کیا کہ اس کا حسن خاتمہ دیکھیں چنانچہ وہ بھی خدا کا ذکر کرتے ہوئے اور صاف صاف کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے چل بسا۔

مولوی جلال الدین حسین خاں عرف مولوی حسین صاحب حضرت مرشد کے خلیفہ تھے ان کی بیوی بڑی ثابت قدم مریدہ تھیں وہ بڑے ثبات و استقامت کے ساتھ جاں بحق ہوئیں۔ ان کا عزیمت و استقامت کے ساتھ مرنا دیکھ کر بہت سی عورتوں پر اثر ہوا اس خاتون نے مرتے وقت شوہر کو وصیت کی تھی کہ سنت پر ثابت قدم رہیں۔

حضرت مرشد کے خلاف شورش کے زمانہ میں جب مولوی محمد حسین صاحب کی تنخواہ نواب صاحب کی طرف سے یہ کہکر بند کردی گئی کہ حضرت واعظ سے پھرو تو تنخواہ جاری کی جائے گی تو ان کی بیوی ان سے کہنے لگیں کہ کچھ فکر نہ کیجیے، آپ کو جو کمائی چاہیے محض مجھے اور میری اولاد کو کھلانے پلانے کے لیے چاہیے، مگر میں آپ سے کچھ نہیں چاہتی ہوں، اپنی محنت و مزدوری سے سب کا خرچ کروں گی تم ہرگز بیعت سے نہ پھرو، بیعت پر قائم رہو، یہ سنکر مولوی صاحب نہایت خوش ہوئے کہ بیوی کی وہی مرضی ہے جو میری ہے کہ دنیا پر لات ماردیں مگر بیعت نہ توڑیں۔

خود مولوی صاحب کی وفات کا جب وقت آیا تو اپنی قوم کے معتقد و نامور لوگوں کو اور کچھ دوسرے لوگوں کو اپنے پاس بلایا انھیں میں حافظ یار جنگ عرف اولیاء صاحب بھی تھے، جو ان کے بہنوئی اور حضرت مرشد کے سخت مخالف تھے، ان سب کو جمع کرکے ذکر و اذکار کرتے ہوئے حضرت مرشد کی تعریف کرتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ دیکھو ان کا مرید دم اخیر کس استقلال سے خدا کے پاس جا رہا ہے۔ انتقال کیا۔ اس واقعہ کا اولیاء صاحب پر بڑا اثر ہوا، چنانچہ مولوی صاحب کی وفات کے بعد کہہ اٹھے کہ اسی وقت کے لیے اور ایسی ہی موت کے لیے آدمی عمر میں ذکر و شغل کرتا ہے۔

میرے والد صاحب نے خلفاء کو آخری وقت میں توحید و اتباع سنت کی وصیت کرکے قرآن کی آیتیں پڑھتے ہوئے تبسم کے ساتھ رحلت فرمائی، وفات کے بعد چہرہ کا نور بڑھ گیا۔ پیشانی پر سجدہ کا نشان ستارے کی طرح چمکتا تھا، بعض اعزہ جو سخت مخالف تھے وہ بھی چہرے کا نور دیکھ کر سخت حیران ہوئے اور بے اختیار سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے لگے اور کئی ایک معتقد ہوگئے، میت سے بہت نمایاں طور پر خوشبو پھیل رہی تھی۔ ایک خانساماں جو حضرت مرشد کا بہت سخت دشمن تھا والد صاحب کے انتقال کے دو تین روز کے بعد انکے خلیفہ مولوی اسمٰعیل صاحب ویلوری کے پاس آیا اور یہ کہکر بیعت کی درخواست کی کہ کلب میں میز کے وقت ایک عیسائی نے دوسرے عیسائیوں سے کہا کہ نواب عالم کا انتقال ہوا، اب ہمارے پادریوں کو اسلام کا رد

کرنے میں دقت نہ ہوگی، یہ سنکر میں نے حضرت سیدؒ کی مخالفت سے توبہ کی کہ جس کے خلیفہ ایسے ہوں کہ ان کے اٹھنے سے اسلام کو صدمہ پہونچتا ہے تو پھر وہ مرشد کیسے صاحبِ مقام ہوں گے۔

کرامات

انبیائے کرام کے معجزات کی طرح اولیائے کرام کی کرامات بھی حق ہیں اللہ کے نیک بندوں سے اور ان کے بارے میں خرق عادت امور کا ظہور سنت الٰہی رہی ہے۔ مولانا سید محمد علی رامپوری رحمۃ اللہ علیہ خدارسیدہ صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے اس لیے ان سے کرامات کا ظہور حیرت انگیز بات نہیں۔ ان کی غیر معمولی تاثیر اور قوت تسخیر سب سے بڑی کرامت ہے ہزاروں انسان ان کے کشف و کرامات کا مشاہدہ کرکے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور شرک و بدعت سے توبہ کرکے توحید و سنت پر قائم ہو گئے۔ "القول الجلی" کتاب در اصل ان کی کرامات کے بیان میں ہے مصنف نے اس کتاب میں اپنی چشم دید اور معتبر راویوں کی بیان کی ہوئی کرامتیں شامل کی ہیں۔ جن کی صحت و استناد میں کسی قسم کا شبہ کرنا مشکل ہے کھانے میں غیر معمولی برکت۔ مخالفین اور بدگویوں کے انجام بد، مریدین کی کامیابی و سرفرازی، کشف وغیرہ کے بے شمار واقعات مطالعہ کرنے سے ایمان و عرفان میں اضافہ ہوتا ہے۔

یادِ رفتگاں

خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

ہماری خالہ صاحبہ مرحومہ

دنیا میں ماں کی ممتا، بے لوث محبت اور بے غرض شفقت کے لیے ضرب المثل ہے۔ یہاں تک کہ اپنے بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کے انسانی خلوص و محبت کے تمام معیاروں سے سوا ہونے کو بیان کرنے کے لیے بھی لسانِ نبوت نے یہی تعبیر اختیار کی تھی کہ ایک ماں کے دل میں اپنے جگر گوشے کے لیے جو محبت ہوتی ہے، اپنے بندوں کے لیے اللہ اس سے بھی زیادہ رحیم و کریم ہے۔

ماں اور باپ کے بعد بالعموم یہی دیکھا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ محبت خالہ کے دل میں ہوتی ہے اور شاید اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں باپ کے بعد سب سے بڑا رتبہ اور حق خالہ ہی کا بتایا ہے۔ بلکہ ترمذی شریف کی ایک حدیث میں تو یہ مضمون آیا ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھ سے ایک بڑا گناہ ہو گیا ہے تو کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ آپؐ نے اس کے جواب میں دریافت فرمایا، تمھاری والدہ زندہ ہیں؟ انھوں نے کہا کہ نہیں، پھر آپؐ نے فرمایا، تمھاری کوئی خالہ ہیں؟ انھوں نے عرض کیا جی ہاں! آپؐ نے فرمایا، پھر ان کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو (اسی کی برکت سے اللہ تعالیٰ گناہ کو معاف فرمادے گا)

اللہ اکبر! کس قدر رتبہ بلند ہے ماں اور خالہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں!

ان سطور کا راقم جب ۵ سال کا تھا، تو اس کی والدہ دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں، ماں کی جدائیگی، وہ بھی کمسنی میں ہر اولاد کے لیے بڑا سنگین حادثہ ہے، لیکن اگر اولاد ایسی ہو کہ ماں ہی اس کی پوری دنیا ہو، گھر سے باہر اسے دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہو، اور کسی بھی وجہ سے ماں کو زیادہ محبت اسی سے ہو، تو ایسی اولاد کے لیے، ایسی ماں کی جدائیگی کا صدمہ دوہرا

ہو جاتا ہے ۔۔۔ میرا معاملہ کچھ ایسا ہی تھا۔ لیکن اللہ کا عجب نظام ہے کہ والدہ کے انتقال کے بعد ہماری خالہ نے ہم سب کو ایسی محبت دی، ایسی شفقت دی، ایسا پیار دیا کہ ہم سب بھائی بہنوں کو دوبارہ ماں مل گئیں ۔۔۔ ادھر کافی عرصہ سے وہ علیل چل رہی تھیں، دوشنبہ یکم اکتوبر کو سنبھل سے بذریعہ فون یہ خبر آئی کہ صبح ۹ بجے دن ان کا انتقال ہو گیا، بالکل ایسا محسوس ہوا کہ آج دوبارہ ہم ماں کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔

عجیب و غریب صفات والی خاتون تھیں وہ، میں نے ان کی تدفین کے بعد گھر میں جمع ہونے والے سارے اعزہ و اقارب سے جب یہ کہا کہ اگر ان سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو تو میں دست بستہ گذارش کرتا ہوں کہ للہ معاف کر دیں، یا مجھ سے اپنا حق وصول کر لیں، تو سب نے یہی کہا کہ کسی کو ان سے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچی ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ دوسروں کی رعایت، مروت، ایثار، اور صبر ان میں بہت تھا، پاکیزگی، طہارت، صفائی بلکہ نفاست کا اتنا اہتمام اور سلیقہ اور حسن انتظام اس قدر تھا کہ کوئی ان کے گھر کو دیکھ کر ان کے حالات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا تھا، نماز کی ایسی پابند تھیں کہ آخری دنوں میں شدید علالت کے باوجود ایک نماز بھی ان کے ذمے باقی نہ رہی ۔۔۔۔

ان سطور میں ان کا تذکرہ لکھنا مقصد نہیں ہے۔ ورنہ بات طویل ہو جائے گی۔ بس چونکہ یہ معلوم ہے کہ الفرقان کے قارئین مرحومین کے لیے دعاؤں کا اہتمام کرتے ہیں، اور اپنے تمام دوستوں اور متعلقوں کو فرداً فرداً مطلع کرنا اور دعا کی درخواست کرنا ممکن بھی نہیں، (جن میں سے بعض حضرات حرمین شریفین میں ہیں، اور ان کی دعاؤں سے راقم کو بہت سہارا رہتا ہے) اس لیے یہ اطلاع دیتے ہوئے سب حضرات سے یہ گذارش ہے کہ وہ ہماری خالہ صاحبہ مرحومہ کے لیے دعاؤں کا اہتمام فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ رحمت و مغفرت کا معاملہ فرمائے اور مراتب بلند فرمائے۔

ہمارے خالو صاحب (مولانا محمد عثمان صاحب) خود بہت ضعیف ہو گئے ہیں ان کے لیے اور ان کی غم زدہ صاحبزادی کے لیے صبر و سکون، اور صحت و عافیت کی دعاؤں کا بھی اہتمام فرمائیں ۔۔۔ بڑا احسان اس راقم آثم پر ہوگا۔ واجرکم علی اللہ،

• اور اس دیومالائی مذہب کے احیاء کی حالیہ کوششوں کے لئے برپا کی جانے والی تحریکوں کے بارے میں آپ خود کوئی قطعی فیصلہ کر سکیں۔

تو

اس کتاب کو خود پڑھیئے
اپنے حلقۂ احباب میں پہنچائیے
اور اُس کے مضامین کو اچھی طرح اخذ
کر کے ہمدردانہ اور مثبت انداز سے لوگوں میں انکی اشاعت
کیجیئے

ہم یہ چاہتے ہیں کہ
یہ کتاب

دنیا بھر کے مسلمانوں کے پاس پہنچ جائے اور ہمیں یقین ہے کہ اللہ کے ایک بندے نے کبرسنی، شدید ضعف اور گوناگوں امراض وعوارض کے باوجود دو سال کی شب و روز کی محنت سے جو کتاب تیار کی ہے، اللہ تعالیٰ اسے دور دور پہنچائے گا اور اسے اپنے بندوں کے لئے نافع بنائے گا۔

ہم نے اس کتاب کی توسیع اشاعت کے لئے ایک مخصوص اسکیم تیار کی ہے، اگلے صفحہ پر وہ اسکیم ملاحظہ فرمائیے خود بھی اس سے فائدہ اُٹھائیے اور دوسروں کو بھی اسکی ترغیب دیجیئے

کتاب کا ترجمہ عربی، انگریزی اور فرانسیسی میں شروع ہو چکا ہے

---

22 × 18 سائز پر تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل آفسٹ کی عمدہ طباعت اور خوبصورت جلد سے مزیّن، قیمت صرف ۲۰/-

۶۔ بیرونی ممالک کے لئے بذریعہ ہوائی جہاز ایک کتاب کی قیمت مع محصولڈاک

ا۔ سعودی عرب اور دیگر عرب ملکوں کے لئے: پچاس روپے -/۵۰ روپے۔

ب۔ یورپ و افریقی ممالک کے لئے: ساٹھ روپے -/۶۰ روپے یا 4/00 پونڈ

ج۔ امریکہ و کنیڈا کے لئے: ستّر روپے -/۷۰ روپے یا 4/½ پونڈ

بیرونی ممالک کے حضرات اگر اس کتاب کے ۵ نسخے طلب کریں تو محصولڈاک میں کفایت بھی ہوگی اور مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کی تصنیف "انقلاب ایران اور اس کی اسلامیت" کے ۲ نسخے ہماری طرف سے بطور ہدیہ پیش کئے جائیں گے۔ پانچ نسخوں کے لئے شرحیں حسب ذیل ہیں:

ا۔ سعودی عرب اور دیگر عرب ملکوں کے لئے: دو سو پندرہ -/۲۱۵ روپے

ب۔ یورپ و افریقہ کے لئے: دو سو ساٹھ -/۲۶۰ روپے یا 17½ پونڈ

ج۔ امریکہ و کنیڈا کے لئے: تین سو دس -/۳۱۰ روپے یا 38 ڈالر

پاکستان کے شائقین نوٹ کرلیں کہ اس کتاب کی طباعت کا اہتمام پاکستان میں بھی کیا جارہا ہے، اس سلسلہ میں قطعی اور مفصّل اطلاع آئندہ شمارہ میں دی جائے گی۔

تاجر حضرات کے لئے خصوصی پیشکش:

کم از کم پچاس نسخے نقد طلب کرنے پر مقررہ کمیشن کے علاوہ پانچ فیصد ۵٪ مزید کمیشن۔

دی پی یا بینک سے کتاب طلب کرنے کی صورت میں چوتھائی رقم پیشگی بھیجنا ضروری ہے۔

آخری ضروری بات

ہماری یہ مخصوص اسکیم محدود وقت کے لئے ہے اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے آپ کی فرمائش مع مطلوبہ رقم ۳۰ نومبر سے قبل ہمارے پاس پہنچ جانا ضروری ہے۔

نوٹ: ڈرافٹ یا پوسٹل آرڈر صرف الفرقان بکڈپو لکھنؤ ALFURQAN BOOK DEPOT LUCKNOW کے نام بنوا کر ارسال فرمائیں۔

کتاب کے اہم مضامین کی فہرست

مقدمہ از — حضرت مولانا سید ابو الحسن علی مدظلہ

پیش لفظ

• ائمہ انبیاء علیہم السّلام کی طرح معصوم ہوتے ہیں۔

• ائمہ معصومین کے قیامِ حمل اور ان کی پیدائش کے بارے میں امام جعفر صادق کا عجیب و غریب بیان۔

ام انسانی فطرت کے خلاف اماموں کی دس خصوصیات۔

• اماموں کا حمل ماؤں کے رحم میں نہیں بلکہ پہلو میں قائم ہوتا ہے۔

• ائمہ معصومین کو ماننے والے (شیعہ) اگر ظالم اور زانی (و) فاجر بھی ہیں تو جنّتی ہیں اور ان کے علاوہ مسلمان، اگر متقی پرہیزگار بھی ہیں تو دوزخی ہیں۔

• ائمہ کا درجہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے برابر اور دوسرے تمام انبیاء سے برتر اور بالاتر۔

• امیر المومنین کا ارشاد کہ تمام فرشتوں اور تمام پیغمبروں نے میرے لئے اسی طرح اقرار کیا جس طرح محمدؐ کے لئے کیا تھا اور میں ہی لوگوں کو جنّت اور دوزخ میں بھیجنے والا ہوں۔

• ائمہ کو ماکان وما یکون کا علم حاصل تھا اور وہ علم میں حضرت موسیٰ جیسے جلیل القدر پیغمبر سے بھی فائق تھے۔

• ائمہ قیامت کے دن اپنے زمانہ کے لوگوں کے بارے میں شہادت دیں گے۔

• انبیاء سابقین پر نازل ہونے والی تمام کتابیں توراۃ انجیل، زبور وغیرہ ائمہ کے پاس ہوتی ہیں اور وہ انکو ان کی اصل زبانوں میں پڑھتے ہیں۔

• ائمہ کے لئے قرآن و حدیث کے علاوہ علم کے دوسرے عجیب و غریب ذرائع۔

• ائمہ پر بھی بندوں کے دن رات کے اعمال پیش ہوتے ہیں۔

• ائمہ کے پاس فرشتوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔

• ہر شب جمعہ میں ائمہ کو معراج ہوتی ہے وہ عرش تک پہنچائے جاتے ہیں اور وہاں انکو بے شمار نئے علوم عطا ہوتے ہیں۔

• ائمہ کو وہ سب علوم حاصل ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں اور نبیوں، رسولوں کو عطا ہوتے ہیں۔

• اور اس کے علاوہ بہت سے ایسے علوم بھی جو نبیوں اور فرشتوں کو بھی عطا نہیں ہوئے۔

• ائمہ پر ہر سال کی شب قدر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کتاب نازل ہوتی ہے جس کو فرشتے اور الرّوح لے کر آتے ہیں۔

• ائمہ اپنی موت کا وقت بھی جانتے ہیں اور انکی موت ان کے اختیار میں ہوتی ہے۔

• ائمہ کے پاس انبیاء سابقین کے معجزات بھی تھے۔

• ائمہ دنیا اور آخرت کے مالک ہیں جس کو چاہیں دے دیں اور بخش دیں۔

• **امامت نبوّت اور الوہیت کا مرکّب**

• جس طرح نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نامزد

ہوتے ہیں۔ اسی طرح امیر المومنین (ع) سے لے کر بارہ امام قیامت تک کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نامزد ہیں

- ہر امام کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سربمہر لفافہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا جس میں اس امام کے لئے خاص ہدایات تھیں وہ ہر امام کو سربمہر ہی ملتا رہا۔
- اللہ تعالیٰ کی طرف سے بارہ اماموں کی نامزدگی اور آسمان سے نازل ہونے والی ایک عجیب وغریب تختی کا قصہ۔
- حضرت علی نے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانہ میں ایک دن ان کا ہاتھ پکڑ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرادی حضور نے ان سے فرمایا...
- اللہ تعالیٰ کی طرف سے ولایت علی کے عام اعلان کا حکم اور صحابہ کے مخالفانہ ردِّعمل کے خطرہ سے آپ کا تردد و توقف، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاکید اور شدید وعید۔

ضروری انتباہ

قرآن مجید میں امامت اور ائمہ کا بیان

- اللہ تعالیٰ نے آسمانوں زمین اور پہاڑوں پر جو امانت پیش کی تھی اور جس کا بار اٹھانے سے انھوں نے انکار کر دیا تھا، وہ امامت کا مسئلہ تھا۔
- قرآن مجید نہیں، امامت کا مسئلہ
- قرآن میں پنجتن پاک اور تمام ائمہ کے نام تھے۔
- قرآن میں اسی طرح کی ایک اور تحریف۔
- حضرات خلفائے ثلاثہ اور عام صحابہ کرام قرآن کی رُو سے قطعی کافر و مرتد
- قرآن کی ایک آیت میں ایمان سے مُراد امیر المومنین علی، کفر سے مُراد ابوبکر فسق سے مُراد عمر اور عصیان سے مُراد عثمان۔
- امامت علی سے متعلق قرآن میں ایکٹ اور تحریف۔

اثنا عشری عقیدہ کے مطابق امام آخر الزماں کے متعلق چند اہم حقائق

- بارھویں امام غائب کی پیدائش وغیبت کا عجیب قصّہ
- امام غائب کی والدہ محترمہ کی حیرت انگیز داستان۔
- امام آخر الزماں کی غیبت صغریٰ اور کبریٰ
- امام غائب کا ظہور کب ہوگا؟

امام غائب کے بارے میں دو قابلِ مطالعہ روایتیں

- رسولِ خدا امام مہدی کی بیعت کریں گے۔
- امام غائب حضرت عائشہ کو زندہ کر کے سزا دیں گے

اثنا عشریہ کے چند اور قابلِ مطالعہ عقائد و مسائل۔

تمام صحابہ کرام خاص کر خلفاء ثلاثہ کافر و مرتد اللہ و رسول کے غدار، جہنمی اور لعنتی

- شیخین کے بارے میں خرافاتی روایات
- ابوبکر کی بیعت سب سے پہلے ابلیس نے کی تھی۔

فاروق اعظم کی شان میں

- فاروق اعظم کا یوم شہادت سب سے بڑی عید
- اس روایت سے متعلق کچھ ضروری اشارات۔
- ان خرافات کے افترائے محض ہونے کی روشن ترین دلیل عقد ام کلثوم
- عقد ام کلثوم اور شیعہ علماء و مصنفین

خون کھولا دینے والی ایک روایت

- امام مہدی شیخین کو قبروں سے نکال کے زندہ کر کے ہزاروں بار سولی پر چڑھائیں گے۔

ازواج مطہرات کی شان میں

کتمان اور تقیہ

- کتمان اور تقیہ کی تصنیف کس ضرورت سے ہے؟
- کتمان اور تقیہ کے بارے میں ائمہ معصومین کا ارشاد اور عمل۔
- تقیہ کی ایک تاویل اور اس کی حقیقت
- تقیہ صرف جائز نہیں بلکہ فرض و واجب۔
- بالکل بے ضرورت ائمہ کے تقیہ کی مثالیں۔
- دینی مسائل (حلال و حرام) کے بیان میں بھی تقیہ
- سیدنا حسین رض پر ذلیل ترین تقیہ کی تہمت۔

ختم نبوت کا عقیدہ ختم اور بے معنی

قرآن مجید میں تحریف اور کمی بیشی

- شیعہ مذہب میں عقیدۂ امامت کا درجہ
- ایک اہم سوال قرآن میں عقیدۂ امامت کا ذکر کیوں نہیں؟ تحریف کا دعویٰ اسی سوال کا جواب ہے۔
- تحریف کے بارے میں ائمہ کے ارشادات۔
- قرآن کا قریباً دو تہائی حصہ غائب کر دیا گیا
- اس سلسلہ میں حضرت علی کا ایک عجیب ارشاد
- اصلی قرآن وہ تھا جو حضرت علی نے مرتب فرمایا تھا۔ اور امام غائب اس کو لیکر آئیں گے

مسئلہ تحریف اور شیعہ علمائے متقدمین

- علامہ نوری طبرسی اور ان کی کتاب "فصل الخطاب"
- قرآن میں تورات و انجیل ہی کی طرح تحریف ہو گئی ہے
- متقدمین علمائے شیعہ سب ہی تحریف کے قائل ہیں
- روایاتِ تحریف کے تواتر کا دعویٰ کرنے والے اکابر علماء شیعہ
- قرآن میں تحریف کی روایات کے متعلق تین اہم باتیں
- شیعی دنیا میں علامہ نوری طبرسی کا مقام و مرتبہ

دو اور قابلِ ذکر عقیدے

- عیسائیوں والا کفارہ کا عقیدہ۔
- کربلا کا مرتبہ کعبۃ اللہ سے برتر اور بالاتر

خاتمۃ الکلام

چندہ سالانہ
ہندوستان میں ۔/۲۵
پاکستان سے پاکستانی سکہ میں ۔/۶۰
بنگلادیش سے ہندوستانی سکہ میں
۔/۳۰

فی شمارہ ۲/۵۰

ممالک غیر سے
بحری ڈاک سے ۔/۶۰ روپے
(۴ پونڈ یا ۲۵ ریال)
ہوائی ڈاک سے ۔/۱۲۵ روپے
(۹ پونڈ ۵۰ ریال ۱۵ ڈالر)

جلد (۵۲)	بابت نومبر ۱۹۸۴ء مطابق صفر المظفر ۱۴۰۵ھ	شمارہ (۱۱)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی روانہ کیا جائے گا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں اگر دوبارہ بھیجنے کے لیے دفتر میں پرچہ ہوگا تو ضرور بھیجا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار حضرات مبلغ ۔/۵۰ روپے ہندوستانی سکہ میں کسی بھی ذریعہ سے دفتر الفرقان لکھنؤ کو روانہ فرمائیں یا پاکستانی سکہ میں ۔/۶۰ روپے ناظم ادارہ "اصلاح و تبلیغ" آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیج دیں۔

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

ویلنگٹن (نیوزی لینڈ) سے ایک خط حال ہی میں آیا ہے۔ مکتوب نگار نے نیوزی لینڈ میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات لکھے ہیں۔ اسی ضمن میں انھوں نے لکھا ہے:

"ایران نیوزی لینڈ سے خام گوشت خریدتا ہے، اس لیے ایرانی حکومت نے اپنی ضرورت کے تحت ایک نام نہاد نگراں حلال گوشت کی تصدیق کے لیے روانہ کیا، جو درحقیقت شیعہ مذہب کا ایک جید عالم اور بہترین مقرر ہے۔ ان کا نام حجت الاسلام محمد شریف مہدوی ہے، وہ ایران کی مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کے رکن بھی ہیں۔ مہدوی صاحب نے نیوزی لینڈ پہنچنے کے بعد اور وہاں کے مسلمانوں کے حالات کے جائزہ کے بعد یہ اعلان کیا کہ میں مسلمانوں کا روحانی پیشوا ہوں، وہ اہل زبان کی طرح انگریزی بولنے پر قادر ہیں، چنانچہ انھوں نے اپنی تقریروں سے لوگوں کے دلوں کو مسحور کر دیا۔ اور جوان طبقہ خاص طور پر شیعہ فرقے میں شامل ہونے لگا — نیوزی لینڈ کے بے خبر مسلمانوں نے اس شخص کو اپنی انجمن کا نائب صدر منتخب کر لیا۔ اپنے عہدہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے انجمن کے قانون میں یہ ترمیم کی کہ "جعفری برادران بھی اس کے ممبر ہو سکتے ہیں"۔ نیوزی لینڈ کے سادہ لوح مسلمانوں کو کیا معلوم کہ جعفری فرقہ کیا ہوتا ہے؟ میں نے مسلمانوں کو جعفری فرقہ سے متعلق بہت سی باتیں بتائیں لیکن میری باتوں کا کسی پر اثر نہ ہوا۔ بلکہ مہدوی صاحب کو ہی امام بھی بنا دیا گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مکتوب نگار نے آگے مہدوی صاحب کی ایک مجلس کا ذکر کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ کثیر تعداد میں شیعہ لٹریچر ان کے ذریعہ نیوزی لینڈ میں پھیل رہا ہے۔

ایک نیوزی لینڈ کا کیا ذکر! امریکہ، یورپ، آسٹریلیا، اور افریقہ کے بیشتر ممالک کی یہی صورت حال ہے ــــــ ہزاروں اخبارات، ہزاروں رسائل، لاکھوں پمفلیٹ بے شمار اجتماعات، اور تمام ممکن ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ایرانی قیادت شیعیت و سبائیت کو اسلامی انقلاب کا خوشنما لیبل لگا کر دنیا کے کونے کونے میں برآمد کر رہی ہے ــــ اور اس نقار خانے میں جب کوئی بندۂ خدا امت کو اس پر فریب سازش سے آگاہ کرنے کے لیے دو لفظ بولتا ہے تو ہمارے بعض پرجوش بھائی اسے خاموش کر دینا اپنا سب سے بڑا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ ایرانی انقلاب اور امام خمینی کے متعلق حضرت والد ماجد مدظلہ کے مضامین پڑھ کر اس قسم کے جو خطوط آتے رہے ہیں ان کی بھی خاصی تعداد ہے۔ انفرادی طور پر اب تک ان کو جواب دیا جاتا رہا۔ اور الحمد للہ کہ ان میں سے بعض حضرات نے اپنے موقف پر نظر ثانی بھی کی ــــ حال ہی میں اسی قسم کا ایک خط جدّہ سے جناب س۔ احمد صاحب کا موصول ہوا ہے، یہ خط بھی والد ماجد ہی کے نام ہے۔ انھوں نے اس کا جواب لکھنے کے لیے اسے راقم کے سپرد فرمایا ہے ــــ خط چونکہ خاصا طویل ہے اس لیے اس کو بعینہ یہاں نقل کرنا ممکن نہیں۔ تاہم اس کے مندرجات کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں اس مکتوب کا مرکزی خیال یہی ہے کہ ہمیں خمینی صاحب کے عقائد سے بحث نہیں ہے۔ ہم ان کے برپا کردہ دینی انقلاب کے حامی و مؤید ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اس انقلاب کی مخالفت صرف اس وجہ سے کی جا رہی ہے کہ "فلاں" جماعت اسے مسلمانوں کے لیے فال نیک سمجھتی ہے۔ مکتوب نگار نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ آخر خمینی صاحب کے عقائد کے متعلق لکھے گئے اس مضمون میں عراق کے صدام حسین کے عقائد سے کیوں بحث نہیں کی گئی؟ اور اس سے زیادہ عجیب و غریب

بات یہ کہی ہے کہ انگریزی دورِ حکومت میں آپ نے گاندھی جی کے مشرکانہ عقائد سے کیوں بحث نہیں کی تھی جب کہ آپ کے اسلاف گاندھی، نہرو، پٹیل کے تابع محض ہو کر رہ گئے تھے؟ ــــ ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی محترم مکتوب نگار نے کیا ہے کہ ایرانی انقلاب سے شیعیت کو فروغ حاصل نہیں ہو رہا ہے، نہ ان دونوں کے درمیان کوئی ایسا رابطہ ہے جس سے کبھی اس کا اندیشہ ہو۔

ذیل میں یہ راقم الحروف ان سب اشکالات کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی کوشش کرے گا۔

جیسا کہ ہم نے ابھی عرض کیا، مرکزی خیال صاحب مکتوب کا یہی ہے کہ "ایران کا انقلاب اس لیے اسلامی ہے کہ اس کے قائدین نے "اسلامی قوانین" رائج کر دیے ہیں، جوے خانے، شراب خانے، قحبہ خانے ختم کر دیے ہیں۔ ہمیں ان کے جزوی عقائد سے بحث نہیں ہے ــــ ہمارے اندازے ہی نہیں تجربے میں بھی یہ طرزِ فکر ہے جو ہمارے زمانے میں بیشتر ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ اور اس لیے اس کے بارے میں پہلے اور کچھ زیادہ گہرائی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام جو انسانوں کی کامیابی و خوش بختی کے لیے خالق ارض و سما کی طرف سے وضع کردہ طرزِ زندگی کا ابراہیمی نام ہے۔ عقائد اور اعمال دونوں شعبوں میں متعین اور واضح ہدایات رکھتا ہے ــــ اس کے نزدیک انسان ایک مکمل وجود ہے جس کو الگ الگ اکائیوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، اس لیے یہ کافی نہیں ہے کہ اس کی تربیت اور اس کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کے نشو و نما کے لیے اسے بس کچھ رسوم سکھا دی جائیں، اور وہ خاص خاص دنوں اور موقعوں پر ان رسوم کو ادا کر لیا کرے ــــ جو انسان عبادت خانے میں رسومِ عبادت سے متاثر ہوتا ہے، وہی انسان بازاروں، دکانوں، شادی کی تقریبات اور غمی کی محفلوں اور سفر و حضر کے ہر معمول نیز اجتماعی و تمدنی زندگی کے ہر ہر موڑ پر اپنے اعمال و تصرفات سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی تربیت کے لیے ان تمام ہی گوشوں میں پیش آنے والے حالات و معمولات کے

بارے میں اس کی رہبری کی جائے اور اسی لیے اسلام زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں واضح اور فطری و ربانی طور طریقوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام کے اس پورے نظام عقائد و اعمال میں فرق مراتب قائم ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ انسانی وجود جن مختلف اعضاء اور عنصر حیات سے مرکب مجموعہ کا نام ہے ان میں کچھ اعضاء ایسے ہیں جن میں سے ایک بھی اگر نکال لیا جائے تو انسان کا وجود باقی نہیں رہ سکتا، اور کچھ ایسے ہیں جن کے نہ رہنے سے انسانی وجود ناقص ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ختم نہیں ہوتا، اور کچھ میں کسی عیب کے آجانے سے صرف بدنمائی پیدا ہوتی ہے ——— جہاں تک عنصر حیات کا تعلق ہے تو وہ اتنا اہم جزو ہے کہ اگر سب ظاہری و اندرونی اعضاء صحیح و سالم بھی ہوں اور عنصر حیات نہ ہو تو ظاہر ہے کہ زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہے گی ——— اور پھر اس جسم میں جس میں ظاہری طور پر کوئی کمی نظر نہیں آتی، محض روح کے نہ ہونے کی وجہ سے ایسا تعفن پیدا ہوگا کہ پورا ماحول سخت اذیت میں مبتلا ہو جائے گا ——— بالکل اسی طرح اسلام عقائد و اعمال سے مرکب جس ڈھانچے کا نام ہے، اس کے اجزاء ترکیبی میں بھی یہی حقیقت کارفرما ہے ——— عملی زندگی سے تعلق رکھنے والی اس کی بعض تعلیمات اعضاء رئیسہ کی مانند ایسی ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو زندگی سے خارج کر دینے سے پورا ڈھانچہ ہی بے جان اور کالعدم ہو جاتا ہے۔ اور بعض تعلیمات ایسی ہیں جن سے اس ڈھانچہ میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جہاں تک اس کے بنیادی عقائد کا سوال ہے تو وہ بالکل روح اور عنصر حیات کی مانند ہیں، اگر ان میں سے کوئی ایک مفقود ہے۔ تو وہ ڈھانچہ دیکھنے میں خواہ بالکل صحیح و سالم ہو، لیکن وہ فی الحقیقت مردہ اور بے جان لاشہ ہوگا، اور اس کی کوئی قیمت نہیں ہوگی۔

قرآن مجید میں عقائد کی اس اہمیت کو مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے ——— ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنثُورًا	(ایمان سے خالی لوگوں کے نیک اعمال کی طرف ہم متوجہ ہوں گے اور انھیں اڑتی ہوئی خاک کر دیں گے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَعْمَالُھُمْ کَسَرَابٍ بِقِیْعَۃٍ یَّحْسَبُہُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰی اِذَا جَآءَہٗ لَمْ یَجِدْہُ شَیْئًا	جو لوگ کافر ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے جنگل میں چمکتی ہوئی ریت ہو، جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے، مگر جب اس کے پاس آتا ہے تو اس کو وہاں کچھ نہیں ملتا۔

. . . .

بہر حال یہ بات مسلمہ حقائق میں سے ہے کہ بڑے سے بڑا عمل اس وقت تک اللہ کے یہاں کوئی قیمت نہیں رکھتا جب تک کہ اس کے پیچھے جو جذبہ اور داعیہ ہو وہ بھی صحیح ہو، اور صحیح عقائد سے پیدا ہونے والی روح اس کے اندر سرایت کیے ہوئے ہو۔

عقائد تو اسلام میں کئی ہیں، لیکن یہاں ہم دو عقیدوں کا ذکر کریں گے۔ جن کو اسلام نے اپنے کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں رکھا ہے۔ توحید، اور رسالت۔

توحید دراصل حقیقت کا نام ہے کہ صرف خدا کی ہستی کو الٰہ مانا جائے، اسی کی عبادت کی جائے، اسی سے امید رکھی جائے، اسی سے ڈرا جائے، اسی سے دعائیں کی جائیں، اس کا یقین کیا جائے کہ تکوینی و تشریعی حکومت صرف اسی کو حاصل ہے (الا لہ الخلق والامر) اسی لیے کہ وہی رب ہے، وہی فاعل و مؤثر حقیقی ہے۔ ہر چھوٹا بڑا معاملہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی مرئی یا غیر مرئی طاقت اس کے ساتھ شریک نہیں،

اور رسالت اس حقیقت کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں ہی میں سے کچھ افراد کو منتخب فرما کر انھیں اس کا مکلف کیا جائے کہ وہ انسانوں کی تربیت اور سعادت کے لیے اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ طرز زندگی وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے اخذ کرکے اس کے بندوں تک پہنچائیں۔ اور اس طرز زندگی کو عام اور قائم کرنے کے لیے ہر ممکن جد و جہد کریں۔ نبوت و رسالت سے بڑھ کر نوع انسانی کی رسائی کسی اور مقام تک نہیں، نبی و رسول معصوم ہوتا ہے۔ واجب الاطاعت ہوتا ہے۔ اللہ کی رضا و محبت اس کی اطاعت کے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس بزرگی مرتبہ کے باوجود وہ بندہ ہوتا ہے، اللہ کی الوہیت یا ربوبیت میں اس کی کوئی شرکت نہیں ہوتی۔

انسانیت کی تاریخ میں آخری مرتبہ۔ اور بعض پہلوؤں سے سب سے زیادہ مکمل طور پر یہ مرتبۂ بلند محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں آیا۔ آپ کے بعد نبوت و رسالت بھی ختم ہوئی، اور اس کے لوازم بھی ختم ہوئے ـــــ اب نہ کوئی فرد معصوم ہوگا۔ نہ اس کے پاس وحی آئے گی۔ قیامت تک کا زمانہ آپ ہی کی نبوت کا زمانہ قرار پایا۔

توحید اور رسالت یہ دو عقیدے منجملہ ان عقائد کے ہیں، جن پر ان کے صحیح مفہوم کے مطابق یقین کے بغیر کوئی شخص خواہ کتنا ہی نیک سیرت ہو اسلام کے دائرے کے اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص اگر شراب نہیں پیتا، جوا نہیں کھیلتا، نہ ان مخرب اخلاق برائیوں کو معاشرہ میں پھیلنے دینے کا روادار ہے ـــــ بلکہ اگر اسے کسی علاقے میں اقتدار حاصل ہو جائے تو وہ ان برائیوں سے معاشرہ کی تطہیر پر اپنا پورا زور صرف کر دے تو اس کے اس عمل کو سراہا جائے یہ تو ممکن ہے، لیکن اگر وہ اسلام کے عقائد کو صحیح طور پر قبول نہیں کرتا ہے بلکہ بس پردہ ہی سہی ان سے متصادم عقائد کی تبلیغ و تشہیر کی کوشش کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ کوئی باہوش آدمی اسے مسلمان اور اسلامی انقلاب کا علمبردار کے خطابات نہیں دینے لگے گا۔

ممکن ہے کہ بہت سے قارئین کو یہ سمجھنے میں مشکل پیش آ رہی ہو کہ ہماری اب تک کی ان معروضات کا زیر بحث موضوع ایرانی انقلاب اور اس کے قائدین کی اسلامیت سے کیا تعلق ہے، امید ہے کہ ہماری آئندہ گذارشات اس امر کی وضاحت کے لیے کافی ہوں گی۔

ہمارے محترم مکتوب نگار صاحب نے والد ماجد مدظلہٗ کے مضمون میں بھی پڑھا ہوگا۔ اور اسکے علاوہ انکے علم میں بھی ہوگا کہ خمینی صاحب اثنا عشری مذہب کے بنیادی عقیدہ "امامت" کے قائل ہی نہیں داعی بھی ہیں ـــــ امامت اور ائمہ کے بارے میں خمینی صاحب کا جو عقیدہ خود ان کی صریح تحریروں سے معلوم ہوتا ہے، وہ توحید و رسالت کی بنیادوں کو بالکل منہدم کر دیتا ہے ـــــ اور کہا جا سکتا ہے کہ امامت اثنا عشری مذہب میں، جس کے

عصر حاضر میں سب سے بڑے داعی خمینی صاحب ہیں۔ وہ حقیقت ہے جس میں الوہیت و ربوبیت، نبوت و رسالت اور خلافت تینوں حقیقتیں ضم ہو جاتی ہیں۔ یعنی امام خدا کی طرح تشریعی و تکوینی حاکمیت کا مالک بھی ہوتا ہے۔ نبی و رسول کی طرح معصوم، صاحب وحی اور واجب الاطاعت بھی ہوتا ہے، اور خلیفہ کی طرح صاحب امر بھی ہوتا ہے۔ اس لیے یقین کے ساتھ یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے عقائد توحید و رسالت اور خمینی صاحب اور اثنا عشریت کا عقیدۂ امامت یہ دو ایسے متضاد عقیدے ہیں جن کو ایک ساتھ جمع کرنا اسی طرح ناممکن ہے جیسا کہ عقیدۂ تثلیث اور توحید کا بیک وقت قائل ہونا۔

ہم بے تکلف عرض کرتے ہیں کہ ہم خود اب تک یہ سمجھتے تھے کہ امامت دراصل خلافت راشدہ کے متوازی ایک منصب کا نام ہے لیکن اس دوران خمینی صاحب اور ان کے پیشرو اثنا عشری علماء کی تصنیفات کے مطالعہ سے یہ حقیقت اس طرح واشگاف ہو کر سامنے آئی کہ اس میں شک یا تردد کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ مسئلہ صرف خلافت کا نہیں۔ الوہیت اور نبوت کا بھی ہے ——— امامت کے بارے میں خمینی صاحب اور اثنا عشری مذہب کے یہ خیالات حضرت والد ماجد مدظلہ کی تازہ تصنیف میں بڑی وضاحت کے ساتھ آ گئے ہیں ——— تاہم اپنے محترم مکتوب نگار صاحب کے مطالعہ کے لیے خمینی صاحب کی چند تحریریں ہم یہاں بھی پیش کر دینے میں حرج نہیں سمجھتے۔

اپنی کتاب الحکومۃ الاسلامیہ (ص ۵۲) میں ایک مقام پر خمینی صاحب نے لکھا ہے "فإن للامام مقاما محمودا ودرجة سامية وخلافة تكوينية تخضع لولايتها وسيطرتها جميع ذرات هذا الكون" (امام کو مقام محمود، رتبہ بلند اور وہ تکوینی خلافت حاصل ہوتی ہے جس کا قتدار و اختیار اس کائنات کے ذرے ذرے پر محیط ہوتا ہے۔)

اسی کتاب کے ص ۱۱۳ پر انھوں نے لکھا ہے "إن تعاليم الائمة كتعاليم القرآن يجب تنفيذها واتباعها" (ائمہ کی تعلیمات قرآن کی تعلیمات کی طرح واجب الاتباع اور واجب التنفیذ ہوتی ہیں۔)

اسی کتاب میں انھوں نے ایک جگہ فرمایا ہے: "وإن من ضروريات مذهبنا أن لائمتنا مقاما لا يبلغه ملك مقرب ولا نبي مرسل" (ہمارے مذہب کے بنیادی عقائد میں سے یہ بھی ہے کہ ہمارے ائمہ کو وہ مقام حاصل ہے جس تک رسائی نہ کسی مقرب فرشتے کو میسر ہے نہ کسی نبی و رسول کو) (ص۵۲)

خمینی صاحب تو اس زمانے کے مصنف ہیں، اور ایک ایسے انقلاب کے قائد ہیں جس کی مصلحت کا تقاضا ہے کہ پوری دنیائے اسلام اس کی ہمنوا ہو، جب انھوں نے اس بارے میں اتنی صراحت سے اظہار خیال کیا ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اثنا عشری قدیم علماء نے اپنی تصنیفات میں اس بارے میں کن الفاظ میں اظہار خیال کیا ہو گا۔ واقعہ یہ ہے کہ امامت کے بارے میں خمینی صاحب کے پیشرو علماء کی ان تصنیفات کے مطالعہ ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ امامت اور ائمہ کے بارے میں اثنا عشری مذہب کے عقائد کیا ہیں۔

خارجی و تاریخی شواہد کے علاوہ خود اصول مذہب کے اندرونی تجزیہ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس مذہب کے بانیوں کے پیش نظر امت مسلمہ میں ایک عمومی ذہنی، فکری عقائدی اور سیاسی انتشار (ANARCHY) پھیلا کر اس کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا اور اس کی قوتوں کو اندرونی جھگڑوں ہی میں ضائع کر کے دعوت اسلام کی پیش قدمی کو روکنا تھا ____ اور امت مسلمہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے انھوں نے اس کے ان تینوں بنیادی مراکز توحید، رسالت، خلافت ہی پر تیشۂ تحریف چلانا ضروری سمجھا، کیونکہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جب تک کوئی شخص ان تینوں کو صحیح طور پر سمجھ کر ان سے اپنے کو وابستہ رکھتا ہے، اس کے عقیدہ میں انحراف پیدا کرنے کی اور اس کے رخ کو موڑنے اور اس کا قبلہ تبدیل کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی جبکہ ان کے پیش نظر جو مقاصد تھے ان کے لیے یہ تینوں باتیں ضروری تھیں ____ کسی بھی غلط عقیدہ کو قبول کرنے سے اس وقت کے ایک عام مسلمان کو یہی تین مراکز اطاعت روک سکتے تھے ____ اور آج بھی ان تینوں کی یہ حیثیت قائم ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ باور کر لے کہ یہ حضرات (ائمہ ؒ) تینوں ہی

اختیارات (AUTHORITIES) کے جامع ہیں تو اسے ان کی طرف منسوب کسی بھی بات کو قبول کرنے سے روکنے والی کوئی شے باقی نہیں رہتی۔

اس موقع پر یہ راقم سطور اپنے اکابر و اساتذہ حضرات اہل علم کی خدمت میں یہ گذارش پیش کرنا مناسب سمجھتا ہے کہ عقیدۂ امامت پر اس پہلو سے وہ از سر نو غور فرمائیں اور توحید و رسالت اور ختم نبوت جیسے عقیدوں سے سو فیصد متعارض اور دین میں تمام تحریفات کی راہ ہموار کرنے والے ایک عقیدہ کی حیثیت سے اور اسلام کی بیشتر دینی و عقائدی بنیادوں کو منہدم کرنے والے ایک کلی و اساسی نظریہ کی حیثیت سے جس کی روح پورے نظام دین و شریعت میں سرایت کیے ہوئے ہے اس عقیدہ کے علمبرداروں کے اسلام سے تعلق کی نوعیت کی تعیین فرمائیں ـــــ امید ہے کہ ایرانی انقلاب کے نتیجہ میں جو توجہ شیعیت کے مطالعہ کی جانب ہوئی ہے اس کے بعد ہمارے حضرات اہل علم پہلے سے زیادہ وضاحت و صراحت کے ساتھ اس بارے میں رائے قائم اور ظاہر کر سکیں گے۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک أمراً

اب ہم زیر بحث موضوع کی طرف واپس آتے ہوئے محترم مکتوب نگار صاحب اور غلط فہمی کا شکار دوسرے حضرات کی خدمت میں اپنا مدعا مختصر الفاظ میں یوں عرض کرتے ہیں کہ:

ہم جانتے ہیں کہ ایران کی انقلابی قیادت نے شراب خانے، جوئے خانے، اور قحبہ خانے بند کر دیے ہیں۔ اور اس کے علاوہ بعض دوسرے سماجی شعبوں میں جو "اصلاحات" وہاں کی گئی ہیں ہم ان سے بھی واقف ہیں، جو فداکارانہ جذبہ اور جوشِ عمل ایرانی قوم کے نوجوانوں کے دل و دماغ سے ابل رہا ہے، نہ وہ ہم پر مخفی ہے اور نہ ہم اس کے منکر ہیں۔ لیکن ہم جب ان کے اور ان کے پیشرووں کے عقائد پر نظر ڈالتے ہیں تو جو کچھ وہاں ہم کو نظر آتا ہے ہم اسے وہ اسلام قرار نہیں دے سکتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے اور جو قرآن و حدیث میں محفوظ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیح شیخ، بتکدہ میں برہمن کی پختہ زناری، اور اہل حرم

کی حرم سے جفائے وفا نما کا مشاہدہ ہر وقت ہمارے احساس کو چٹکیاں لیتا رہتا ہے؛ اور ہم عالم عرب کے بارے میں شاعرِ اسلام کے اس تجزیہ کو آج بھی بالکل مطابق واقعہ سمجھتے ہیں کہ ؎

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

لیکن ہم اس فکری بے توازنی اور عقلی بے اعتدالی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ عالم عرب کی بظاہر اس مایوس کن صورت حال کے منفی ردعمل کے نتیجہ میں جو شخص بھی اس خلا کو پر کرنے کا نعرہ لگائے، ہم اس کے حدود اربعہ کے جائزے، اس کے عقائد اور حقیقی ارادوں کی تحقیق کیے بغیر اس کے پیچھے لپک پڑیں ——— اور اسے "امیر المومنین" تسلیم کرکے اس کے ہاتھ پر بیعت کرلیں۔ اور پھر جب اس کی اصل حقیقت ظاہر ہو تو شتر مرغ کی طرح سر چھپاتے پھریں ——— امت میں ایسی مثالوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ ماضی قریب میں شاید اس کی سب سے زیادہ واضح مثال ترکی کے کمال اتاترک کی ہے۔ اور عنقریب ان کی جگہ آیۃ اللہ روح اللہ خمینی صاحب کا نام لکھا جانے والا ہے۔ اسی طرح ہم اس عقلی پستی و علمی گمراہی سے بھی اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ محض ضبط و نظام کو اور قربانی و سرفروشی کو معیار حق مان کر عقائد کو "ایک جزوی شئے قرار دے دیں؛ اور ان پر غور کیے بغیر کسی گروہ، اور کسی دعوت و تحریک کی مثالی اسلامیت کا فیصلہ کردیں ——— تاریخ اسلام میں ایسی کئی تحریکوں کی تفصیلات محفوظ ہیں جو بالاتفاق اسلام کے راستہ سے ہٹی ہوئی تھیں اور جنھوں نے اسلامی نظام، اس کی مرکزیت دین و دعوت اور نظام خلافت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور جن کے مضحکہ خیز مذہبی عقائد، اور طفلانہ استدلالات آج بھی دعوت قہقہہ دیتے ہیں؛ لیکن؛ ان کا حیرت انگیز ضبط و نظم اور اجتماعی جذبۂ قربانی بڑے سے بڑے مخالف کو انگشت بدنداں کردیتا ہے۔

ماضی بعید میں دیکھا جائے تو ایسی سب سے پہلی تحریک "خارجیت" کی ملتی ہے۔

خوارج کی عسکریت، تنظیم، فوجی اسپرٹ، والہانہ جوش جہاد، مذہبی وارفتگی، شہادت سے ان کا سچا عشق، ان کے نوجوانوں کی بے داغ سیرت، پاکبازی آج بھی دنیا سے داد طلب ہے ——— ان اوصاف کے علاوہ وہ اپنی انفرادی زندگی میں عبادت و تقوے کے لحاظ سے بھی بے مثال تھے۔ اور ایران کے "پاسداران انقلاب" ان سے اس پہلو سے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔

اس موقع پر مناسب ہو گا اگر ہم ان کے ایک سردار ابو حمزہ خارجی کی ایک تقریر نقل کر دیں جس میں اس نے اپنے رفقا کی تصویر کشی کی ہے ——— وہ کہتا ہے:

"وہ نوجوان ہیں مگر بخدا اپنی جوانی میں بوڑھوں کو شرمانے والے، برائی سے ان کی نظر ہی نیچی، باطل کے راستے پر ان کے پاؤں بھاری، عبادت کے مارے اور راتوں کے تھکے ہارے، رات کو جب اللہ نے ان کو دیکھا تو اس حال میں دیکھا کہ ان کی پیٹھیں قرآن کے پاروں پر جھکی ہوئی ہیں، جب جنت کا ذکر دیکھتے ہیں تو شوق کے مارے رونے لگتے ہیں اور جب جہنم کا تذکرہ پڑھتے ہیں تو بے اختیار ان کے منھ سے چیخ نکل جاتی ہے جیسے کہ وہ جہنم کی آواز اپنے کانوں سے سن رہے ہیں۔ دن کی تھکن رات کی تھکن سے مل جاتی ہے۔ زمین ان کے گھٹنوں، ہاتھوں اور ناکوں کو کھا گئی ہے (سجدہ سے یہ اعضا گھس گئے ہیں) اور اس کے باوجود بھی وہ اللہ سے شرماتے ہیں۔ پھر جب میدان جنگ میں تیر کمانوں میں جوڑ دیے گئے، نیزے ان کی طرف بڑھے اور تلواریں نیام سے نکل آئیں اور فوج موت کی بجلیاں بن کر چمکی اور ہلاکت کا بادل بن کر گرجی تو انھوں نے ان دھمکیوں کو اللہ کی وعید کے سامنے کھیل سمجھا۔ مجاہد نوجوان موت کا استقبال کرنے کے لیے اس طرح لپکا کہ اس کے پاؤں گھوڑے کی گردن پر تھے، اس کے خوبصورت چہرے پر خون کا نقاب پڑ گیا۔ زمین کے درندے اور آسمان کے پرندے اس پر ٹوٹے، جو آنکھیں کل تک

خشیت الٰہی سے اشکبار تھیں، آج ان کی پتلیوں میں چڑیوں کی چونچ ہے۔ اور جو ہتھیلی رات کو عابد کے جسم کو سہارا دے رہی تھی آج کلائی سے اکھڑ گئی ہے "۔

لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ان کے ان اوصاف کے باوجود، ان سے سخت گمراہ کن عقائد کی وجہ سے امت کے فقیہوں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت یافتہ جماعت صحابہ نے جن میں امیر المومنین حضرت علی اور حبر امت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم بھی تھے ان سے جہاد کیا اور نہایت سختی سے ان کی تحریک کو پھیلنے سے روکا۔ ——— شاید اللہ تعالیٰ نے عقائد کی اہمیت ہم بعد میں آنے والوں کو سمجھانے ہی کے لیے ان بلند اوصاف مگر گمراہ کن عقائد والی تحریک کو قائم اور برپا ہونے کا تکوینی و تقدیری طور پر موقع دیا تھا۔ ذالک تقدیر العزیز العلیم

اسلام میں عقائد کی اہمیت کتنی ہے، اس کو واضح کرنے کے لیے جو چند اور پہلو راقم الحروف کے ناقص ذہن میں تھے ابھی انہی کو بیان نہ کر پایا تھا کہ صفحات کی گنجائش ختم ہو گئی۔ ——— جہاں تک محترم مکتوب نگار کے دوسرے اشکالات کا تعلق ہے تو اولاً تو ان کے جواب کی اس وضاحت کے بعد ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، تاہم مختصراً ان کے متعلق بھی چند کلمات عرض کر کے آج کی گفتگو کو ختم کیا جاتا ہے۔

۱۔ مکتوب نگار صاحب نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ شاید صرف اس وجہ سے ایرانی انقلاب کی مخالفت کی جا رہی ہے کہ فلاں جماعت اسے مسلمانوں کے لیے نیک فال سمجھتی ہے ——— جواباً عرض ہے کہ نہیں! الحمد للہ کہ حاشیۂ خیال میں بھی یہ داعیہ موجود نہیں ہے۔ دین کو تحریف سے اور امت کو گمراہی سے بچانے کے سوا اور کوئی جذبہ اس کا محرک نہیں ہے۔ ——— واللہ علی ما نقول وکیل۔

۲۔ مکتوب نگار صاحب کے اس سوال کے جواب میں کہ "خمینی صاحب کے عقائد کے

لہ ابو حمزہ خارجی کی یہ تقریر الجیب اور تاریخ کے مصادر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر احمد امین نے بھی اپنی معروف کتاب فجر الاسلام میں اسے نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو صفحہ ۲۶۲

متعلق لکھے گئے مضمون میں عراق کے صدام حسین کے عقائد سے کیوں بحث نہیں کی گئی؟
——— یہ عرض ہے کہ دنیا میں کوئی باہوش آدمی عراقی حکومت کو خلافت راشدہ کے بعد واحد اسلامی حکومت سمجھنے والا موجود نہیں ہے۔ نہ ان کو خود اس کا دعویٰ ہے۔ نہ اس کا کوئی خطرہ ہے کہ غلبۂ اسلام کی تمنا سے سرشار مسلمان عوام اور نوجوان عراق کی قومی بعثی حکومت کو اسلامی حکومت باور کر لیں گے، اور ان کے عقائد و افکار کو قبول کر کے دوہری گمراہی میں مبتلا ہو جائیں گے۔
اس کے برعکس خمینی صاحب نے نہ صرف اپنے اوپر اسلامیت کا مقدس غلاف چڑھایا بلکہ پوری دنیائے اسلام کو اپنے پیچھے چلنے کی دعوت دی ہے، اس لیے ضرورت ہوئی کہ ان کے عقائد کا تجزیہ کیا جائے ——— ورنہ الحمدللہ کہ ہمارا تعلق اس حلقہ سے ہے جو عرب قومیت اور بعثیت کو الحاد کا نقطۂ آغاز سمجھتا ہے اور جس نے ان بتوں کو توڑنے میں۔ اللہ کی توفیق سے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔
۳۔ مکتوب نگار صاحب نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ ہندوستان میں آپ نے گاندھی جی کے مشرکانہ عقائد سے کیوں بحث نہیں کی تھی...... ؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سوال کا کیا جواب دیا جائے۔ گاندھی ہندوستان کی آزادی کی تحریک چلا رہے تھے۔ کچھ حضرات کا خیال تھا کہ اس تحریک میں ان کے ساتھ تعاون کر کے برطانوی استعمار سے استقلال کے مشترکہ مقصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ اور کچھ حضرات ان کے ساتھ شرکت و تعاون کو آئندہ کے لیے مضر اور اصولی طور پر غلط سمجھتے تھے۔ اس صورت حال میں اس کی کیا ضرورت مکتوب نگار صاحب کو نظر آئی کہ گاندھی کے ذاتی عقائد سے بحث کی جاتی ؟ جبکہ دنیا جانتی تھی کہ وہ ہندو مذہب کے پیرو ہیں ——— خمینی صاحب اور گاندھی جی میں کیا قدر مشترک ہے ؟ یہ بھی ہم سمجھنے سے قاصر رہے۔
۴۔ جہاں تک مکتوب نگار صاحب کے اس خیال کا تعلق ہے کہ ایرانی انقلاب سے شیعیت کو فروغ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ سو اس کی بابت عرض یہ ہے، کہ واقعہ اس کے بالکل برخلاف ہے ——— نیوزی لینڈ سے آئے ہوئے اس خط میں جس کا

اقتباس ہم نے اسی مضمون کے شروع میں نقل کیا ہے، آپ پڑھ چکے کہ وہاں کے مسلمان نوجوان شیعیت تیزی سے قبول کر رہے ہیں۔ اسی قسم کی اطلاعات ہمارے پاس متعدد دوسرے ملکوں سے بھی آئی ہیں ___ خلیجی ممالک کا بھی یہی حال ہے۔ اور دوسرے عرب ملکوں میں بھی یہی صورت حال ہے ___

اللہ تعالیٰ حق کو عام اور غالب فرمائے، اور اپنے کمزور بندوں کی ان کوششوں کو سبب کے طور پر قبول فرمالے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کے لیے دعائے صحت کی گذارش

ہمارے بیشتر قارئین ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب سے واقف ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف حضرت والد ماجد مدظلہ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے قریبی اہل تعلق محبت میں سے ہیں اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے مسائل کے لیے فکرمندی و اضطراب اور بے لوث خدمت کی توفیق بھی اللہ نے ڈاکٹر صاحب کو خوب دی ہے ___ ادھر کچھ عرصہ سے ڈاکٹر صاحب مسلسل علیل ہیں، آجکل بغرض علاج ہی بمبئی میں مقیم ہیں ___ الفرقان کے محترم ناظرین سے گذارش ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے لیے صحت و عافیت کی دعاؤں کا اہتمام فرمائیں۔

چند ضروری گذارشات

- ہر قسم کی مراسلت کرتے وقت اپنا مکمل پتہ صاف صاف اردو کے ساتھ انگریزی میں بھی لکھیں۔
- جواب طلب امور کے لیے ہمیشہ جوابی کارڈ ہی ارسال فرمائیں۔
- اگر آپ الفرقان کے قدیم خریدار ہیں تو اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔ ورنہ صراحت فرمائیں کہ آپ جدید اجراء چاہتے ہیں۔
- منی آرڈر کوپن پر اپنا مکمل پتہ اور خریداری نمبر لکھنا ضروری ہے۔
- پاکستانی حضرات اپنا پتہ انگریزی میں بھی لکھیں تاکہ اسپیلنگ کی غلطی کی وجہ سے رسالہ گم ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔
- اب ہم اندرون ملک کے خریداروں کو ان کی مدت خریداری کے آخری شمارے کے ساتھ ایک منی آرڈر فارم بھیجتے ہیں۔ یہ فارم ملتے ہی آپ اپنا چندہ اسی فارم کے ذریعہ روانہ فرمائیں ___ منیجر

تاریخ اسلام میں شیعیت و باطنیت کا منفی کردار

از مولانا شمس تبریز خاں (رفیق مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ)

تشیع پر کسی بھی زاویے سے نظر ڈالیے تو وہ اسلام کے بالمقابل اور متوازی (PARALLEL) ایک مستقل مذہب و تہذیب محسوس ہوتا ہے اور اس کا مقصد ہر چھوٹے بڑے مسئلے میں جمہور امت اور راہِ سنت سے علاحدگی و انحراف معلوم ہوتا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان عقائد اور علم و عمل کے لحاظ سے اختلاف کی خلیج اتنی وسیع و عمیق ہے جس کو اصولی و بنیادی تبدیلیوں کے بغیر پاٹا نہیں جاسکتا۔

عقائد و مقاصد کے گہرے اختلافات ہی کی وجہ سے اسلام اور تشیع حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دور سے اب تک ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ اور یہ معرکہ آرائی و صف بندی اسلام کو مکمل طور پر اپنائے بغیر نہیں ختم ہو سکتی۔ سنی مورخین تشیع کا سلسلہ عبد اللہ بن سبا سے ملاتے ہیں جس کا آسانی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مگر تشیع کے مزاج و منہاج کو دیکھتے ہوئے اس کا سلسلۂ نسب نفاق و منافقین سے قائم کیا جاسکتا ہے، کیونکہ جس طرح نفاق کی بہت سی شکلیں ہیں، اسی طرح شیعیت و باطنیت کے بھی بہت سے چہرے اور صورتیں ہیں۔

شیعیت و باطنیت کے گوناگوں اصول و مقاصد

تاریخ اسلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں

کے اکثر فرقوں کے اصول و مقاصد اسلام دشمنی پر مبنی ہیں اور انھوں نے تاریخ میں
جمہور امت سے نہ صرف علاحدگی بلکہ اُن کی بیخ کنی، ان کے خلاف سازش، اور
ان کے دشمنوں سے دوستی کا عمل جاری رکھا ہے، اور اس مقصد کے لیے انھوں نے تمام
امکانی ذرائع اپنائے ہیں۔ تقیہ اور اخفاء و رازداری چونکہ ان کے اصول دین میں ہے
اس لیے اپنے عقائد و مقاصد کی کبھی کھل کر وضاحت نہیں کی جس کی وجہ سے اہلسنت
ان کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکے اور جس کے نتیجے میں وہ شجر ملت کو گھن کی طرح
کھوکھلا کرتے رہے اور کاروانِ امت کی پیشقدمیوں کی راہ میں برابر رکاوٹ بنے
رہے۔ انھی منافقین کے لیے (جو اپنے عمل سے امت کو کمزور کرتے رہتے ہیں، اور گھر
کے بھیدی بن کر بدخواہی کا رویہ اپناتے ہیں) اور مسلمانوں کی صفوں میں رہ کر ان میں
انتشار پیدا کرتے رہتے ہیں، قرآن کہتا ہے:

لَوْ خَرَجُوا فِيكُم مَّا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ ۝ (التوبۃ: ۴۷)

اگر وہ تمھارے ساتھ نکلتے تو تم میں فساد ہی کا اضافہ کرتے اور تمھارے درمیان دوڑے پھرتے تمھارے لیے فتنے کے ارادے سے۔

وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَن يَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ مَغْرَمًا وَيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَائِرَ ۚ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (التوبۃ: ۹۸)

اور دیہاتیوں میں بعض وہ ہیں کہ جو وہ خرچ کرتے ہیں اسے جرمانہ سمجھتے ہیں اور تم لوگوں کے لیے گردش زمانہ کے منتظر رہتے ہیں، بُرا وقت تو انھیں پر پڑنے والا ہے، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

شیعیت یا باطنیت کے مقاصد کبھی واضح اور متعین نہیں رہے لیکن اسلام دشمنی اور مسلم
کشی اس کے تمام فرقوں میں قدر مشترک کے طور پر قائم رہی اور اپنے تاریخی سفر میں اس نے
ہر اس عقیدے اور عمل کو اپنا لیا جو جمہور امت اور مسلک اہل سنت کے خلاف پڑتا

تھا یا اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا تھا۔ جنگ جمل و جنگ صفین میں اسی جماعت نے مسلمانوں کے دو گروہوں کو لڑایا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاتی اور انھیں خانہ جنگی پر اکساتی رہی۔

اس مقصد کے لیے انھوں نے حب علیؓ و محبت اہل بیت کا دعویٰ کیا مگر ان کے دلوں میں دراصل بغض صحابہؓ اور اہل سنت کی مخالفت و عداوت کا جذبہ موجزن تھا۔ انھوں نے "اہل بیت" کے مفہوم کو محدود کر کے ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر صاحبزادیوں اور ازواج مطہراتؓ کو خارج قرار دیا، اور بجائے ان کی پیروی کے ان کا نام اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ اور "خلافت" کی جگہ "امامت" کی اصطلاح اپنائی اور تبرّا کو اپنا اصول بنایا۔ اس کے لیے انھوں نے دوسرا بڑا حربہ "باطنیت" کا اپنایا جس کے تحت اسلام کے معنی و مفہوم اور مقصد و نصب العین کو برباد کرنے کا ایک سوچا سمجھا، دوررس اور دیرپا منصوبہ تیار کیا گیا اور کہا جانے لگا کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک باطنی مفہوم ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا، اور انسان باطنی ترقی کے ذریعے اس مقام تک جا پہنچتا ہے جہاں شریعت بے معنی ہو جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ اہل تشیع نے اپنے کو خواص مومنین اور دوسروں کو عوام و جمہور کے خانوں میں بانٹا اور دعویٰ کیا کہ قرآن کی تاویل اصل ہے جو ہمارے حصے میں آئی ہے اور قرآن کا متن و تنزیل عوام کے ہاتھ میں ہے۔

اسماعیلی داعی حکیم ناصر خسرو (۳۹۴-۴۸۱ھ) کہتا ہے ~

از بہر پیمبر کہ بدیں صنع ورا گفت

تاویل بہ دانا دہ و تنزیل بہ غوغا[1]

بہر حال باطنیت کا مقصد علم و عمل کے ہر محاذ پر جمہور سے اختلاف اور مخالفت تھی، تاویل کا دروازہ کھول کر اس نے اسلامی عقائد و نظام حیات اور اقدار کو تہ و بالا کرنے کی سعی کی اور خوب کو ناخوب، اور حرام کو حلال کر دکھایا، اسلامی فکر میں عقلیت و اعتزال

---

[1] سفرنامہ ناصر خسرو ص ۹۴ (دہلی ۱۹۴۱ء)

یونانیت و عجمیت کی ہمت افزائی کی اور وحی الٰہی کی جگہ عقل اور اقوال اکابر کو اہمیت دی اس طرح دین کے سیدھے راستے کو چھوڑ کر چند مفروضات و روایات کے پیچھے چل پڑی اور قیامت تک کے لیے دین میں تحریف و انحراف کا دروازہ کھول دیا۔

سیاسی و معاشرتی محاذ پر باطنیت نے اسلام کو برابر اور ناقابل معافی و تلافی نقصان پہنچایا، ابتدائے اسلام میں عباسیوں کی حمایت کے پردے میں عجمیت اور شعوبیت نے عربیت کو شکست دی جو اسلامیت کا دوسرا نام تھی، پھر خلافت عباسیہ کے خلاف بغاوت کی ہمت افزائی کرتی رہی جس کے نتیجے میں متعدد شیعی حکومتیں قائم ہو گئیں جو خلافت عثمانیہ کے لیے دردِ سر بنی رہیں اور مسلمانوں کے متحدہ محاذ کو سبوتاژ کرتی رہیں۔ اس طرح ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ ایران کا آریائی مزاج اور عجمی عصبیت، اسلام اور اس کی سیاسی طاقتوں سے برابر برسرِ پیکار رہی اور اس نے دنیا کے سیاسی نقشے سے اسلامی اثرات کو محو کرنے کا شرمناک راستہ اپنایا، جس کے نتیجے میں پہلے خلافت عباسیہ، پھر خلافت عثمانیہ اور اخیر میں ہندستان کی سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

ہوا پرستی بجائے خدا پرستی

اسلام نام ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی کامل اطاعت و اتباع کا اس کے سوا جو راستے اپنائے جائیں گے وہ سب نفس کی اطاعت اور ہوا پرستی میں شمار ہوں گے خواہ اسے کسی خلیفہ و امام معصوم کی پیروی کا نام دیا جائے یا اسلام کی روح اور ایمان کی جان قرار دیا جائے، اور اپنی خواہش نفس کو عقل و حکمت، تقیہ و مصلحت، باطنیت و روحانیت، قرآن کے مغز و باطن کی پیروی اور اہل بیت کے اتباع کا نام دیا جائے۔ قرآن نے جگہ جگہ اس اتباع ہوا اور اپنے مزعومہ و مفروضہ راستے پر چلنے کو گمراہی سے تعبیر کیا ہے۔

ہوا پرستی نے اسلام کی تاریخ میں بہت سے بھیس بدلے اور بہروپ بھرے ہیں اور عوام کو فریب دینے اور اپنے محدود مفادات کے حصول کے لیے اسے تشیع و باطنیت، اور معقولیت پسندی اور باطن پرستی کا نام دیا ہے اور صد درجہ جسارت و ذہانت سے کام لے کر قرآن کی ایسی تاویلیں کی جس سے وہ ربانی ہدایت کے عالمی صحیفے کے بجائے اہلبیت کا قصیدہ اور

تبرا نامہ نظر آنے لگا اور اس کے پیغام کی اصلیت و حقیقت فوت اور اس کا مقصد و مفہوم خبط و مفقود ہو کر رہ گیا۔ مولانا سید ابو الحسن علی صاحب مدظلہ نے باطنیت و تشیع کے اس مہلک تاریخی حربے کی نشاندہی کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

"انھوں نے اپنی ذہانت سے اس نکتہ کو سمجھا کہ الفاظ و معانی کا یہ رشتہ امت کی پوری زندگی اور اسلام کے فکری و عملی نظام کی بنیاد ہے اور اسی سے اس کی وحدت اور اپنے سرچشمہ اور اپنے ماضی سے اس کا ربط قائم ہے۔ اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے اور دینی الفاظ و اصطلاحات کے مفہوم و معانی متعین نہ رہیں یا مشکوک ہو جائیں تو یہ امت ہر دعوت اور ہر فلسفہ کا شکار ہو سکتی ہے اور اس کے سنگین قلعہ میں سیکڑوں چور دروازے اور اس کی مضبوط دیواروں میں ہزاروں شگاف پیدا ہو سکتے ہیں۔ .... الفاظ شرعی کے متواتر و متوارث معنی و مفہوم کا انکار اور قرآن و حدیث کے ظاہر و باطن اور مغز و پوست کی تقسیم ایسا کامیاب حربہ تھا جس سے اسلام کے نظام اعتقاد و نظام فکر کے خلاف سازش کرنے والوں نے ہر زمانہ میں کام لیا، اسلام کی پوری عمارت کو اس طرح آسانی سے ڈائنا مائٹ کیا جا سکتا تھا اور اسلام کے ظاہری خول کے اندر ریاست اندر ون ریاست قائم کی جا سکتی تھی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کی صدیوں میں جن فرقوں نے اور منافقین کی جس جماعت نے نبوت محمدی کے خلاف بغاوت کرنی چاہی، اس نے باطنیت کے اسی حربے سے کام لیا، اور اس معنوی تواتر و توارث کا انکار کر کے پورے نظام اسلامی کو مشکوک و مجروح بنا دیا، اور اپنے لیے دینی سیادت بلکہ نئی نبوت کا دروازہ کھول لیا، ایران کی بہائیت اور ہندستان کی قادیانیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔"[1]

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت ۱/۱۲۵-۱۲۶

ایسے تمام باطل فرقوں کا شمار قرآن نے اہل اہواء میں کیا ہے جن کا اسلام سے کوئی علاقہ نہیں، قرآن کی ذیل کی دو آیتوں میں ایسے ہی گمراہ، نفاق پسند، نفس پرست اور تاویل باز دجلساز فرقوں کی نفسیات و کیفیات کی تصویر کشی کی گئی ہے اور ان کی گمراہی کا اعلان کیا گیا ہے:

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۔ (قصص ۵۰)

پھر اگر وہ آپ کی بات نہ مانیں تو سمجھ لیجیے کہ وہ اپنی خواہشوں کی اتباع کر رہے ہیں اور اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے جس نے اللہ کی ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہش کی اتباع کی ؟

دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا:

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشَاوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۔ (الجاثیہ: ۲۳)

کیا آپ نے اسے دیکھا جس نے اپنا معبود اپنی خواہش کو بنا لیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہ کر دیا اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی بصارت پر پردہ ڈال دیا، تو اب اللہ کے بعد اسے کون ہدایت دے گا؟ تو تم سمجھتے کیوں نہیں۔

کتاب و سنت سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اسلام اور ہوا پرستی و اتباع نفس دو متضاد چیزیں ہیں اور دونوں کا اجتماع محال ہے ؎

یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ!

اس حقیقت کو اس آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے:

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ

کیا وہ شخص جو اپنے رب کی ہدایت پر ہو اس کی طرح ہو سکتا ہے جس کے برے

عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿محمد ۱۴﴾

اعمال کو اس کے لیے اچھا دکھایا گیا ہے اور وہ اپنی خواہشوں کی اتباع کرتے ہیں؟

تمام اہل ادیان اور ان تمام فرقوں کو جو اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے کھلی کتاب وسنت کے معتبر ومعروف راستے سے ہٹے ہوئے اور ایک الگ دینی نظام اور فرقہ وارانہ علاحدگی پسندی کے مرتکب ہیں اور جمہور مسلمین کے مقابلے پر اپنی الگ راہ وروش قائم رکھے ہوئے ہیں اور اس طرح دین محمدی وسنتِ نبوی سے بغاوت کیے ہوئے ہیں یہ آیت ایک سخت وعید اور انذار نہائی کا حکم رکھتی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ ﴿الأنعام ۱۵۹﴾

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفریق پیدا کی اور گروہوں میں بٹ گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں، ان کا معاملہ خدا کے حوالے ہے پھر وہ ان کے کرتوتوں کے بارے میں بتادے گا۔

باطنیت وشیعیت کے تخریبی عزائم ومقاصد کی پیش بندی ودفاع کے لیے محدثین ومتکلمینِ اسلام نے شروع ہی سے اظہار حق کیا اور ان کے فاسد عقائد کی نشاندہی کی جیسے علم الرجال اور علم الکلام کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن امام عبدالقاہر بغدادی (م ۴۲۹ھ) نے اپنی بلند پایہ وبیش قیمت کتاب "الفرق بین الفرق" میں اسلامی فرقوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب "فضائح الباطنیہ" میں اسی کتاب کے بیانات کو نقل کیا ہے[1] پھر علامہ ابن الجوزیؒ (۵۱۰-۵۹۷ھ) نے اپنی تاریخ "المنتظم فی تاریخ الملوک والأمم" میں امام غزالیؒ کے بیان کو نقل کیا ہے۔

---

[1] امام غزالیؒ نے باطنیوں کی تردید میں جو کتابیں لکھیں ان میں سے پانچ کتابوں کے نام ملتے ہیں: حجة الحق، مفصل الخلاف، قاصم الباطنیة، فضائح الاباحیة، اور مواھم الباطنیة ملاحظہ ہو تاریخ دعوت وعزیمت ۱/۱۴۶

ہم یہاں ان کے بیان کا خلاصہ نقل کرتے ہیں، ابن الجوزی فرماتے ہیں :

"(اسماعیلیہ نے سوچا) کہ ہم عام مسلمانوں کے دین کو مٹانا چاہتے ہیں مگر انکی کثرت کے سبب یہ ممکن نہیں، اس لیے یہی طریقہ رہ جاتا ہے کہ دین کے اندر ہم ایک دعوت پیدا کریں اور ان کے کسی فرقے کی طرف منسوب ہو جائیں، اور ان میں رافضیوں کا فرقہ سب سے زیادہ ضعیف العقل ہے اس لیے ہم ان سے سادات کی مظلومیت، اور ان کے حقوق کی پامالی اور قتل وغیرہ کا ذکر کر کے اسلام کے مٹانے کا کام کریں، چنانچہ اسماعیلیہ و باطنیہ اس ناپاک مقصد کے لیے متحد ہو گئے اور اپنے کو اسماعیل بن جعفر بن محمد صادقؒ (م ۱۴۳ھ) کی طرف منسوب کیا۔ پھر شیطان کے سمجھانے پر انھوں نے مجوس اور فلاسفہ کے خیالات اپنا لیے اور اپنے پیرووں کے سامنے تحریف شدہ دین رکھا، مگر ان کا مقصد اسلام کا مطلق انکار تھا لیکن یہ ممکن نہ ہونے کے سبب اس کے لیے دوسرے ذرائع اختیار کیے"[1] (باقی)

[1] القرامطہ لابن الجوزی بتحقیق محمد الصباغ ص ۳۲-۳۴ (دمشق ۱۹۷۷ء)

گاہے گاہے باز خواں

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

مسلمانوں کی دینی حالت اور ہماری ذمہ داری

[یہ مضمون چالیس سال قبل جمادی الاولیٰ و جمادی الثانیہ ۱۳۶۶ھ کے شمارے میں شائع ہوا تھا، اب اسے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ ہمارے محترم قارئین اس کے پیغام کی قدر کریں گے۔ اور جس عملی جد و جہد کی دعوت اس میں دی گئی ہے سنجیدگی اور قربانی کے ساتھ اس میں لگیں گے ۔ ——— مدیر]

اگر آپ نے اپنی مسلمان قوم کی دینی حالت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اب تک کوئی کوشش نہیں کی ہے تو کم از کم ایک دن اس مقصد کے لیے ضرور قربان کیجیے اور پنسل اور نوٹ بک ہاتھ میں لے کے صبح کو گھر سے نکل جائیے اور در دروازہ در دروازہ پھرنے کے بجائے صرف چند ایسے مقامات پر چلے جائیے جہاں مسلمانوں کے مختلف طبقات کے جتھے کے جتھے آپ کو مل سکیں، مثلاً سب سے پہلے علی الصباح گوشت کی مارکٹ میں جائیے اور وہاں کے گوشت بیچنے والے اور گوشت خریدنے والے خالص مسلمانوں کی دینی حالت کا ایک اندازہ لگا کے نوٹ بک میں درج کر لیجیے ——— پھر ترکاری بازار میں پہنچ کے سبزی فروش مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لیجیے ——— پھر کسی اور ایسے ہی بازار میں جائیے جہاں زیادہ تر آپ کے مسلمان بھائیوں ہی کی دکانیں ہوں، اور وہاں کے مسلمان دوکانداروں اور مسلمان گاہکوں کی عام دینی حالت کا اندازہ کیجیے ——— پھر کسی کارخانہ میں چلے جائیے اور وہاں کے مسلمان مزدوروں کی دینی حالت دیکھیے ——— پھر ریلوے اسٹیشن پر پہنچیے، اور وہاں کے مسلمان قلیوں اور تانگے چلانے والے

مسلمانوں سے باتیں کر کے اُن کی دینی حالت کا اندازہ لگائیے ـــــ پھر مسلمان دھوبیوں، گھوسیوں، بھشتیوں جیسے پس ماندہ طبقوں کی بستیوں میں جائیے اور اُن کی اور اُن کے بال بچوں کی دینی حالت کا مطالعہ کیجیے ـــــ پھر کچہری پہنچیے اور مسلمان مقدمہ بازوں، گواہی یا دلّالی کا پیشہ کرنے والوں سے مل کر دیکھیے، نیز مسلمان وکیلوں، مختاروں اور عدالت کی کرسیوں پر بیٹھنے والے مسلمان حاکموں کے احوال کا مشاہدہ کیجیے! اسی طرح کسی تھانہ میں پہنچ کے مسلمان تھانیدار صاحب اور مسلمان محرروں، کانسٹبلوں کی حالت زار دیکھیے ـــــ پھر کسی اسلامیہ کالج یا اسلامیہ اسکول میں چلے جائیے اور وہاں کے مسلمان پروفیسروں، ماسٹروں اور طالب علموں کی دینی حالت پر ایک نظر ڈالیے! ـــــ پھر اگر حسن اتفاق سے اُسی دن آپ کے شہر میں مسلمانوں کا کوئی قومی اجتماع ہو، کوئی سیاسی کانفرنس ہو رہی ہو تو وہاں جمع ہونے والے مسلمانوں کی قومی سیاست کے نقیبوں اور اسلام کی نمایندگی کے مدعیوں پر سرسری نظر ڈالیے ـــــ پھر کسی مسلمان اخبار کے دفتر میں بھی چلے جائیے اور وہاں کے ادارتی اسٹاف اور کلرکوں، کاتبوں اور دوسرے ملازمین کی دینداری اور دین سے آشنائی کا اندازہ کیجیے ـــــ پھر مسلمانوں کے کسی محلہ کی کسی مسجد میں بھی جائیے اور اندازہ لگائیے کہ محلہ کی کئی ہزار کی آبادی میں سے کتنے عدد نماز کے لیے مسجد میں آتے ہیں؟ پھر آنے والوں میں کتنے پرانے وقتوں کے بوڑھے ہیں، اور کتنے اس زمانہ کے جوان، کتنے تعلیم یافتہ اور آسودہ حال سفید پوش ہیں اور کتنے "غیر تعلیم یافتہ" غریب اور میلے کچیلے گرد آلودہ؟

اگر آپ کی بستی میں کوئی ٹوٹا پھوٹا عربی مدرسہ ہو تو جا کے ذرا اس کی بھی زیارت کیجیے اور دیکھیے کہ اس میں آپ کے شہر کے کتنے طالب علم ہیں، اور پھر اُن میں کوئی ایک بھی کسی معزز گھرانے یا کسی نمایاں خاندان کا ہے؟ ـــــ نیز وہاں کے پڑھنے پڑھانے والوں سے بھی مل کر اور باتیں کر کے اس کا اندازہ لگائیے کہ ان کی اکثریت میں بھی حقیقی دینی روح کی کس قدر کمی ہے، اور خالص دینی ہی نقطۂ نظر سے ان کے بھی اکثر افراد کی ذہنی اور عملی حالت کتنی پست اور کس قدر مایوس کن ہے۔

پھر شہر سے نکل کے قریب کے کسی ایسے گاؤں میں بھی چلے جائیے جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں

آبادیوں اور ان کی زندگی کا مطالعہ کرکے دیہاتی مسلمانوں کے متعلق بھی معلومات حاصل کیجیے۔

جس دن آپ اتنی سی محنت کرکے حساب لگائیں گے اس دن آپ کو معلوم ہو گا کہ موجودہ مسلمان قوم میں ایک فی صدی بھی ایسے لوگ نہیں ہیں جو دین سے آشنا اور خدا و رسولؐ کے شناسا ہوں اور جن کی زندگی کو اوسط درجہ کی ہی اسلامی زندگی کہا جاسکے۔

آہ اسلام کا اقرار کرنے والوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے والوں کی اتنی بڑی تعداد جبکہ محض اپنی جہالت اور غفلت کی وجہ سے دین سے اس قدر دور پڑی ہوئی ہے اور اللہ و رسولؐ سے اس قدر بیگانہ ہو چکی ہے۔ تو اہل دین کا اپنے ان بھائیوں کی اصلاح سے بے فکر رہ کر جینا اور چین و اطمینان کے ساتھ اپنے دوسرے مشاغل میں مشغول رہنا یقیناً بڑی فرض ناشناسی ہے۔

تمام مسلمانوں کی خیر خواہی اور نصیحت اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں باہم تعاون کو اسلام نے ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا ہے اور جب امت کے ۹۹ فیصدی کے قریب افراد جہالت و غفلت کے سمندر میں اس طرح غرق ہو رہے ہوں اور اسلام سے ان کا تعلق صرف برائے نام رہ گیا ہو تو ایسی حالت میں بھی اگر ہم "دعوت الی الخیر، تواصی بالحق" اور "تعاون علی البر والتقویٰ" کا کا فریضہ ادا نہ کریں اور جہالت و غفلت کی وادیوں میں بھٹکتے ہوئے اپنے ان بھائیوں کی خبر نہ لیں، اور ان کو اللہ و رسولؐ سے آشنا اور اسلام سے وابستہ کرنے کے لیے امکانی جد و جہد نہ کریں تو یقیناً ہم بڑے مجرم اور بڑے بے درد ہیں۔[لہ]

بیشک ارسطو اور ابن سینا کے جانشینوں یعنی پلیتھ، و رطبیبوں اور ڈاکٹروں کے لیے عرف عام میں بالکل زیبا ہے کہ جب تک مریض یا مریض کے والی وارث خود علاج کی خواہش نہ کریں

لہ بالخصوص جب کہ یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلمانوں کی یہی بڑی تعداد اور اس کی یہ غیر اسلامی زندگی ہی غیروں کے لیے اسلام کو سمجھنے میں بھی سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے اور "لتکونو شھداء علی الناس" کا مقصد کلی طور پر فوت ہو رہا ہے۔ بہرحال یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ جب تک "قوم" "مسلمان قوم" اسلام کا زندہ نمونہ نہیں بنے گی، غیروں کے سامنے اسلام کو پیش کرنے کی ہر کوشش بے نتیجہ رہے گی۔

اطبا اور ڈاکٹر از خود کوئی پیش قدمی نہ کریں، لیکن انبیاء علیہم السلام کے وارثوں اور دولتِ دین کے امینوں کے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ جاہلوں و غافلوں کی دینی اصلاح و تربیت سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر اس خیال سے بیٹھے رہیں کہ جب کوئی طالب بن کر آئے گا اور اصلاح چاہے گا تو ہم اس کو راستہ بتا دیں گے۔ اگر کچھ حضرات ایسا سمجھے ہوئے ہیں تو یقیناً ان کی رائے قابلِ نظرِ ثانی ہے ـــــ حاملینِ دین کے لیے انبیاء علیہم السلام کا اسوۂ حسنہ ہی قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ وہ حضرات از خود غافلوں اور جاہلوں کے پاس پہنچتے تھے اور جس طرح بھی بن پڑتا تھا ان کی اصلاح و ہدایت کی کوشش کرتے تھے۔

قرآن پاک میں حضرت نوح کے اس بیان کو ذرا غور سے پڑھیے:

رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا
وَّنَهَارًا فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي
إِلَّا فِرَارًا وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ
لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي
آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ
وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا
ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ثُمَّ
إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ
إِسْرَارًا (سورۂ نوح ۵-۹)

اے میرے پروردگار! میں نے اپنی اس قوم کو رات دن تیری طرف بلایا لیکن جتنا میں نے بلایا یہ اتنے ہی اور زیادہ بھاگے۔ اور جب جب بھی میں نے انھیں دعوت دی تیری مغفرت کے لیے تو انھوں نے انگلیاں دے لیں اپنے کانوں میں اور ڈال لیے اوپر سے کپڑے۔ اور اڑ گئے اپنی جہالت اور گمراہی پر، اور دماغ چڑھائے انھوں نے غرور سے (خداوندا) اس کے بعد بھی میں نے انہیں بلایا اپنی پوری آواز سے پھر میں نے ان کو اعلانیہ اور خفیہ ہر طرح ہی سمجھایا۔

حضرت نوح کے علاوہ اور بھی جن جن انبیاء اور رسل کی تبلیغ و دعوت کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ یہ چیز ان حضرات کے احوال میں بالکل مشترک ہے کہ جاہلوں اور غافلوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے وہ خود پھرتے تھے، اور لوگوں کے آنے کے منتظر نہیں رہتے تھے ـــــ امام غزالی اپنے وقت کے اہلِ دین کو، دین سے ناواقف عوام کی تعلیم و تربیت کے اسی فریضہ کی طرف متوجہ فرماتے ہوئے "احیاء العلوم" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

ولا ینبغی ان یصبر الی ان یسئل عنه بل ینبغی ان یتصدی لدعوة الناس الیٰ نفسه فانهم ورثة الانبیاء والانبیاء ماترکو الناس علی جهلهم بل کانوا ینادونهم فی مجامعهم ویدورون علی ابواب دورهم فی الابتداء ویطلبون واحداً واحداً فیرشدونهم فان مرضی القلوب لا یعرفون مرضهم
(احیاء العلوم جلد ۲ باب دواء الثو)

اور جائز نہیں ہے کہ دین کے جاننے والے اس کے انتظار میں بیٹھے رہیں کہ کوئی آکر اُن سے پوچھے تو بتلائیں۔ بلکہ ان کو چاہیے کہ خود لوگوں کو اپنی طرف بلائیں (اور داعی اور طالب بنیں) کیونکہ وہ انبیا علیہم السلام کے وارث ہیں اور حضرت انبیاءؑ نے لوگوں کو ان کی جہالت پر نہیں چھوڑے رکھا بلکہ وہ ان کو ان کے مجمعوں میں جا جا کر دعوت دیتے تھے اور ابتدا میں ان کے دروازہ پر خود جاتے تھے اور ایک ایک کو بلاتے تھے اور انھیں ہدایت کا درس دیتے تھے۔ یہ اس واسطے ضروری ہے کہ دلوں کے بیمار اپنی بیماری سے خود واقف نہیں ہوتے۔

ممکن ہے ہماری اس گزارش اور امام غزالی کے اس ارشاد پر کسی صاحب کو یہ شبہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کا یہ طرز عمل تو "کافروں" کے ساتھ تھا کہ اپنی دعوت لے کر اُن کے پاس خود پہنچتے تھے۔ اور ان کی اصلاح وہدایت کے لیے اس طرح پھر پھر کے کوششیں کرتے تھے اور تم مسلمانوں کی اصلاح وہدایت کے لیے اسی طرح کام کرنے کی دعوت دیتے ہو حالانکہ انبیاء علیہم السلام ایمان لانے والوں کے پیچھے پیچھے اور ان کے گھروں پر اس طرح سے نہیں پھرا کرتے تھے، بلکہ مومنین خود آکر دین کی تعلیم وتربیت اُن سے حاصل کرتے تھے۔

بہرحال جن حضرات کے دل میں یہ کھٹک پیدا ہو وہ اگر مزید غور وفکر سے کام لیں تو اس حقیقت کا سمجھنا اُن کے لیے مشکل نہ ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام کا اصل کام خدا فراموش انسانوں اور اللہ کے بچھڑے ہوئے بندوں کو اللہ تعالیٰ سے وابستہ کرنے اور اس کی بندگی کے راستہ پر لگانے کی کوشش کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اُن کے زمانہ میں یہ حالت چونکہ صرف "کافروں" کی ہوتی ہے اس لیے یہ حضرات اپنی دعوت کو لے کر انہی میں پھرتے اور انہی کی مجلسوں اور انہی

کے مجمعوں میں جاتے ہیں، اور پھر اس دعوت کو قبول کر کے جو لوگ ایمان لے آتے ہیں چونکہ ان کا ایمان شعوری ہوتا ہے اور وہ اس کی قدر و اہمیت کو جانتے ہیں اس لیے ایمان لاتے ہی وہ خود تعلیم و تربیت کے طلب گار اور فکرمند بن جاتے ہیں۔ اور بجائے اس کے کہ انبیاء علیہم السلام ان کو دین کی باتیں بتانے کے لیے ان کے گھروں پر جائیں، وہ خود دین کی ضروری تعلیم حاصل کرنے کے لیے بالکل اسی طرح پھرنے لگتے ہیں جس طرح کوئی پیاسا پانی کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے ـــــ لیکن بدقسمتی سے فی زماننا "مسلمان" کہلانے والوں کی اکثریت کی حالت غفلت و خدا فراموشی کے لحاظ سے جیسی کچھ ہے وہ ہمارے آپ کے سامنے ہے۔ دین کی قدر و اہمیت کا احساس اور دین کی تعلیم و تربیت کی طلب اُن کے اندر بالکل مفقود ہے، اس لیے اُن کو خدا سے آشنا کرنے اور کم از کم دین کی بنیادی باتوں سے اُن کو واقف کر کے برائے نام اسلامی نسبت کے بجائے حقیقی دین اسلام سے ان کو وابستہ کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ابتداءً دین کی دعوت کو لے کر خود ان میں پھرا جائے اور خود ان کے پاس پہنچ پہنچ کے اسلام کی بنیادی باتیں ان کو پہنچائی جائیں، اور دین کی قدر و طلب ان میں پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

جن اہل علم و اہل دین حضرات کا یہ خیال ہے کہ "ہمارا فرض اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ جو کوئی اصلاح اور تعلیم و تربیت کا طالب بن کر ہمارے پاس آئے ہم اس کی تعلیم و اصلاح کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں، اور جو کوئی دینی مسئلہ پوچھے تو اپنے علم کے مطابق اسکو بتلا دیں"۔

سو ان حضرات کے مغالطہ کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اصلاح اور تعلیم و تربیت کے مختلف درجات کی اہمیت اور ذمہ داری میں جو فرق ہے انھوں نے اس مسئلہ پر غور کرتے وقت اس کا لحاظ نہیں فرمایا ہے۔

ورنہ یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ جو جاہل و غافل مسلمان دین کی بنیادی باتوں سے بھی آشنا نہیں ہیں اور ان میں دین سیکھنے اور دیندار بننے کی کوئی طلب بھی نہیں ہے، سو ان کی اتنے درجہ کی اصلاح اور اتنی تعلیم و تربیت کی کوشش جتنی کہ ان کے مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے، یقیناً اہم فرائض میں سے ہے جس سے کسی وقت بھی استغنا جائز نہیں ـــــ البتہ اس کے

بعد اصلاح اور تعلیم و تربیت کے جو تکمیلی درجے ہیں مثلاً علوم دین میں کمال اور درجۂ افضلیت حاصل کرنا، یا مثلاً حضرات صوفیہ کے طرز پر تزکیۂ نفس اور تزکیہ اخلاق کی تکمیل کرنا سو یہ درجے بیشک ایسے ہیں کہ نہ تو ہر مسلمان کے لیے ان کی تحصیل فرض عین ہے اور نہ ہر ایک کو ان کی تحصیل کی دعوت دینے اور ان کے لیے کوشش کرنے کے ہم مکلف ہیں۔ لہذا اس کام کے لیے یہ طریقہ بالکل صحیح ہے کہ جو طالب بن کر آئے اُس کی خدمت سے دریغ نہ کیا جائے اور ہر ایک کو پکڑ پکڑ کے لانے کی کوشش نہ کی جائے۔ یہ وہی کام ہے جس کا تکفل ہمارے مدرسے اور ہماری خانقاہیں کیے ہوئے ہیں۔ اور وہاں کا طریق کار یہی ہے جو اپنے دائرہ میں بالکل صحیح ہے ــــ لیکن ہماری اس گزارش اور ہماری دعوت کا جو موضوع ہے (جس کی طرف ان سطور کے ذریعہ اہل دین کو متوجہ کرنا مقصود ہے) وہ مدارس اور خانقاہوں میں انجام پانے والا یہ تکمیلی کام نہیں ہے۔ بلکہ وہ برائے نام قسم کے جاہل و غافل مسلمانوں میں حقیقی ایمان اور دینی شعور پھیلانے اور خداترسی اور فکر عاقبت اُن میں پیدا کرنے اور دین کی ضروری ضروری باتیں ان کو سکھانے کا بنیادی کام ہے۔

اور چونکہ فی زمانا کوئی ایسا ہمہ گیر دینی ادارہ موجود نہیں ہے جو کما حقہ اس کام کی کفالت کر رہا ہو اور ضرورت کے مطابق اس خدمت کو انجام دے رہا ہو (بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو افراد اور جو بعض جماعتیں اس سلسلہ میں کچھ کر بھی رہی ہیں، وہ عالم اسلامی کی موجودہ ضرورت کے لحاظ سے ہزارواں حصہ بھی نہیں ہے) اس لیے حسب موقع اور حسب وسعت اس خدمت کی انجام دہی جملہ اہل دین کا فرض ہے اور ہم سب ہی کے ذمہ ہے کہ اپنے اپنے علاقہ کے دین سے غافل مسلمانوں کی خبر لیں اور ضروری درجہ کی ان کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کا کوئی بندوبست کریں[1]۔ ورنہ سخت بازپرس کا خطرہ ہے۔

---

[1] جو حضرات دین ہی کی دوسری اہم خدمات میں مشغول ہیں مثلاً تدریس و تصنیف اور تزکیہ و ارشاد وغیرہ (اللہ تعالیٰ ان کی ان خدمات کو بابرکت اور امت کے لیے زیادہ سے زیادہ نافع بنائے اور قبول فرمائے) وہ بھی اس سلسلہ میں اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ اپنے اہل عقیدت اور زیر اثر لوگوں کو اس کام کی طرف متوجہ فرمائیں اور خود ان کے کام کی سرپرستی اور نگرانی فرمائیں، یا رہنمائی اور نگرانی کا کام بھی کسی اور اہل کے سپرد کر دیں ــــ جاہل و غافل عوام میں دین کے اس بنیادی اور ابتدائی کام کے لیے کسی خاص درجہ کے علم اور مشیخت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اہل علم اور اصحاب فہم کی رہنمائی اور نگرانی ضروری ہے ــــ اس کام کے کرنے کا طریقہ جو تجربہ میں بھی آچکا ہے وہ بھی بہت سہل اور

(باقی اگلے صفحہ پر)

حدیث کے مشہور جامع دفتر "کنز العمال" میں، عوام کی دینی تعلیم و تربیت سے غفلت کرنے والوں کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نہایت عتاب آمیز خطبہ روایت کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے واسطے منبر پر کھڑے ہوئے اور غضب و جلال کے انداز میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا ـــــ "کیا بات ہے کہ کچھ لوگ خود تو دین کا علم رکھتے ہیں لیکن ان کے ارد گرد رہنے والے قبائل علم دین سے محروم ہیں، سو وہ لوگ اپنے ناواقف اور بے علم پڑوسیوں میں علم دین پھیلانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ ان کی اصلاح کیوں نہیں کرتے۔

اور ایسے ہی میں ان بے علم لوگوں سے بھی کہتا ہوں، جن کے پڑوس میں دین کے جاننے والے موجود ہیں وہ اپنے علم والے پڑوسیوں سے دین سیکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔

(راوی کا بیان ہے کہ حضورؐ نے ان دونوں گروہوں کو تین دفعہ اس طرح مخاطب فرمایا اور پھر ارشاد فرمایا) یا تو یہ دونوں طبقے اپنے اپنے طرزِ عمل کو بدلیں (یعنی دین کے جاننے والے اپنے نہ جاننے والے پڑوسیوں کو سکھائیں اور نہ جاننے والے لوگ اپنے علم والے پڑوسیوں سے دین کی تعلیم و تربیت حاصل کریں) ورنہ میں اس دنیا ہی میں ان کو سخت سزا دلواؤں گا۔

آگے اس حدیث میں یہ مضمون ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اشارہ اس پُرعتاب خطاب میں اشعریین کی طرف تھا، یہ لوگ عام طور سے دین کے جاننے والے اور دین کی سمجھ بوجھ رکھنے والے تھے، لیکن ان کے ارد گرد چشموں پر اور جنگلوں میں جو لوگ رہتے تھے وہ دین کے علم و فہم سے عاری تھے ـــــ جب ان اشعریوں کو حضرت کے اس عتاب کا علم ہوا تو انھوں نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "دوسرے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سادہ ہے، ضرورت صرف اس کی ہے کہ اہل دین اس کو عمومی طور پر اپنائیں۔ بقول حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ "جتنے کروروں میں کام کرنے کی ضرورت ہے کم از کم اتنے لاکھ تو کام کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں" ـــــ "آج دین" غریب ہے اور دین و ایمان والوں کو اس کی پکار ہے۔ "من انصاری الی اللہ؟"

لوگ اگر اپنی بدبختی سے دین کا علم حاصل نہیں کرتے ہیں تو کیا اُن کی ذمہ داری بھی ہم پر ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا۔ ہاں! جاننے والی ہر جماعت اپنے ماحول کے نہ جاننے والو کو سکھلانے اور ان میں علمِ دین پھیلانے کی کوشش کرنے کی ذمہ دار ہے، اور نہ جاننے والے سیکھنے اور تعلیم حاصل کرنے کے ذمہ دار ہیں، اور دونوں گروہوں میں سے جو بھی اپنے فریضہ میں کوتاہی کرے گا وہ مستوجب سزا ہوگا۔"

پھر ان اشعریوں نے ان بے علم قبائل کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک سال کی مہلت مانگی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ مہلت دے دی اور آخر میں آپ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (مائدہ ع ۱)

امام احمد بن حنبل کے رسالہ "الصلوٰۃ و ما یلزمها" میں (جو علامہ حافظ ابن القیم کے رسالہ "کتاب الصلوٰۃ و احکام تارکها" کے ساتھ مصر میں چھپ چکا ہے) ایک حدیث نظر سے گزری جس کا مضمون یہ تھا کہ:۔

"قیامت میں ایک شخص اپنے پڑوسی کے خلاف اللہ تعالیٰ کی عدالت میں دعویٰ کرے گا کہ اس نے میرے ساتھ خیانت کی ۔۔۔ وہ جواب میں کہے گا "یارب وعزتک ما خنته فی اهل ولا مال (قسم اللہ کی میں نے نہ کبھی اس کے اہل کے بارے میں خیانت کی اور نہ مال میں) وہ مدعی کہے گا بیشک اس نے میرے اہل یا مال میں تو خیانت نہیں کی لیکن میں اپنی غفلت و شامت سے گناہ کرتا تھا اور یہ

لہ اس آیت کا حاصل مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل پر ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کی وجہ سے اللہ کے پیغمبر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبانوں سے لعنت ہوئی۔ ان کا ایک بڑا جرم یہ تھا کہ اُن میں جو بُرائیاں رواج پا رہی تھیں وہ آپس میں ان کی روک تھام کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

یہ شخص دیکھنے کے باوجود مجھے اس سے روکنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔[1]

ناواقف عوام کو دین کی تبلیغ تعلیم و تذکیر، تواصی بالحق اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تاکید کے بارے میں جو آیات اور احادیث کثیرہ عام طور سے معلوم اور مشہور ہیں[2]۔ ان کے علاوہ یہ دو حدیثیں بھی اس مدعا کی کس قدر واضح دلیلیں ہیں کہ ہر جگہ کے دین داروں اور دین کا علم رکھنے والوں کے فرائض میں سے ہے کہ کم از کم اپنے ماحول کے ان مسلمانوں کی اصلاح اور ضروری درجہ کی دینی تعلیم و تربیت کی فکر اور کوشش کریں جو دین کی بنیادی باتوں سے بھی ناواقف ہیں اور محض جہالت و غفلت ہی کی وجہ سے خدا فراموشانہ زندگی گزار رہے ہیں۔

جتنا جتنا اس مسئلہ پر غور کیا جاتا ہے حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر اہم فریضہ سے ہم لوگ کیسے غافل ہیں ـــــ اور اپنے کو مسلمان کہنے والے، اللہ کے ان ہزاروں بندوں کے متعلق ہم قیامت میں کیا جواب دے سکیں گے جو ہمارے قرب و جوار میں رہتے ہیں، اور اپنی جہالت اور ہماری مجرمانہ غفلت کی وجہ سے ہی اللہ سے اور اس کے دین سے قطعاً بے تعلق ہو کر جی رہے ہیں، اور خدا فراموشی ہی میں عمریں گنوا کے مر رہے ہیں۔

جس دینی دعوت اور اصلاح و تبلیغ کے جس سلسلہ کا ذکر ان صفحات میں بار بار ہوتا رہتا ہے، درحقیقت وہ اسی فریضہ کی ادائیگی کی کوشش ہے، اور اس کا خاص موضوع عمومی تعلیم و تربیت اور عمومی اصلاح کے ایک خاص نظام کے ذریعہ "مسلمان قوم" میں حقیقی ایمان اور دین کے شعور اور اس کی قدر کو عام کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

---

[1] چونکہ اصل کتاب اس وقت پیش نظر نہیں ہے اس لیے نہ حدیث کا متن نقل کیا جاسکتا ہے اور نہ بعینہٖ لفظی ترجمہ بلکہ حافظہ میں جو مضمون تھا اپنے لفظوں میں اس کو ادا کر دیا ہے، انشاء اللہ کوئی معنوی فرق نہ ہوگا۔

[2] جن کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ مخدومنا حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث سہارنپور کے رسالہ "فضائل تبلیغ" میں بھی جمع ہو گیا ہے۔

سرزمین امریکہ میں اسلام کے علمبردار

ڈاکٹر عباد الرحمٰن نشاط استاذ شعبۂ انگریزی ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ

[اسلام کی مقناطیسی کشش اور ناقابل تسخیر طاقت کا ظہور اسی وقت ہوتا ہے جبکہ اس کی آزمائش منہاج نبوت کے مطابق دعوت کے میدان میں کی جائے۔ ذیل کا مضمون دجالی تہذیب کے سب سے بڑے مرکز امریکہ میں اسلام کی جاذبیت دعوت کے کچھ واقعات و مشاہدات کے بیان پر مشتمل ہے۔ ایسے دور میں جس میں کہ ہر طرف سے سیاسی و قومی میدانوں میں لڑی جانے والی جنگوں میں پے در پے شکست و ہزیمت کی خبروں نے ہماری قوتوں کو مفلوج اور ہمتوں کو مردہ کر دیا ہے، کیسی شدید ضرورت ہے اس بات کی کہ دعوت و شہادت علی الناس کے میدان میں اللہ کی نصرت و تائید سے حاصل ہونے والے حوصلہ افزا نتائج سے امت کو باخبر کیا جائے!! تاکہ اولاً یہ مایوسی و دل شکستگی ختم ہو اور (۲) یہ عقدہ بھی کھلے کہ ان پیہم شکستوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ جس میدان میں ہم لڑ رہے ہیں ہم اس کے سپاہی نہیں ہیں۔ — اٹھیے اور جی جان سے دعوت الی اللہ کے کام میں اپنی کل پونجی کو قربان کر دیجیے ——— مدیر]

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ طوفاں کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

۱۹۷۲ء کے دسمبر کی آخری تاریخوں میں جب میں تعلیم کے لیے امریکہ روانہ ہو رہا تھا تو میرا دل امید اور اندیشے کی ملی جلی کیفیت سے دوچار تھا ایک تو اس امید سے دل مسرور تھا کہ اہل زبان کے درمیان رہتے ہوئے انگریزی زبان و ادب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی میری دیرینہ تمنا پوری ہونے کی صورت پیدا ہوئی تھی، تو دوسری جانب یہ احساس دل میں کانٹا بن کر کھٹک رہا تھا کہ مجھے اپنی زندگی کے چند سال ایک ایسے خدا فراموش ماحول میں گزارنے تھے جو مادیت کا سب سے بڑا علمبردار تھا، مادیت جو اس صدی میں اسلام کی سب سے منظم دشمن طاقت بن کر خود اسلامی ممالک کے قلب میں اسلام کے فرزندوں کی خود اعتمادی مجروح کر رہی تھی، اس کے سب سے بڑے "قمار خانہ" میں داخل ہوتے ہوئے اگر مجھے اپنے دینی

اور تہذیبی اقدار کی حفاظت کی فکر دامن گیر ہو رہی تھی تو یہ کوئی غیر فطری بات نہیں تھی لیکن اس ملک میں اپنے نو سالہ قیام کے دوران جب میں نے بارہا ایسے غیور مسلمان دیکھے جن کی حمیت ایمانی کی آب و تاب مادیت کی مصنوعی چمک کے بالمقابل اور بھی نکھر گئی تھی تو اس حقیقت میں میرا یقین پختہ ہو گیا کہ جب کسی مسلمان کے دل کے سونے کو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا پارس چھو لیتا ہے تو پھر اس کی نگاہوں میں وہ قیمتی ہیرا بھی ایک بے حقیقت پتھر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا جس پر غیر اسلام کی مہر ثبت ہو۔

یہ مضمون اسلام کے ایسے ہی جگر گوشوں سے متعلق ہے اور اس میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، میں خود ان کا بالواسطہ یا بلا واسطہ شاہد ہوں اور ان واقعات کو اس نیت سے یہاں قلم بند کر رہا ہوں کہ کوئی مسلمان جو عصر حاضر کے حالات اور مغربی تہذیب کی دل فریبیوں سے مرعوب ہو گیا ہو، شاید اپنا یقین گم کردہ پھر سے حاصل کرے، اور کوئی مسلمان جو اس اسلام مخالف دور میں خود اسلام پر چلنے اور دوسروں کو اس کی دعوت دینے کا جذبہ رکھتا ہو، شاید اپنے عزم و شوق کے چراغ کی لو تیز سے تیز تر کر لے۔

مجھے یاد ہے امریکہ کے ایک شہر میں ایک دینی عنوان سے مختلف مقامات سے مسلمان جمع ہوئے تھے جن میں بڑی تعداد امریکی نومسلموں کی تھی، اکثر لوگوں کا قیام مقامی مسجد میں تھا۔ سفر کی بے آرامی اور تکان کی وجہ سے میں بھی ظہر کی نماز کے بعد مسجد کے ایک گوشہ میں پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا، مسجد بھری ہوئی تھی اور تقریباً سارے ہی لوگ لیٹے ہوئے تھے، میرے تھکے ہوئے جسم نے مسجد کے اس حصے میں بہت سکون محسوس کیا، لیکن میں دوسرے ہی لمحے چونک پڑا کسی کی سسکیوں کی آواز میرے کان سے ٹکرائی تھی، میں نے دیکھا میرے سامنے مسجد کی دیوار سے ٹیک لگائے ایک ایک نومسلم امریکی نوجوان رو رہا تھا، اس کے جسم پر لمبا عربی جبہ تھا، سر پر ٹوپی تھی اور چہرے پر داڑھی تھی، اس کی بے قراری دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے

ضبط نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ اس کی سسکی تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور چند منٹ کے بعد ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے اس نوجوان کی طرف دیکھا اور میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر یہ کون سا غم ہے جو اس نوجوان کو اس طرح رلاتا ہے جو اسے اس طرح بے قرار کیے ہوئے ہے، کون سا نقصان ہے جس کے احساس کی شدت نے اسے اپنے گرد و پیش سے بھی بے نیاز کر دیا ہے۔ اس سے پہلے کہ میرا ذہن اس سوال کا جواب تلاش کرتا میں نے دیکھا کہ مسجد کے دوسرے گوشے سے ایک دوسرا امریکی نومسلم نوجوان اٹھ کر اس کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی، اس نے وہ کتاب اس روتے ہوئے نوجوان کی طرف بڑھائی اور انگریزی میں کہا:

"یہ ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں، آؤ اسے مل کر پڑھیں۔" اس نوجوان نے کتاب لے لی، سنبھل کر بیٹھ گیا اور پھر کتاب کھول کر ایک حدیث شریف کا انگریزی ترجمہ بلند آواز سے پڑھنے لگا — "رسول اللہ (ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو) نے یہ فرمایا......" تھوڑی دیر میں اس نوجوان کے اردگرد چند اور امریکی نومسلم سنجیدگی اور وقار کے ساتھ آکر بیٹھ گئے۔ وہ نوجوان انتہائی ذوق و شوق سے ایک کے بعد دوسری حدیث پڑھتا رہا اور پھر دھیرے دھیرے اس کی آواز صاف ہو گئی، آنکھوں کے گوشے چمکنے لگے، چہرے پر طمانیت کا اجالا پھیل گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس بے چین اور بے قرار [illegible] روح کے درد کی دوا مل گئی ہو۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے میں بھیگی آنکھوں سے حدیث پاک کی یہ عجیب و غریب محفل دیر تک دیکھتا رہا تھا اور سوچتا رہا تھا کہ آج سے چودہ سو سال قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس فکر و اخلاص سے دنیا کے سامنے اپنی دعوت پیش کی تھی کہ آج ایک ایسا انسان جو نہ اس زبان سے واقف ہے جس میں پہلی بار اس دعوت کو پیش کیا گیا تھا، نہ اس ملک سے کوئی قومی تعلق رکھتا ہے، جہاں

اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تھا اور نہ ہی اس تہذیب سے کوئی مناسبت رکھتا ہے
جس کی آغوش میں پیغمبر اسلام نے پرورش پائی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ اب
اپنے سارے تعصبات توڑ کر مسجد میں آ گیا ہے اور ان ایام پر روتا ہے جو اسلام
سے اس کے تعلق کے بغیر گزر گئے۔

میرے ذہن میں جو دوسری یاد ابھرتی ہے وہ بھی ایک امریکی نومسلم کی ہے
میری نگاہوں میں شکاگو کی ایک عمارت کا نقشہ پھر جاتا ہے جسے مسلمانوں نے
جگہ کو مسجد کی شکل دے دی ہے، ایک دن وہاں عشاء کی نماز کی اقامت ہو رہی
تھی نہ جانے مکبر کا اخلاص تھا یا کسی کے دکھے دل کا آبگینہ ہی پھوٹ پڑنے
کے لیے منتظر تھا کہ جوں ہی اقامت کی آواز بلند ہوئی پہلی صف سے کسی کی سسکی
کی تیز آواز سنائی دی ـــــ میں نے چونک کر اس آواز کی جانب نگاہ اٹھائی
رونے والے کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرا دل محبت کے جذبات سے بھر گیا۔
میں ان سے واقف تھا، میری پہلی ملاقات ان سے شکاگو ہی میں ایک مکان
کے زیریں حصے (BASEMENT) میں ہوئی تھی جہاں اس علاقے کے مسلمان جماعت
سے نماز پڑھتے تھے اس وقت مجھے امریکہ آئے ہوئے صرف چند روز ہوئے تھے
ایک دن جب میں وہاں نماز کے لیے داخل ہوا تو وہاں وہ اپنے ایک ساتھی
کے ساتھ موجود تھے، ان کے جسم پر عربی لباس تھا اور چہرے پر گھنی داڑھی۔ میں نے
انھیں کسی افریقی ملک کا باشندہ سمجھا اور سلام کے بعد انگریزی میں پوچھا۔
"کیا آپ انگریزی جانتے ہیں؟" وہ ہنس پڑے اور بولے "میں امریکن ہوں اور
انگریزی میری مادری زبان ہے، شاید آپ کو میرے لباس کی وجہ سے غلط فہمی
ہوئی، میں یہ لباس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اپنانے کے شوق میں پہنتا ہوں،
اسلام قبول کرنے کے بعد اب میرا یہی لباس ہے" اس ملاقات کے بعد ہم
دونوں بارہا ملے اور اپنے نو سالہ قیام کے درمیان مجھے انھیں بہت نزدیک
سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے انھیں ایک بڑے جنرل اسٹور کے مالک کی

حیثیت سے بھی دیکھا، اور پھر خدمتِ اسلام کے شوق میں اپنا بزنس ختم کرکے ایک انتہائی معمولی ذریعۂ آمدنی پر اکتفا کرتے بھی دیکھا، میں نے انھیں ایک ہندوستانی قاری سے قرآن پاک پڑھتے بھی دیکھا اور نومسلموں کو نماز سکھاتے بھی دیکھا، میں نے انھیں مسجد میں رات کی تاریکی میں بلک بلک کر روتے بھی دیکھا اور دن کی روشنی میں دعوت و تبلیغ میں سرگرم عمل بھی دیکھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا اور بارہا چشمِ عبرت سے دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیے کوئی غیر مسلم اسلام قبول کر رہا ہے" اس لیے جب اس دن میں نے انھیں نماز کے وقت روتے دیکھا تو مجھے ان کے دل کی کیفیت سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی، مجھے اندازہ ہو گیا کہ تکبیر کے الفاظ نے جس میں خدائے واحد کی ربوبیت اور عظمت کی پکار تھی، اس مخلص مسلمان کے دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ کسی جذبے کو بے قابو کر دیا تھا، صف سیدھی کی جا رہی تھی کہ میرے بازو میں کھڑے میرے ایک دوست نے میرے کان میں سرگوشی کی "کیا آپ جانتے ہیں کہ حال ہی میں ان کے ہاتھ پر ایک دن میں ۳۳ لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے؟" میرے دل میں تعظیم و تحسین کے جذبات موجزن ہو گئے، میرے لیے یہ اطلاع نئی تھی، نماز کے بعد لوگوں کی درخواست پر انھوں نے اس واقعہ کو بیان کیا، انھوں نے بتایا کہ انھوں نے ویسٹ انڈیز (WEST INDIES) کا ایک دعوتی سفر کیا اور ایک دن وہاں کے مسلمانوں سے خطاب کیا، اس مجلس میں تین عیسائی نوجوان بھی موجود تھے اسلام کا پیغام سنجیدگی اور وقار کے ساتھ شاید پہلی بار ان کے سامنے پیش ہوا تھا، تقریر ختم ہوتے ہی انھوں نے مزید معلومات کے لیے کچھ وقت لیا، سوالات پوچھ کر اپنی تشفی کی اور پھر روح کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے کلمۂ شہادت پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے دریافت کیا کہ اب ان کی کیا ذمہ داری ہے؟ ان کا جواب تھا ——— "اب آپ اسلام کا پیغام دوسروں تک پہنچائیے

جیسے ہیں نے یہ پیغام آپ تک پہنچایا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا، تو آپؐ نے یہی جواب دیا تھا۔

نہ جانے وہ قبولیت کی کیسی گھڑی تھی، وہ تینوں نومسلم اٹھ کر چلے گئے اور چند گھنٹوں کے بعد جب وہ واپس آئے تو ان کے ساتھ تیئس غیر مسلم تھے، ان سب کو دعوت دی گئی اور سب نے اسی مجلس میں اسلام قبول کر لیا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کفر کا ایک جادو تھا جو دعوتِ حق کی آواز بلند ہوتے ہی معدوم ہو گیا۔ مادیت کی ایک سجی دوکان تھی —— جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی صدا لگتے ہی اجڑ گئی اور اس کے خریداروں نے اس دعوت پر لبیک کہہ کر اپنا نصیب بلند کر لیا۔

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

(باقی)

(صفحہ ۳۳ کا بقیہ)

بار بار عرض کیا جا چکا ہے، اور اب پھر عرض کیا جاتا ہے کہ اس کام کے سلسلہ میں آپ کو ہماری دعوت یہ نہیں ہے کہ آپ فلاں انجمن یا فلاں جماعت سے وابستہ ہو کر یہ کام کیجیے بلکہ ہماری گزارش صرف یہ ہے کہ دین کی اس خدمت کے لیے اور اس سلسلہ میں اپنا فرض ادا کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیے، اور اللہ کے جو بندے اس کام کو کر رہے ہیں اُن کے طریق کار کو دیکھیے، پھر اگر بالفرض اس طریق عمل کے کل اجزاء پر آپ کا ضمیر مطمئن نہ بھی ہو تو جتنے حصہ پر یا جس طریقے پر آپ کو اطمینان ہو اس کو شروع کر دیجیے!

اس وقت دنیا بہت تیزی سے اپنا سفر طے کر رہی ہے، برسوں کی منزلیں دنوں میں طے ہو رہی ہیں، اگر یہ وقت بھی ہم نے غفلت سے گزار دیا تو خطرہ ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح اور دین کے احیاء کے جو امکانات اور جو سہولتیں ابھی باقی ہیں۔ بہت سے علاقوں میں کہیں وہ ختم نہ ہو جائیں

العجل العجل! الساعۃ الساعۃ!!

ممالک غیر سے
بحری ڈاک سے ۶۰/- روپے
(۴ پونڈ یا ۲۵ ریال)
ہوائی ڈاک سے ۱۳۵/- روپے
(۹ پونڈ، ۸۵ ریال، ۱۵ ڈالر)

فی شمارہ ۲/۵۰

چندہ سالانہ
ہندوستان میں ۲۵/-
پاکستان سے پاکستانی سکہ میں ۴۰/-
بنگلادیش سے ہندوستانی سکہ میں
۳۰/-

جلد (۵۲) | بابت دسمبر ۱۹۸۴ء مطابق ربیع الاول ۱۴۰۵ھ | شمارہ (۱۲)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا دوسری اطلاع مہینے کے آخر تک آجانا چاہیے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی روانہ کیا جائے گا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھ دیا کریں جو پتہ کی چِٹ پر لکھا ہوتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر مہینے کے آخر تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اگر دوبارہ بھیجنے کے لیے دفتر میں پرچہ ہوگا تو ضرور بھیجا جائے گا۔

پاکستان کے خریدار حضرات مبلغ ۵۰ روپے ہندوستانی سکہ میں کسی بھی ذریعہ سے دفتر الفرقان لکھنؤ کو روانہ فرمائیں، یا پاکستانی سکہ میں ۴۰ روپے ناظم ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیج دیں۔

محمد حسان نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

[قریباً چالیس سال پہلے محرم ۱۳۶۵ھ کے شمارے میں حضرت والد ماجد مدظلہٗ کا یہ مضمون "انبیاء علیہم السلام کا کام و پیغام اور ہمارے موجودہ مشاغل" کے زیرِ عنوان شائع ہوا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان میں پہلی مرتبہ انتخابات ہونے والے تھے جن میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی جداگانہ رائے دہندگی کے نظام پر عمل ہو رہا تھا۔ اب اسے پھر شائع کیا جا رہا ہے ــــ مضمون کے مطالعہ سے اس شمارہ میں اس کی دوبارہ اشاعت کی وجہ سمجھ میں آجائے گی ــــــ مدیر]

اگر نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی اور اللہ تعالیٰ کسی پیغمبر کو اس زمانہ میں بھیجتا ...... یا اگر بالفرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی آج ہماری اس دنیا میں تشریف لے آئیں، تو ان کا کام و پیغام کیا ہوگا؟

یہ ایک سوال ہے جس پر ہر اس شخص کو غور کرنا چاہیے، جو اللہ اور یوم آخرت اور سلسلۂ نبوت کی صداقت پر یقین رکھتا ہو اور نبیوں، رسولوں کے طریقہ پر چلنا اور مرنا چاہتا ہو ــــــ پھر اس سوال کا جواب معلوم کرنا بھی اُن لوگوں کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے جنھوں نے قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کا کام و پیغام پڑھا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ جن کے سامنے ہے۔

یقیناً ہر زمانہ اور ہر طرح کے ماحول میں انبیاء و رسل کی دعوت اور ان کی پیغمبرانہ جدوجہد کا مرکز و محور ایک اور صرف ایک رہا ہے اور وہ یہ کہ صرف اللہ کے بندے ہو جاؤ، اسی کی بندگی کرو،

اُس کی گرفت اور اُس کے عذاب سے ڈرو، اصلاح وتقویٰ کی راہ چلو اور اس کے رسول کی لائی ہوئی شریعت کو اپنا دستور بنا لو (اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝)

درحقیقت انبیاء علیہم السلام کے پیغام اور ان کی ہدایت کا ہر زمانہ میں یہی مرکزی نقطہ رہا ہے —— اور ہر قوم کے لیے اور ہر دور میں اسی کو انھوں نے انسانیت کا مرکزی مسئلہ قرار دیا ہے اور اسی کو فکر ونظر اور علم وعمل کی اساس وبنیاد قرار دے کر انھوں نے جملہ مسائل حیات میں امتوں کی رہنمائی کی ہے۔ انھوں نے اگر تہذیب وتمدن اور معیشت ومعاشرت کے بارہ میں بھی اصلاحی ہدایتیں دی ہیں تو اسی اصل کے ماتحت اور اگر تعلیم وتعلم جیسی کسی ضروری چیز پر بھی زور دیا ہے تو اسی غرض کے لیے، اور علیٰ ہذا انھوں نے دنیا کے نظم ونسق اور سیاست وحکومت پر قابو حاصل کرنے کے لیے اگر کبھی کوئی اقدام اٹھایا ہے اور کوئی جد وجہد کی ہے تو وہ بھی صرف اسی مقصد اعلیٰ کی خاطر (لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا ویکون الدین کلہ للہ)

الغرض صرف اللہ کی بندگی، تقوے کی زندگی اور شریعت الٰہیہ کی پیروی کے لیے کوشش ہی ہمیشہ تمام انبیاء علیہم السلام کا بنیادی کام رہا ہے پھر آج جب کہ ہوا وہوس کی بندگی عام ہے اور عملی دنیا اور بالخصوص اس کے اجتماعی معاملات میں آخرت فراموشی اور مواخذۂ خداوندی سے بے خوفی اور بے فکری بالکل عام ہے۔ اور جب کہ نبوی ہدایات وتعلیمات سے قطعاً بے پروا ہوکر اپنے اپنے پسند خاطر راستوں پر چلنے کا عام چلن ہے (اور یقیناً بہت کم ایسے اللہ کے بندے ہیں جو اس عام حالت سے مستثنیٰ کیے جا سکتے ہیں) پس عمومی ضلال وفساد کی اس فضا میں اگر بالفرض، اللہ کا کوئی رسول مبعوث ہوتا، یا فرض کرو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو اللہ تعالیٰ اگر اس حالت میں دوبارہ بھیجدیتے تو اس میں کیا شبہ ہے کہ ان کی دعوت وپکار اور اُن کی جد وجہد یہی ہوتی کہ

اعبدوا اللہ واتقوہ واطیعون	اللہ کے بندو صرف اللہ کی بندگی کرو اسکی
(قرآن مجید)	گرفت اور اس کے عذاب سے ڈرو اور میں
	جو ہدایت وشریعت لایا ہوں اس کے مطابق چلو۔

. . . .

اور اس سے زائد اور اس کے علاوہ جو کچھ ان کو کرنا ہوتا یقیناً وہ اس کے بعد اور اسی اصل و اساس کی بنیاد پر کرتے۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا اس لیے اب کوئی نیا نبی ہماری ہدایت کے لیے مبعوث ہونے والا نہیں، اور یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اب کبھی اس دنیا میں تشریف لانے والے نہیں، مگر ان کا کام و پیغام زندہ ہے، باقی ہے اور اس کو باقی و جاری رکھنے کی ذمہ داری اُمت پر اور خصوصاً حاملین علوم نبوت پر ہے۔

پس نبوت ختم نہ ہونے کی صورت میں آنے والے کوئی نبی و رسول جو کام ضلال و فساد کی اس دنیا میں کرتے اور جو پیغام اس زمانہ کے لوگوں کو دیتے، اس عہد کے مسلمانوں، بالخصوص علوم کتاب و سنت کے امینوں کا فرض ہے کہ وہ اسی کام اور پیغام کو لے کر کھڑے ہوں اور اسی کے واسطے اپنی جانیں کھپانے کا فیصلہ کریں۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اس دنیا میں کچھ اور بھی ہماری قومی، تمدنی اور اجتماعی ضرورتیں اور اہمیت رکھنے والے قومی مسائل ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایمانی نقطۂ نظر سے ضروری ہے کہ ان قومی مسائل و ضروریات کو ترتیب اہمیت میں وہی درجہ دیا جائے جو انبیاء علیہم السلام کے طرز عمل نے دیا ہے، نیز ان عمومی ضروریات کے بارہ میں بھی جو کچھ سوچا جائے اور جو کچھ کیا جائے نبوت کے اس مرکزی مقصد کو سامنے رکھ کر سوچا اور کیا جائے۔ غرض یہی ہمارے تمام مسائل و مہمات کی روح اور اصل و بنیاد ہو اور باقی سب کچھ اسی کے واسطے اور اسی کے فروع اور توابع ہوں۔

مگر آج ہو یہ رہا ہے کہ یہ اصل مقصد تو بالکل کسمپرسی کے عالم میں پس پشت جا پڑا ہے اور وہ دوسرے قومی مسائل جو اس کے خادم ہونے کی حیثیت سے ہمارے سامنے آنے چاہییے تھے وہی آج مقصود بالذات بن کر ہمارا مقصد حیات بنے ہوئے ہیں اور انھیں کے گرد ہماری ساری زندگی گھوم رہی ہے۔

مثلاً اسمبلیوں میں اپنی اپنی پارٹیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سیٹیں حاصل کرنے کے لیے ہمارے عوام و خواص آج جو جد و جہد کر رہے ہیں اور جس طرح اس راہ میں انھوں نے مہینوں سے اپنے چین و آرام اور اپنے جان و مال کو ارزاں بلکہ بے قیمت کر رکھا ہے اور کلکتہ سے لے کر اچی تک، بمبئی سے پشاور تک سارا دیو بند... سے لے کر ... گڑھ تک ... جو قیامت خیز ہلچل اور طوفانی جد و جہد ہو رہی ہے،

کیا دعوت دینی کے احیاء کے واسطے اور غافل و خدا ناشناس بندگانِ خدا کو نبوی ہدایات سے آشنا کرنے اور ان میں صحیح دینی شعور اور صلاح و تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اُس کا عشر عشیر بھی ہم نے کبھی کیا ہے۔

اس سلسلہ میں بڑا حیرت انگیز بلکہ عبرتناک طرزِ عمل ان بزرگوں کا ہے جن کے متعلق خود ہم کو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ نہ وہ اپنے لیے یا اپنے دوستوں کے لیے وزارتوں کے خواہاں ہیں نہ اپنے اعزا کے لیے سرکاری نوکریوں اور سرکاری ٹھیکوں کے اچھے مواقع نکالنا ان کے پیشِ نظر ہے اور نہ کوئی اور بھی ان کی اس طرح کی ذاتی غرض ہے اور نہ قوم کا صرف اقتصادی اور معاشی مسئلہ ہی ان کی اس سعی و حرکت کا اصل محرک ہے بلکہ اس ساری تگ و دو میں درجہ اول کا ان کا مطمح نظر صرف یہی ہے کہ آئندہ کی کسی درجہ کی خود مختار حکومت کے نظام میں دخیل ہو کر بقدر امکان مسلمانوں کی قومی اور دینی ضرورتوں کی بہتر تنظیم و تشکیل کی جا سکے اور انگریزی حکومت کے اس طویل عرصہ میں اُن کے دین، اُن کے قومی خصائل اور مفادات کو جو نقصان اب تک پہونچتا رہا ہے اور پہونچ رہا ہے اس کا سدباب ہو سکے۔ اور مستقبل کی سیاسی ترقی کا رُخ دین کے خلاف نہ ہونے پائے۔

حالانکہ موجودہ حالات اور واقعات کی رفتار نے اب اس حقیقت کو بھی بالکل بے نقاب کر دیا ہے کہ اس دروازے سے اس مقصد میں کامیابی کا امکان بھی صرف اس صورت میں ہے کہ آپ کم از کم مسلمانوں میں عمومی تبلیغ و تعلیم اور عمومی تربیت کے ذریعہ غرض پرستی یا قوم پرستی کے بجائے محض حق پرستی کا جذبہ اور ایسا دینی شعور، یا ایسی مومنانہ سیرت، اور دین کی اتنی قدر و اہمیت پیدا کر دیں کہ دین ان کی زندگی کا سب سے اہم اور سب سے بڑا فعال عنصر ہو، اور اُن کے ذہن اور دماغ کی آپ اس طرح تربیت کریں کہ وہ خالص دین اور دینی مفاد کو اپنی پسند اور اپنے انتخاب کا معیار بنا لیں۔

الغرض آپ جب تک اپنی خاموش اور مخلصانہ کوششوں سے عام مسلمانوں تک میں ایسا دینی شعور اور دین کی قدر کو پیدا نہ کریں گے رائے اور انتخاب کی حکومت کے اس دور میں کسی طرح بھی آپ ایسی سیاسی طاقت حاصل نہ کر سکیں گے جس کو آپ اپنی آرزوؤں کے مطابق دین کی بہتری کے لیے استعمال کر سکیں۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ہماری قوم کا غربت زدہ اور ناتعلیم یافتہ طبقہ تو حالات

ونادانی اور اجتماعی معاملات کو سمجھ سکنے کی صلاحیت سے محرومی کے علاوہ پست درجہ کی غرض پرستی میں مبتلا ہے جس کی وجہ سے ہر چالاک اور ناخدا ترس آدمی جھوٹ فریب کے ذریعہ اپنے دام تزویر میں اس کو پھانس سکتا ہے، یا معمولی لالچ یاد بادے کر اُن کی تائید وحمایت اپنے لیے حاصل کرسکتا ہے ـــــــــ اور وہ تعلیم یافتہ خوش حال شہری طبقہ جو اجتماعی معاملات کی اہمیت کو سمجھتا ہے اور غرض پرستی سے بالاتر ہوکر کچھ سوچتا اور کرتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کی غالب اکثریت نے قومی مفاد کو اپنا سیاسی آلہ بنا لیا ہے پھر سیاسیات میں انگریزوں کی مکمل شاگردی کی وجہ سے اس طبقہ کا قومی مفاد کا تصور بھی خالص مادہ پرستانہ ہے اس لیے اس طبقہ کی تائید وحمایت بھی وہی لوگ زیادہ حاصل کرسکتے ہیں جو خود بھی مادہ پرستانہ نقطہ نظر رکھتے ہیں، اور اس لیے قومی مفاد ہی کو اپنا لائحہ عمل اور سیاسی آلہ بنائے ہوئے ہیں۔

یہی وہ صورت حال ہے جس نے ہماری قومی سیاست کی قیادت وزعامت مادہ پرستانہ نقطہ نظر رکھنے والے دین سے بے بہرہ چند لیڈروں اور چند خود غرض دولت مندوں کے ہاتھوں میں دے دی ہے اور بڑے بڑے اکابر دین جو ان کے حریف بنے شکست خوردہ ہیں اور جو حلیف بن گئے ہیں، اُن کے ہاتھوں میں بھی سوائے تائیدی جھنڈوں کے اور کچھ نہیں ہے۔

پس اس صورت حال کو بدلنے کی واحد سبیل بھی صرف یہی ہے کہ آپ خدا کا کام سمجھ کر اور اجر آخرت پر نظر جما کر عوام میں دینی روح پھونکیں اور صحیح دینی شعور کو ان میں پیدا کرکے ان کے ذہن اور دماغ کی اس طرح تربیت کریں کہ دین ہی اُن کے لیے فیصلہ کی میزان اور انتخاب کا معیار ہو اور اس کی روشنی میں وہ مسٹر جناح اور مولانا شبیر احمد اور مسٹر آصف علی اور مولانا حسین احمد کی ذوات اور ان کے مقاصد کے فرق کو سمجھ سکیں۔

اس کے خلاف اگر آپ نے وقتی طور پر ایک چلنے والا حربہ سمجھ کر غریب کاشتکار پیشہ اور مزدور پیشہ مسلمانوں میں روٹی اور پیٹ کے مسئلے کی اہمیت کے احساس کو تیز کرکے کسی اقتصادی اور معاشی نعرے کو مقناطیس بنایا اور اس کے ذریعہ ان غریبوں کی تائید وحمایت حاصل کرنے کی اس وقت کوشش کی، تو چاہے اس میں کہیں کہیں آپ کو کوئی وقتی کامیابی بھی حاصل ہو جائے لیکن یقین رکھیے کہ انجام کار یہ پالیسی آپ کے اور آپ کے مقاصد کے لیے سخت مضر ہوگی اور

آپ کے لگائے ہوئے اس بیج کے پھل صرف کمیونسٹ کھائیں گے کیونکہ ظاہر ہے کہ خالص اقتصادی اور معاشی مسئلہ میں آپ کسان اور مزدور کے سامنے کمیونسٹ سے بڑھ کر کوئی پیشکش نہیں کر سکتے۔

علیٰ ہذا اگر آپ نے وقت کا ایک چلتا ہوا کام سمجھ کر مسلمان قوم کے خالص مادی منافع اور محض سیاسی استقلال کے مسئلہ کو اگر مسلمانوں کا اصل مسئلہ بنانے کی کوشش کی اور عوام کے ذہن و دماغ کو اسی اصول پر آپ نے تیار کیا تو آپ کی اس کوشش سے فائدہ بھی وہی لوگ اٹھائیں گے جو محض عاجلہ کے پرستار اور مادہ پرستانہ قومی و سیاسی نقطہ نظر رکھنے والے ہیں۔ کیونکہ اس بارہ میں آپ کبھی ان سے آگے نہ جا سکیں گے۔

الغرض آجکل کی سیاست و حکومت میں اہل دین کی موثر حصہ داری کا راستہ بھی صرف یہی ہے کہ تبلیغ اور عمومی تربیت کے ذریعہ عوام میں صحیح دینی شعور پیدا کیا جائے اور دینی نقطہ نظر کو ان کے ذہن و دماغ پر اتنا حاوی اور ان کے مزاج میں اتنا دخیل کر دیا جائے کہ وہ ہر معاملہ کو مومن ہی کی نگاہ سے دیکھیں اور مومن کے ہی ذہن سے سوچیں اور دین ہی کو معیار و میزان بنا کر معاملہ کا فیصلہ کریں۔

اس سلسلہ میں بعض حضرات کو ایک بڑا مغالطہ یہ بھی ہے کہ سیاسی اقتدار حاصل کیے بغیر ہم عوام کی کوئی دینی اصلاح نہیں کر سکتے اس لیے جس طرح اور جس راستہ سے بھی ہو سکے پہلے سیاسی اقتدار میں حصہ لینے کی جد و جہد کرنا ہی صحیح طریقہ کار ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ محض خام خیالی ہے اور نبوت و رسالت اور سلسلہ اصلاح و تجدید کی ساری تاریخ اس کی تکذیب کر رہی ہے اگر عوام الناس کی دینی ہدایت و اصلاح کا کام سیاسی اقتدار کے بغیر ناممکن یا متعذر ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہر نبی کو سیاسی اقتدار اور حکمرانی کی طاقت پہلے ہی دن دے کر بھیجا کرتا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کے جتنے اولوالعزم پیغمبر اس دنیا میں آئے مادی طاقت کے نقطہ نظر سے بالکل بے سر و سامانی کی حالت میں دعوت الی اللہ اور ہدایت خلق کا کام کیا اور بعد میں ان کو اگر سیاسی اقتدار بھی حاصل ہوا ہے تو اسی دعوت و ہدایت ہی کے راستہ سے اور بظاہر اسباب انہی تیار کردہ ہدایت جماعت کی جد و جہد سے حاصل ہوا ہے ــــ علیٰ ہذا علماء مجددین اور مصلحین امت کا طریقہ کار بھی یہی رہا ہے۔

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دینی و اخلاقی اصلاح و تربیت کے بغیر کسی قوم کو اگر سیاسی اقتدار حاصل ہو بھی جائے تو دین و دیانت کے حق میں وہ ہلاکوؤں اور چنگیزوں کا اقتدار ہوتا ہے۔
کیا آج ترکی میں، ایران میں اور عراق میں سیاسی اقتدار مسلمانوں ہی کے مسلمان نمائندوں کے ہاتھ میں نہیں ہے؟ مگر چونکہ ان ممالک کی رائے عامہ بھی ہندوستان کے عام مسلمانوں کی طرح دینی نقطۂ نظر سے محروم ہے اور زمانہ دراز سے ان کے عوام کی بھی دینی تعلیم و تربیت نہیں ہوئی ہے اس لیے ان کا سیاسی اقتدار دین کے حق میں غیر مسلموں کے سیاسی اقتدار سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے ــــ دراصل وہی سیاسی اقتدار اور وہی سیاسی طاقت دین کے لیے مفید اور کارآمد ہو سکتی ہے اور اسی سے دین کی خدمت کا کام لیا جا سکتا ہے جس کی بنیاد کسی عمیق اور مخلصانہ دینی دعوت اور دینی اصلاح کی ٹھوس کوششوں پر قائم ہو، آج جو حضرات یورپین تحریکات اور نظریات سے متاثر ہو کر اتاترک، رضا شاہ اور امان اللہ خاں کی طرح قومی یا وطنی لائنوں پر اپنی ساری کوششوں کو لگائے ہوئے ہیں اور دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی اپنے عوام میں بھی صرف روٹی پیٹ کے مسئلہ یا مسلمان قوم کے مفاد کے جذبہ کو تیز کر کے ان کے ذہن و دماغ کی تربیت یورپ کی مادہ پرست قوموں کے طور طریقوں سے کر رہے ہیں اور ان راستوں سے ہونے والے اقتدار سے اپنی دینی تمناؤں کو بھی وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ ان کے عزائم چاہے کتنے ہی مقدس ہوں مگر اس میں شبہ نہیں کہ ببول کے درخت کو دن رات پانی دے دے کر وہ سیب اور انار کے پھل اس سے حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں جس کا نتیجہ معلوم ہے۔

بہرحال دین کی بقا، اس کی ابری سربلندی، اور حاملان دین کے برسر اقتدار آنے اور وقت کی سیاست کو دین کا خادم بنا سکنے کی واحد صورت یہی ہے کہ آپ اپنی قوم کی دینی تربیت اور اصلاح کی طرف متوجہ ہوں اور ان کے اندر حق پرستی کے جذبہ کو تمام دوسرے جذبات پر غالب کرنے کی کوشش کریں، اس مقصد کے لیے مخلصانہ کوشش کے بغیر اور عوام میں دینی رجحان کو تمام دوسرے رجحانات پر غالب کیے بغیر صرف موجودہ سیاست کی راہ سے قومی یا وطنی مفادات کی امیدیں تو بالکل صحیح ہیں لیکن اس کے ذریعہ دین کی خدمت کا ہر خیال اور ارادہ محض خواب ہے جس کی تعبیر دیکھنے کے لیے آپ اور آپ کے بعد آنے والے بھی زندگیوں بھر ترستے ہی رہیں گے۔

بہت ممکن ہے کہ برسہا برس سے موجودہ سیاسی جماعتوں کے ہنگامہ خیز پروگراموں پر چلنے والے بعض حضرات جو اس طرح کے کسی خاموش اور ٹھوس تعمیری اصلاحی کام کے عادی نہیں رہے ہیں، موجودہ فضا میں اس اصلاحی اور تبلیغی کام کو ناممکن یا مشکل ترین کام سمجھیں اور میری اس گزارش کو آج کے مارگزیدہ کے لیے عراق سے تریاق لانے کا مشورہ قرار دیں ــــــ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جن راہوں میں وہ برسوں سے سر کھپا رہے ہیں عوام کی اصلاح اور دینی تربیت کا یہ راستہ اگرچہ ان کے مقابلہ میں بے مزہ، صبر آزما اور خشک تو ضرور ہے مگر نہ تو ناممکن ہے اور نہ اتنا دشوار اور بھیر کا راستہ ہے جتنا کہ سمجھا جا رہا ہے۔

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت تبلیغ و اصلاح کے سلسلہ میں راقم سطور کا جو کچھ تھوڑا سا تجربہ ہے اس کی بنا پر وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس الیکشن میں جس تن دہی اور بے جگری سے ہمارے سیکڑوں احباب اور بزرگ اور ان کے ہزاروں متبعین کام کر رہے ہیں اگر اس سے صرف چوتھائی مقدار میں بھی، اخلاص، صبر اور سلیقہ کے ساتھ ہم اس کے لیے جدوجہد کریں تو انشاء اللہ صورت حال نمایاں طور پر بدل سکتی ہے اور محیر العقول تبدیلی ہو سکتی ہے ــــ افسوس ہے مجھے ایسا کوئی ذریعہ حاصل نہیں کہ میں اپنا محکم یقین و اذعان دوسروں کے دلوں میں ڈال سکوں۔

اس شمارے کے صفحہ ۳۶ پر

چند ضروری گذارشات کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اسے ضرور بغور ملاحظہ فرمائیں۔

ــــــــــــ ادارہ

سرزمین امریکہ میں اسلام کے علمبردار

ڈاکٹر عبادالرحمٰن نشاط استاذ شعبۂ انگریزی ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ

(دوسری و آخری قسط)

شکاگو سے تقریباً ستر میل کی دوری پر "ڈی کیلب" نامی ایک مقام ہے جو ایک مشہور یونیورسٹی NORTHERN ILLINAIS UNIVERSITY کی نسبت سے خاصا معروف ہے۔ یونیورسٹی خاصی بڑی ہے۔ میں نے اپنی آخری ڈگری اسی یونیورسٹی سے حاصل کی اور اس وجہ سے وہاں برسوں میرا قیام رہا۔ ڈی کیلب کھلے میدانوں اور فارموں کے درمیان بسا ہوا چھوٹا سا ایک خوبصورت شہر ہے، ۴۰-۴۵ ہزار کی اس آبادی میں تقریباً تیس ہزار افراد یونیورسٹی سے متعلق ہیں اور باقی ۱۰-۱۵ ہزار مقامی افراد ہیں، چونکہ ڈی کیلب کی آبادی کا بڑا حصہ یونیورسٹی کی وجہ سے نوجوان طالب علموں کا تھا اس لیے اس شہر کا ماحول اسی آزادانہ طرز زندگی اور بے باکانہ بے راہ روی کا حامل تھا جو امریکی نوجوان طبقے کی خصوصیت ہے لیکن اس آزادانہ ماحول میں جہاں مادیت اور دنیاوی لذات کا ہوش ربا جمال، طلسمی رعنائی اور دلفریب خود سپردگی انسان کو بے خود اور مسحور کیے دیتی تھی، وہاں اسی ماحول کے قلب میں اسلام کے ایسے وفادار جگر گوشے بھی تعلیم حاصل کر رہے تھے جن کے دل اسلام کی محبت سے معمور اور جن کی آنکھیں یقین محکم سے روشن تھیں، ان مسلمان لڑکے اور لڑکیوں نے جو مختلف ممالک سے تعلق رکھتے تھے اپنے آپ کو

متحد کرنے کے لیے ایک اسلامی سوسائٹی ——— ISLAMIC SOCIETY OF NORTHRN
ILLINAIS UNIVERSITY کی بنیاد ڈالی تھی اور ایک چھوٹی سی عمارت کرائے پر لے کر
اپنے مرکز کے طور پر ایک مسلم ہاؤس قائم کر لیا تھا، اس کے ہال میں نماز کا انتظام تھا، دائیں جانب
شلف پر دینی کتابیں سجی تھیں، اور دوسرے گوشے میں ایک بڑا فریزر (FREEZER) رکھا ہوا
تھا جس میں ذبیحہ گوشت رکھنے کا انتظام تھا تاکہ وہاں کے مسلمان غیر ذبیحہ گوشت سے پرہیز
کر سکیں، اس مسلم ہاؤس کی فضا بھی عجیب پر نور تھی، وہاں پانچوں وقت اذان پکاری جاتی
اور جماعت سے نماز ہوتی، جو لڑکے کلاس سے فارغ ہوتے، جماعت سے نماز ادا کرنے کے
شوق میں مسلم ہاؤس آتے، دن میں کلاس کی وجہ سے سب لڑکے جماعت میں شریک نہیں ہو پاتے
لیکن مغرب وعشاء میں بڑی بہار ہوتی، خصوصاً عشاء کی نماز میں ۲۰-۲۵ لڑکے جمع ہو جاتے
جو امریکہ کی مشغول زندگی کے پیش نظر ایک اچھی خاصی تعداد کہی جا سکتی تھی، اذان دینے
میں لوگ ذوق و شوق سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے، ملیشیا کے بعض لڑکے
جب خوش الحانی سے اذان پکارتے تو سننے والوں کے دلوں میں گداز پیدا ہو جاتا نماز کے
بعد ایک دو حدیث شریف پڑھی جاتی اور دعا ہوتی، جمعہ کے روز (چونکہ سنیچر اور اتوار فرصت
کے دن ہوتے تھے) مسلم ہاؤس کی رونق اور بڑھ جاتی، عشاء کی نماز کے بعد اکثر مسلم ہاؤس میں رہنے
والے لڑکے نمازیوں کے سامنے پھل اور چائے لا کر رکھ دیتے، کبھی کبھی مسلمان لڑکیاں جو
اسلامی سوسائٹی اور مسلم ہاؤس سے وابستہ تھیں اور ایک علاحدہ مکان میں رہتی تھیں، اپنے
نمازی بھائیوں کے لیے خشک ناشتہ بنا کر بھیج دیتیں، لڑکے ٹولیوں میں بیٹھ جاتے اور اس سے
شغل کرتے، ان میں آٹھ دس لڑکے ایسے تھے جو جلد چائے سے فراغت پا کر ہال کے ایک
گوشہ میں حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے اور ہر ہفتہ ایک حدیث عربی متن اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ
یاد کرتے اور پہلے یاد کی ہوئی احادیث ایک دوسرے کو سناتے، ان کا عزم چالیس احادیث
کے یاد کرنے کا تھا تاکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان وعدوں کی مستحق ہو سکیں جو
چالیس احادیث کی حفاظت پر ہیں۔ رمضان المبارک میں مسلم ہاؤس کی یہ محفل بہت نکھر جاتی،
لوگ مسلم ہاؤس زیادہ آتے اور وہاں زیادہ وقت گزارتے، نماز و تلاوت کا زیادہ اہتمام کرتے

اور ایک دوسرے سے زیادہ قربت محسوس کرتے، عمومی دعوت کا سلسلہ تقریباً پورے مہینہ چلتا، کبھی ایک شخص تنہا اور کبھی اپنے کسی دوسرے ساتھی کے ساتھ مل کر مسلم ہاؤس آنے والے سارے مسلمانوں کی دعوت کرتا، دعوت کا کھانا لڑکے مل جل کر مسلم ہاؤس میں پکاتے، پھر سب نشاط و بشاشت کے ماحول میں افطار کرتے، نماز مغرب ادا کرتے، کھانا کھاتے اور عشاء، اور تراویح کی تیاریوں میں لگ جاتے جمعہ کی نماز میں چونکہ زیادہ لوگ ہوتے اس لیے اس کا انتظام ایک مقامی چرچ کے ہال میں کیا جاتا، چرچ کا مرکزی ہال لوگ دو گھنٹے کے لیے کرایہ پر لیتے، وقت ہونے پر اذان دی جاتی، پھر خطبہ ہوتا اور نماز ادا کی جاتی اور دیکھنے والی نگاہیں یہ نظارہ دیکھتیں کہ جو گھر خالصتاً کفر کے نام پر تعمیر کیا گیا اس کے اندر اللہ کے یہ بندے خدائے واحد کی ربوبیت کی آواز بلند کر رہے ہیں اور اس کے در و دیوار کو اپنے رکوع و سجود سے منور کر رہے ہیں۔ سنیچر کے دن لڑکے چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بٹ کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اسلام کا مطالعہ کرتے اتوار کی صبح کو مسلم ہاؤس کا ہال ڈی کیلب کے مسلم بچے اور بچیوں کے لیے خالی کر دیا جاتا، صبح ساڑھے سات بجے چند مسلمان لڑکے اپنی گاڑیاں لے کر نکل جاتے اور مختلف مسلم خاندانوں سے بچوں کو لاکر مسلم ہاؤس پہنچا دیتے، —— وہاں تقریباً ۸ بجے سے مسلمان لڑکیاں پڑھانے کی ذمہ داری سنبھال لیتیں، بچوں اور بچیوں کو تعلیمی ضرورت، عمر اور زبان کے لحاظ سے مختلف گروپ میں تقسیم کر دیا جاتا اور اس طرح وہاں ایک دینی مدرسہ قائم ہو جاتا، پڑھانے والی لڑکیاں محبت اور اخلاص سے پڑھاتیں، بچے شوق اور دلچسپی سے پڑھتے اور اکثر ایسا ہوتا کہ اسلام سے اپنے رشتے کا احساس اور اس پر افتخار کا جذبہ جو ان بچوں کو ان کے والدین کبھی غایت مشغولیت کی وجہ سے اور کبھی امریکی تہذیب سے مرعوبیت کے باعث نہ دے پاتے یہ بے لوث لڑکیاں انھیں عطا کرتیں۔

ڈی کیلب میں اس مسلم ہاؤس کی حیثیت بس کچھ ایسی تھی جیسے کفر و مادیت کی گہری تاریکی میں ایک روشن منارہ سربلند کیے سکون و سلامتی کی دعوت دے رہا ہو، ایک دن جب شاید عشاء کی نماز ہو چکی تھی ایک غیر مسلم مسلم ہاؤس میں آیا اور دیر تک وہاں موجود مسلمان لڑکوں سے اسلام پر گفتگو کرتا رہا، جاتے وقت اس نے کہا "میرے بعض مسلمان دوستوں نے

جو تھیں پسند نہیں کرتے، مجھ سے تم لوگوں کا تذکرہ کیا تھا، انھوں نے کہا تھا کہ تم لوگ بہت قدامت پسند ہو، کھانے پینے، پہننے، اوڑھنے، اٹھنے بیٹھنے اور تفریحات میں مذہبی بندشوں کے قائل ہو اور اپنے ان ہم وطن مسلمانوں سے بھی زیادہ میل جول نہیں رکھتے جو آزادی پسند ہیں۔ ملنے سے پہلے میرے ذہن میں تمھارا ایک منفی نقشہ تھا لیکن اب میں تمھارے لیے اپنے دل میں محبت و احترام کا جذبہ محسوس کرتا ہوں ___ تم لوگ بہت خوش نصیب ہو کہ تمھارا ایک مذہب ہے جس سے تم پوری طرح مطمئن ہو، میں عیسائی تھا لیکن اب میں اپنے مذہب میں یقین کھو چکا ہوں۔ میں نے چند دن پہلے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے لیکن مجھے وہاں بھی سہارا نہیں ملا" ___ وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگیا اور پھر بولا ___ "مجھے یہاں نماز کے ہال میں بیٹھ کر ایک عجیب و غریب سکون کا احساس ہوتا ہے"

ڈی کیلب کا نام آتا ہے تو ذہن کے گوشوں میں ایک ایسی باوقار مسلمان لڑکی کی تصویر ابھرتی ہے، جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا لیکن پھر بھی جس کا خیال میرے دل میں فخر و تعظیم کے جذبات جگاتا ہے، ایک دن میرے ایک عرب اور ایک مصری دوست ایک نومسلم امریکی طالب علم سے ملنے اس کے ہوسٹل (HOSTEL) گئے وہاں اس کا ایک امریکی دوست بھی بیٹھا ہوا تھا۔ تعارف ہوتے ہی اس نے خوش ہو کر پوچھا ___ "کیا تم لوگ مسلمان ہو؟" ___ اثبات میں جواب پا کر اس نے اسلام میں اپنی دلچسپی ظاہر کی اور بس تھوڑی ہی دیر میں کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔ یہ بات میرے دوستوں کے لیے بھی تعجب کی تھی کہ اس شخص نے اپنی زندگی کے بارے میں اتنا اہم اور سنجیدہ فیصلہ اتنی آسانی سے کیسے کر لیا اور انھوں نے اپنے استعجاب کا اظہار اس شخص پر بھی کیا، اس شخص کا جواب تھا ___ "اگرچہ اسلام کا نام میں نے سب سے پہلے میل کم اکس (MALCOLMX) کے حوالے سے سنا تھا لیکن اس کی صداقت کا ناقابل تردید ثبوت مجھے ملائشیا کی ایک مسلمان لڑکی کی شخصیت سے ملا، وہ لڑکی اسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہی تھی، جب میں نے اسے پہلی بار یونیورسٹی میں دیکھا تو میری پوری توجہ اس کے لباس کی طرف مبذول ہوگئی، اس کا لباس امریکی اور دوسری غیر ملکی لڑکیوں کے عام لباس سے بہت مختلف تھا، اس نے ایک ڈھیلا ڈھالا لباس

پہن رکھا تھا جس سے ہاتھ اور چہرہ کے علاوہ اس کا پورا جسم چھپا ہوا تھا؛ میرے لیے یہ بات تعجب کی تھی اس لیے کہ امریکہ میں نوجوان لڑکیوں کے لیے جسم کو زیادہ سے زیادہ کھلا رکھنا جدید فیشن ہے، یہ کون لڑکی تھی جو اس طرح ماحول کے خلاف تنہا کھڑی تھی، میرا تجسس بڑھا اور میں نے اس لڑکی کے پاس جاکر اس سے اس کے لباس کے بارے میں سوال کیا، اس نے جواب دیا۔

"میں مسلمان ہوں اور میں نے اسلامی تعلیمات کے مطابق یہ لباس پہن رکھا ہے، میرا مذہب عورتوں اور مردوں کو مناسب لباس پہننے کا حکم دیتا ہے، میں اس پر عمل کرتی ہوں۔ اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ اسی میں سلامتی ہے" میں نے سوال کیا۔ "کیا تم مسلمانوں میں کوئی مذہبی عہدہ رکھتی ہو، جیسے ہم عیسائیوں میں نن (NUN) ہوتی ہیں؟" "نہیں" اس لڑکی کا جواب تھا۔ "میں یہ لباس کسی عہدے کی مجبوری کی وجہ سے نہیں پہنتی بلکہ اس لیے پہنتی ہوں کہ مجھے اسلام اور اس کے اصولوں سے محبت ہے، میں ایک عام لڑکی ہوں، تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں اپنے وطن واپس جاکر ایک گھریلو زندگی گزارنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ میری آرزو ہے کہ میں ساری زندگی اسلام کے اصولوں کو اپنا رہنما بناؤں اور اس دنیا سے جاتے وقت آئندہ نسل کو ان اصولوں میں یقین کی دولت قولاً اور عملاً سونپ جاؤں۔"

میری نگاہوں میں تحسین کے جذبات دیکھ کر اس لڑکی نے اپنا کتابوں کا بیگ کھولا اور اسلام پر ایک تعارفی کتابچہ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "جیسے تمھیں یہ بات پسند آئی تمھیں اسلام کے دوسرے اصول بھی پسند آئیں گے، خدا تمھارا مددگار ہو۔"

اس امریکن نوجوان نے میرے دوستوں سے کہا:

"اس مسلمان لڑکی نے میرے دل پر احترام کے بہت گہرے نقوش چھوڑے۔ میں نے محسوس کیا کہ جس مذہب نے ایک کمزور سی لڑکی کو جو اپنے ماحول سے ہزاروں میل دور غیروں کے درمیان تھی یہ جرأت اور یقین عطا کیا وہ یقیناً ایک سچا مذہب ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے لیے میں نے تم سے کوئی ثبوت طلب نہیں کیا، تم سے سوالات نہیں کیے، بحث نہیں کی۔"

سردیوں کی ایک شام کو ڈی کیلب میں یونیورسٹی کے ایک کشادہ اور خوبصورت ہال

میں لوگ جمع تھے، یونیورسٹی کی اسلامی سوسائٹی نے مسلم اور غیر مسلم سامعین کے لیے اسلام پر لکچر کا انتظام کیا تھا اور اس مقصد کے لیے باہر سے دو مقرروں کو مدعو کیا تھا۔ تقریر کے بعد سوال و جواب کے وقفے میں ایک مسلمان طالب علم جو پولیٹیکل سائنس میں پی، ایچ، ڈی کر رہا تھا اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے سوال پوچھنے کے لیے وقت لیا، اس کا سوال اسلامی معاشرے میں عورت کے مقام سے متعلق تھا۔ وہ سیکولر نظام کے مساویانہ سلوک کا قائل تھا اور اسلامی نظام میں اس کی کمی کا شاکی ۔۔ "ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ اسلامی معاشرے میں عورت کو دوسرے درجے کے شہری سے زیادہ کی حیثیت حاصل نہیں"۔۔ مقرر نے اس کا معقول و مدلل جواب دیا ۔۔۔

اگر عورت کو اسلام میں دوسرے درجے کا شہری کہا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں پہلے درجے کا حامل کون ہے؟ کیا مرد؟ حقائق اس سے انکار کرتے ہیں، اسلام یہ تسلیم کرتا ہے کہ مرد و عورت کی فطرت میں چند بنیادی فرق ہیں اس لیے بعض مخصوص باتوں میں وہ دونوں فریقوں پر جدا جدا ایسی ذمہ داری ڈالتا ہے جو ان کے طبعی و فطری مزاج سے میل کھاتی ہو۔ اس کے علاوہ مرد و عورت اسلام کی نگاہ میں برابر ہیں، اگر عورت کو اپنے جسم کو مناسب طریقے سے چھپانے کا حکم ہے تو یہ حکم مردوں کے لیے بھی ہے، اگر عورتوں کے لیے غیر محرم مردوں سے اختلاط منع ہے تو مردوں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ اگر مرد اپنی پسند سے شادی کر سکتا ہے تو عورت بھی ایسا کر سکتی ہے اگر مرد اپنی شریک حیات سے کسی مجبوری و ناپسندیدگی کے باعث علاحدگی اختیار کر سکتا ہے تو عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے، اگر مرد اپنے مال کا مالک ہے تو عورت بھی اپنے مال پر مکمل حق تصرف رکھتی ہے اگر مرد نیکی اور اخلاص کے باعث اللہ تعالیٰ سے بہت قریب جا سکتا ہے تو عورت کے لیے بھی کوئی حد مقرر نہیں "۔۔۔۔۔۔

مقرر کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی، ادھر سوال پوچھنے والا ابھی اپنی جگہ پر کھڑا تھا صاف ظاہر تھا کہ اس کا سوال اب بھی باقی تھا، شاید وہ اپنا سوال کسی دوسرے پہلو سے اٹھانا چاہتا تھا، لیکن میری توجہ ملیشیا کی ایک طالب علم لڑکی کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ جو سوال کرنے کی اجازت لینے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھائے ہوئے تھی اور بہت بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی، مقرر کا جواب ختم ہوتے ہی میں نے موڈریٹر (MODERATOR) کی حیثیت سے

اجازت دی، وہ اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی، ایک نگاہ سوال پوچھنے والے پر ڈالی اور پھر سامعین سے یوں مخاطب ہوئی:

"میں نے یہ وقت سوال پوچھنے کے لیے نہیں، اس سوال کا جواب دینے کے لیے لیا ہے جو اسلام میں عورت کے مقام کے سلسلے میں پوچھا گیا ہے: میں ایک لڑکی ہوں، اور مغربی تہذیب نے عورت کے دامن میں پھول کے نام پر جو کانٹے ڈالے ہیں، ان کی چبھن سے مردوں سے زیادہ واقف ہوں، آپ آج مجھے اسلامی لباس میں دیکھ رہے ہیں لیکن آپ کو یہ بات معلوم نہیں ہوگی کہ چند سال قبل تک میں مکمل طور پر مغربی تہذیب کے مطابق زندگی گزار رہی تھی، یہی وجہ تھی کہ میں تنہا اپنے ملک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ آئی تھی، ان دنوں مجھے اصرار تھا کہ میں وہ سب کچھ کر سکتی ہوں. جو ایک مرد کر سکتا ہے۔ چنانچہ میں ہر معاملہ میں مرد کی ہمسری کا جذبہ دل میں چھپائے اس طرح زندگی گزار رہی تھی کہ جیسے وہ سب کچھ کر سکنا، جو مرد کر سکتے ہیں عورت کے لیے کامیابی کی میزان ہو، میں ایک عورت تھی لیکن مغربی تہذیب کے زیر اثر میں ایک مرد کی طرح زندگی گزارنے میں اپنا رول ادا کرنا چاہتی تھی، میں جو تھی وہ نہیں رہنا چاہتی تھی، جو نہیں تھی، وہ بن جانے کے لیے ساری کوششیں صرف کرتی تھی، نتیجتاً میری زندگی میں ایک زبردست انتشار تھا، امریکہ آکر میں اپنی چند مسلمان بہنوں کی کوشش سے اسلام سے قریب ہوئی اور تب میں نے محسوس کیا کہ اسلام سے دور رہ کر میں نے اپنے اوپر کتنا بڑا ظلم کیا تھا، اسلام نے عورت کی حیثیت سے میرے مقام کو تسلیم کیا اور میرے لیے ایک متوازن، خوشگوار، باعزت اور بامقصد طرز حیات کی نشان دہی کی آج میری زندگی سکون و اطمینان سے بھرپور ہے، میں نے حال ہی میں اپنے ایک ہم وطن مسلم نوجوان سے شادی کر لی ہے، میں اپنے گھر کے لیے ذمہ دار ہوں، اپنی تعلیم کو اچھے طریقے سے پورا کر رہی ہوں، اپنی مسلمان بہنوں کے ساتھ دینی پروگرام میں حصہ لیتی ہوں، اور ہفتہ میں ایک بار اس شہر کے مسلم بچوں اور بچیوں کو دینی تعلیم دیتی ہوں، آج میرے سامنے ایک مقصد ہے، اب میں ایک باوقار مسلمان عورت

ہوں، اور مغربی عورت کی طرح کسی احساس کمتری کا شکار نہیں "

اس مقام پر اس لڑکی کی آواز بھرا گئی اور اس نے جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

"اگر کسی شخص کو یہ شکایت ہے کہ اسلام نے عورت کے ساتھ انصاف نہیں کیا تو وہ مجھ سے براہ راست سوال کرے، میں اس کا جواب دوں گی"

میری نگاہیں سامعین کی طرف اٹھ گئیں، پورے ہال میں سناٹا چھا گیا تھا، سوال پوچھنے والا اپنی جگہ پر نہ جانے کب بیٹھ گیا تھا ——— ملائشیا کی آٹھ دس لڑکیوں نے، جو اسلامی لباس زیب تن کیے ہوئے تھیں، شکر گزاری کی نگاہوں سے اس لڑکی کی جانب دیکھا جیسے وہ سب کہہ رہی ہوں ——— شکریہ، بہت بہت شکریہ! تم نے ہم سب کے جذبات کی ترجمانی کی" ——— لیکن میری نگاہیں اس امریکی نوجوان خاتون کی طرف متوجہ تھیں جس نے حال ہی میں اسلام قبول کیا تھا اور ایک ایرانی مسلمان سے شادی کی تھی، جب ملیشیا کی وہ لڑکی کھڑی ہو کر اسلام سے اپنی وابستگی کا اظہار کر رہی تھی وہ امریکی لڑکی مڑ کر ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں تعجب، مسرت، محبت اور جوش کے ملے جلے جذبات موجزن تھے اور وہ زبان حال سے کہہ رہی تھی:

"میں نے امریکہ میں آنکھیں کھولیں اور اس کے اس آزادانہ ماحول میں پرورش پائی ہے جو عورت کو مرد کی طرح مساویانہ مقام دینے کا دعویدار ہے، مگر میں نے آج تک تمہاری طرح اپنے عورت ہونے میں فخر محسوس نہیں کیا، بلند ہے وہ مذہب جس نے تمہاری آنکھوں کو یقین کا یہ نور عطا کیا اور فخر ہے مجھے اب اس بات پر کہ میں ایک مسلمان لڑکی ہوں:

امریکہ میں اسلامی اصول کے مطابق زندگی گزارنے والوں اور اس پر فخر کرنے والوں کی تعداد اتنی حقیر نہیں کہ یہ چند صفحات ان کے متحمل ہو سکیں، وہ اگر بہت زیادہ نہیں تو بہت تھوڑے بھی نہیں، وہ مختلف ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان سب کے دل ایک ہی عزم سے روشن ہیں۔ ان میں وہ امریکی نومسلم بھی ہے جو ایک عرب مسلمان کو دعوت عمل دے رہا تھا، اس نے عربی لباس پہن رکھا تھا، اور عربی زبان میں گفتگو کر رہا تھا جبکہ اس کا مخاطب انگریزی لباس میں ملبوس تھا اور انگریزی میں جواب دے رہا تھا۔ ان میں ۲۳-۲۴ برس کا

وہ عرب نوجوان بھی ہے جو فخر کے ساتھ عربی لباس میں کلاس جایا کرتا تھا اور مشکل سے کوئی ایسا شخص ہو گا جس سے اسے بات کرنے کا موقع ملا ہو، اور اس نے اسے اسلام کی دعوت نہ دی ہو، جس کے نتیجے کے طور پر دس پندرہ غیر مسلم اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کر چکے تھے، ان میں وہ ہندوستانی نوجوان بھی ہے جس نے اسی، نوے ہزار ڈالر سالانہ (۹۰۰۰۰ لاکھ روپے سالانہ) کی نوکری چھوڑ کر، ایک اوسط درجے کی بزنس پر اس لیے اکتفا کر لیا کہ اس کے خیال میں امریکہ میں دین کے تقاضے اس سے جتنا وقت چاہتے تھے، نوکری کی مجبوری کی وجہ سے وہ اتنا وقت نہیں دے پاتا تھا، ان میں وہ ہندوستانی عمر رسیدہ شخص بھی ہیں جنھوں نے ضعیفی میں گھر پر آرام کرنے کے بجائے دعوت اسلام کی نسبت سے امریکہ اور کینیڈا کی طنابیں کھینچ کر رکھ دیں، ان میں وہ پاکستانی عالم بھی ہیں جنھوں نے گزارے کے لیے ایک انتہائی معمولی نوکری کی اور اپنا سارا وقت نومسلموں کو قرآن پاک پڑھانے اور دین کی ضروری باتیں سکھانے کے لیے وقف کر دیا۔ ان میں مختلف ممالک کی وہ خواتین بھی ہیں جنھوں نے موقعہ اور سہولت کے باوجود باہر جا کر نوکری کرنے سے خود کو روکا اور گھر میں اپنے بچوں کو دینی تعلیم و تربیت کے لیے ایک محاذ قائم کیا، ان میں ملائشیا کا وہ نوجوان بھی ہے جو امریکہ آیا، ایک ڈگری وہاں سے حاصل کی اور واپس جاتے وقت بولا "میں نے یہاں کے قیام کے دوران اپنے لیے ایک پینٹ یا قمیص بھی نہیں خریدا، میں جن کپڑوں میں آیا تھا اسی میں واپس جا رہا ہوں"۔ حالانکہ وہ ڈی کیلب کی اسلامی سوسائٹی کی مالی مدد میں ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا اور اس کا سب سے بامقصد اور فعال رکن تھا اور ان میں، وہ گمنام مسلمان بھی ہے جس نے ڈی کیلب کی اسلامی سوسائٹی کی مدد کے لیے ایک خطیر رقم (تقریباً ۱۱ ہزار ہندوستانی روپے) ایک لفافے میں مسلم ہاؤس کے اندر ڈال دی اور لفافے پر لکھ دیا۔ "مسلم ہاؤس کے لیے" اور کسی کو یہ بتانا بھی گوارا نہیں کیا کہ وہ کون ہے۔

یہ فہرست ابھی بہت طویل ہے جنھیں میں جانتا ہوں، ابھی ان کی کہانی ہی مکمل نہیں ہوئی اور ایسے سیکڑوں ہیں جنھیں میں نہیں جانتا، ان میں امریکی بھی ہیں اور غیر امریکی بھی، گورے بھی ہیں اور کالے بھی، مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی، کم عمر نوجوان بھی ہیں اور عمر رسیدہ حضرات بھی۔ ان سب کی زندگی یقین، جدوجہد اور جرأت کی داستان سناتی ہے اور مسلمانانِ عالم

کو عموماً اور داعیانِ اسلام کو خصوصاً احیائے اسلام کے لیے یہ پیغام دیتی ہے کہ حالات کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں، مایوسی ایک مومن کے لیے حرام ہے،

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ٥

(اور دیکھو) بے دل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا اگر تم مومن (صادق) ہو تو تمہیں غالب رہوگے۔ (آل عمران۔ ۱۳۹) عہ

عہ یہ پورا مضمون ایک پمفلٹ کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت صرف ۲ روپے ہے ادارۂ الفرقان سے طلب فرمایا جا سکتا ہے۔

گاہے گاہے باز خواں

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

ربیع الاول کے سیرتی جلوس اور جلسے

[ماہ ربیع الاول کی آمد آمد ہے۔ اور ہر طرف سے میلاد کمیٹیوں، سیرت کمیٹیوں انجمنوں اور تنظیموں کی طرف سے سیرت کے جلسوں اور جلوسوں کی تیاریوں کی خبروں اور دعوت ناموں کی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی ہے۔ واللہ وہ جذبہ تو یقیناً قابل قدر وستائش ہے جو بہت سے سادہ دل بھائیوں اور پرجوش نوجوانوں کے دل میں ان جلسوں اور جلوسوں کے اہتمام کا داعیہ پیدا کرتا ہے لیکن یہ سوچ کر بہت رنج اور دکھ بھی ہوتا ہے کہ اس جذبہ کو ان رسمی مشغولیتوں میں برباد کر کے شیطان نے ہماری کتنی قیمتی طاقت کو معطل اور مفلوج کر کے رکھ دیا ہے ــــ اللہ ہمیں عقل سلیم دے اور اپنی تمام تر صلاحیتوں اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں، عمر اور جان و مال کو اس مستقل جد و جہد میں لگانے کی توفیق نصیب فرمائے جس سے ہمارے مزاج کی ایسی ٹھوس اور پائیدار اصلاح ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہمارے ایک ایک قول اور ایک ایک قدم سے ہونے لگے اور ہمارے دل و دماغ میں ان ہی کی فکر غالب ہو جائے ــــ مناسب معلوم ہوا کہ حضرت والد ماجد مدظلہٗ کا ایک مضمون جو الفرقان کے صفر ۹۶ھ کے شمارہ میں شائع ہوا تھا، اب پھر شائع کر دیا جائے۔ ناظرین ذیل میں وہی مضمون ملاحظہ فرمائیں۔ ــــــ مدیر]

تقریباً ہر سال ایسا ہوتا ہے کہ محرم ہی کے مہینے سے ربیع الاول کے "سیرتی جلسوں" کے لیے مختلف مقامات سے دعوت نامے آنے شروع ہو جاتے ہیں اور ان کا جواب لکھنا بھی ایک

مستقل کام ہو جاتا ہے اس سلسلہ کے اکثر دعوت ناموں کا مضمون ایک ہی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ "یہاں اتنے ہزار یا اتنے لاکھ مسلمان آباد ہیں، ان میں اس قدر جہالت ہے اور اس قدر برائیاں پھیلی ہوئی ہیں آپ ہمارے اس جلسہ میں ضرور تشریف لائیے، اتنے ہزار یا اتنے لاکھ مسلمانوں کی ہدایت سے زیادہ اہم اور ضروری کوئی دوسرا کام نہیں ہو سکتا، لہٰذا اپنے تمام دوسرے کاموں کو ملتوی کر کے ہمارے جلسہ میں آنے کا ضرور فیصلہ کر لیجیے۔"

ان دعوت ناموں کے لکھنے والے خواہ خود اپنے دل میں یقین رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں لیکن مکتوب الیہ کو یہ یقین دلانے کی ضرور کوشش کرتے ہیں کہ اُن کے شہر اور ان کی بستی کے لاکھوں یا ہزاروں مسلمانوں کی ہدایت اُن کے اس جلسہ سے اور اس جلسہ میں آکر، خاص اس مقرر کے ایک تقریر کر دینے سے وابستہ ہے اور گویا کہ ساری بستی کی ہدایت بس اسی پر موقوف اور معلق ہے۔ اور اس کارِ خیر میں بس اسی کی دیر ہے۔

اگر یہ بیچارے فی الحقیقت بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں تو سادہ لوحی کی حد ہے۔ یہ لوگ اگر اپنی کم علمی کی وجہ سے ان جلسوں، جلوسوں کی اندرونی خرابیوں اور شرعی مفاسد کے ادراک سے قاصر ہیں تو کم از کم اتنی بات تو ہر آدمی کے بھی سمجھنے سوچنے کی ہے کہ اتنے برسوں سے ان جلسوں جلوسوں کا سلسلہ جاری ہے اور ہر سال اس پر روپیہ اور وقت صرف کیا جاتا ہے لیکن کیا کسی جگہ کے مسلمانوں کی ذرہ برابر بھی دینی اصلاح ان ہنگامہ آرائیوں سے ہوئی ہے۔

اصلاح تو کیا ہوتی اس ایجاد نے تو بدعات و خرافات کا ایک نیا مسئلہ امت میں شروع کر دیا ہے اور بہت سے مقامات پر سیرت کے نام سے جو جلوس نکالے جاتے ہیں اُن میں وہ سب خرافات ہوتی ہیں جو پہلے تو صرف تعزیہ داری کے محرمی جلوسوں میں ہوا کرتی تھیں، رنگ برنگ کے علم اور جھنڈے قسم قسم کے باجے نعت خوانوں اور گانے بجانے والوں کی مختلف ٹولیاں وغیرہ وغیرہ۔ اور ہمارے بریلی شریف میں تو روضۃ النبی اور سولہ والنبی (معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زچہ خانہ) کی شبیہ بنا کر تعزیہ ہی کی طرح اس کا گشت بھی ہونے لگا ہے، اس پر چڑھاوے بھی چڑھتے ہیں اور نذریں نیازیں بھی گزاری جاتی ہیں، اور ابھی تو اس سب کی ابتداء ہے

ع "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا"

الغرض ربیع الاول کے مہینہ میں سیرت النبی کے نام پر جلسوں اور جلوسوں کی شکل میں جو ہنگامہ آرائی اکثر شہروں میں ادھر چند سال سے ہونی شروع ہوئی ہے دینی اصلاح کے بارے میں اس کی بے نتیجگی بلکہ مضرت رسانی اتنی کھلی ہوئی ہے کہ کسی ادنیٰ درجہ کے سمجھ دار سے بھی مخفی نہ رہنی چاہیے اور صرف انہی آزادہ مزاج لوگوں کو اس میں حصہ لینا چاہیے جن کو دین سے بحیثیت دین کے کوئی تعلق نہ ہو اور صرف جشن و نشاط اور عیاشی و تماشبینی کے کاموں سے انھیں دلچسپی ہو۔ لیکن اس سلسلہ کے بعض دعوت ناموں سے پتہ چلتا ہے کہ بعضے مخلص اور دین کے دردمند بھی ان ہنگامہ بازیوں کو دینی کام سمجھتے ہیں اور ان سے مسلمانوں کی دینی اصلاح کی امیدیں رکھتے ہیں —— حال ہی میں اس قسم کے ایک صاحب کا خط راجپوتانہ کے ایک شہر سے آیا تھا جس میں راقم کو ۱۲ ربیع الاول کے سیرتی جلوس اور جلسہ کی شرکت کے لیے بڑے خلوص اور بہت اصرار سے دعوت دی تھی اور اس سے لوگوں کی ہدایت یابی کی بڑی امیدیں ظاہر کی تھیں۔ یہاں سے ان کو جو جواب لکھا گیا، ناظرین الفرقان بھی ذیل میں اس کو ملاحظہ فرمالیں۔

میرے دینی بھائی وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

.... اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو ہدایت دے، جلسوں اور جلوسوں کے جن ہنگاموں کو آپ دینی کام اور خدمتِ اسلام سمجھتے ہیں اور جس میں شرکت کے لیے آپ مجھے دعوت دے رہے ہیں میں ان کو موجودہ مسلمان قوم کی ایک بیماری اور فسادِ مزاج کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔...

میرے دوست! اسلام کے سب سے بڑے دشمن شیطان نے ہمیں کچھ ایسے کاموں میں پھنسا دیا ہے جن کو ہم اپنی نادانی اور کم غوری کی وجہ سے خدمتِ اسلام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اسلام کو ان سے ذرہ برابر بھی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ وہ الٹے مضرت رساں ہیں اور ان کی کم سے کم مضرت یہ ہے کہ آپ جیسے لوگ بھی ان کو خدمتِ دین سمجھ کر ان پر روپیہ اور وقت صرف کرتے ہیں اور اس دھوکہ میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے خدمتِ دین کے صحیح کاموں سے محروم محروم رہتے ہیں۔ دین کا درد رکھنے والوں کو خدمتِ اسلام سے محروم رکھنے کی شیطان کے پاس یہی تدبیر ہے۔ وہ ملعون آپ کے درد کو تو دل سے نکال نہیں سکتا اس لیے اپنی عیاری سے غلط راستہ پر لگا کر خدمتِ دین سے اس نے آپ کو محروم کر دیا اور آپ کو اس غلط فہمی میں

مبتلا کر دیا کہ آپ دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ دین کے دردمندوں اور مخلصوں کو شیطان ہمیشہ اسی راہ سے مارتا ہے۔

میرے مخلص! کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ کتنے برسوں سے آپ اس جلسہ جلوس کا اہتمام کرتے ہیں۔ کیا اس عرصہ میں آپ کے یہاں کے مسلمانوں کی حالت کچھ سدھری کیا لوگوں کے ایمانو میں کچھ نور اور کچھ روشنی بڑھی، نمازیوں کی تعداد میں کوئی نمایاں اضافہ ہوا؟ سنیما دیکھنے کی لعنت کچھ کم ہوئی۔ کچھ مسلمانوں نے سود اور شراب وغیرہ سے توبہ کی، جھوٹ، گالم گلوچ، اختلاف باہمی، خیانت اور بدمعاملگی جیسے بُرے کام کچھ مسلمانوں نے چھوڑ دیئے؟ ——

اگر ان میں سے کوئی نتیجہ بھی ظاہر نہیں ہوا (اور میں یقین سے کہتا ہوں کہ نہیں ظاہر ہوا ہوگا) تو کم سے کم آپ جیسے بیوپار کرنے والے آدمی کو تو سوچنا چاہیے کہ جس کاروبار میں ایک پائی کا بھی نفع نہ ہو اور صرف گھاٹا ہی گھاٹا ہو تو اس سے چمٹا رہنا کونسی عقلمندی ہے۔

چاہے آپ کو بُرا لگے میں صاف کہتا ہوں کہ آپ کے دنیوی کاروبار کی یہ صورت ہوتی تو آپ ہرگز کبھی اس حالت پر مطمئن نہ ہوتے لیکن چونکہ دین کی پوری قدر اور اس کے نفع نقصان کی فکر نہیں ہے اس لیے برسوں کے تجربے کے باوجود آپ وہی بے نتیجہ بلکہ نقصان رساں کام کیے جارہے ہیں اور سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے

میرے بھائی! اپنے دماغ کو کسی وقت تمام اِدھر اُدھر کے خیالات سے بالکل خالی کر کے اور تنہائی میں بیٹھ کے ذرا سوچیے کہ اس جلسہ و جلوس سے اب تک دین کی کیا خدمت اور مسلمانوں کی کتنی اصلاح ہوئی ہے؟ اگر اس کے بعد آپ کا دل بھی یہی گواہی دے کہ یہ ساری ہنگامہ آرائی دین کے حق میں بے نتیجہ اور لا حاصل رہی ہے اور بجائے نفع کے اس سے اور زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے تو پھر مجھ سے پوچھیے کہ دین کا درد و فکر رکھنے والوں کے لیے خدمت دین اور خود اپنی اور مسلمانوں کی دینی اصلاح و ترقی کا صحیح پروگرام کیا ہے۔ اور پھر جو کچھ میں بتلاؤں چند سال نہیں چند دن اس کا تجربہ کر کے اس کے نتائج بھی دیکھ لیجیے ؎

من آنچہ شرط بلاغ است با تو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

تاریخ اسلام میں شیعیت و باطنیت کا منفی کردار

از مولانا شمس تبریز خاں (رفیق مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ)

(دوسری قسط)

بعض باطنی و اسماعیلی فرقے اور ان کے عقائد

علامہ ابن جوزیؒ فرماتے ہیں (یہی علامہ عبد القاہر اور امام غزالیؒ کا بھی قول ہے) کہ انھیں باطنیہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن و حدیث کے ظاہری الفاظ کے ایسے باطنی معنی ہیں جو چھلکے کے مقابلے میں مغز کا حکم رکھتے ہیں........ اور جو علم باطن میں ترقی کر جاتا ہے اس سے تکلیف شرعی ختم ہو جاتی ہے اور وہ اس سے آرام پا جاتا ہے ان کا اس سے مقصد شریعت کو ختم کرنا ہے کیونکہ جب انھوں نے عقائد کو ظاہری احکام سے ہٹا دیا تو ایسے باطنی دعوے کرنے لگے جو دین سے تعلق ختم کر دیتے ہیں....... انھیں (مُحَمَّرہ) اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بابک خرمی کے زمانے میں سرخ کپڑے پہنتے تھے جو ان کا شعار تھا۔ انھیں (سبعیہ) اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کا خیال ہے کہ سات ستارے عالم سفلی کے مدبر ہیں۔ انھیں (تعلیمیہ) اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مخلوق کو امام معصوم کی تعلیم کی طرف بلاتے ہیں۔

ان کا مقصد شریعت کا خاتمہ ہے اس لیے کہ ان کی دعوت متعین نہیں بلکہ ہر جماعت سے اس کی رائے کے مطابق بات کرتے ہیں کیونکہ ان کی غرض سب پر حاوی ہونا ہے... باطنیہ کے پردوں میں کم عقل، جاہ پسند، طالع آزما، عوام دشمن، لذت پسند اور عقلیت زدہ انسان ہی نظر آتے ہیں، جن سے وہ وعدہ کرتے ہیں کہ اگر انھوں نے ان کی مرضی کے مطابق کام کیا تو وہ امام اور نبی کے درجے پر پہنچ جائیں گے اور بتدریج ترقی کرتے کرتے

حجت، پھر امامت، پھر رسالت کے درجے پر پہنچ جاتا اور (نعوذ باللہ) خدا سے مل کر خدا ہو جاتا ہے۔[1]

امام عبد القاہر بغدادی نے بھی ایسا ہی خیال ظاہر کیا ہے کہ "باطنیہ کے پیرو دل میں وہ عوام ہیں جو بصیرت سے خالی ہیں جیسے نبطی، کُرد، مجوسی، دوسرے وہ شعوبی ہیں جو عجم کو عرب پر فضیلت دیتے ہیں اور عجم کی حکمرانی کے خواہشمند ہیں۔

تیسری قسم بنی ربیعہ کے بے وقوفوں کی ہے جو آنحضرتؐ کے مضری ہونے سے خفا ہیں! عبد اللہ بن خازم السلمی نے اپنے خطبۂ خراسان میں کہا کہ ربیعہ اللہ تعالیٰ سے اپنے نبیؐ کو مضر سے مبعوث کرنے پر خفا ہیں اسی وجہ سے بنو حنفیہ نے مسیلمہ کذاب سے بیعت کی تھی کہ شاید یہ بنی ربیعہ کا نبی بن جائے۔[2]

علامہ ذہبی (نصیریۃ) کے بارے میں کہتے ہیں" یہ محمد بن نصیر کے پیرو ہیں جو امامی شیعہ تھا، نصیریہ، زمانے کے ساتھ برابر بدلتے رہے، علامہ ابن تیمیہ کے زمانے میں ان کے تلمیذ ابن مری شافعی نے ان کے عقائد کے بارے میں بتایا کہ وہ حضرت علیؓ کو خدا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حجاب، سلمان فارسیؓ کو باب، اور حضرت علیؓ کو خالق ارض وسما مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آدمؑ اسم تھے اور معنی حضرت شیثؑ تھے اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسم تھے اور معنی حضرت علیؓ، اسی کے ساتھ وہ عالم کی قدامت، تناسخ ارواح کے قائل ہیں اور قیامت کا انکار کرتے ہیں اور جنت وجہنم کو دنیاوی چیز سمجھتے ہیں، پانچ نمازوں کا مطلب پنج تن علیؓ، حسنؓ، حسینؓ، محسن اور فاطمہؓ کو بتاتے ہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ نصیریہ، اسماعیلیہ اور باطنیہ، شیعہ امامیہ ہی سے پیدا ہوئے۔[3]

نصیریہ کی بڑی تعداد شام میں ہے جو اب اپنے کو علویین کہتے ہیں۔ شام ولبنان میں بسنے والے دروزیوں کے بارے میں مولانا عبد الحلیم شرر لکھتے ہیں" شام کے اسماعیلی فی الحال تین فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں، سویدانی، خضروی اور دروز، سب سے زیادہ

---

[1] ایضاً ص ۳۶ تا ۴۷، [2] الفرق بین الفرق، ص ۲۸۶

[3] مختصر منہاج السنۃ للذہبی، ص ۹۷-۹۹ (دمشق ۱۳۷۴ھ)

جماعت تو دروز کی ہے جنھوں نے حسن بن صباح کے اصول چھوڑ کر ایک نیا مذہب بنالیا ہے۔
اس مذہب کی ابتدا یوں ہوئی کہ گیارھویں صدی عیسوی میں خلفائے بنی فاطمہ مصر میں سے الحاکم بامر اللہ نے جب پرانے خیال کے مسلمانوں پر بے انتہا مظالم کر کے تمام مخالف قوتیں توڑ دیں تو اس کے اشارے یا اس کی ہیبت و جبروت نے اس کی نسبت ایک نیا خیال پیدا کیا۔ محمد بن اسماعیل نامی ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ خلیفہ الحاکم خداوند جل وعلا کا ایک مظہر کامل ہے۔ اس اصول نے خلیفہ یا امام کی ذات میں ایک شانِ الوہیت پیدا کر دی اور اسے ایک پورا دیوتا بنا دیا۔ خوشامد آمیز عقیدت الحاکم کو ایسی پسند آئی کہ اس کی تصدیق ہی نہیں کی بلکہ حکومت کے زور سے اور لوگوں کو بھی اس عقیدے کا پابند بنانے لگا۔ اس طریقے سے جو لوگ محمد بن اسماعیل کے ہم عقیدہ بنائے گئے ان لوگوں کو دروز کا خطاب دیا گیا۔ ......

اس مذہب کا سب سے بڑا داعی اور رواج دینے والا حمزہ بن علی نامی ایک شخص تھا جس کے خطوط تبلیغ کا ایک مجموعہ یورپ میں چھپا ہے۔ یہ مجموعہ کتاب الدروز کے نام سے مشہور ہے اور فرقہ دروز میں قرآن سے زیادہ مقبولیت و وقعت رکھتا ہے۔ حمزہ نے اس فرقہ والوں کے سامنے یہ اصول پیش کیا کہ محمد (صلعم) صرف قرآن کی تنزیل یعنی ظاہری ولغوی معنوں کو سمجھ سکتے تھے۔ ان کے اصطلاحی، اصلی اور مرادی معنی فقط حاکم بامر اللہ ہی سمجھا جس میں شان الوہیت پائی جاتی تھی ...... دروز کا واقعی یہ عجیب اعتقاد ہے کہ قرآن کی حقیقت اور اس کے بذریعہ وحی نازل ہونے کے تو معتقد ہیں مگر آنحضرت کو برا بھلا کہتے ہیں ......
اگر غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں میں (یہ) یہ عجیب فرقہ ہے جس نے اپنے آپ کو قریب قریب تمام اسلامی شعائر اور مذہبی قیود سے آزاد کر لیا ہے۔ نہ ختنہ کرتے ہیں، نہ نماز پڑھتے ہیں، نہ روزہ رکھتے ہیں، شراب بے تکلف پیتے ہیں، سود کا گوشت کھاتے ہیں، کسی قسم کا تامل نہیں کرتے اور ازدواج و نکاح بہت سی رسموں اور قیدوں میں شریعت اسلام کا کچھ پاس و لحاظ نہیں کرتے۔[1]

---

[1] حسن بن صباح (مکتبہ اردو، لکھنؤ) ص ۱۵۹–۱۶۰

جمال الدین قفطی لکھتا ہے "فرقۂ باطنیہ کے بعض لوگ اس حکیم (ابیذقلیس یونانی) کو اپنا پیشوا خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابیذقلیس چند باتیں رمز و کنایہ میں کہہ گیا ہے جن کا علم آج تک کسی کو حاصل نہیں ہوا، لیکن میں نے اس حکیم کی تصانیف دیکھی ہیں، ان میں کوئی ایسی بات نہیں ملی۔

اسلام میں اس فلسفی کا مشہور پیرو محمد بن عبداللہ الجبلی الباطنی القرطبی ہے، جو اپنے مرشد کے فلسفے کا بڑا شیدائی تھا اور زندگی بھر اس کی اشاعت کرتا رہا (م ۳۱۹ھ)[1]

عبدالکریم شہرستانی (۴۷۹-۵۴۸ھ) لکھتے ہیں:

"ان لوگوں کو باطنیہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ہر ظاہر کا باطن اور ہر آیت کی تاویل کے قائل ہیں، انھیں اور القاب سے بھی یاد کیا جاتا ہے، عراق میں وہ باطنیہ، قرامطہ اور مزدکیہ، اور خراسان میں تعلیمیہ و ملاحدہ کہلاتے اور وہ اپنے کو اسماعیلیہ کہتے ہیں۔ قدیم باطنیوں نے اپنے عقائد میں فلاسفہ کے اقوال شامل کر لیے تھے اور اپنی کتابیں بھی اسی طرز پر لکھی تھیں۔"[2]

عبدالقاہر بغدادی (م ۴۲۹ھ) نے باطنیہ پر بہت تفصیل سے لکھا ہے اور ان کی تاریخ اور ان کے عقائد پر دوسرے متکلمین کے تبصرے نقل کرنے کے بعد اپنی فیصلہ کن رائے بھی دی ہے۔ اس طرح پرانے لکھنے والوں میں وہ باطنیہ پر سند کا درجہ رکھتے ہیں، یہاں ان کی تفصیلی تحریر کا صرف مختصر خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"باطنیہ کے اغراض و مقاصد کے بارے میں متکلمین اسلام میں اختلاف ہے، ان کی اکثر تعداد کا کہنا یہ ہے کہ باطنیہ کا مقصد، قرآن و سنت کی تاویل کرکے مجوسیت کی طرف بلانا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ ان کا بانی میمون بن دیصان مجوسی اور اہواز کے غلاموں میں تھا، اس کے بیٹے عبداللہ نے بھی لوگوں کو اپنے باپ کے دین کی طرف بلایا، اسی طرح اُن کا ایک داعی البزدھی

---

[1] تاریخ الحکماء، ص ۲۸-۳۹ (دہلی ۱۹۴۵ء) [2] الملل والنحل ۱/۲۹ (مصر ۱۳۲۰ھ)

نے اپنی معروف کتاب "المحصول" میں لکھا ہے کہ مبدءِ اول نے نفس کو پیدا کیا، پھر اول اور ثانی سات ستاروں اور چار طبائع کے ذریعے دنیا کو چلاتے ہیں اور یہ بالکل مجوسی عقیدہ ہے۔ .... بعض لوگوں نے باطنیہ کو صابئین حران سے منسوب کیا ہے اور یہ دلیل دی ہے کہ میمون کے بعد باطنیہ کا داعی حمدان قرمط حران کے صابیوں میں سے تھا جو اپنا دین چھپاتے ہیں اور صرف اپنے آدمیوں پر ظاہر کرتے ہیں اور باطنیہ کا بھی یہی طرز ہے۔

دین باطنیہ کے بارے میں میرا یقین یہ ہے کہ وہ دہری اور زندیق ہیں وہ عالم کو قدیم مانتے، رسولوں، اور شریعتوں کے منکر ہیں کیونکہ وہ من مانی کرنے کا میلان رکھتے ہیں، میں نے ان کی کتاب "السیاسۃ والبلاغ الاکید والناموس الاعظم" میں جو عبید اللہ بن الحسن قیروانی کا خط سلیمان بن الحسن الجنانی کے نام ہے جس میں اس نے اسے تاکید کی ہے کہ لوگوں کو ان مرغوبات کے ذریعے دعوت دو جنکی طرف وہ میلان رکھتے ہیں اور ہر ایک پر یہ ظاہر کرو کہ تم اسی کے آدمی ہو اور جس میں "صلاحیت" دیکھو اس پر اپنا راز ظاہر کرو، اور اگر کوئی فلسفی مل جائے تو اس کو غنیمت سمجھو کیونکہ فلاسفہ ہی ہمارا سرمایہ ہیں۔

اس نے اس خط میں آخرت اور عذاب و ثواب کا بھی انکار کیا ہے، اور کہا ہے کہ جنت سے مراد دنیا کا آرام، اور عذاب سے مراد متشرع لوگوں کا نماز، روزہ، حج اور جہاد میں مشغول ہونا ہے۔ اس نے اس خط میں لکھا ہے کہ اہل شریعت ایسے خدا کو پوجتے ہیں جسے پہچانتے نہیں اور اس کے نام کے سوا اس کے جسم تک ان کی رسائی نہیں۔

اس نے لکھا ہے کہ دہریہ کی عزت کرو کہ وہ ہمارے اور ہم ان کے ہیں اسی طرح وہ معجزات، نزول ملائکہ، بلکہ آسمان میں وجود ملائکہ کے وجود ہی کے منکر ہیں اور اپنے داعیوں کو ملائکہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اپنے مخالفین کو شیاطین کہتے ہیں۔ وہ انبیاء علیہم السلام کو نبوت کے ذریعہ قیادت کے خواہشمند بتاتے

ہیں۔ .... اس کے ساتھ وہ ہر رکن شریعت کی گمراہانہ تاویل کرتے ہیں،
ان کے یہاں نماز کے معنی اپنے امام کی پیروی، حج کے معنی اس کی زیارت اور
خدمت، صوم کا مطلب، امام کے راز کا افشا نہ کرنا، زنا کا مطلب بغیر عہد و
پیمان لیے اپنے مذہب کا راز بتانا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جو عبادت کا مفہوم سمجھ
گیا اس سے فرض ساقط ہو جاتا ہے اس کی دلیل (وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ
الْيَقِيْنُ، حجر ۹۹) سے دیتے اور یقین کا مطلب تاویل بتاتے ہیں۔

قیروانی نے اپنے رسالے میں سلیمان بن الحسن کو لکھا ہے کہ لوگوں کو قرآن،
توراۃ، زبور، انجیل کی طرف سے شک میں مبتلا کردو اور انھیں ابطال شریعت
اور انکار آخرت و ملائکہ کی دعوت دو۔ .... رسالے کے آخر میں کہتا ہے
کہ اس آدمی پر سخت تعجب ہے جو عقل کا مدعی ہو اور اس کی خوبصورت بہن یا بیٹی
ہو (اور اس کی بیوی حسین نہ ہو) پھر بھی وہ انھیں اپنے اوپر حرام سمجھے اور ان کا
دوسرے سے نکاح کر دے، اگر اس جاہل کو عقل ہوتی تو اپنی بہن بیٹی کا اپنے کو
مستحق سمجھتا، مگر ایسا اس لیے ہوا کہ ان کے نبی نے ان پر اچھی چیزیں حرام کر دی
ہیں اور ایک غیر معقول و غائب خدا کا خوف پیدا کر دیا ہے اور ان میں حشر و
حساب اور دوزخ و جنت کی خبریں بتائیں جنھیں وہ کبھی نہیں دیکھیں گے۔ اس
طرح اس نے انھیں غلام اور اپنی زندگی میں اپنا اور اپنے بعد خاندان کا وفادار
بنا دیا اور ان کے مال کا استحصال کیا، گویا ان سے اپنا معاملہ نقد کیا اور ان سے
اُدھار کا وعدہ کیا۔

عبد القاہر بغدادی (م ۴۲۹ھ) اپنی مشہور کتاب "الفرق بین الفرق" کی ستر ہویں
فصل "باطنیہ کے خارج از اسلام ہونے کے بیان میں" فرماتے ہیں:

"مسلمانوں پر باطنیہ کا ضرر یہود و نصاریٰ اور مجوس سے بھی زیادہ ہے بلکہ تمام دہریوں،
ہر قسم کے کافروں، اور آخر زمانہ میں ظاہر ہونے والے دجال کے ضرر و نقصان سے بھی کہیں
بڑھا ہوا ہے، کیونکہ باطنی دعوت کے ظہور سے اب تک اس کے ذریعے گمراہ ہونے والوں کی

تعداد کہیں زیادہ ہے اس لیے کہ فتنۂ دجال تو کل چالیس دن رہے گا جبکہ باطنیہ کے دجل و فریب ارض کے ذروں اور بارش کے قطروں سے بھی زیادہ ہیں۔

اصحاب مقالات اخوان الصفا کا کہنا ہے کہ "باطنی دعوت" کی بنیاد ایک جماعت نے رکھی ہے جن میں سے ایک میمون بن دیصان القداح بھی تھا۔ جو جعفر بن محمد صادق کا غلام اور اہل اذکار میں رہنے والا تھا۔ ان میں محمد بن الحسین، الملقب بہ ذیدان بھی تھا۔ یہ دونوں جب والی عراق کی قید میں تھے تو انھوں نے وہاں باطنی مذہب کے قیام کی سازش کی۔ سب سے پہلے اس جماعت میں الجبل کے کردوں کے ساتھ البدین نامی شخص داخل ہوا۔ پھر میمون بن دیصان المغرب کی طرف چلا گیا اور اپنے کو عقیل بن ابی طالب رضؓ کی نسل سے ظاہر کیا پھر غالی رافضیوں اور حلول کے قائلوں کی تائید پاکر محمد بن اسماعیل بن جعفر صادقؒ کی نسل سے ہونے کا دعوا کیا حالانکہ انھوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی۔

پھر اس باطنی دعوت میں حمدان قرمط داخل ہوا (اس کی کج روی، چھوٹے قدموں سے چلنے یا کج مج نویسی کی وجہ سے اسے قرمط کہا جاتا تھا) وہ ابتدا میں سواد کوفہ کا ایک کسان تھا، قرامطہ کی نسبت اسی کی طرف ہوتی ہے۔ پھر اس دعوت میں ابو سعید الجنابی داخل ہوا جو بحرین کے علاقے میں غالب آیا اور بنو سنبر اس کی دعوت میں داخل ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد القداح کی نسل میں سعید بن الحسین پیدا ہوا جس نے اپنا نام و نسب بدل کر اپنے کو عبید اللہ بن الحسن بن محمد بن اسماعیل بن جعفر الصادقؒ ظاہر کیا۔ پھر اس کا فتنہ المغرب میں نمودار ہوا۔ اس کی اولاد آج کل مصر کے علاقے پر قابض ہے۔ انھیں میں ابن کرویہ بن مہرویہ الدندانی تلمیذ حمدان اور حمدان کا بھائی مامون نے فارس میں اپنی دعوت دی۔ اسی لیے قرامطۂ فارس کو "مامونیہ" بھی کہا جاتا ہے۔ ارض دیلم میں ابو حاتم نے باطنی دعوت دی۔ نیشاپور میں الشعرانی نے دعوت دی جو ابو بکر بن محتاج کے عہد میں قتل ہوا۔ ماوراء النہر کے داعی محمد بن احمد نسفی، اور ابو یعقوب السجزی المعروف بہ بندانہ تھے، نسفی نے "المحصول" اور ابو یعقوب نے "اساس الدعوۃ"، "تاویل الشرائع"، "کشف الاسرار" لکھی۔ نسفی اور بندانہ بھی اپنی ضلالت کے سبب قتل ہوئے۔

بابک خرمی

اصحاب تاریخ نے لکھا ہے کہ باطنیہ کی دعوت مامون کے زمانے میں شروع ہوئی اور معتصم کے زمانے میں اشاعت پذیر ہوئی، معتصم کے فوجی افسر الافشین نے بھی باطنی دعوت قبول کرلی تھی اور بابک خرمی سے ملا ہوا تھا جو البذین کے علاقے میں بغاوت برپا کیے ہوئے تھا۔ جبل خرمیہ کے مکین مزدکی تھے اس لیے خرمی اور باطنی متحد ہو گئے، چنانچہ بابک کے ساتھ اہل بذین اور دیلم کے تقریباً تین لاکھ آدمی ہو گئے۔ خلیفہ نے ان کے مقابلے پر الافشین کو بھیجا، خلیفہ اسے مسلمانوں کا مخلص سمجھ رہا تھا حالانکہ وہ بابک سے ملا ہوا تھا چنانچہ اس نے ایسے مسلمان فوجوں کی کمزوریاں بتا دیں اور بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ پھر افشین کو کمک پہنچی اور اشغری و العجلی اور عبداللہ بن طاہر کی فوجیں بھی اس سے مل گئیں اور اس طرح بابک اور قرامطہ مسلمانوں کے لیے دردِ سر بن گئے، مسلمانوں نے ان کے خوف سے بیرزند نامی ایک مخصوص بستی بسائی اور فریقین میں کئی سال جنگ جاری رہی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اُن پر فتح عطا کی اور بابک قید ہو کر سر من رائے میں ۲۲۳ھ میں پھانسی پا گیا۔ پھر اس کا بھائی اسحاق بھی پکڑا گیا اور جرجان و طبرستان کے باغی المازیار کے ساتھ پھانسی دیا گیا، بابک کے قتل کے بعد جب خلیفہ کو الافشین کی غداری کا علم ہوا تو اس کے حکم سے اسے بھی سولی دی گئی۔

باطنیہ کے بعض اور عقائد

اصحاب تاریخ نے لکھا ہے کہ باطنیت کی بنا رکھنے والے مجوس کی اولاد اور اپنے آبائی دین کی طرف مائل تھے مگر مسلمانوں کے خوف سے اس کا اظہار نہیں کر پاتے تھے۔ ان لوگوں نے ایسے اصول وضع کیے جن میں مجوسیت چھپی ہوئی تھی، پھر انہی اصول کے مطابق قرآن وسنت کی تاویلیں کیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ثنویہ نور وظلمت کو عالم کا خالق قدیم مانتے ہیں، باطنیہ ان کے مطابق عقل و نفس کو خالق مانتے ہیں جو سات ستاروں کے ذریعے دنیا کو چلا رہے ہیں۔ باطنیہ صانع اول و ثانی کے بھی قائل ہیں جنھیں مجوس یزدان واہرمن کہتے ہیں۔ وہ آگ کی پرستش کا اعلان تو نہیں کر سکتے تھے اسی لیے انھوں نے اس کا ایک خوبصورت طریقہ نکالا اور مسلمانوں سے کہا کہ ہر مسجد میں ایک عود دان ہونا چاہیے جس میں ہر وقت عود و بخور سلگتے رہنے چاہئیں۔ برامکہ نے ہارون الرشید کو یہ مشورہ دیا تھا کہ خانہ کعبہ کے اندر بھی ایک آتشدان ہو جس میں عود وغیرہ

جلتا رہے۔ ہارون الرشید معاملہ سمجھ گیا کہ وہ کعبہ کو اس طرح آتش کدہ بنانا چاہتے ہیں چنانچہ یہ بات بھی برامکہ پر ہارون کے عتاب کا سبب تھی۔

پھر باطنیہ نے اصول دین کی مشرکانہ تاویل کرنے کے بعد احکام شریعت کی ایسی تاویل کی جس سے شریعت ہی ختم ہو جاتی یا مجوسی احکام سے مشابہ ہو جاتی۔ چنانچہ انھوں نے بیٹیوں، بہنوں سے نکاح کو جائز بتایا اور شراب نوشی اور تمام لذتوں کو مباح قرار دیا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بحرین و احساء میں سلیمان بن الحسین قرمطی کے بعد ایک باطنی نے اپنے پیروؤں کے لیے لواطت ضروری قرار دی اور ایسے لڑکے کو قتل کرنے کا حکم دیا جو اس سے منع کرے، اور جو آگ کو اپنے ہاتھ یا منھ سے بجھائے اس کا ہاتھ اور اس کی زبان کاٹ لی جائے اس کا نام ابن ابی زکریا طامی تھا اور اس کا ظہور ۳۱۰ھ ۹۲۳ء میں ہوا تھا، اس کا فتنہ کچھ عرصے تک چلتا رہا مگر اللہ نے اس پر بالآخر ایسے شخص کو مسلط کیا جس نے اسے اس کے بستر ہی میں قتل کیا۔

ہم نے باطنیوں کے مجوس کی طرف میلان کی جو بات کہی ہے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ روئے زمین پر جہاں کوئی مجوسی ہے وہ باطنیوں کے ظہور کا منتظر اور ان کا ہوا خواہ ہے۔ اور وہ سمجھتا ہے کہ انھیں حکومت باطنی فرقے ہی کے ذریعے ملے گی۔ بعض نجومیوں کے کہنے میں آکر باطنیہ خلیفہ المکتفی اور المقتدر کے عہد میں اسلامی خلافت کے خاتمہ اور مجوسی حکومت کے قیام کے منتظر تھے مگر اس کے برعکس انھیں مسلمانوں کے ہاتھوں برابر ذلت و شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

"ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" کے بارے میں

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ کے تاثرات

الفرقان کے ماہ اکتوبر کے شمارے میں ادارتی صفحات میں اس کا تذکرہ آچکا ہے کہ حضرت والد ماجد مدظلہ کی تازہ تصنیف کا ابتدائی حصہ تین قسطوں میں (جو ایرانی انقلاب امام خمینی کے متعلق ہے) جب الفرقان میں شائع ہوا، تو ان بہت سے خواص اہل علم و فکر میں جنھوں نے اس کے مطالعہ کے بعد اپنی رائے میں ترمیم کی ایک ہمارے مخدوم و محترم جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی (مدظلہ) بھی ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت والد ماجد مدظلہ کے نام مولانا موصوف کے ایک خط کا اقتباس بھی ہم نے اپنے ناظرین کے ملاحظہ کے لیے شائع کیا تھا ــــ اس کے بعد مولانا نے اپنے موقر رسالہ "برہان" میں اپنے نظرات میں اپنے اس تاثر کا قدرے تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ذکر فرمایا، ہم ذیل میں مولانا کے اسی ادارتی مضمون کو بعینہ شائع کر رہے ہیں۔

الحمدللہ کہ توقع کے بالکل مطابق مولانا کی اس مختصر سی تحریر سے بہت سے ان لوگوں کو مدد ملی ہے جو ایرانی انقلاب کے متضاد پہلوؤں کی وجہ سے حیرت اور تذبذب میں مبتلا تھے، جیسا کہ ملک اور بیرون سے ملنے والے بعض خطوط سے اندازہ ہوتا ہے ـــ ہمیں امید ہے کہ مولانا کا یہ مضمون اس مصلحت کو مزید تقویت بہم پہنچائے گا، اسی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ شاید اپنے موقف سے رجوع کی وہ سنت جو عصر حاضر میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہو گئی ہے، ایک تازہ مثال کے سامنے آنے کے بعد پھر زندہ ہو جائے۔ اس مضمون کو الفرقان میں شائع کیا جا رہا ہے (مدیر)

ایران میں انقلاب اور اس کی موجودہ حکومت کے متعلق راقم الحروف وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا ہے، ابھی گذشتہ ماہ دسمبر میں جنوبی افریقہ کے ایک سفر میں انٹرویو دیتے ہوئے راقم الحروف نے کہا تھا کہ میرے نزدیک انقلاب بہرحال اسلامی ہے اس کو سنی یا شیعہ کہنا درست نہیں ہے البتہ ایران کی موجودہ حکومت کو اسلامی نہیں کہا جا سکتا اور اس کے لیے ہمیں ابھی انتظار کرنا چاہیے۔ راقم الحروف کا ایران کے انقلاب کے متعلق یہ تاثر اس مشاہدے اور تجربے پر مبنی تھا کہ انقلاب سے پہلے ایرانی طلبہ اور طالبات کی ایک بڑی تعداد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پا رہی تھی اور یہ سب وضع قطع لباس اور معاشرت اور اخلاق وعادات کے اعتبار سے مغربی تہذیب میں ڈوبے ہوئے تھے لیکن انقلاب کے برپا ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی حالت یکسر منقلب ہوگئی، لڑکوں نے داڑھیاں بڑھالیں، انگریزی لباس ترک کر دیا اسی طرح لڑکیوں نے مغربی لباس اور نیم برہنگی ترک کر کے چادر اور لباس ساتر اختیار کر لیا۔ پھر یہی نہیں بلکہ ان سب لوگوں نے سرسید نگر میں ایک بہت بڑا مکان کرایہ پر لیا اس میں پنجوقتہ اذان کے ساتھ نماز باجماعت ہوتی تھی روزانہ عشاء کے بعد باقاعدہ درس قرآن ہوتا تھا اور آئے دن وعظ اور تبلیغ کے اجتماعات ہوتے تھے ان تمام چیزوں سے متاثر ہونا ایک امر طبعی تھا اس بنا پر انقلاب کے بعد ہی میں نے ایران میں جو نظرات لکھے تھے اس میں اس انقلاب کی بہت تعریف کی تھی لیکن انقلاب کے برپا ہونے کے بعد وہاں جو حالات پیش آئے ان کی وجہ سے شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے اور اس بنا پر میں بالکل خاموش ہوگیا، اس درمیان میں مختلف مقالات اور مضامین ان حضرات کی طرف سے شائع ہوتے رہے جنھوں نے خود ایران جا کر حالات کا مطالعہ بچشم خود کیا تھا یہ مضامین میری نظر سے گذرتے رہے لیکن چونکہ ان مضامین میں ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد خیالات وافکار کا اظہار کیا گیا تھا اس بنا پر میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکا اور تردد و تذبذب کے عالم میں رہا۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ہمارے برادر محترم مولانا محمد منظور نعمانی کو کہ انھوں نے نہایت محنت اور جانفشانی سے ان کتابوں کا براہ راست مطالعہ کیا جو خود علامہ خمینی کے قلم

کی رہین منت ہیں ان کتابوں میں علامہ خمینی نے نہایت وضاحت اور صراحت کے ساتھ ان بنیادوں کو بے جھجک اور بے تامل بیان کردیا ہے جس پر انقلاب ایران مبنی ہے اور حکومت کے اس نصب العین اور منہج وطریق کار کی بھی وضاحت کردی ہے جس پر وہ اب اپنی حکومت کو چلا رہے ہیں اور آئندہ بھی اسی نہج پر کام کرنے کا عزم رکھتے ہیں، مولانا نعمانی نے اپنے اس دقیق اور عمیق وسیع مطالعے کے نتائج صاف اور شستہ زبان میں نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ماہنامہ الفرقان کی گذشتہ چند اشاعتوں میں شائع کردیے ہیں میں نے مولانا کے یہ مقالات بڑی دلچسپی سے از اول تا آخر پڑھے اور اب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ایرانی انقلاب یا موجودہ حکومت کے متعلق میں نے اب تک "برہان" میں جو کچھ لکھا ہے میں اس سے رجوع کرتا ہوں۔ الفرقان کے یہ مضامین اس درجہ اہم اور بصیرت افروز ہیں، کہ ان کے مطالعے کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی صحیح العقیدہ مسلمان ان سے اختلاف کی جرأت کرسکتا ہے۔ جی تو چاہتا تھا کہ میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھوں لیکن اس سے خواہ مخواہ مذہبی بحثوں کا دروازہ کھلتا ہے جن میں الجھنا میری افتادِ طبع کے خلاف ہے۔ ضرورت ہے کہ مولانا نعمانی کے ان مضامین کو کتابی شکل میں چھاپنے کے علاوہ ان کا عربی، انگریزی اور فارسی میں ترجمہ بہت بڑی تعداد شائع کیا جائے۔

بہرحال علامہ خمینی کا ہم سب کو اس لیے شکر گذار ہونا چاہیے کہ اگر وہ چاہتے تو تقیہ کے اصول پر عمل کرکے عالمِ اسلام کی عام ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اپنے ان افکار وخیالات کو جو انھوں نے اپنی کتابوں میں ظاہر کیے ہیں، بیان نہ کرتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ نہایت صفائی اور وضاحت سے اپنے بنیادی عقائد وافکار کو اپنی تصنیفات میں بیان کردیا ہے اور اس کے بعد عالم اسلام کو موقع دیا ہے کہ وہ ایران کے انقلاب اور اس کی حکومت کے متعلق اپنا موقف متعین کریں یقیناً یہ بہت بڑی جسارت اور خود اعتمادی کی دلیل ہے جس پر علامہ خمینی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

والسلام علی من اتبع الھدیٰ

چند ضروری گذارشات

۱ — آپ حضرات سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ کتب خانہ الفرقان خالص تجارتی ادارہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اولین مقصد کم سے کم قیمت پر مفید دینی کتابوں کی فراہمی ہے — اس کا اندازہ کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات کی قیمتوں کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ کی تازہ تصنیف ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت کی قیمت ممکن حد تک کم رکھی گئی ہے — اور پھر اس کی توسیع اشاعت کے لیے جس رعایتی اسکیم کا اعلان کیا گیا ہے، اس کے بعد تو کتب خانہ کو اس کی مجموعی لاگت بھی وصول نہیں ہو گی۔ لیکن ہمارا منشا یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک یہ کتاب پہنچ جائے، اور ایک سنگین فتنہ کا سد باب ہو سکے اور ہم بھی اس کے اجر و ثواب میں کچھ حصہ اللہ کے کرم کی بدولت پا سکیں۔

آپ سے ہماری خصوصی گذارش اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اس کتاب کی توسیع اشاعت کے لیے خالص دینی دعوتی جذبہ سے کوشش کیجیے خود پڑھئے دوسروں کو اس کے مطالعہ کی طرف متوجہ کیجیے۔

۲ — ماہ اکتوبر کے شمارے میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ کی مذکورہ تصنیف "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" کی عنقریب اشاعت کا اعلان کیا گیا تھا، اس وقت ہمیں امید تھی کہ وسط نومبر تک کتاب کی طباعت کا مرحلہ مکمل ہو جائے گا۔ اور آخر نومبر تک اس کی ترسیل شروع ہو جائے گی۔ لیکن اولاً تو کتاب کے مقدمہ کے انتظار میں تاخیر ہوئی۔ پھر گذشتہ ماہ کے اوائل میں جو حالات ملک کے بیشتر علاقوں میں پیش آئے ان کی وجہ سے مزید تاخیر ہوئی — اب الحمد للہ کتاب کی طباعت شروع ہو چکی ہے اور امید ہے کہ جب تک الفرقان کا یہ شمارہ آپ کو ملے گا، کتاب کی ترسیل شروع ہو چکی ہو گی۔ اکتوبر کے شمارے میں شائع شدہ اعلان کے بعد ملک اور بیرون ملک سے بہت بڑی تعداد میں فرمائشی خطوط ہمیں موصول ہو رہے ہیں لیکن چونکہ وہ شمارہ کچھ تاخیر سے روانہ ہو سکا تھا اور پھر گذشتہ دنوں کے حالات کی وجہ سے بہت سے حضرات کو اتنی تاخیر سے موصول ہوا کہ وہ کتاب کی توسیع اشاعت کے لیے ہماری خصوصی رعایتی اسکیم کے بموجب اپنی فرمائش سے ہمیں وقت مقررہ کے اندر مطلع نہ کر سکے۔ اس لیے ہمارے بعض کرم فرماؤں نے اس طرف ہمیں متوجہ کیا اور رعایتی اسکیم کی مدت میں اضافہ کا مشورہ دیا لہٰذا

اب یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اس کی مدت میں ایک ماہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے ــــ ۳۱ دسمبر تک جو فرمائشیں ہمیں موصول ہو جائیں گی ان کی تعمیل رعایتی اسکیم کے مطابق کی جائے گی ــــ

۳ ـ دینی مدارس کے ذمہ داران کی خدمت میں:

جیسا کہ آپ حضرات کو بخوبی علم ہے کہ شیعیت اپنے مخصوص مزاج، سازشی اغراض و مقاصد اور تاریخی اسباب کی بنا پر اپنے مکروہ کردار پر اسلامیت، اور محبت اہلبیت کی نقاب ڈالے رہنے میں بڑی حد تک کامیاب رہی ہے ــــ لیکن تقدیر الٰہی نے ایرانی انقلاب اور امام خمینی کے ذریعہ اس نقاب کو مزید دبیز کرنے کی کوشش کرا کے شیعیت کے عقائد اور کردار کی صحیح تشخیص کی جستجو اور فیصلہ کن انداز میں شیعیت اور اسلام کے تعلق کی وضاحت کا جو جذبہ علمائے اہلسنت میں پیدا کر دیا ہے اس کے نتیجہ میں امید ہے کہ آئندہ آنے والی نسلیں شیعیت کے بارے میں اس طرح بے خبر نہیں رہیں گی جس طرح کہ اب تک کا عام حال تھا۔ اور کیا عجب ہے کہ ایرانی انقلاب کے اس عارضی شر میں یہ دیرپا اور نہایت بیش قیمت خیر بھی پنہاں ہو۔ (ان ربی لطیف لما یشاء)

پوری دیانت داری کے ساتھ ہمارا یہ احساس ہے کہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ کی یہ تازہ تصنیف اس سلسلہ کی نہایت اہم کڑی ہے، اس کے مطالعہ سے شیعیت کو سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا۔

ہمارا خیال ہے کہ دینی مدارس کے فضلا حضرات اساتذہ، اور ائمہ مساجد کو شیعیت کے بارے میں ضرور واقف ہونا چاہیے ــــ اور اس مقصد سے اس کتاب کا مطالعہ ان کے لیے ان شاء اللہ بہت مفید ہوگا۔

گجرات کے بعض مدارس کے ذمہ داران نے لکھا ہے کہ اسی ضرورت کو محسوس کر کے انھوں نے اپنے اساتذہ و طلبہ کو جمع کر کے اس کتاب کے مطالعہ کی ترغیب دی، جن میں سے کثیر تعداد نے اس کتاب کو خریدنے کا اشتیاق ظاہر کیا، جس کی بنا پر ان مدارس کے ذمہ داران نے سو سو نسخے طلب فرمائے، ساتھ ہی انھوں نے ہم سے دینی مدارس کے لیے شرح رعایت بھی دریافت فرمائی، ہم نے ان حضرات کو یہ لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کے سو نسخے طلب کرنے پر ان شاء اللہ ۴۰٪ خصوصی رعایت بھی پیش کی جائے گی اور محصول بھی ہمارے ذمے ہوگا۔ اب ہم ہندوستان کے تمام دینی مدارس کے محترم ذمہ داران کی خدمت میں اپنی یہی پیشکش عرض کرتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ اس پر فوری طور پر توجہ فرمائی جائے گی۔

۴۔ وی پی سے نہ منگائیں:

شاید بہت سے حضرات کو یہ یقین کرنے میں مشکل پیش آئے کہ گذشتہ دو ماہ سے کتب خانہ الفرقان کو ایک بھی وی پی فارم موصول نہیں ہوا ہے۔ مجموعی طور سے دو سو سے زائد وی پی پیکٹ ایسے ہیں جن کی رقم ہمیں موصول نہیں ہوئی ہے۔ جبکہ ان میں سے نصف کی رقم ہمارے مقامی ڈاکخانہ میں آچکی ہے۔ لیکن وہاں کے کارکن صاف کہتے ہیں کہ ہمیں ہر فارم پر کچھ ملے تو ہم اس کی ڈیلیوری کریں گے ـــــ ہمیں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ لکھنؤ کے سب اور دو ناشرین کے ساتھ یہ ذلیل حرکت کی جا رہی ہے ـــ اور ان رقموں کو سود کی کاروبار میں لگا کر ڈاکخانہ کے بابو لوگ اپنے پیٹ کی دوزخ بھر کر اپنے کو بہت ہی چالاک اور کامیاب سمجھ رہے ہیں۔ اعلیٰ ذمہ داران کی طرف سے ہماری پے در پے شکایتوں پر کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ ہم ہرگز ان کے اس ناجائز مطالبہ کو پورا نہیں کریں گے ـــ اس سلسلہ میں ہمیں اپنے تمام قارئین سے اس تعاون کی ضرورت ہے کہ وہ حتی الامکان نہ کتابوں کو بذریعہ وی پی طلب فرمائیں، نہ رسالہ کا چندہ وی پی سے بھیجیں۔ (اسی لیے ہم نے اپنے قارئین کی سہولت کے پیش نظر ختم مدت کی اطلاع کے ساتھ ہی منی آرڈر فارم کی ترسیل کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔) خاص طور پر اس کتاب کے بارے میں ہماری گذارش ہے کہ اسے بذریعہ وی پی نہ طلب فرمایا جائے۔ جو حضرات بذریعہ وی پی بھیجنے کی فرمائشیں ارسال کر چکے ہیں، ان سے گذارش ہے کہ وہ ہماری مجبوری کا لحاظ فرماتے ہوئے پیشگی رقم ارسال فرما دیں۔

۵۔ پاکستان میں اس کتاب کی اشاعت جس ادارہ کے سپرد کی گئی ہے اس کا پورا پتہ یہ ہے

صدیقی ٹرسٹ، پوسٹ بکس ۶۰۹، نسیم پلازا، نشتر روڈ، کراچی ۵

۶۔ بعض حضرات نے دریافت فرمایا ہے کہ کتاب کے انگریزی و عربی تراجم کب تک تیار ہو جائیں گے؟ سو اس کی بابت عرض ہے کہ ابھی ان تراجم کی تیاری میں کم از کم دو ماہ اور لگیں گے ـــــ ہماری پوری کوشش ہے کہ جلد از جلد یہ تراجم مکمل ہو کر شائع ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ آسان فرمائے۔

۷۔ اکتوبر کے شمارے میں آپ نے اس کتاب کا جو مفصل تعارف ملاحظہ فرمایا تھا، ہم نے اسے ایک مکمل تعارف نامہ کی شکل میں الگ بھی چھپوا کر تیار کر لیا ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں ایسے حضرات یا لائبریریاں، یا انجمنیں اور تنظیمیں ہوں جن کی نظر سے یہ تعارف نامہ آپ کی رائے میں گذرنا مناسب ہو تو آپ ہمیں ان کے پتے لکھ دیجیے یہاں سے وہ تعارف نامہ ان شاء اللہ (بلا قیمت) ارسال کر دیا جائے گا۔

(ادارہ)

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

از مولانا محمد منظور نعمانی

ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت
مولانا مدظلہ کی تازہ ترین عظیم تصنیف
عکسی طباعت سے مزین۔ قیمت صرف ۲۰/-

کتاب	قیمت
اسلام کیا ہے؟	۸/-
دین و شریعت	۱۲/-
قرآن آپ سے کیا کہتا ہے	۱۰/-
ملفوظات مولانا الیاسؒ عکسی	۸/-
معارف الحدیث مکمل مجلد (اول، پنجم، ششم، ہفتم اب عکسی طباعت سے مزین)	۱۹۰/-
تذکرہ مجدد الف ثانیؒ	۱۸/-
تصوف کیا ہے؟	۸/-
شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور علمائے حق پر اس کے اثرات	۶/-
کلمہ طیبہ کی حقیقت	۳/-
نماز کی حقیقت	زیر طبع
برکات رمضان	۳/۵۰
آپ حج کیسے کریں؟	۹/-
آسان حج اُردو	۲/-
〃 ہندی	۳/۵۰
منتخب تقریریں	زیر طبع
مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف	۱۰/-

کتاب	قیمت
فیصلہ کن مناظرہ	۵/۵۰
شاہ اسماعیل شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات	۳/۵۰
تبلیغی جماعت جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات	۳/۷۵
قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟	۲/-
کفر و اسلام کے حدود اور قادیانیت	۲/-
قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ	۲/-
براق الغیب علی من یدعی لغیر اللہ علم الغیب یا مسئلہ علم غیب کا قرآنی فیصلہ	۱۳/-
آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ اور آپ کی منزل کیا ہے؟ عکسی	۲/۵۰
میری طالب علمی	۱/-

از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

کتاب	قیمت
تجلیات ربانی (مکتوبات مجدد الف ثانیؒ) مکمل دو حصے	۲۴/-
مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی	۱۶/-
تذکرہ خواجہ باقی باللہ	زیر طبع
وصایا شیخ شہاب الدین سہروردیؒ	۲/-

دیگر مصنفین کرام کی تصانیف

کتاب	قیمت
صحبتے با اہل دل (از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)	۱۳/-
رہنمائے تلاوت یا قرآن کریم کی بیسک ریڈر	۱۲/-
تاریخ میلاد (از مولانا عبدالشکور مرزاپوری)	۸/-
بریلوی فتنہ کا نیا روپ (از مولانا محمد عارف سنبھلی ندوی)	۱۲/-
تذکرہ شیخ الحدیثؒ (ماہنامہ الفرقان کا شیخ الحدیث نمبر)	۳۰/-
تذکرہ حضرت مولانا یوسفؒ (ماہنامہ الفرقان کا حضرتؒ جی نمبر)	۱۲/-
انقلاب ایران اور اس کی اسلامیت، ایک سفر ایران کی سرگزشت۔ مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کی بنا تصنیف	۴/-
ذہنی قسیال	۰/۵۰
تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ	۲/۵۰
معمولات یومیہ	۱/۵۰
اوراد فضیلہ	۲/-
احکام نماز	۱/-
قرآنی علاج	۱/۵۰
تبلیغ دین کے لیے ایک اہم اصول (از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)	۱/-

ملنے کا پتہ: الفرقان بک ڈپو۔ ۱۱۴ نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

حال ہی میں شائع ہونے والی کچھ اہم مطبوعات

تحفۂ انسانیت

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

مولانا کے حلقۂ پیام انسانیت کے تحت بھوپال، اجین، اندور اور مالوہ کے دورہ کی دلچسپ اور پر اثر روداد جس میں مولانا کی کئی اہم تقریریں ہیں ۱۰/-

تحفۂ مشرق

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

مولانا مدظلہٗ کے سفر بنگلہ دیش کی پانچ اہم فکر انگیز اور ایمان افروز تقریریں۔ جن میں بصیرت ایمانی مطالعۂ قرآن اور حقیقت پسندی سے کام لیا گیا ہے۔ قیمت ۴/-

تفہیم القرآن سمجھنے کی کوشش حصہ دوم

(از مفتی عبدالقدوس رومی)

مولانا مودودی کی مشہور تفسیر تفہیم القرآن پر تبصرہ کی دوسری جلد جس میں سوا پارہ کی تفسیر پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۱۵/-

تاریخ دارالعلوم ندوۃ العلماء

ہندوستان کی عظیم تعلیمی تحریک ندوۃ العلماء کی تاریخ جس میں اس کی تعمیری و اصلاحی خدمات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ دو حصوں میں مکمل

حصہ اول ۲۵/- حصہ دوم ۳۵/-

برکت نماز

نماز کے موضوع پر ایک نہایت جامع کتاب جس میں تمام نماز کے ضروری مسائل و فضائل کو اس طرح جمع کیا گیا ہے کہ یہ کتاب آپ کو بہت سی نماز کی کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ ۴/-

سماج کی تعلیم و تربیت

مغربی تجربات۔ اور۔ اسلامی تصور

از مولانا محمد رابع حسنی ندوی

فن تعلیم فرد و معاشرہ کی نفسیات، علم النفس و علم الاجتماع اور دعوت الی اللہ کے موضوع پر بے شمار وسیع کتب سے ماخوذ کردہ یہ کتاب خاص کر فضلائے مدارس اور دینی دعوت کا کام کرنے والے عربی داں نوجوانوں کی حالات و ضروریات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنا کام کرنے کے لیے دین کے ہر داعی کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ ۱۵/-

ذائقہ

از خیر النساء بہتر صاحبہ مرحومہ۔ والدہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ اس میں نفیس اور لذیذ ہندوستانی کھانے تیار کرنے کی ترکیبیں درج کی گئی ہیں۔ ہر گھر میں رہنے کے قابل کتاب قیمت ۴/۵۰

آداب السلام

سلام کے موضوع پر قرآنی آیات اور احادیث نبوی کی روشنی میں لکھی گئی ایک مفید کتاب ۳/-

بدعات محرم اور تعزیہ داری

اس میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ شیعی مراسم کی اصل حقیقت اور ان کا غیر شرعی ہونا کتاب و سنت علمائے کرام کے فتاویٰ اور کتب شیعہ کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے۔ ۴/-

رد فتنہ یعنی فتنہ یا حاصل مطالعہ اول

ڈاکٹر سید انور علی کی کتاب رد فتنہ کا جواب۔ قیمت ۶/-

. . . .

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کی خود نوشت سوانح

کا دوسرا حصہ

کاروانِ زندگی (حصہ دوم)

سرگزشت حیات (آپ بیتی) کا دوسرا حصہ جس میں ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۸ء کے آخر تک کے اہم واقعاتِ زندگی، مصروفیات و اسفار، ذاتی زندگی نیز ملک و بیرون ملک میں پیش آنے والے اہم حوادث و تغیرات ذہن و قلب پر ان کے اثرات، اور فکر و تحریر میں ان کے انعکاسات کی تصویر پیش کی گئی ہے، اور ملت کے ایک دردمند و حقیقت پسند فرد کی حیثیت سے ان واقعات کا بے لاگ جائزہ بھی لیا گیا ہے اور کتاب و سنت، اقوام و ملل کی تاریخ، اور اسباب و نتائج کے باہمی ربط کی روشنی میں ان کا علاج بھی تجویز کیا گیا ہے۔

ایک تاریخی دستاویز، ادبی مرقع، دعوتِ فکر و عمل

معیاری کتابت و آفسٹ طباعت، پلاسٹک کوٹیڈ ڈسٹ کور

مجلد -/۳۰، مکمل سیٹ -/۶۵،

پوری قیمت پیشگی بھیجنے والوں کو پوسٹ و رجسٹری فیس کی رعایت کے ساتھ کتاب رجسٹرڈ بھیجی جائے گی

ملنے کا پتہ

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، پوسٹ بکس ۱۱۹، لکھنؤ

(ناشر خود مصنف کتاب مدظلہ)

Monthly AL-FURQAN 31, Naya Gaon West Lucknow-226018
VOL. 52 NO. 12 DECEMBER 1984 Phone : 45547